ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

سوانح حیات

خطیب پاکستان حضرتؒ مولانا

قاضی احسانؒ احمد شجاع آبادیؒ

رحمۃ اللہ علیہ

مصنفہ

محمدؐ نورالحق قریشی ایم۔اے۔ایل۔ایل بی ایڈووکیٹ ملتان

ناشر

مکتبہ احسان نزد چھلیک ملتان شہر فون ۳۶۲۱

قیمت ۱۶ روپے

سوانح حیات
خطیبِ پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی

فہرست ابواب

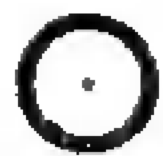
انتساب

جناب چودھری اعجاز حسین ولد جناب چودھری اللہ دتہ مرحوم
مالک ڈیلر میسی فارگوسن ٹریکٹر، عارف والہ کے نام ——
جو ۱۳ر فروری ۱۹۷۷ء کو بعمر ۲۷ سال، مریدکے (شیخوپورہ) کے قریب
کار کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ——
چودھری صاحب کی جوانمرگ موت سے عارف والہ کے در و دیوار ہل گئے
جنازہ کے وقت ایک تاریخی اجتماع تھا —— ہر شخص اشک بار اور
پُرنم تھا —— دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں جنّت الفردوس میں جگہ
عطا فرمائے اور برادر عزیز چوہدری محمد فیاض سلمۂ کو ہمہ قسم کی ذمّہ داریوں
سے عہدہ برا ہونے کی توفیق مرحمت کرے۔ آمین

شریکِ غم
نورالحق قریشی

"پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدّین وزیر اعظم کی توجہّ قادیانی تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کرائی وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھا قادیانیت کی مخالفت اس شخص کی زندگی کا واحد مقصد معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ جہاں کہیں جاتا ہے، اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر بھرا ہوتا ہے۔ زیادہ اہم سیاسی واقعات کا ذکر تو درکنار، پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت پیش آجائے، کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہوجائے، قائدِ ملّت قتل کر دیئے جائیں یا ہوائی جہاز گر پڑیں، قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں ہی کی سازش کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

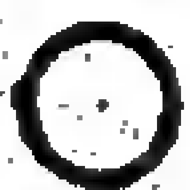
(رپورٹ تحقیقاتی عدالت ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۲)



"خدا نے ہمارے خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ان لوگوں کو جماعت سے وابستہ کر دیا ہے جن کا گلا اور آواز پروپیگنڈا کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا عبد القیوم کان پوری، حضرت مولانا غلام غوث، مولانا عبد القیوم پوپلزئی، عبد الرحیم عاجز، حافظ علی بہادر خاں بمبئی، قاضی احسان احمد، یہ کون ہیں؟ مجلس احرار کو قدرت کے عطا کردہ لاؤڈ سپیکر ہیں۔ اسی سبب سے دنیا خار کھاتی ہے۔ اسی باعث ہمارے مخالفوں کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ جو نیا ادیب اور خطیب حوصلہ مندی سے اٹھتا ہے اُسے احرار میں شامل ہونے کی راہنمائی ہوتی ہے۔ آخری سول نافرمانی پر ہماری قوت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ کیا جانے قدرت کو اس جماعت سے کیا کام لینا ہے؟"

تاریخ احرار، صفحہ ۲۶۸

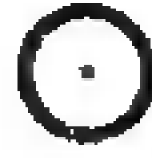
امیر افضل حق مرحوم



ہندوستان کے مردہ مسلمانو! تم کون سے صورِ اسرافیل کے منتظر ہو؟ ہندو آزادی مانگ رہا ہے اور تم بے حس و حرکت پڑے ہو۔ یاد رکھو، ہندو انگریز سے زیادہ کینہ خصلت دشمن ہے۔ اگر تم اس کے غلام بن گئے تو مٹ جاؤ گے۔ اگر تم غلام ہی رہنا چاہتے ہو تو موجودہ قفس میں کونسی بُرائی ہے قفس تو بہر حال قفس ہی ہے، خواہ وہ انگریز عیّار کا ہو یا ہندو مکّار کا۔ پس اگر تم اپنے رشتۂ فلاح میں بدبختی اور غلامی کی گرہ نہیں لگانا چاہتے ہو، تو کسی صورِ اسرافیل کا انتظار کئے بغیر اپنے ایک الگ ملک کے حصول کے لئے جنگِ آزادی لڑو۔ ہندوؤں سے زیادہ تو تم کو وطن کی ضرورت ہے۔ ہندو اپنے تمام مُردے ایک گڑھے میں ڈال کر جلا سکتا ہے لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اُسے زندہ رہنے کے لئے زمین کی ضرورت ہے، لیکن مسلمانوں کو زندہ رہنے کے لئے ۲ دو فٹ اور مرنے کے لئے ۶ چھ فٹ زمین کی ضرورت ہے۔

امیرِ شریعت

بحوالہ "ترجمان اسلام" ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء



"میں اپنی حکومت سے، اپنے وزراء سے، سردار عبدالرب نشتر سے، بصد احترام درخواست کرتا ہوں کہ خدارا آپ اس جھگڑے کو ختم کر دیجئے آپ مجھے اور مرزا بشیر الدین محمود امیر جماعت احمدیہ دونوں کو بیک وقت گرفتار کر لیجئے۔ دونوں کو اکٹھی ہتھکڑی لگائیے اور اکٹھے ہی سات دن کے لئے حوالات میں رکھئے۔ کھانے کو پانی اور نمک کے سوا کچھ نہ دیجئے اور پھر سات دن تک تحقیقات کیجئے اور ہم دونوں کو عدالت میں پیش کر دیجئے۔ مرزا محمود چاہیں تو اپنا وکیل چوہدری سر ظفر اللہ بالقابہ کو مقرر کر لیں اور میں خود اپنی وکالت آپ ہی کروں گا۔ اور پھر اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں یا میری پارٹی غدار ہے تو لاہور سے لے کر پشاور تک مجھے، میرے اہل و عیال، تمام ساتھیوں، دوستوں اور سب کی سب پارٹی کو درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دو۔ اور اگر مرزا بشیر الدین اور اس کی جماعت غدار ثابت ہو جائے، تو قادیاں سے ربوہ تک تمام قادیانی درختوں سے اُلٹے لٹک رہے ہوں۔"

روزنامہ "آزاد" لاہور۔ ۳۰ اپریل ۱۹۵۰ء

"شاہ جی کی تقریر کا اقتباس"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

قاضی احسان احمدؒ

"ایک شخصیت"

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی دینی و سیاسی تاریخ کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ اس خطے کی گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ مسلمانوں کی ہی تاریخ ہے اور اس تاریخ کی تشکیل و ترتیب میں سب سے زیادہ، سب سے اہم اور بنیادی حصہ علماء دین کا ہے۔

برصغیر میں علماء کی تاریخ صرف مذہبیات کی تاریخ ہی نہیں ہے بلکہ یہ سیاسیات کی بھی تاریخ ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک کو صحیح سیاسی سوجھ بوجھ صرف علماء حق کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں گزشتہ ایک ہزار سال کے علماء حق کے سیاست گرانہ کردار پر تفصیل سے روشنی ڈال سکوں۔

تاہم اتنا تو ہر پڑھے لکھے مسلمان کو علم ہے کہ عہد اکبری سے عہد انگلیشیہ تک حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا فضل حق خیر آبادیؒ، حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا ابوالکلامؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ وہ اکابر علماء حق گزرے ہیں جنہوں نے اس ملک میں دین اور سیاست کو اس طرح یکجا کر دیا تھا کہ مؤرخ کا قلم ان کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان بزرگوں میں سے ہر شخصیت اپنے عہد اور اپنے دائرے کی انسانیت ساز اور تاریخ گر شخصیت تھی۔ وہ بجائے خود ایک امت تھے، اور انہوں نے جماعت علماء حق کی ایسی شیرازہ بندی کی تھی، جس نے

واقعات وحالات کے ہر موڑ پر حق کا عَلَم بلند رکھا، اور باطل کا چیلنج قبول کیا ——— پنجاب کی سرزمین پر ایسی ہی ایک شخصیت کا ظہور برطانوی عہد کے عین عروج کے وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام سے ہوا جس نے ہندوستان کے چپہ چپہ پہ فرنگی اقتدار کو چیلنج کیا، اور فرنگیت کے ان دیسی گماشتوں کو قدم قدم پر للکارا، جن کو اسلام کے نام کی نقاب ڈال کر انگریز نے مسلمانوں کی صف میں داخل کیا، اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ختم نبوّت کے قلعہ میں شگاف ڈالنے پر مامور کیا تھا۔ ان عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے جنہیں بعد میں امیر شریعت کے معزز لقب سے نوازا گیا، ایک قافلۂ احرار ترتیب دیا تھا جو فرنگیت اور مرزائیت کے تعاقب کا ہراول دستہ بن گیا۔

برصغیر پاک وہند کی تاریخ آزادی اور تاریخِ باطل شکنی اس قافلۂ احرار کی داستانِ جرأت و جان نثاری کی ہمیشہ مرہونِ منّت رہے گی، بالخصوص پنجاب کی سرزمین کو فرنگی استبداد اور مرزائیت کے اثرات سے نجات دلانے میں اس قافلہ کے کارہائے نمایاں بھلائے نہیں جا سکتے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترتیب دئے ہوئے اس قافلہ میں یوں تو ہر شخص قربانی وایثار، جرأت وعزیمت کا پیکر تھا، تاہم جن خاص شخصیتوں نے اس قافلے کے نام کو تاریخ میں سربلند بنایا اور جن کے کردار عملی سے علماء سلف کی تاریخ زندہ وتابندہ ہوئی ان میں ایک شخصیت حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی بھی تھی۔

قاضی احسان احمد مرحوم نہ صرف قافلۂ احرار کے سرگرم راہنما تھے بلکہ اپنی دل آویز شخصیت اور اپنی سحر انگیز خطابت کی بدولت انہیں شاہ صاحبؒ کا ثانی بھی کہا جاتا تھا۔

قاضی صاحب کے کارنامے احرار کی تاریخ کے ہی نقوش نہیں ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں، اور علماء حق کے تذکار میں اپنا ایک انفرادی اور اہم مقام رکھتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ بنانے میں علماء کا جتنا اہم حصّہ ہے افسوس کہ ان کے کارناموں کے ذکر سے ہماری تاریخ اتنی ہی خالی ہے۔ کتنی عجیب اور اندوہناک بات ہے کہ فرنگی کے اقتدار اور اسلام کو مٹا دینے والے فتنوں کا مقابلہ جس جاں گسل تندہی اور قربانی کے ساتھ مسلسل دو سو سال تک علماء حق نے کیا، اس کے ذکر سے تو ہماری نام نہاد تاریخ کی کتابیں یکسر خالی ہیں۔ یا سرسری طور پر ایک آدھ بات کا

ذکر کرکے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں انگریزوں نے اپنی حمایت و خدمت کے صلہ میں شمس العلماء، سر اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا اور اپنے تسلّط کو قائم رکھنے کے لئے آلۂ کار بنایا، ان کا ذکر ان کتابوں میں قابلِ فخر مشاہیر کی طرح کیا جاتا ہے۔

اس کمی کو ہر سچے مسلمان اور محبّ وطن کا دل شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن یہ کمی بھی وہی لوگ دُور کر سکتے ہیں جن کا ذہنی اور عملی تعلق ان بزرگانِ ملت اور سلسلۂ حریت و احرار کے اکابر سے ہے۔

بلاشبہ ان اداروں کی یہ زبردست ذمہ داری ہے جو ان بزرگوں کے ساتھ اپنے تعلق کا دامن وابستہ کرتے ہیں لیکن ان کی زندگیوں کے حقائق کو نمایاں کرنے اور ان سے عوام الناس کو روشناس کرانے کیلئے مسلسل غفلت و تساہل اور کوتاہی برت رہے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ کو مختلف انگریز دوست حلقے جس طرح مسخ ہی نہیں بلکہ جعلی بنا رہے ہیں، اسکی ذمّہ داری سے یہ ادارے بھی بری نہیں ہو سکتے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی مرحوم کے بارے میں ان کے نسبتی فرزند جناب قاری نور الحق صاحب ایڈووکیٹ نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس سے مولانا مرحوم کی زندگی کے مذہبی، قومی، سیاسی اور علمی پہلوؤں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مستقبل کے ایسے ہی کاموں کیلئے نشانِ راہ بنے گی اور قاری صاحب کی یہ کوشش مقبول ہو گی۔ میں قاری صاحب کو ان کی اس سعی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ قاضی صاحب مرحوم کی زندگی حق پسند اور حریت پرور افراد کیلئے ایک قابلِ قدر نمونہ ہے اور یہ نمونہ اب قاری نور الحق صاحب کی بدولت ہر شخص کی دسترس میں آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی بلیشمار رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

(مفتی) محمود[عـہ] M.N.A

شیخ الحدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان و جنرل سیکرٹری کُل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام

۵ ربیع الاوّل ۱۳۹۲ھ - ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء بروز جمعرات بوقت ۱ بجے صبح

عـہ مفتی محمود صاحب، وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد

حرفِ آغاز

اقوامِ عالم میں سیاسی و مذہبی اختلافات، معاشی و معاشرتی تفاوت، نیز تہذیبی و ثقافتی تناقص کے باوجود، ایک باب میں ہمیشہ ہم آہنگی و یکسانیت رہی ہے اور وہ ہے ہر قوم کی تاریخ کا "بابِ حرّیت"۔

ہر قوم نے اپنے طور پر غیر ملکی اقتدار سے نجات پانے، قومی شعائر کے تحفّظ، ملّی اقدار کے احیاء اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے وسیع جد و جہد کی ہے اور بعض اقوام آجتک اس جدّ و جہد میں مصروف ہیں۔ جب کسی قوم میں حرّیت و آزادی کے علمبردار اپنی سرگرمیاں کھلم کھلا یا زیرِ زمین شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے ہی ملک کے لوگ انہیں "فتنہ پرور، انتشار پسند، وطن دشمن اور غدّار" کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ الفاظ ہم وطن از خود استعمال نہیں کرتے بلکہ غیر ملکی حکمران اپنے جھوٹے پراپیگنڈے اور ناجائز اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے بعض گروہوں (سرمایہ داروں اور مفاد پرستوں) کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا کر حرّیت پسندوں کے خلاف استعمال کراتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ کی رَو میں سادہ قسم کے لوگ بھی بہہ جاتے ہیں۔ لیکن ہر قوم کا حرّیت پسند طبقہ ان "القابات اور تمغہ جات" کی پروا کئے بغیر اپنی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کامیابی اس کے قدم چُوم لیتی ہے۔ لیکن جونہی وہ کامیابی کی دہلیز پہ قدم رکھتا ہے، مفاد پرست طبقہ دوسرے ہی سانس میں انہیں "جہادِ آزادی کا علمبردار" اور "قوم پرست لیڈر" کہنا شروع کر دیتا ہے۔

انسانی تاریخ نے حرّیت پسندوں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کیا۔ اس طبقہ کے ساتھ

اپنے انصاف کرتے ہیں اور نہ وقت کا مؤرخ عدل و انصاف کا قلم اپنے ہاتھ میں لیتا ہے آج کا مؤرخ قصیدہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ نیز اس کے قلم کو چونکہ خلعتِ فاخرہ اور انعام و اکرام کی ضرورت ہے اور یہ تمام چیزیں اُسے مفاد پرست طبقہ، خوشامد پسند گروہ اور قومی غدار ٹولہ بہ آسانی مہیا کر سکتا ہے اس لئے وہ ان کا ہمنشین ہے، جبکہ حریت پسندوں کے پاس سوائے اپنے خون کے چند قطروں اور اپنی جان ایسی متاعِ عزیز کے رکھا ہی کیا ہے جس سے مؤرخ کا پیٹ بھر سکے۔

تاریخِ عالم کا یہ حیرت انگیز تجربہ بھی ناقابلِ فہم ہے کہ ہمیشہ تاریخ ساز کردار غریبوں اور بے نواؤں نے ہی ادا کیا ہے، یعنی ایک ایسے طبقے نے اپنے آپ کو ہر اُس آزمائش کے لئے پیش کر دیا، جس کی راہ کانٹوں سے پُر اور جس کی منزل خطرناک دشواریوں سے لبریز تھی۔ جس کے وسائل محدود تھے، جس کے ہاں دُور دُور تک خوشحالی کے درخت کا سایہ تک نظر نہیں آتا، مگر جونہی قومی خدمت کا وقت آیا، اس طبقہ نے ہر قسم کی قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اِس کے برعکس ہر قوم کا خوشحال طبقہ اپنے لامحدود وسائل کے باوجود قومی و ملّی خدمات میں کوئی کردار ادا کرنے کی بجائے، غیر ملکی آقاؤں کے سامنے سربسجود نظر آیا اور زر پرستی نے اُسے خوشامد پرست، بزدل اور مصلحت کیش بنا دیا۔ مگر مؤرخین نے ستم یہ کیا کہ جس طبقہ نے اپنے اور اپنی نسل کے مفاد کو داؤ پہ لگا کر قوم میں زندگی اور حرارت پیدا کی، اُسے قوم دشمن کہا اور جس طبقہ نے چڑھتے سورج کی پوجا کی اور اپنے مفاد کو عزیز تر رکھا اُسے قوم کی کشتی کا کھیون ہار بنا دیا۔ قومی مفاد کے مقابلہ میں ذاتی مفاد کو ترجیح دینے والے "ہیرو اور دردمندانِ قوم" کہلائے، اور قوم کی خاطر اپنا خون اور اپنے بچوں کا مستقبل تاریک کرنے والے "دشمنِ قوم" بنا دیئے گئے۔

مجلس احرار اسلام کا نام آتے ہی بعض لوگوں کی جبینیں شکن آلود ہو جاتی ہیں، بعض کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ بعض کی نبضوں کی حرکت تیز ہو جاتی ہے

بعض کے دل دھڑکنے اور دماغ ماؤف ہونے لگتے ہیں، بعض زبانیں قینچی کی طرح چلنے لگتی ہیں، مورخ کا "بے پاک اور راستباز قلم" عدل و انصاف کے موتی بکھیرتا ہوا "ملت فروشوں کی قبروں پر پھول چڑھاتا ہوا" نکل جاتا ہے۔ بہرحال اس اُمید پر کہ کبھی تو تعصب سے پاک اور جانبداری سے بے نیاز مورخ جنم لے گا۔ جو غلط قلم کاروں کی خبر لے گا، اور ان تمام ناپاک چھینٹوں کو دھو دے گا جو ایک گہری سازش کے تحت معصوم کپڑوں پر ڈال دیئے گئے ہیں، چند گذارشات احرار کے متعلق پیش کر دی گئی ہیں۔

مَیں اِن سطور میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ راقم الحروف مجلسِ احرارِ اسلام کا کبھی دو آنے کا ممبر نہیں رہا۔ اور نہ ہی مسلم لیگ میں شمولیت کا شرف حاصل رہا ہے تشکیلِ پاکستان کے وقت راقم کی عمر بمشکل نو دس برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں بچے کا ذہن کیا سوچ سکتا ہے۔ کم عمری کا اعتراف اس لئے کرنا پڑ رہا ہے، کہ بعض اصحاب کسی "شرف" کو حاصل کرنے اور اُسے اپنے سر تھوپنے کے لئے بڑی عمر کے "بزرگ" بن جاتے ہیں۔ چنانچہ مَیں واضح طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے تشکیلِ پاکستان سے قبل جنگِ آزادی یا حصولِ پاکستان میں کام کرنے کا "شرف" حاصل نہیں رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ راقم کو خطیبِ پاکستان قاضی احسان احمد سے نسبتِ فرزندی ۱۱ / اکتوبر ۱۹۵۶ء کو حاصل ہوئی۔ اس نسبت کی وجہ سے مجھ پر یہ لازم نہیں آ جاتا کہ جس سیاسی مسلک سے وہ وابستہ رہے ہوں، مَیں اُسی کا ہمنوا بن جاؤں جبکہ میری آزادیٔ رائے کا احترام قاضی جی نے عمر بھر برقرار رکھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے کبھی مجھے اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ترغیب یا تبلیغ کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی تک میں کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ اس لئے قارئین کرام یا میرے نقاد مجھے مجلسِ احرار سے منسلک گردان کر وکیل صفائی تصور نہ فرمالیں۔ بلکہ ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے دلائل و واقعات کی روشنی میں میرے افکار و خیالات ٹھنڈے دل و دماغ

سے ملاحظہ فرمائیں تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ انہیں ان خیالات میں تنگ نظری، تعصب اور بے جا توصیفی کلمات نظر نہیں آئیں گے۔ اور وہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو پالیں گے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ احرار کے متعلق کوئی کیا سوچتا ہے۔ کسی کی سوچ یا فکر پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی، لیکن حقائق بہرحال حقائق ہیں، جن سے کوئی شپرۂ چشم ہی اپنی کور چشمی کے باعث صرفِ نظر کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی صاحبِ بصیرت حقائق سے آنکھ بند نہیں کر سکتا۔

مجلسِ احرار اسلام کا قیام ۱۹۲۹ء میں عمل میں آیا۔ احرار راہنماؤں کا ذہنی رجحان فرنگی اقتدار کے خاتمہ کی طرف تھا۔ چنانچہ شاہ جی کا مشہور قول تھا کہ:۔

"مَیں کچھ نہیں چاہتا۔ ایک فقیر ہوں۔ اپنے نانا کی شریعت پر مرمٹنا چاہتا ہوں، اور اگر کچھ چاہتا ہوں، تو صرف اس مُلک سے انگریز کا انخلاء،

——— دو ہی خواہشیں ہیں۔ میری زندگی میں یہ مُلک آزاد ہو جائے یا پھر مَیں تختۂ دار پر لٹکا دیا جاؤں"۔

احرار کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے ملک کے اندر سامراج دشمنی کا ذہن پیدا کیا۔ یہ سامراج دشمنی اُسے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کانگریس یا کسی دوسری جماعت سے اس نے سامراج دشمنی کی سرشت حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرسی لیڈروں نے خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے لئے سامراج دشمنی کو آلہ کار بنایا۔ مگر کانگریس میں چونکہ بڑے دبنگ قسم کے لیڈر موجود تھے، اس لئے متحدہ ہندوستان میں سامراج دشمنی کا دوسرا نام کانگریس ہی سمجھا جانے لگا۔ احرار نے اپنی علیحدہ سرگرمیوں کا آغاز کر کے ثابت کر دیا کہ سامراج دشمنی کانگریس ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ انٹی برٹش ذہن مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے ساتھ سامراج دشمنی میں بھی ملک کی کسی جماعت سے پیچھے نہیں ہیں۔ اگر احرار کانگریس سے علیحدہ ہو کر آزادیٔ ہند کا

نعرہ بلند نہ کرتی تو مستقبل کا مورخ حصولِ آزادی کی خاطر صرف کانگریس ہی کو خراج عقیدت پیش کرتا۔ آج کا مسلمان مورخ فخر سے سر اونچا کر کے فرنگی سامراج کو للکار کر کہہ سکتا ہے کہ اس کے اقتدار کا سورج غروب کرنے میں مسلمانانِ ہند نے ہراول دستے کے طور پر کام کیا ہے۔ یہ فخر خوش قسمتی سے احرار، خاکسار، جمعیۃ علماء ہند، سرحد کے سرخپوشوں اور ایسی دوسری سامراج دشمن جماعتوں اور گروہوں کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کتاب ہذا میں شواہد و واقعات کی روشنی میں احرار کے اِن کارناموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۲) ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے پاکستان کے متعلق اس وقت ہماری لائبریریوں میں جو مواد موجود ہے، تاریخ و سیاسیات کے ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں اسے قطعاً قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ ان کتابوں میں صرف ایک ہی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر تاریخ پاکستان یا برصغیر کے سیاسی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ نقطۂ نظر کیا ہے؟ وہ ہے صرف "جماعتی سیاست کا نقطۂ نظر"۔ میرے نزدیک ایک مورخ کو تاریخ کی تدوین میں "جماعتی سیاست" سے بلند و بالا ہونا چاہیئے۔ اُسے قومی نقطۂ نظر سامنے رکھ کر تاریخ لکھنی چاہیئے۔ مجھے علم نہیں کہ ہندوستان کے تاریخ دانوں نے آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں اپنے ملک میں کیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اگر ان کا نقطۂ نظر اوّل و آخر کانگریسی ذہن کی عکاسی کرتا ہے تو اسے بھی صحیح تاریخ نہیں کہا جائے گا بلکہ برصغیر کی تاریخ کے متعلق زیادہ سے زیادہ "کانگریس جماعت کے رول" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے جن مؤرخین کی نگارشات میری نظر سے گذری ہیں، سب کی سب "جماعتی سیاست" کی آئینہ دار ہیں۔ انہیں قومی نگارشات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ان مؤرخین نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اگر ان کے ذہن و فکر کے خلاف کوئی نقطۂ نظر سامنے آیا تو اُسے آزادیٔ فکر و نظر کا نام دینے کی بجائے "غداری و وطن دشمنی" کے نام سے معنون سمجھا جانے لگا۔ اس تعصّب اور ذہنی ژولیدگی کی وجہ سے قومی طرز کی تحریریں ہمارے

سامنے نہ آسکیں۔ میرے نزدیک قومی نقطۂ نظر یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے سلسلہ میں جن جماعتوں اور گروہوں نے مختلف ناموں سے کام کیا، اور ان کے اثرات، آزادیٔ ہند کی صورت میں متشکل ہوئے یا پاکستان کے وجود میں آنے کی صورت میں واضح ہوئے، وہ سب قابلِ مبارکباد ہیں اور وہ آزادیٔ ہند اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمہ دار ہیں۔ انھیں تاریخ کے صفحات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

میری یہ خواہش ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی ایک ایسی مستند، مکمّل اور غیر جانبدار تاریخ لکھی جائے، جس میں ہر جماعت کے موقف کی پوری پوری وضاحت موجود ہو، تاکہ آئندہ نسلیں مطالعہ کے بعد کسی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ کتاب ہذا میں اختصار کیساتھ کوشش کی گئی ہے کہ برصغیر میں کانگریس، احرار اور مسلم لیگ نے جو مختلف رول ادا کئے ہیں، قارئین کے سامنے رکھے جائیں۔ جہاں میں نے اختلاف کیا ہے، اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے جس سے کانگریسی، احراری اور لیگی ذہن رکھنے والے ناراض ہوں گے، لیکن میں دیانتداری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ جب تک کسی جماعت کے حسن و قبح کے تمام پہلو ظاہر نہیں ہوں گے آئندہ نسلیں اُن سے صحیح نتائج مرتب کر سکتی ہیں اور نہ اُن غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے جو ماضی میں اِن جماعتوں سے سرزد ہوئیں۔

(۳) قاضی احسان احمد شجاع آبادی کا شمار اگرچہ برصغیر کے ممتاز لیڈروں میں نہیں ہوتا نہ ہی احرار کے صفِ اوّل کے راہنماؤں میں ہوتا ہے۔ تاہم احرار میں نوجوانوں کی کھیپ میں قاضی صاحب ممتاز نظر آتے ہیں۔ ایک زمیندار گھرانے کا فرد، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، ملتان کے ایک قصبہ شجاع آباد سے پرائمری پاس لڑکا، جب بخاریؒ کے دستِ حق پر بیعت کرتا ہے تو یہ تعلق ارادت و عقیدت کی حد تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ایک ہونہار شاگرد اور ایک وفادار دوست کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ شجاع آباد کی مٹی سے جنم لینے والے دیہاتی شاگرد کو بخاریؒ کی تربیت و شفقت نے کلکتہ، بمبئی، بنارس، سہارنپور،

بہار، میرٹھ، دہلی، لکھنؤ، مدراس، کراچی، لاہور، پشاور اور بنگال کے عظیم تہذیبی و ثقافتی مراکز میں عظیم الشان کانفرنسوں سے خطاب کا اہل بنا دیا۔ پھر ان کانفرنسوں کی نوعیت عام اصلاحی اور مذہبی جلسوں کی نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ یہ عظیم کانفرنسیں ہندوستان کے مستقبل کے مسائل پر غور و فکر کرنے، برٹش گورنمنٹ سے ٹکر لینے اور بین الاقوامی سیاسی الجھنیں دُور کرنے کے لئے منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں کوئی ایرا غیرا قسم کے آدمی خطاب نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ایسی کانفرنسوں سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی محمد کفایت اللہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا شبیر احمد عثمانی، جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں، سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خان، مہاتما گاندھی، راجندر پرشاد، سبھاش چندر بوس اور اسی طرح کے دیگر زعمائے ہند خطاب کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب میں ایک بڑا انسان بننے کی پوری صلاحیتیں موجود تھیں، لیکن بقول خود قاضی صاحب "مجھ میں جو خوبیاں ہیں وہ میرے استاد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تربیت کی وجہ سے ہیں اور جو بُرائیاں ہیں اُن کا ذمہ دار میں خود ہوں۔" اس اعتراف کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے یہ اعتراف بجائے خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ بایں ہمہ قاضی صاحب کی یہ کتاب دراصل شاہ جی ہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

اس سیاسی زندگی میں قاضی صاحب نے کیا مقام پایا اور اکابرین کی نظر میں کیا رفعت حاصل کی۔ اس کا اظہار ان مکتوبات سے ہو جاتا ہے جو کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ یہ خطوط مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد یوسف بنوری، سیاسی لیڈروں میں شیخ عبدالمجید سندھی، نواب مشتاق احمد

گورمانی، سردار بہادر خاں اور دیگر زعماء کی طرف سے قاضی صاحب کے نام لکھے گئے۔ یہ خطوط بجائے خود ایک قیمتی سرمایہ ہیں جنہیں من وعن شائع کیا جارہا ہے۔ یہ تمام خطوط غیر مطبوعہ ہیں اور پہلی دفعہ اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

(۴) احراری راہنماؤں کی طرح قاضی صاحب کی زندگی کے بھی دو مقاصد تھے۔ اوّلاً آزادیٔ ہند، ثانیاً تحفّظِ ملک و ملّت۔ جہاں تک آزادیٔ ہند کا تعلق ہے، ایک رضاکار کی حیثیت سے انہوں نے اس وادیٔ پُرخار میں ایک جرأت مند انسان کی طرح قدم رکھا اور تمازیست پائے استقامت میں تزلزل نہیں آیا۔ ہر قسم کے ابتلاء و امتحان کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بالآخر اس مقصدِ جلیلہ میں عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ان کی زندگی میں انگریز بوریا بستر سمیٹ کر چلتا بنا۔ ظاہر ہے کہ جن راہنماؤں نے انگریزوں کی جیلوں میں اپنے وطن کی آزادی کی خاطر ریت و کنکر آمیز روٹی کھائی اور تالاب اور جوہڑوں کا گندا پانی پیا ہوگا، پھر شدّت کی گرمی میں میانوالی اور ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیلوں میں ایامِ قید تنہائی بصورت سی کلاس گزارے ہوں گے، ان کے جسم کا رواں رواں، آزادی کی نعمت پاکر خوشی سے پھولا نہ سمایا ہوگا۔ اس خوشی کا اندازہ قاضی صاحب کا ٹوٹا ہوا بازو اور مرزا جانباز کا شکستہ کندھا ہی کہہ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی زندگی کا دوسرا مقصد تحفّظِ ملک و ملّت تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد احرار نے سیاسی قیادت لیگ کے حوالہ کرکے لیاقت کے مُکّہ کے نشان پر ملک بھر میں دفاعی کانفرنسوں کا جال بچھا دیا تھا۔ اسی طرح ملک کے تحفّظ کے عنوان سے احرار نے جسدِ ملّی میں ناسور پیدا کرنے والے گروہ، قادیانیوں کی زیر زمین سازشوں سے نقاب کشائی کرکے "پاکستان ریاست" کی جگہ "مرزائیل ریاست" کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ میرے نزدیک، دوسری کامیابی، پہلی کامیابی سے کسی صورت کم درجہ کی نہیں۔ اس لئے کہ اسقدر عظیم قربانیوں سے حاصل کردہ ملک میں، اگر فرنگی سامراج کا خود کاشتہ پودا، فرنگی

کی طرح کے ناجائز ہتھکنڈوں سے برسرِ اقتدار آجاتا تو جو خون خرابہ فرنگی نے ہندوستان پر تاجر کے بھیس میں قبضہ جمانے کے بعد روا رکھا تھا، اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ جاتیں اور آج تاریخِ پاکستان کا نقشہ کچھ کا کچھ ہوتا۔

بنا بریں کتاب ہذا میں اس فتنہ کے صرف سیاسی خدوخال سے پردہ سرکائے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اس خطرناک گروہ کی فتنہ سامانیوں پر کڑی نگاہ رکھیں۔ خاص طور پر موجودہ حکومت کا فرضِ اوّلین ہے کہ ہماری طرف سے پیش کردہ شواہد و واقعات کی چھان پھٹک کر کے کسی نتیجہ تک پہنچے، اور سپریم کورٹ کی طرف سے عدالتی کمیشن بٹھائے جو اِن باتوں کی تحقیق کرے کہ قادیانیوں کا گروہ ملک اور اسلام دشمنی میں کس حد تک ملوث ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت ہم سے جس قسم کی اعانت چاہیگی اُسے مہیّا کی جائے گی۔

⑤ کتاب کو صرف ایک شخصیّت تک ہی محدود نہیں کیا گیا بلکہ نصف صدی کے سیاسی حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے، تاکہ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف ایک شخصیّت کا پورا عکس ہی ذہن میں نہ سما جائے بلکہ تقسیمِ ملک سے قبل اور بعد کے سیاسی حالات میں جو تغیّر رونما ہوا، اُس کا پورا آئینہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔ خاص طور پہ احرار کے کردار کا وہ پہلو جسے شاید احراری راہنما بوجوہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ خاص طور پر مدّنظر رکھا گیا ہے جو اُنہوں نے کانگریس سے علیحدہ ہوکر لیگ کے ساتھ تقسیمِ ملک سے قبل اور بعد میں تعاون کی بارہا کوششوں کی صورت میں پیش کیا۔ اور لیگی قیادت نے جسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ صرف اس لئے کہ کہیں نئے ملک پاکستان میں عوامی راج قائم نہ ہوکر رہ جائے جس کا نقصان سب سے زیادہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لاڈلے شہزادوں کو پہنچے گا۔

⑥ مسلمانوں کا ایک اجتماعی عقیدہ ختمِ نبوّت ہے۔ ایک غیر مسلم دائرہ اسلام میں اُس وقت داخل ہوتا ہے جب وہ توحیدِ خداوندی کے اقرار کے ساتھ ہی ختمِ رسالت پر ایمان لاتا ہے

لیکن شاید پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ایمان لانے کی جزوِ اوّل کو تو لازمی سمجھا جاتا ہے، جزو ثانی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر ختمِ نبوّت کا صرف نام ہی لیا جائے تو فوراً فرقہ وارانہ مسئلہ کہہ کر یا مُلّا کا مسئلہ سمجھ کر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے حیث کہ یہ مسئلہ صرف پاکستان کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلام کی اجتماعی ہیئت کا مسئلہ ہے۔ اسلامی ملکوں میں صرف مصر ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں قادیانیوں پر ہر قسم کی پابندی عائد ہے۔ اگرچہ صدر ناصر مرحوم نے سیاسی وجوہ کی بنا پر ایسا کیا ہے، تاہم اگر ہمارے ملک میں بھی سیاسی وجوہ کی بنیاد پر ہی اس کا تعاقب کیا جائے تو اسے خلافِ قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کام پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان سرانجام دینے والے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی اور ایسے کسی اقدام سے پہلے ہی گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔

قاضی صاحب نے اس گروہ کی سازشوں کو بے نقاب کرنے میں کن کن راہنماؤں، لیڈروں، افسروں اور ماتحتوں کے ہاں جا جا کر ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے کیا جوابات دیئے خاص طور پر پاکستان کے تین وزراء اعظم خان لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، چودھری محمد علی، مرکزی وزراء میں سردار عبدالرب نشتر، سردار بہادر خان اور ایک چیف جسٹس محمد منیر سے ملاقات کرکے انہوں نے کیا تاثر قائم کیا، تفصیل کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

عقیدۂ ختمِ نبوّت احرار یا کسی فرد کا عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ عالمِ اسلام کا اجتماعی عقیدہ ہے۔ مگر پاکستان میں جس قدر تضحیک "ختمِ نبوّت" کے عقیدہ کی، کی گئی ہے، شاید صفحۂ ہستی پر کسی اسلامی ملک میں ایسا ہوا ہو۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس گروہ کے ناپاک وجود اور عقیدۂ ختمِ نبوّت سے لاپرواہی کی بدولت آج ہم اپنی زندگی میں ملک کا بڑا حصہ اپنے سے جدا ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے اس گروہ کو بے جا تحفظ دے کر خدا اور اس کے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کو ناراض کیا، جس کا صلہ تقسیمِ پاکستان کی صورت میں پا چکے ہیں۔

میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب میں سیاسی اور آمرانہ قیادت کو بنیادی

وجوہ خیال کرتا ہوں لیکن ان اسباب کی تہ میں اس گروہ کی سازشیں بھی کار فرما ہیں۔ نمونہ کے طور پر جناب ایم۔ ایم۔ احمد مشیر اقتصادیات حکومتِ پاکستان پر قاتلانہ حملہ کے ضمن میں فوجی عدالت کا بیان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے سلسلہ میں مجھے کن دقتوں، مالی پریشانیوں اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہونا پڑا، اس کا تذکرہ عبث ہے۔ بہرحال کتاب جیسی بھی ہے پیش خدمت ہے۔ کوتاہیوں سے درگذر فرمایا جائے اور خامیوں سے آگاہ کیا جائے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنی اہلیہ کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے گھریلو حالات بتانے میں ہی تعاون نہیں کیا بلکہ معصوم بچوں کو سنبھال کر مجھے موقع فراہم کیا کہ میں اپنی تمام تر توجہ کتاب کی تکمیل پر مرکوز رکھ سکوں۔ خدا کرے ہمارا ساتھ تا دیر قائم رہے تا کہ مختصر زندگی میں ملک و ملّت کی زیادہ خدمت کر سکوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس ثواب میں برابر کی شریک ہونگی۔

اسی طرح مولانا لال حسین صاحب اختؔر صدر مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان، مولانا عبدالرحیم اشعؔر ناظم اعلیٰ، محترم جناب مرزا غلام نبی صاحب جانبازؔ ایڈیٹر ماہنامہ "تبصرہ"، جناب خواجہ عبدالقدوس صاحب ملتان، جناب حفیظ رضا پسروری شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے قیمتی معلومات بہم پہنچائیں۔ میں محترم جناب سید نفیس الحسینی صاحب نفیس رقم و جناب ضیاء الحسن صاحب خوشنویس کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے نامساعد حالات میں بھی کتابت کی بہ عجلت تکمیل کے لئے پورا تعاون کیا۔

مکرّمی حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی کا بھی ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے ملکی و سیاسی معاملات میں بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود کتاب کے لئے مقدمہ لکھ کر عزّت افزائی فرمائی۔

فجزاهم الله تعالیٰ احسن الجزاء

نورالحق قریشی

باغ و بہار شخصیّت

حضرت مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ ایک پُر بہار شخصیت کے مالک تھے۔ خزاں کا دور کبھی آتا بھی تو وہ عارضی اور چند لمحات کے لئے ہوتا تھا۔ جہاں تک انکی شخصیّت کا تعلق ہے، ہنستے اور کھلکھلاتے مکھڑے کا نام قاضی احسان احمد تھا۔ انہوں نے سنجیدہ رہ کر کبھی اپنی شخصیّت کا لوہا نہیں منوایا، بلکہ ہنستے کھیلتے اپنی شخصیت کا اثر چھوڑ کر لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے۔ ان کی بے تکلفی اور انداز بے حجابانہ بڑا محبوب تھا۔ جہاں بیٹھتے مجلس زعفران بن جاتی تھی۔ جس سے گفتگو کرتے، اُسے یہ تاثر دیتے کہ وہ بھی آزادانہ اپنے دل کی بات کہے۔ جب کسی محفل میں آجاتے تو ؎

وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

والا معاملہ ہوتا۔ لیکن اگر کسی مجلس سے رخصت ہو کر چلے جاتے، تو ؎

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اگر آپ کو کہیں سفر یا بازار میں لمبے قد، بھرپور جسم، موٹی آنکھیں، سُرخ و سپید رنگت، سفید ململ کے کپڑوں میں ملبوس، سر پر ململ کا سفید رومال، ایک خاص انداز سے سجائے، خوشبو میں معطر گھنگھریالے بالوں اور داڑھی میں کنگھا کئے محبوبانہ چال سے چلتا ہوا کوئی شخص نظر پڑے تو سمجھ لو کہ آپ قاضی احسان احمد سے مل رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی متانت اور سنجیدگی کا رُوپ دھار کر، یا میلے کچیلے کپڑے پہن کر اپنے بزرگ ہونے

یا شخصیّت کا رُعب جمانے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ میاں عبدالرحمٰن انصاری چوک بازار مُلتان کا خیال ہے کہ مجھے زندگی میں دو آدمی محبوب رہے ہیں۔ ایک مولانا داؤد غزنوی دوسرے قاضی احسان احمدؒ جو سراپا نفاست تھے اور ہمیشہ صاف ستھرا رہنے کے عادی تھے۔ ان کی ملاقات سے قبل طبیعت مکدّر بھی ہو تو سامنا ہوتے ہی تروتازگی پیدا ہو جائیگی اور فرحت و انبساط کی لہر دوڑ جائے گی۔ وہ اچھا کھانا کھانے اور اچھا پہننے کے عادی تھے اور اسی کی تلقین فرماتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ "ہم نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مَیلا کچیلا کپڑا زیب تن فرمایا ہو، یا خوشبو نہ لگائی ہو۔ عبادت و پاکیزگی کا ہمیں قرآن میں بھی حکم دیا گیا ہے، تو کیوں نہ ہم اسلام کی ان تعلیمات پر بھی عمل پیرا ہوں ہمارے ہاں "اللہ والے" کا تصوّر ہی اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ ہم "اللہ والے" کی علامات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، گھنی داڑھی رکھے اور دو گز تسبیح لٹکائے، اور پسینے کی بدبو سے "آراستہ" ہو۔ بزرگی کا یہ تصوّر ہمیں حضور علیہ السّلام کے اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی سیرتِ اطہر میں تو نہیں ملتا، البتہ اسے ہندووانہ یا عجمی تصوّر کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بزرگوں کو ماننے والے تو اس سے کئی قدم آگے بڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بزرگ خورد و نوش اور جامہ پوشی سے بھی بے نیاز ہوتا ہے اور یہ باتیں تو اکثر سُننے میں آتی ہیں کہ فلاں ملنگ مادر زاد برہنگی کی حالت میں اپنے حال میں مست رہتا ہے اور خواتین بڑی تعداد میں تعویذ لینے جاتی ہیں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ۔ یہ ہندوؤں کا سادھو تو ہوسکتا ہے مسلمانوں کا ولی ہرگز نہیں۔ اسلام نے پاکیزگی، طہارت اور صاف ستھرا رہنے کی جو تلقین کی ہے اُسے ہم "شو" (SHOW) یا دکھاوا تو سمجھتے ہیں، بزرگی کی علامت نہیں۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی پہنچا۔ کچھ عرصہ تک ان کے پاس رہا، پھر اجازت چاہی تو بزرگ نے پوچھا۔ بھئی کیا بات ہے، اتنی جلدی جانے کا ارادہ کر لیا۔ کہنے لگا۔ حضرت! مَیں آپ کو بہت بڑا بزرگ سمجھ کر حاضر ہوا تھا، مگر مجھے کوئی ایسی علامت نظر نہیں آئی۔ انہوں نے

فرمایا۔ بھئی میں تو گناہ گار ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ جتنا عرصہ تم نے میرے ہاں قیام کیا ہے، تم نے
میرا کوئی فعل سنّتِ رسول کے خلاف پایا؟ کہنے لگا۔ نہیں! فرمایا۔ حضورؐ کی پیروی اور کس
چیز کا نام ہے؟ تم خوارقِ عادات کے قائل ہو۔ تم نے ولایت کے لئے لازم سمجھ رکھا ہے کہ ولی
وہ ہے جس سے ایسے افعال سرزد ہوں، جو عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے
یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ میری گذارشات کا
مقصد صرف یہ ہے کہ جس طرح ہندووانہ رسومات جو مسلم معاشرہ میں داخل ہو چکی ہیں، اسی
طرح ولایت کا عجمی تصوّر بھی ہمارے ہاں موجود ہے۔

عادات و اطوار

قاضی صاحب کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ انہوں نے کبھی رُوپ یا
بہروپ (PRETENTION) اختیار نہیں کیا۔ یہی وجہ
ہے کہ آج ہم انہیں ایک رہنما، ایک خطیب اور سُلجھے ہوئے انسان کی حیثیت سے تو جانتے
ہیں مگر ان کے متعلق ایک ولی، ایک مجذوب اور ایک گدّی نشین ہونے کا تصوّر ہماری
آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اپنے متعلق بعض ایسی باتیں جلسۂ عام میں بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ
بارہا یہ جملہ دہرایا کہ میں جہلِ مرکب ہوں، اگر مجھ میں کچھ نیکیاں ہیں تو یہ سب میرے اُستاد، امیرِ
شریعت کی وجہ سے ہیں۔ اُن میں ایک بڑی خامی یہ تھی کہ انہیں غصّہ بہت جلد آتا تھا۔ غصّے کی حالت
میں جو منہ میں آتا کہہ گذرتے۔ جس پر غصّہ آگیا، وہ اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا
اس کی سابقہ نیکیوں پر پانی پھر جاتا۔ لیکن یہ غصّہ زیادہ دیر تک نہ رہتا تھا۔ بعض اوقات تو
منٹوں میں بھاگ جاتا، ورنہ گھنٹوں اور زیادہ سے زیادہ چند روز کے اندر رفو چکّر ہو جاتا۔
قاضی صاحب کو غصّہ اپنی بیوی، بچّوں اور ہر اُس آدمی پر آتا جن سے ان کا پیار اور بے تکلّفی
ہوتی تھی۔ جس طرح غصّہ کی حالت میں آپے سے باہر ہو جانا ان کا معمول تھا۔ اسی طرح اُن کا
پیار بھی غیر معمولی ہوتا تھا، اور یہ پیار بعض اوقات جب کج فہم اور کند ذہن لوگوں کو
میسّر آجاتا تو وہ قاضی صاحب سے گستاخی پر بھی اُتر آتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا

غصّہ اور پیار دونوں خامیاں تھیں، جو عمر کے آخری حصّہ میں نکتۂ عروج کو پہنچ چکی تھیں۔

اولاد قاضی صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہؤا۔ لڑکا وفات پاگیا۔ لڑکی سعیدہ بی بی، مولانا قاضی عبداللطیف صاحب جو مرحوم کے چچازاد بھائی بھی ہیں، کے گھر میں خوش و خرّم آباد ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی، جس سے چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہؤا۔ لڑکے کا نام محی الدین رکھا، مگر وہ بعد میں وفات پاگیا۔ قاضی صاحب کے ایک عقیدت مند نے لڑکے کی پیدائش پر ایک نظم بھی لکھی، جو کتاب ہذا میں کسی جگہ پیش خدمت کر دی گئی ہے۔ دو لڑکیاں وفات پاگئیں۔ چار لڑکیاں بقیدِ حیات ہیں۔ بڑی لڑکی طاہرہ بتول میرے نکاح میں ہے۔ دوسری لڑکی عابدہ بتول کی شادی قاضی صاحب کے پھوپھی زاد بھائی جناب خان محمد علی خاں صاحب بی۔ اے کے ساتھ مرحوم کی وفات کے بعد ان کی منشاء کے مطابق کر دی گئی۔ دوسری دو لڑکیاں ساجدہ بتول اور شاہدہ بتول ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ پہلی بیوی کو دوسری شادی کے کافی عرصہ بعد کسی وجہ سے طلاق دے دی تھی، اور وہ قاضی صاحب کی زندگی میں ہی وفات پاگئیں۔ دوسری بیوی بقیدِ حیات ہیں۔

آپ کو چھوٹے بچے بہت پیارے تھے لیکن بیٹیوں کی اولاد تو اُن کی جان تھی۔ جب میرا پہلا لڑکا تولّد ہؤا، تو انہوں نے اسی طرح خوشی کا اظہار کیا، جس طرح ایک انسان اپنی حقیقی اولاد کے لئے کرتا ہے۔ ان کے سندھ، کراچی اور لاہور تک کے احباب نے عقیقہ میں شرکت کی۔ جب انہوں نے میرے والد ماجد مولٰینا محمد سعید صاحب سے بچّے کے نام کے متعلق پوچھا کہ نام کیا رکھا جائے تو والد صاحب نے کہا۔ آپ خود کوئی نام تجویز کیجئے، مگر آپ نے اصرار کیا کہ نام آپ خود ہی تجویز کریں، تو والد صاحب نے دادا، نانا اور

والد کے ناموں میں سے ایک ایک حرف لے کر پوتے کا نام "محمد احسان الحق" تجویز کیا۔

والدین سے محبّت

آپ کو جس قدر اہل و عیال سے محبّت تھی، اس سے کہیں زیادہ والدین سے لگاؤ اور پیار تھا۔ آپ کی زبانی علم ہوا کہ ان کے والد قاضی محمد امین صاحب بڑے سخت قسم کے آدمی تھے۔ بایں ہمہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو "چاند" کہہ کر پکارتے تھے۔ وقت کی ستم ظریفی کہئے کہ جب باپ کا آخری وقت آن پہنچا تو اس وقت باپ کا "چاند" تحریکِ ختمِ نبوّت کے سلسلہ میں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چھپا ہوا تھا۔

آپ کے احباب نے انتہائی کوشش کی، حکومت سے رابطہ قائم کیا، مگر مسلم لیگی وزارت نے یہ گوارا نہ کیا کہ لبِ مرگ باپ کو، رخصت ہوتے وقت، محبوس بیٹا دیدار کر سکے۔ شجاع آباد کے لوگ کہتے ہیں کہ قاضی محمد امین صاحب آخری لمحات میں صاحبِ فراش ہو گئے تھے لیکن جس وقت بھی ہوش آجاتا، آنکھ کھول کر پہلے گھر کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے، پھر کہتے۔ ابھی "چاند" نہیں آیا؟ یونہی بوڑھا باپ، اپنے قیدی بیٹے کو یاد کرتے کرتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اس پر علامہ طالوت مرحوم نے چند اشعار کہے ہیں۔ جو پیشِ خدمت ہیں۔

مومنِ پاک دل امین و شجاع — قاضیِ وقت، حاکمِ باطن
جس کا بیٹا خطیبِ پاکستان — جس کا احساں، قوم کا ضامن
اس کا جب وقتِ آخری پہنچا — اس کا "احسان" قید تھا اُس دن
ہاتفِ غیب نے کہی تاریخ — مصرعِ آخری میں دیکھو سَن

لختِ دل اس کا گو رہا نہ ہوا
قیدِ غم سے رِہا ہوا مومن

طالوتؒ

جب پاکستان کی اسلامی حکومت نے آپ کو رہا کیا تو سب سے پہلے والد مرحوم کی قبر پر حاضری کے لئے تشریف لے گئے اور دیر تک روتے رہے۔ اس کے بعد گھر آئے۔

قاضی صاحب نے اپنی والدہ کی خدمت میں بھی انتہا کر دی۔ آپ نے والدہ کے لئے ایک مستقل خادمہ کا انتظام کر رکھا تھا، جو ہر وقت خدمت میں مصروف رہتی تھی۔ آپ نہ صرف خادمہ کو خوش رکھتے، بلکہ اس کے سارے کنبہ کا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی آپ نے والدہ کو زیورات اور قیمتی ملبوسات پہنا رکھے تھے۔ آپ کی والدہ صاحبہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور صفائی و پاکیزگی کا مظہر تھیں۔ سفر سے جب بھی آپ واپس آتے، مولانا حافظ امید علیؒ امام شاہی مسجد شجاع آباد سے اپنی والدہ کی خیریت دریافت فرماتے۔ جب اُن کی زبانی معلوم ہوتا کہ والدہ یاد کر رہی ہیں تو سامان گھر میں بھجوا کر سیدھے والدہ کی خدمت میں پہنچتے، قدمبوسی کرتے، فرمائشیں پوری کرتے اور ساتھ ہی اپنی بڑی بیٹی سعیدہ بی بی کی خیریت دریافت کر کے گھر لوٹتے تھے۔ جب تک آپ شجاع آباد رہتے، سبزی لینے بازار خود جاتے تھے اور تین گھرانوں کے لئے سبزی خریدتے۔ ایک اپنے گھر کے لئے، دوسری والدہ اور تیسری اپنی بیٹی سعیدہ کے گھر بھیجتے تھے۔

آپ اپنی ہمشیرہ جو بہاولپور بیاہی ہوئی ہیں، سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے تھے اور ان کی ہر طرح سے خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اپنے بھانجوں کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہا، مگر وہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ بہن نے جب اور جس چیز کا مطالبہ کیا، بھائی نے اسی وقت پورا کر دیا۔ رشتہ داروں سے مودّت اور محبت تو سمجھ میں آتی ہے لیکن آپ غیروں کے لئے بھی اپنوں کی طرح تھے۔ کسی حاجت مند نے جب بھی کسی چیز کا مطالبہ کیا، آپ نے فوراً پورا کر دیا۔ علاوہ ازیں آپ بیوگان، یتیموں اور طالب علموں کی خفیہ طور پر امداد کیا کرتے تھے۔ یہ بات آپکی وفات کے بعد معلوم ہوئی۔

مہمان نوازی | آپ حد درجہ مہمان نواز تھے۔ ہر وقت آپ کے گھر مہمانوں کا تانتا

بندھا رہتا تھا۔ آپ موجود ہوں تو اہلِ خانہ کو مہمانوں سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ آپ کی عدم موجودگی میں بھی مہمان آتے رہتے تھے۔ مہمانوں کے لئے انواع و اقسام کے کھانے پکوا تے۔ آپ کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ میں نے ساٹھ اور ستّر مہمانوں کا یک وقت کھانا پکایا ہے۔ مہمانوں میں آپ کے احباب، رشتہ دار، طلبہ اور عقیدت مند سب شامل ہوتے تھے۔ آپ ہر مہمان کے مزاج اور رتبے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اگر کوئی عالمِ دین یا بڑا افسر اور مقتدر آدمی مہمان ہوتا ہے تو آپ اس کے لئے کھانا، بستر اور آرام وغیرہ کے لئے نگرانی خود کرتے تھے۔ عام طور پر موسم گرما میں آموں کے دِنوں میں ہر وقت مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ملک بھر میں احباب اور عقیدت مندوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔ اس لئے ہر کسی کو دعوت تھی کہ وہ آم کھانے کے لئے شجاع آباد آئے۔ آموں کے علاوہ گھر میں بہترین اقسام کے اچار اور مربّے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ چنانچہ گھر سے اچار اور مربّہ بھی کراچی سے پشاور تک کے دوستوں کے لئے بطور تحفہ بھیجا جاتا تھا۔ آپ دوسروں کو کِھلا کر خوش رہتے تھے۔ آپ جب بھی کھانا کھا رہے ہوں، یہ عادت تھی کہ لقمہ توڑ کر مختلف مہمانوں کے منہ میں ڈالتے، کسی کے منہ میں بوٹی، کسی کے منہ میں بڑا لقمہ دے ڈالتے اور اصرار کرتے کہ فوراً کھا جاؤ۔ پھل کھانے کی باری آئی تو آپ نے پورا کیلا یا سنگترہ اٹھا کر مہمان کے منہ میں ڈال دیا۔ اب کوئی کھا سکے یا نہ، مگر آپ اس کے منہ میں ٹھونس دیتے تھے۔ مہمانوں کے منہ میں لقمہ ڈالنے کی عادت پر ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک دفعہ احباب نے آپ سے کہا کہ اگر حضرت مولانا احمد علی مرحوم کے منہ میں روٹی کا لقمہ ڈال سکیں تب آپ کو جانیں گے۔ آپ نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ چیلنج کرنے والے سب حضرات ایک دفعہ لاہور میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر اکٹھے ہوئے۔ کھانا چُنا گیا۔ حضرتؒ بھی موجود تھے۔ آپ حد درجہ حضرت کا احترام کرتے تھے۔ چونکہ حضرت سنجیدہ رہتے، اس لئے دیگر علماء اور احباب نے آپ کو چیلنج کیا تھا کہ آپ اُن کے

منہ میں روٹی کا لقمہ نہیں ڈال سکیں گے۔ کھانے کے دوران آپ نے لقمہ اُٹھایا اور بڑے ادب سے ہنسی کو ضبط کئے حضرت کے منہ میں ڈال دیا اور کہا کہ حضرت یہ بوٹی مجھے اچھی لگی، یہ کھالیں۔ ساری محفل ہنسی ضبط نہ کر سکی اور آپ کا لوہا مان لیا گیا۔

دورانِ طعام باتیں بھی جاری رہتیں اور لطائف وظرائف کی مجلس بھی گرم رہتی تھی۔ مہمانوں کے لئے چارپائیوں اور بستروں کا انتظام نہایت معقول تھا۔ کبھی کسی دوسرے گھر سے بستر مانگنے یا چارپائی مانگنے کی نوبت نہیں آئی۔ شاہی مسجد کے اوپر دو کمرے مہمانوں کے لئے وقف تھے۔ ان میں مطالعہ کے لئے مختلف عنوانات پر کتابیں اور اخبارات پڑے رہتے۔ آپ ہمیشہ مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتے اور رات کا قیام بھی مہمانوں کے مابین کرتے۔ پھر جب مجلس گرم ہو جاتی تو رات کے بارہ بج جاتے تھے۔ اس میں مذہب و سیاست، معاشرت، تہذیب و تمدّن سے لے کر گھریلو باتیں تک زیر بحث آتیں۔

لطیفہ گوئی و حاضر جوابی

آپ خوش طبع تھے۔ خوش رہتے اور دوسروں کو بھی ہمیشہ خوش رکھتے۔ اگر کوئی مغموم اور اُداس آدمی آپ کے پاس آجاتا تو وہ اُس وقت کے لئے اپنا غم والم بھول جاتا اور خوش و خرم رہتا آپ کو سینکڑوں لطیفے یاد تھے جو برمحل اور برموقع سُناتے۔ ان لطائف میں جہاں مزاح کی چاشنی شامل ہوتی تھی، وہاں موقع و محل کے مطابق مسئلہ بھی حل کر دیتے تھے۔ آپ سوال کرنے والے سے کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آئے۔ سوال خواہ نجی مجلس میں کیا گیا ہو یا جلسۂ عام میں، ہمیشہ خندہ پیشانی سے جواب دے کر سائل کی تسلّی کرتے تھے۔ نوجوان طبقہ آپ سے حددرجہ مانوس تھا کیونکہ آپ کے ہاں خشک پن نہیں تھا، بلکہ "گھل ملنے" کی عادت تھی۔ آپ کے پروانوں میں دینی طلبار سے لے کر کالج کے طلبار اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ آپ بڑی سے بڑی بات کو معمولی لطیفہ سے حل کر دیتے

تھے۔ مثلاً جب آپ پاکستانی قوم کو طاقتور بننے اور دشمن کے مقابلہ میں آہنی دیوار بن جانے کی تلقین کرتے تو آپ یہ لطیفہ ہمیشہ سناتے کہ ایک ٹکٹ کلکٹر نے ایک پٹھان کو گاڑی سے اتار دیا، کیونکہ اس کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ جب گاڑی چلنے لگی اور گارڈ نے وسل دے کر اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہونے کی کوشش کی تو پٹھان نے مضبوط ہاتھ سے گارڈ کی کلائی پکڑ لی اور کہا کہ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں تھا تو تم نے ہمیں اتار دیا۔ تمہارے پاس بھی ٹکٹ نہیں ہے اس لئے تم بھی ہمارے پاس ٹھہرو۔ بعد میں گارڈ نے سرخ جھنڈی دکھا کر گاڑی روک لی اور پٹھان کو گاڑی میں سوار کر دیا۔ لطیفہ سنانے اور ہنسانے کے بعد آپ کہتے کہ دیکھا جب بازوؤں میں قوت ہو تو چلتی گاڑی رک جاتی ہے۔ شر سے بچنے اور نادانوں سے چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہنے کیلئے آپ ایک اور لطیفہ سناتے کہ گاڑی کے انٹر کلاس کے ڈبہ میں ایک ہٹا کٹا جاٹ گھس آیا۔ دورانِ سفر ٹکٹ چیکر جب انٹر کے ڈبہ میں پہنچا تو ٹکٹیں چیک کرتے ہوئے جاٹ کے پاس آیا اور ٹکٹ طلب کی۔ تو جاٹ کے پاس تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ چیکر نے کہا کہ تمہارا ٹکٹ تھرڈ کلاس کا ہے اور تم انٹر میں کیوں بیٹھے ہو۔ جاٹ نے سمجھا شاید دوسری گاڑی کا ٹکٹ ہے۔ کہنے لگا کہ یہ ٹکٹ دوسری گاڑی کا ہے۔ ٹکٹ چیکر نے کہا کہ ٹکٹ اسی گاڑی کا ہے مگر ڈبہ دوسرا ہے۔ جاٹ نے پوچھا کہ اس میں اور دوسرے ڈبہ میں کیا فرق ہے۔ چیکر نے نرم گدیلوں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ جس ڈبہ کا تمہارا ٹکٹ ہے، اس میں یہ گدیلے نہیں ہوتے جاٹ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گدیلے اٹھا کر چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا اور بیٹھ گیا۔ کہنے لگا، اب تو ٹھیک ہے۔ چیکر نے سوچا، اگر میں مزید کچھ کہتا ہوں تو کہیں مجھے اٹھا کر باہر نہ پھینک دے۔ اس لئے خاموشی سے دوسرے ڈبہ میں چلا گیا۔

حاضر جوابی میں آپ کو کمال حاصل تھا

امانت علی چوہان گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں کہ آپ دسمبر ۱۹۶۵ء میں تحفظِ ختمِ نبوت

کانفرنس کے موقعہ پر چنیوٹ میں تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے دورانِ تقریر کہا کہ چنیوٹیو! مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں، بال سفید ہو گئے ہیں آپ کو اللہ کا دین سُناتے ہوئے لیکن آج یہ بات معلوم کر کے مجھے حد درجہ افسوس ہوا کہ آپ اپنی اولاد کو تعلیم کے حصول کے لئے ربوہ کالج بھیجتے ہیں، جس کی انتظامیہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت کی قائل نہیں۔ یہ الفاظ بیان کر رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضرت! چنیوٹ میں سائنس نہیں پڑھائی جاتی۔ آپ نے فوراً جواب دیا۔ اگر چنیوٹ میں بکرے کا گوشت نہ ملے تو پھر سوّر کا گوشت کھاؤ گے، کچھ حیا کرو۔

بعض اوقات معمولی بات سے بڑی بات نکال کر ایک بڑے مقصد کی طرف لطیف سا اشارہ کر جاتے، جس سے حاضرین عش عش کر اُٹھتے اور دیر تک لُطف لیتے۔ چنانچہ چوہان صاحب کی روایت کے مطابق ڈسکہ سیرت کانفرنس میں خطاب کے بعد مختلف حصّوں سے آئے ہوئے لوگوں سے مصافحہ کر رہے تھے کہ ایک وفد سے کہا کہ میری برادری کہاں سے آئی ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ حضرت! ہم وزیر آباد سے آئے ہیں۔ فوراً جواب دیا۔ چھوڑو بھائی! وزیر آباد، کہو فقیر آباد سے آئے ہیں۔ وزیر لوگ ہم سے تنگ، ہم وزیروں سے تنگ!

آپ نئی روشنی کے رسیا نوجوانوں سے بڑی محبت، اخلاق اور رواداری سے پیش آتے تھے۔ اور سمجھانے کا انداز ایسا دل لُبھانے والا ہوتا تھا کہ مخاطب آپ کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ آپ عموماً سیکنڈ کلاس کا سفر کرتے تھے۔ آپ سے کئی بار اس کی وجہ پوچھی، تو آپ کا جواب یہ ہوتا کہ "اس طرح بڑے بڑے افسروں اور بعض اوقات ذمہ دار لوگوں سے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ مَیں اُنہیں تبلیغ کے ساتھ ساتھ فتنہ مرزائیت سے بھی آگاہ کرتا ہوں کیونکہ ایسے لوگ عام جلسوں میں شرکت ہی نہیں کرتے، اس لئے وہ بیسویں صدی کے اس عظیم فتنہ سے بے خبر رہ کر اس کے دامِ فریب میں آسانی سے مبتلا ہو جاتے ہیں"۔ چنانچہ ایک

دفعہ ریل گاڑی میں سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے، آپ کے کمپارٹمنٹ میں ایک نہایت "اَپ ٹو ڈیٹ" نوجوان شریکِ سفر تھا۔ کہنے لگا۔ مولانا! پردہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے بات میں مزاح اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے جواب دیا کہ آپ کو پردے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ مجھے پردے میں بھیجنا چاہتے ہیں یا خود پردے میں جانا چاہتے ہیں؟ اُس نے خفّت مٹاتے ہوئے کہا کہ نہیں میرا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگ عورتوں کیلئے پردہ لازمی قرار دیتے ہیں، اس سے نصف معاشرہ ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ نیز جب جانور تک آزادانہ پھرتے ہیں تو عورتوں نے کونسا گناہ کیا ہے کہ وہ پردہ کی قید میں محبوس رہیں، اور گُھٹ گُھٹ کر مر جائیں۔ آپ نے کہا۔ بیٹا! خوبصورت چیز دیکھ کر انسان اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس طرح گناہ کی طرف قدم بڑھنے لگتا ہے۔ نوجوان نے کہا۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ دوسرے کے مال کو دیکھ کر آدمی لالچی بنے، طبیعت پر کنٹرول چاہیئے کنٹرول۔ آپ نے اندازہ لگا لیا، کہ نوجوان فطری رجحان اور دلائل کی بات سُننے کے موڈ میں نہیں۔ چنانچہ آپ نے مثال سے سمجھاتے ہوئے اپنی ٹوکری سے ایک لیموں نکالا اور چاقو سے اُسے دو ٹکڑے کیا اور کہا کہ دیکھو بیٹا، ایمان سے کہنا، تمہارے منہ میں لیموں کو دیکھ کر پانی تو نہیں آیا؟

کہنے لگا۔ پانی تو آیا ہے کیونکہ فطری تقاضا ہے۔ آپ نے کہا۔ مال میرا، پانی آپ کے منہ میں؟ کچھ شرافت چاہیئے اور طبیعت پر کنٹرول چاہیئے کنٹرول۔

نوجوان فوراً آپ کا مطلب سمجھ گیا اور لاجواب ہو گیا۔

ایّوب خان کا مارشل لاء لگا۔ تو علاوہ دیگر اصلاحات کے، ایک حکم سے گوشت اور دودھ دہی فروخت کرنے والوں کو دکانوں پر جالیاں لگانے کے لئے کہا گیا۔ انہیں ایّام میں آپ کو سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے حیدر آباد مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس میں مختلف مکاتیبِ فکر کے علماء کو دعوت دی گئی تھی۔ آپ کی تقریر کے وقت کرسئ صدارت پر ایک ذمّہ دار افسر متمکن تھے۔ مارشل لاء کا ابتدائی دَور تھا۔ تقریر میں پردہ کی بات آئی تو آپ نے

فرمایا کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی، جب میں نے حکومت کا یہ اعلان پڑھا کہ گوشت پر مکھی وغیرہ نہ بیٹھے، بلکہ گوشت کو جالیوں کی اوٹ میں رکھا جائے۔ یہاں پہنچ کر آپ فوراً جذباتی ہو گئے اور صاحب صدر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "جانوروں کے چند سیر گوشت پر اس قدر پابندی کہ اس پر مکھی نہ بیٹھنے پائے تاکہ صحت خراب نہ ہو جائے لیکن بازاروں میں دو دو من کی انسانی لاشیں دندناتی پھر رہی ہیں جن کی وجہ سے انسانی رُوح بیمار ہو رہی ہے۔ اسے کھلی چھٹی ہے؟ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ بھلا ایسے وقت ایسی بات، اس انداز کی کون کہہ سکتا تھا؟

بزرگوں کی تعظیم مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ، بزرگوں کی عظمت اور ہمعصروں سے محبت اور نوجوانوں سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ بزرگ خواہ کسی قوم یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، آپ تعظیم ضرور کرتے تھے۔ اس پر آپ قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کرتے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًاۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ ط

ایک دفعہ میں نے کہا کہ آپ گاندھی کو گاندھی جی کیوں کہتے ہیں، اس سے آپ کے مخالفین اعتراض کرتے ہیں۔ آپ نے فوراً جواب دیا کہ مخالفین کے اعتراض کو دیکھوں، یا اپنے نبیؐ کریم علیہ السّلام کے طرزِ عمل کو سامنے رکھوں کہ ہمارے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دوسری قوموں کے رہنماؤں کی عزّت کی تلقین فرمائی ہے۔ گاندھی اپنی قوم کا مسلّمہ لیڈر تھا، اس لئے اُس کی قوم جس نام سے اُسے پکارتی ہے، ہمیں اُس نام سے پکارنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے، تاکہ وہ بھی ہمارے قومی لیڈروں کو احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔

یہ نظریہ تو آپ کا دیگر قوموں کے اکابرین کے متعلق تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دیگر اقوام کے متعلق اس قدر وسیع المشرب اور روادار ہو، اس کا انداز مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کے مسلّمہ لیڈروں کے متعلق یقیناً نہایت تعظیمانہ ہوگا۔ چنانچہ آپ کے مخالف بھی آپ کی اس

وسیع المشربی کے قائل تھے کہ آپ نے کبھی بھی مسلمان فرقوں کے رہنماؤں کے متعلق نازیبا اور ناشائستہ کلمہ تک نہیں کہا۔ آپ کی کوشش ہوتی کہ کسی فرقہ کا نام تقریر میں نہ لیا جائے بفرضِ محال اگر نام لئے بغیر چارہ نہ ہوتا تو آپ احترام سے نام لیتے۔

میں انہیں چھیڑنے کی غرض سے اکثر کہتا کہ آپ کے بڑے بڑے لوگوں سے دوستانہ مراسم ہیں۔ بڑے لوگوں سے میری مراد عرفِ عام میں وزیروں، سفیروں اور امراء طبقہ سے ہوا کرتی تھی۔ تو آپ فوراً تردید کرتے اور فرماتے تھے: اس میں شک نہیں کہ صدرِ مملکت سے لے کر عام افسر تک سے میرے مراسم ہیں، لیکن میں نے ان مراسم سے ذاتی مفاد کبھی حاصل نہیں کیا۔ مجھے مخاطب کر کے کہتے۔ تمہارے متعلق سینکڑوں احباب پوچھتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی ہے۔ اب تو کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی، تو سب کو ایک ہی جواب دیتا ہوں کہ میں اپنے بیٹے کے لئے کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن بیٹا! تمہیں معلوم ہے کہ میری خط وکتابت بھی بڑے سے بڑے افسر کے ساتھ ہے، مگر میں اس چیز پر فخر نہیں کرتا۔ البتہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا آزادؒ، میرے استاد حضرت امیرِ شریعتؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ایسے اکابرین کے خطوط جو میرے نام موجود ہیں، وہ میرے لئے یقیناً سرمایۂ افتخار ہیں، اور میں انہیں ذریعہ نجاتِ اُخروی سمجھتا ہوں۔

اساتذہ کا احترام

آپ اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اُستاد کی خدمت کا یہ عالم تھا کہ تعلیم کے ابتدائی ایام میں بھی اپنے استاد مولانا حافظ اللہ وسایا صاحب مرحوم سکنہ موضع جتی (تحصیل شجاع آباد) کی بہت خدمت کرتے تھے۔ سخت سردی میں وضو کے لئے دیہات میں گرم پانی کا انتظام کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ اسباق پڑھنے کے بعد ارد گرد کے کنوؤں سے اوپلے جمع کرتے تھے، اور سرِ شام ہی پانی گرم کرنا شروع کر دیتے۔ مغرب، عشا اور صبح کی نماز کے علاوہ آپ کے استادِ گرامی تہجد کی نماز باقاعدہ ادا کرتے تھے۔ چنانچہ اِن چاروں نمازوں کے لئے قاضی صاحب اپنے اُستادِ

گرامی کے لئے گرم پانی تیار رکھتے تھے۔ ایک دفعہ سخت سردی کی رات تھی، بوندا باندی ہو رہی تھی، تیز ہوا چل رہی تھی۔ آگ سُلگاتے سُلگاتے رات کا کافی حصّہ گزر چکا تھا۔ اوپلے جلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بڑی دقّت کے بعد آگ جلائی اور پانی گرم کیا۔ تہجّد کا وقت ہوا تو مولوی اللہ وسایا کا خیال تھا۔ آج سخت سردی ہے، شاید احسان احمد نے پانی گرم نہ کیا ہو۔ آخر بچّہ ہے، رضائی اوڑھے سویا پڑا ہوگا، اور میری تہجّد کی نماز قضا ہو جائے گی۔ جب وہ تہجّد کے لئے اُٹھے تو قاضی صاحب گرم پانی لئے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جونہی اُستاد نے سخت سردی کے عالم میں گرم پانی اپنے ہاتھ پر ڈالا۔ دِل سے دُعا نکلی اور فرمایا۔ "احسان تُوں میری خدمت کیتی اے۔ مَیں راضی ہاں، خدا راضی تھیوی! وقت آسی بادشاہ دی تیڈی جوتیاں سِدھی کریسن"۔ (احسان! تو نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ مَیں تم سے راضی ہوں، خدا تم سے راضی ہو۔ انشاء اللہ وقت آئے گا کہ بادشاہ تیری جوتیاں اُٹھائیں گے) قاضی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے استاد مرحوم کی اس دُعا کی تکمیل اپنی آنکھوں سے یوں دیکھی کہ جب والئ قلات کے ہاں مہمان ہوا تو دعوت سے فراغت کے بعد والئ قلاّت نے میری جوتی اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دین ادب کا نام ہے۔ اس بُنیاد پر آپ مودودی صاحب اور اُن کی جماعت پر تنقید کی حمایت کرتے تھے کہ مودودی صاحب نے جتنا دین پھیلایا ہے، اُسی قدر بے ادبی کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ ان کے متبعین، صحابۂ کرامؓ، سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین پر تنقید کو جائز اور وقت کی ضرورت خیال کرتے ہوئے "تلاشِ حق کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، مگر جب علمائے ملّت، مودودی صاحب کے غلط اجتہاد اور مسائلِ دینیہ میں غلط استدلال پر اُن کی گرفت کرتے ہیں تو یہ گرفت ان کے عقیدتمندوں کے لئے قابلِ برداشت نہیں ہوتی اور علماء اسلام کو غلط ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ غرض قاضی صاحب مرحوم ادب و احترام کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ یہ چیز ہمارے موجودہ

معاشرے میں عنقا ہے، اور نئی نسل نہ صرف ادب سے نا آشنا ہے بلکہ اسے "قدامت پسندی اور رجعت پسندی" قرار دے کر سرمایہ داری اور جاگیرداری کی طرح ختم کرنا چاہتی ہے۔

قاضی صاحب نفاست پسند تو تھے ہی، عادتوں میں بھی نفاست اور ایٹیکیٹ (ETIQUETTE) یعنی آداب و تہذیب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہ بات گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں۔

آپ مقام و مرتبہ کے مطابق حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ نے کئی مرتبہ کہا، کہ "میں نے ادب اپنے استاد امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے سیکھا ہے۔" اُن کے سکھانے کا انداز بعض اوقات جارحانہ بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ آپ خود سُناتے ہیں، کہ میں نے ایک دفعہ غلطی سے شاہ جی کو بائیں ہاتھ سے پانی پیش کیا۔ شاہ جی نے گلاس لے کر میرے منہ پر دے مارا۔ اس کے بعد کبھی بھی بائیں ہاتھ سے کوئی چیز پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

کھانے پینے کے آداب، کپڑا پہننے اور رہن سہن کے طریقوں تک سے آپ بخوبی آشنا تھے۔ آپ اچھا کھانا بھی پکا سکتے تھے۔ عورتوں کے کپڑوں کا انتخاب، زیورات اور دوپٹوں تک کی اقسام اور قیمتوں سے آپ بخوبی واقف تھے۔ ایسی چیزیں خود خرید کر لاتے اور بیگم اور بچیوں کو پیش کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک وزیر سے مصروفِ گفتگو تھے، کہ آپ نے اجازت چاہی کہ کچھ خرید و فروخت کرنا ہے۔ تو اُس نے پوچھا۔ کیا کچھ خریدنا ہے۔ آپ نے کہا۔ گھر والوں اور بچیوں کے لئے کپڑے خریدنے ہیں۔ اُس نے حیرت سے پوچھا قاضی صاحب! آپ خود خرید کرتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ بیگم کو بازار بھیجنے کا سخت مخالف ہوں۔ دوسرے میری بیگم کا کوئی "بوائے فرینڈ" نہیں ہے جو خرید کر لا دے۔ اس لئے خود ہی خرید لیا کرتا ہوں۔ وزیر صاحب منہ تکتے رہ گئے۔

مختصر یہ کہ آپ زندگی گذارنے کے آداب و اطوار سے مکمل طور پر واقف تھے حالانکہ

ہمارے اکثر حضرات اِن چیزوں سے عموماً ناواقف ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ تہذیب نو کے دلدادگان، علماء کی اس ناواقفیت کو خوب اُچھالتے ہیں، لیکن قاضی صاحب اُن علماء میں سے تھے جو آدابِ زندگی کو بہر حال سمجھتے ہیں اور کسی محفل میں بھی انہیں احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ ایک واقعہ شیخ عبدالمجید صاحب سابق میونسپل کمشنر شجاع آباد نے سُنایا کہ ایک دفعہ بہاولپور کے اسٹیشن پر گاڑی آکر رُکی تو ایک ملبا تڑنگا پٹھان، پیشاب سے فارغ ہو کر استنجا کر کے شلوار باندھنے لگا تو سامنے خواتین کا کمپارٹمنٹ تھا۔ اگرچہ وہ غیر شعوری طور پر ایسا کر رہا تھا، مگر قاضی صاحب سے نہ رہا گیا۔ اُنہوں نے فوراً جا کر اُسے زور سے تھپڑ مارا اور ملامت کی کہ شرم نہیں آتی، عورتوں کے ڈبّے کے سامنے کھڑے ہو کر شلوار باندھ رہے ہو!

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ اگرچہ طاقت میں وہ قاضی صاحب سے دُگنا تھا، مگر رعب میں آگیا اور کھسیانہ ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔

ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے آدابِ زندگی سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے، اور آپ نے اس لحاظ سے یقیناً کامیاب زندگی گزاری۔

عاشقِ رسول ؐ

قاضی صاحب کی سب سے نمایاں خوبی میرے نزدیک اُن کا عاشقِ رسول ؐ ہونا ہے۔ ان کی وفات کے بعد بعض مخالفوں تک نے اپنے خواب مجھ سے بیان کئے ہیں۔ جن میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ اُنہیں قاضی صاحب کی شخصیت کا اندازہ بعد از وفات ہوا۔ ایک صاحب نے کہا مجھے خواب میں قاضی صاحب ایک جگہ خوش و خرّم بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ نُورانی چہروں کا مجمع لگا ہے اور ایک صاحب درمیان میں بڑی شان کے ساتھ بیٹھے خطاب کر رہے ہیں تو قاضی صاحب بھی اُسی مجمع میں بڑے پُرتپاک طریق سے ملے۔ میرے استفسار پر قاضی صاحب نے کہا کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور ہمیں خطاب فرما رہے ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلکاً بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن قاضی صاحب کا بہت احترام کرتے تھے، کہا کہ قاضی صاحب مجھے خواب میں نظر آئے۔ میں نے پوچھا۔ کہئے قاضی صاحب کیسے گذری تو قاضی صاحب نے جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کے غلاموں کی غلامی کی بدولت قدرت نے آبرو رکھ لی۔ یہ جملہ حیات میں بھی بوقتِ اختتامِ دُعا کہا کرتے تھے۔

غرض حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اسمِ گرامی کے آتے ہی چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ قلب پر رقّت طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ جاتی تھی۔ انہوں نے کبھی درُود شریف اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ سے وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تک ہی نہیں پڑھا، بلکہ بِعَدَدِ كُلِّ ذَرَّةٍ اَلْفَ اَلْفَ مَرَّةٍ تک پڑھتے۔ درُود شریف خود بھی پڑھتے اور دورانِ تقریر سارے مجمع کو یک زبان ہو کر پڑھاتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ یہ عشق صرف زبان کی حد تک نہیں تھا، بلکہ عملی طور پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔

ختمِ نبوّت پر جب بھی تقریر ہوتی تو وہ تقریر میں زیادہ کُھلتے۔ بعض اوقات "توحیدی"، لوگ اُنہیں "بریلوی" تک کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف میں جب اُنہیں کوئی نیا شعر ملتا، تو نہ صرف یہ کہ خود محظوظ ہوتے، بلکہ اس کو زبان سے بار بار پڑھتے اور ہر ملنے والے کو سُناتے۔ پھر ایک شعر، پھر دوسرا، پھر تیسرا، اس طرح اشعار کا دفتر کُھل جاتا، اور سیرتِ طیّبہ پہ اقبال، ظفر علی خان، جامی، غالب، شیخ سعدی، حافظ شیرازی اور بابا فرید کے اشعار مسلسل پڑھتے چلے جاتے۔ خود بھی بے خود ہو جاتے اور محفل کو بھی بیخود کر دیتے۔

اب کہاں دُنیا میں ایسی ہستیاں

ایک دفعہ غُسل کر رہے تھے ۔منہ اور سر کو صابن لگا ہوا تھا۔جونہی سر اور منہ دھویا، مجھے آواز دی، نُور الحق! ظفر علی خان نے حضور علیہ السّلام کی تعریف کِس خوبصورت انداز میں کی ہے۔پھر یہ اشعار پڑھے۔

نُور ترا نہ چیرتا گر افقِ شہود کو
ختم نہ ہوتی آج تک تیرگیٔ شبِ حیات
چہرۂ والضحٰے ترا، پرتوِ حُسنِ لم یزل
دونوں جہاں کی رحمتیں تیرے جمال کی زکوٰۃ

آخری مصرع" دونوں جہاں کی رحمتیں تیرے جمال کی زکوٰۃ" پر عش عش کر اُٹھتے اسے بار بار دہراتے اور ظفر علی خاں کو دعا دیتے۔ پھر اقبال و غالب اور بابا فرید تک مختلف اشعار سُنا ڈالے ،غُسل کرنا بھُول گئے، گرم روٹی ٹھنڈی ہو گئی باہر کوئی آواز دیتا تھک جائے، وہ اشعار سُناتے اور داد لینے میں محو ہیں۔محویت کا یہ عالم مَیں نے احرار کے تقریباً ہر خطیب میں دیکھا ہے۔

قاضی صاحب، اشعار درست پڑھتے تھے۔احرار کے خطیبوں میں مَیں نے جنہیں سُنا ہے اُن میں حضرت شاہ جی، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری اور قاضی صاحب، یہ حضرات اشعار کیا پڑھتے کہ سامعین مفہوم تک سے آشنا ہو جاتے۔

مجھے یاد ہے کہ موچی دروازہ لاہور کے باہر ایک بہت بڑا جلسۂ عام تھا۔شاہ جی کی وفات پر تعزیت کا جلسہ تھا۔مختلف مقررین نے خُوب خُوب تقریریں کیں، اور داد پائی۔ماسٹر تاج الدین مرحوم تشریف لائے۔ماسٹر جی خطابت کی نسبت "جوڑ توڑ

کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ جہاں کوئی گتھی سلجھنے کا نام نہ لیتی، اُسے سلجھانے کے لئے ماسٹر جی کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ بہرحال ماسٹر جی اچھی تقریر کر سکتے تھے مگر آخری مقرر تھے، لوگ حیران تھے کہ کیا کہیں گے۔ بہرحال خمیر احرار سے اُٹھا تھا۔ اسٹیج پر تشریف لائے، اور آتے ہی یہ شعر پڑھا سے

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کے

شعر کا پڑھنا تھا کہ مجمع واہ واہ کر اُٹھا۔ پھر ماسٹر جی کا "پولا" انداز، ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور پڑھ کر رُک رُک جانا، لوگ ایک لفظ پر واہ واہ کہتے رہے اور وہ کئی واہ واہ کرائے بغیر آگے گزر جاتے۔ یہ ماسٹر جی کا ہی انداز تھا۔

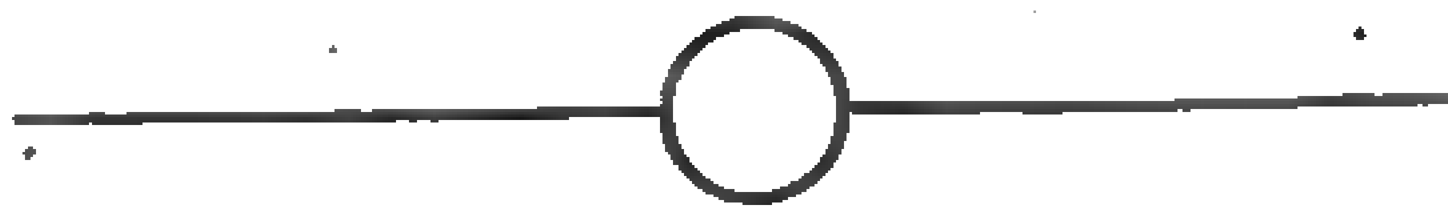
ایک دفعہ قاضی صاحب کی موجودگی میں میں ایک جگہ تقریر کر رہا تھا۔ بڑی خوشی کا اظہار فرما رہے تھے۔ حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے کہ اچانک میں نے سوداؔ کی رباعی پڑھی۔

سوداؔ قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کَن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رُو سیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رباعی کے پہلے مصرع کے آخری لفظ کو میں نے کوہ کَن کی جگہ کوہ کُن کہہ دیا۔ قاضی صاحب کے چہرے پر تغیّر آ گیا۔ خیر تقریر ختم کی۔ بعد میں گھر جا کر کہا کہ "میں سمجھتا تھا میرا بیٹا ایم۔ اے پاس ہے یہ تو "ایویں" پاس نکلا۔ کہیں مولینا محمد علی جالندھری کی صحبت میں تو نہیں بیٹھے؟" میں یہ ساری گفتگو نہ سمجھ سکا۔ مجھ سے کہا۔ ذرا رباعی سُنانا۔ میں نے دوبارہ سُنائی۔ اب تمہیں کس نے بتایا کہ کوہ کَن ہے کوہ کُن نہیں۔ میں نے کہا۔ غلطی کا احساس تو ہو گیا تھا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، واپس کیسے آ سکتا تھا۔ میں نے مولانا

جالندھری کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے۔ بیٹا! اگر اشعار کا تلفظ "صحیح" کرانا ہو تو مولانا سے سیکھ لیا کرو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا واقعی اوّل تو تقریروں میں اشعار سرے سے پڑھتے ہی نہیں تھے، اگر پڑھتے تو ان کی خُوب گت بناتے تھے۔

حضرت قاضی جی کا ایک اور واقعہ جسے شیخ عبدالمجید صاحب سابق میونسپل کمشنر شجاع آباد جو قاضی صاحب کے ساتھ کافی عرصہ ایک بھائی اور دوست کی حیثیت سے رہے ہیں، بیان کرتے ہیں کہ بیماری کے ابتدائی ایّام میں قاضی صاحب نشتر ہسپتال مُلتان میں ڈاکٹر عبدالرؤف کے زیر علاج تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ قاضی صاحب کو نیند آگئی۔ تھوڑی دیر بعد کیا سُنتا ہوں کہ قاضی صاحب بڑی لجاحت سے کہہ رہے ہیں کہ "حضور! میں آپ کی ختمِ نبوّت کی خاطر اتنی بار جیلوں میں گیا ہوں، میں نے ملک کے ذمّہ دار حکمرانوں کو قادیانی فتنہ سے آگاہ کیا ہے، حضور! یہ سب کچھ میں نے آپکی خاطر کیا ہے۔" اس کے تھوڑی دیر بعد دُرود شریف پڑھنے لگے۔ میں یہ سمجھا، شاید قاضی صاحب کا آخری وقت ہے۔ مگر کچھ دیر بعد وہ خود بخود بیدار ہو گئے۔ ہشاش بشاش تھے، درود شریف پڑھ رہے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی خواب کا واقعہ بتایا۔ اللہ تعالےٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو کروٹ کروٹ جنّت الفردوس کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین



قومی خدمات

سیاست میں شرکت ، قید و بند کی صعوبتیں

یوں تو بیسویں صدی کا آغاز برصغیر پاک و ہند کے لئے باعثِ رحمت بن کر آیا۔ اس لئے کہ قدرت کو اس صدی میں دنیائے سیاست میں محیر العقول کارنامے سرانجام دینا تھے۔ اِن حیرت انگیز تبدیلیوں کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکا تھا۔ تاہم بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اقوامِ عالم خصوصاً برصغیر کی سیاست کا دھارا کچھ صحیح رُخ کی طرف مُڑنے لگا تھا۔

تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ کانگریس ۱۸۸۵ء سے وجود میں آچکی تھی۔ ابتداً اس کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد انگریز اور ہندوستانیوں کے مابین رابطہ قائم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بنیاد ایک انگریز مسٹر ہیوم نے ڈالی تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انگریز کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی کہ ہندوستان یا اسکی کسی نوآبادی میں ایسے عناصر سر اُٹھائیں جو آزادی کا مطالبہ کریں۔ بلکہ فرنگی کی یہ پالیسی ہر جگہ کارفرما رہی ہے کہ ایک طبقہ انگریز کا وفادار پیدا کیا جائے اور اس کی سرپرستی کر کے اسے حریت پسندوں کے مقابلے میں لایا جائے تاکہ وہ باہم ٹکرا کر فرنگی حکومت کے لئے خطرہ نہ بن سکیں۔ کانگریس آگے چل کر نیم سیاسی اور پھر نیشنل سطح پر ایک سیاسی جماعت بننے کیلئے کوشاں ہو گئی ، اگرچہ اس کے قومی سطح کے دعاوی بتدریج رو بہ زوال ہونے لگے اور مسلمانانِ ہند نے

اپنے حقوق و اختیارات کے تحفّظ کے لئے جُدا راہوں کا انتخاب شروع کر دیا چنانچہ بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں دو بڑے دھماکے ہوئے، جنہوں نے آگے چل کر برصغیر کی سیاست کا رُخ متعین کرنے میں بنیادی اینٹ کا کام کیا۔ پہلا دھماکہ ۱۹۰۶ء میں جماعت مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ جب کہ دوسرا دھماکہ اسی جماعت کی مرکزی پالیسی کو متعین کرنے اور آئندہ چل کر اُسی اُصول کی بنیاد پر ایک علیحدہ مملکت کی صورت میں رونما ہوا، وہ تھا ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کے لئے جُداگانہ نیابت کے اصول کا فارمولا اور بنگال کے مسلم راہنماؤں کا میدانِ عمل میں آنا یہ تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء کے نتائج کا ردِعمل تھا۔ انگریز وائسرائے کرزن نے تو شرپسندوں کے خاتمہ اور انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر، متحدہ بنگال کو مشرقی اور مغربی بنگال میں تقسیم کر دیا تھا لیکن اس سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے سماجی و معاشی اور معاشرتی تسلّط سے نجات کا راستہ ہموار ہوتا نظر آیا۔

بعض مغرب زدہ مؤرخین نے کرزن کے اس منصوبۂ تقسیم کو مسلمانانِ بنگال کے لئے خوش آئند قرار دے کر، اُسے مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ثابت کیا ہے، جو تاریخی منطقی اور عقلی طور پہ غلط ہے۔ انگریز کبھی مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں رہا ہے، بلکہ بغض اور دشمنی انگریز کو مسلمانوں کے خلاف ورثہ میں ملی ہے۔ بنابریں تقسیمِ بنگال کے دوسرے سال ہی یہ حقیقت منظرِ عام پر آگئی کہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ دیر تک مسلم و ہندو اکٹھے نہیں رہ سکیں گے۔ نیز بعد کے واقعات نے اس حقیقت کو مزید واضح کر دیا کہ مسلم ہندو مِل جُل کر نہیں رہ سکتے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے، جب میں بعض مفکّرین اور بلند پایہ مسلمان سیاست دانوں کے افکار اس سلسلہ میں ملاحظہ کرتا ہوں کہ وہ مسلم ہندو بھائی بھائی کے نعرے لگا کر متحدہ ہندوستان کی خواہش رکھتے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت اُن کی آنکھوں سے اوجھل تھی کہ ہندو ذہنیت کا دوسرا نام "تعصّب اور تنگ نظری" ہے۔ اور یہ قوم، یہودیوں کی طرح محسن کُش، سازشی اور بدطینت ہے۔ اس لئے کہ ایک ایسی قوم جو ہزار سالہ اقتدار پہ براجمان رہی ہو، جو دشمنوں کو معاف کرنے، دوستوں سے

رواداری برتنے اور رعایا کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے جیسے اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو، ایک تنگ نظر قوم کے ساتھ زندگی کی کٹھن راہوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کر سکے گی۔

غرض تقسیمِ بنگال، قیامِ مسلم لیگ اور منٹو مارلے اصلاحات کے بعد مسلمانانِ ہند اپنے لئے الگ راہ تجویز کرنے پر حالات کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ اس پر مہرِ تصدیق ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ نے ثبت کر دی۔

جنگِ عظیم اوّل کے وقت مسلمانوں کی خلافت کا مرکز ترکی تھا۔ ایک مسلمان کو خلافت سے جو تاریخی طور پر لگاؤ ہو سکتا ہے، وہ مسلمانانِ ہند کو جذباتی طور پر تھا۔ چنانچہ دورانِ جنگ ہی مسلمانانِ ہند نے اپنے ان نازک جذبات کا اظہار انگریز سے کیا کہ اگرچہ حالات نے ترکی کو جرمنی کا ساتھ دینے کی وجہ سے اتحادیوں کا مخالف بنا دیا ہے، مگر انگریز جو ہندوستان پر حکمران ہیں، انہیں مسلمانانِ ہند کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے، ترکی سے خلافتِ اسلامیہ کو ختم نہیں کرنا چاہیئے۔ انگریز نے بظاہر مسلمانوں کے ان مطالبات کو منظور کر لیا کہ مقاماتِ مقدسہ کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا، نیز خلافت کو بدستور قائم رہنے دیا جائے گا، اسی بنا پر مسلمانوں نے جنگ میں انگریزوں کی پوری امداد کی۔ لیکن انگریز ایک تیر سے دو شکار کھیل رہا تھا۔ چنانچہ اس نے عربوں کے اندر جذبۂ قومیت ابھارا، اور عربی و عجمی تفاوت پیدا کر کے اولاً ترکی کے خلاف عربوں کے اندر جذبات بھڑکائے کہ حقیقت میں خلافت کے اہل تم ہو، تم پر عجمی خلافت کے رُوپ میں حکومت کر رہے ہیں۔ ثانیاً عربوں میں علاقائی منافرت پیدا کر کے باہمی طور پر لڑایا کہ اگر ترکی سے خلافت منتقل ہو کر عربوں میں آ جائے تو وہ بھی آپس میں اس بات پر لڑ بھڑ جائیں کہ خلافت کے اہل عربوں میں کس علاقہ کے لوگ ہیں۔

اس طرح ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کا انگریزی منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، اور مسلمانانِ ہند کو بھی معلوم ہو گیا کہ انگریز اس قسم کی منافقانہ چال چل رہا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر ہندوستان میں ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم ہوگئی، جس کی شاخیں ملک بھر میں قائم کر دی گئیں۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں نے جانی و مالی قربانی سے دریغ نہ کیا اور یہ بغاوت کی آگ بن کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے بھی عدمِ تعاون کی تحریک شروع کر دی، اس طرح ہندو اور مسلم دونوں انگریز کے خلاف متحد ہو گئے، مگر یہ اتحاد زیادہ دیر تک کارگر نہ ہو سکا۔ مسٹر گاندھی نے خود بخود تحریک کو ختم کر دیا، مصطفٰے کمال نے ترکی میں خلافت کی جگہ صدارتی نظام رائج کر لیا، اور تحریکِ خلافت یوں اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ میرے نزدیک تحریکِ خلافت ایک ایسی تحریک تھی جس نے مسلمانانِ ہند میں "مذہبی سیاست" کو جنم دیا، ایسی سیاست جس پر مذہب کی چھاپ ہو۔ اس تحریکِ خلافت کے بعد مذہبی سیاست دو گروپوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک گروپ محمد علی جناح کے زیرِ کمان آگیا جو مذہب کے ساتھ ساتھ جداگانہ معاش کی بنیاد پر ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور ہندو ذہنیت کو پرکھ کر علیحدگی چاہتے تھے۔ اس گروپ میں شامل افراد، مذہبی تو نہ تھے اور نہ ہی مذہب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا مگر تحریکِ خلافت نے چونکہ مذہب سے محبّت کو جزوِ ایمان بنا دیا تھا اس لئے مسلمانوں کے تمدّن، ثقافت اور ایک علیحدہ قوم کے تصوّر کو اجاگر کرنا، ایک علیحدہ مملکت کے حصول کے لئے بنیادی ضرورت سمجھی گئی۔ اس گروپ میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان، مسلمان نواب اور جاگیردار شامل تھے۔

دوسرا گروپ جو سیاست میں مذہب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھا اور سیاست کو ثانوی حیثیت دیتا تھا، ان افراد پر مشتمل تھا جن میں کتاب و سنّت کے ماہر بھی تھے اور مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے نمائندے بھی۔ ان کی سیاست انگریز کا اخراج تھا۔ انگریز کے اخراج کے بعد اس گروپ کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا۔ یہ اس گروپ کی ایسی خامی تھی جس نے آگے چل کر اس کی تمام تر کامیابیوں پر ایک ایسا دبیز پردہ

ڈال دیا جو آج تک پڑا ہوا ہے۔ اس گروپ کو نیشنلسٹ یا قوم پرست گروپ کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں گروپوں نے اپنے اپنے طور پر اسلام، ملک اور ملت کی بھرپور خدمت کی۔ تقسیم ملک سے قبل ایک ایسا وقت بھی آیا جب یہ دونوں گروپ قریب آ رہے تھے، مگر بعض پوشیدہ ہاتھوں نے، جنہیں عرفِ عام میں سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے ان دونوں کو قریب نہ آنے دیا اور تاریخ ایک اچھے موڑ پر آ کر اپنا رُخ بدل گئی۔ اگر آپ اقوامِ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ایک مسلّمہ حقیقت ہر قوم کی تاریخ میں مشترک نظر آئے گی کہ اس قوم کے سرمایہ دار اور عافیت کوش طبقہ نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو عزیز رکھ کر غریب طبقہ کی اکثریت کے مفاد کو داؤ پر لگا دیا۔ یہ طبقہ مفاد پرست تو پہلے ہی ہوتا ہے، اس کے ساتھ ابن الوقتی بھی اس کی سرشت میں شامل ہو جاتی ہے اور وقت کے دھارے کے ساتھ اپنی وفاداری بدلتا رہتا ہے۔ میں دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ ان دونوں گروپوں نے اپنے اپنے طور پر پاکستان کی تشکیل میں بجا طور حصہ لیا ہے۔ ایک گروپ نے شب و روز مسلسل محنت کر کے شہروں سے نکل کر دیہاتوں تک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے کر، اُن کے اندر دین و مذہب سے محبت کُوٹ کُوٹ کر بھر دی اور جب یہ فصل پک کر تیار ہو گئی تو دوسرے گروپ نے کاٹ لی اور یوں تشکیلِ پاکستان پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

ہمارے ہاں مؤرخین صرف ایک ہی انداز سے سوچنے کے عادی ہیں۔ ان کے نزدیک جو جماعت، ان کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، وہ غدّارِ وطن، دشمن بلکہ "اسلام دشمن" ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جب راقم سیاسیات کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا تو تاریخ و سیاست کے اساتذہ اپنے مخالف نظریات رکھنے والوں کے متعلق نفرت آمیز بلکہ حقارت آمیز انداز اختیار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسلامی شعائر تک کا مذاق اُڑاتے تھے۔ یہ ۱۹۵۹-۶۰ء کی بات کر رہا ہوں آج گیارہ بارہ سال بعد ان دانش گاہوں کا کیا حال ہو گا؟ حالات گواہ ہیں کہ نئی نسل ان

دانش گاہوں سے کیا لے کر باہر آ رہی ہے۔ کسی جماعت سے منسلک کارکن اور ایک مؤرخ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے مؤرخ ملک کی تاریخ کو جماعت کے رُکن کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا یک چشم مؤرخ تاریخ سے کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ البتہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی استعداد ضرور رکھتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جانبدارانہ جذبات سے بالاتر ہو کر تاریخ نویسی کا کام کیا جائے۔ ہم نے سطورِ بالا میں جن دو گروپوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں اختلافات ضرور تھے اور بسا اوقات یہ اختلافات شدّت کا رنگ بھی اختیار کر جاتے تاہم دونوں کے محاسن یک جا کر کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں اپنے اپنے طور پر مخلص تھے اور دیانتداری کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

مجلس احرار اسلام کا قیام ۱۹۲۹ء

اس دوسرے گروپ میں جس کی سیاست پر مذہبی رنگ غالب تھا، مجلسِ احرارِ اسلام کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ مجلس احرار اسلام ایک عوامی جماعت تھی جس کی شاخیں متحدہ ہندوستان میں ہر جگہ تھیں، مگر پنجاب اس کا گڑھ تھا۔ پنجاب اس کا گڑھ کیوں بن گیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چونکہ پنجاب انگریزی اقتدار کا گڑھ بن چکا تھا۔ اس لئے انگریز جیسی جابر قوت سے ٹکرانے والوں کا گڑھ یقیناً پنجاب ہی کو ہونا چاہیئے تھا۔ اس سلسلے میں دو قوتیں نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آگئیں، جنہوں نے انگریز سے ٹکّر لی۔ احرار اور خاکسار۔ طریقِ کار میں اختلاف تھا مگر مقاصد تقریباً یکساں تھے۔ کوئی مؤرخ برصغیر کی ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو خون سے رقم کی ہوئی تاریخ کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جب ۳۱۳ خاکساروں کے جیوش نے بڑن کے حکم کی تعمیل میں انگریز جیسی منظم و مقتدر حکمران پارٹی سے براہ راست ٹکّر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت کی زندگی کا کوئی ایک تاریخی کارنامہ ہی اس کی بقا کیلئے کافی ہوتا ہے۔

تاریخِ عالم کی یہ ستم ظریفی یکساں طور پر ہر جگہ محسوس کی جا رہی ہے، کہ کسی قوم کے

حریت پسندوں اور قوم پرستوں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کیا گیا۔ انہیں غدار اور وطن دشمن کہا گیا، ان کی املاک تباہ، جائیدادیں ضبط اور مکانات بھسم کر دیئے گئے۔ یہانتک کہ ان کی آئندہ نسلوں تک کو نشانۂ انتقام بنایا گیا۔ چنانچہ اس مسلّمہ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مجلس احرار اسلام ایسی جماعتوں اور افراد کو آج تک نہ کسی سرکاری عہدہ کے لئے موزوں سمجھا گیا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے منصب کے اہل گردانا گیا، بلکہ تقرری کے آخری مراحل میں کسی امیدوار کے متعلق "سی آئی اے" کی رپورٹ موصول ہو گئی کہ فلاں امیدوار خطرناک ہے کیونکہ اس کا رشتہ فلاں قوم پرست لیڈر یا راہنما سے جا ملتا ہے، تو آپ یقین کیجئے کہ امیدوار چاہے کتنی اہلیّت اور قابلیت کا مالک ہو اور مقابلہ کے امتحان کے سارے مراحل پورے کر چکا ہو، اُسے منصب پر فائز نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کا رشتہ، اس گروپ کے کسی لیڈر سے جا کر ملتا ہے جس نے زندگی بھر فرنگی کے خلاف جنگِ آزادی لڑی۔ بالفاظ دیگر تا حال فرنگی ہی ہمارے ملک پر حکمران ہے کہ جن افراد یا جماعتوں کو اس نے اپنے "عہدِ سلطانی" میں خطرناک قرار دیا تھا، آج چوبیس سال بعد آزادی حاصل کرنے کے باوجود وہ خطرناک ہی ہیں۔

غرض پنجاب کو تحریکات چلانے، لیڈر پیدا کرنے اور جانباز فوج پیش کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ چنانچہ مجلسِ احرار اسلام کے جیالے رضاکار، اس کے مخلص کارکنوں اور بے لوث راہنماؤں کی اکثریت خطۂ پنجاب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے برعکس پنجاب کو "یہ شرف" بھی حاصل رہا ہے کہ اسی خطۂ زمین سے ٹوڈی قسم کے سرمایہ دار، خوشامدی قسم کے جاگیردار اور غیر ملکی آقاؤں کے اشاروں پر مدعیانِ نبوت پیدا ہوئے۔ فرنگی کی مکارانہ سیاست نے ایک ہی خطّہ کے لوگوں میں ایسے بنیادی اختلافات پیدا کر دیئے جن میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مجلس احرارِ اسلام کو کئی وجوہات کی بنا پر پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز

بنانا پڑا۔

اولاً، ہندوستان کی سیاست میں پنجاب کو ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا رہا ہے جو غیر ملکی حملہ آور پنجاب پر قابض ہو گیا، اس کے لئے ہندوستان کے دوسرے حصوں پر قبضہ کرنا چنداں مشکل نہ رہا۔ چنانچہ ہر بیرونی حملہ آور نے پنجاب پر نگاہ رکھی اور اسے فتح کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے بھی پنجاب کو ملکی سیاست کا مرکز بنایا ہوا تھا اس لئے قوم پرست تحریکات چلانے والوں کے سامنے یہ چیز ہمیشہ پیش نظر رہی ہے کہ کسی طرح انگریز کے قدم پنجاب سے اکھڑ جائیں تو ملک کے دوسرے حصوں سے اس کا اخراج آسان ہو جائیگا۔

ثانیاً، انگریز کو محفوظ پناہ گاہیں سب سے زیادہ پنجاب میں میسر آئیں۔ یہ پناہ گاہیں سرمایہ دار اور جاگیردار اور پیرانِ عظام تھے جنہیں خود انگریز نے پیدا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ "مخلوق، خالق" سے کیسے غداری کر سکتی ہے۔ "ہر فرعونے راموسیٰؑ" کے مصداق انگریز کی اس "مخلوق" سے ٹکرانے کے لئے خالقِ حقیقی نے بہادر سپاہی اور جیالے رضا کار بھی سرزمینِ پنجاب میں پیدا کر دیئے تھے۔ جنہوں نے ان محفوظ پناہ گاہوں کے قلعوں میں شگاف ڈال دیئے اور تابڑ توڑ حملوں سے ان قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا۔

ثالثاً، مجلسِ احرارِ اسلام کے مقتدر راہنما اور خطیب نیز شعلہ بیان مقرروں کی کثیر تعداد پنجاب ہی سے متعلق تھی، اس لئے سیاسیات کا محور زیادہ تر پنجاب ہی رہا۔

رابعاً، پنجاب میں ذرائع آمد و رفت کی ہر قسم کی سہولت حاصل تھی۔ سڑکوں اور ریلوں کا ایک مربوط اور لامتناہی سلسلہ موجود تھا۔ اس جماعت کے راہنما بھی غریب تھے اور رضا کار بھی۔ چنانچہ وسائل کی کمی کے باوجود تبلیغ و اشاعت کے لئے پیدل، سائیکلوں اور گھوڑوں کے ذریعہ کام چل جاتا تھا۔ اسلئے حالات و عدم وسائل نے بھی احرار کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ پنجاب پر مرکوز رکھے۔

خامساً، پنجاب کے عوام قربانی کے سلسلہ میں برصغیر کے تمام حصوں کے مقابلہ میں

پیش پیش رہے ہیں۔ برصغیر میں کوئی تحریک اٹھی، اُسے پنجاب نے خوش آمدید کہا، اور اُس کے لئے تن من دھن کی قربانی پیش کی، تحریک کی کامیابی میں ہر رکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے پورا زور صَرف کر دیا۔ جیلیں بھر دیں، دار و رسن پر لبیک کہی اور اپنے راہنماؤں کو آنکھوں پر بٹھایا۔ ان وجوہات کی بنا پر بھی احرار کو اپنی کمین گاہ کے لئے پنجاب ہی مناسب رہا۔

سادساً، پنجاب نہ صرف زرعی لحاظ سے زرخیز ہے بلکہ "مردم خیز" بھی ہے۔ اس سرزمین نے ہر سطح کے بلند مرتبہ انسان پیدا کئے۔ چوٹی کے شعراء، اعلیٰ پایہ کے علماء، وقت کے مجتہد و مفکر، ارب پتی صنعت کار و سرمایہ دار، کروڑ پتی زمیندار و جاگیردار، جیالے مجاہد، جانباز سپاہی، بہترین مقنن، اعلیٰ پایہ کے منتظم، مختلف علوم کے ماہر اور نصب العین کی خاطر مر مٹنے والے شہید پیدا کئے۔

ان وجوہات کی بنا پر مجلس احرار اسلام کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز پنجاب کو بنانا پڑا۔ جماعت کے قیام کے صرف دو سال بعد خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ ۱۸-۱۷ سال کی عمر میں جماعت میں شامل ہو گئے۔

گاندھی اروِن سمجھوتے کے بعد نمکین ستیہ گرہ کی تحریک ماند پڑ چکی تھی۔ انگریز دوسری جنگِ عظیم کے خطرات کے پیش نظر ہندوستان سے بگاڑ نہیں چاہتا تھا، تاہم حاکمانہ جھکاؤ بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں آزادی کی تحریک اس تیزی سے آگے بڑھی کہ ہر گھر سے انگریز کے خلاف وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے سر بکف نوجوان میدان میں نکل آئے تھے۔ بڑھتے ہوئے اس سیلاب کو روکنے کے لئے برسرِ اقتدار غیر ملکی سلطنت کا غرور ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح نظر آنے لگا۔ ایسے وقت میں انگریز کو کانگریس کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور کچھ دیر کے لئے تحریکِ ستیہ گرہ ملتوی کر دی گئی۔ جیل خانوں میں اسیرانِ ملک و ملت ایامِ اسیری سے فارغ کر دیئے گئے۔ ان کی رہائی کے بعد حالات نے نئی کروٹ

لی۔ عین اُنہیں دِنوں کشمیر کے ۳۲ لاکھ مظلوم ڈوگرہ شاہی ظلم و ستم سے پریشان ہو گئے۔ راجہ کے تشدّد نے اپنی مظلوم رعایا کو جب اپنے سامنے سینہ سپر دیکھا تو بندوقوں اور سنگینوں سے ان کے سینے چھلنی کر دیئے۔ کشمیر کی گل پوش وادیاں اپنے باسیوں کے خُون سے رنگین ہو گئیں۔ دریائے جہلم کا پانی مظلوم کشمیریوں کے خون سے بہنے لگا۔ ان کی چیخ و پکار سے ہندوستان کا مسلمان بے چین ہو گیا۔ لوگ جو ابھی ابھی ہندوستان کی آزادی کے لئے جیلوں میں گئے تھے، جب انہوں نے مظلوم کشمیریوں کی آہ و پکار سُنی تو انہیں خطوط پر جن پر وہ انگریز سے برسرِ پیکار تھے، مہاراجہ کشمیر سے، کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے لئے میدان میں نکل آئے۔ یہ جولائی ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ اس سے ایک ہفتہ پیشتر مجلسِ احرارِ اسلام کی از سرِ نو بنیاد رکھی گئی تھی مجلسِ احرار میں ایسے لوگ شامل تھے جنہوں نے تحریکِ خلافت سے کانگریس کی ستیہ گرہ تک، جہادِ حریت میں برادرانِ وطن کا برابر ساتھ دیا تھا۔ لیکن جب کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی چیخ و پکار نے بحیثیت انسان مسلمانوں کو بیقرار کیا، تو ہندو پریس خصوصیت کے ساتھ کشمیری حکمرانوں کی حمایت میں نکل آئے۔ جس سے مجلسِ احرار کو اپنی مشکلات میں دوگونہ اضافہ دیکھ کر حالات کو نئے سانچہ میں ڈھالنا پڑا۔ اور دوسری طرف انگریزی ضرورت کے تحت قادیانی ٹولہ بھی کشمیر کمیٹی کے نام سے سامنے آیا۔ ان حالات کے پیش نظر مجلسِ احرار کے سامنے ابتدائی ایّام میں دو ٹوک فیصلہ کرنے کا وقت آن پہنچا۔ چنانچہ اگر احرار اسلام اس وقت خاموش رہتی ہے تو کشمیر کے ۳۲ لاکھ مسلمان اسلام سے منحرف ہو کر قادیانیوں کی آغوش میں چلے جائیں گے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریز کی سیاسی ضرورت، ریاست کشمیر کے شمالی حصّوں کو اپنے قبضہ میں لینے کی خواہاں تھی تاکہ اشتراکی انقلاب کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے ہندوستان کو محفوظ رکھا جا سکے لیکن معاہدہ امرتسر کے تحت مہاراجہ ہری سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ انگریز کا قدم ریاست میں آئے خود مجلسِ احرار بھی سیاسی طور پہ انگریز کی اس حرکت سے آشنا تھی۔ انہی دنوں ۱۴ اگست

بعد جب کبھی وہ قاضی صاحب کو خط لکھتا تو "محسنِ اعظم" یا "پتا جی" کے خطاب سے خط شروع کرتا۔

اسی طرح انگریز جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر سمتھ بھی قاضی صاحب کا اس قدر گرویدہ تھا کہ جب کبھی وہ راونڈ پر آتا، قاضی صاحب کو مؤدب طریق سے ملتا اور احترام سے گفتگو کرتا۔ یا قاضی صاحب کبھی جیل خانے کی ڈیوڑھی میں جاتے تو سپرنٹنڈنٹ اس وقت تک کرسی چھوڑ کر کھڑا رہتا، جب تک قاضی صاحب کھڑے رہتے۔ بحیثیت قیدی قاضی صاحب نے چھ ماہ کا عرصہ گورداسپور جیل میں امتیازی حیثیت سے گذارا۔

یہ ماہ رمضان تھا۔ کہ قاضی صاحب گورداسپور جیل میں داخل ہوئے۔ یہ وہی دن تھے، جب ان کا بایاں بازو ایک سفر کے دوران ٹوٹ گیا تھا۔ جیل کی رات ان کی زندگی میں ایک کیف پرور رات تھی۔ اگرچہ اس سے قبل ۲۱ء میں مغل پورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل وکٹر کے خلاف ایجی ٹیشن میں بھرپور حصہ لینے کی پاداش میں جہلم کی جیل میں چھ ماہ کی نظر بندی کی سزا کاٹ چکے تھے، تاہم کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کے نوجوان عالم دین کو جب دوسری بار جیل کی پہلی رات میسر آئی اور انگریزی قانون نے قادیان کی حفاظت میں اپنے مخالف کو ان رعایتوں سے محروم کر دیا جس کا کہ وہ مستحق تھا تو نصف رات جب قاضی صاحب نے پہلو بدلنے کے لئے کروٹ لی تو وہ کھڈی (مٹی کا تھڑا جس پر قیدی سوتا ہے) سے نیچے گر گئے، اس سے ان کا بایاں بازو جو معالج نے درست کر دیا تھا، پھر ٹوٹ گیا۔ اور ایسا ٹوٹا کہ عمر بھر درست نہ ہو سکا۔ سی کلاس کی خوراک بھی قاضی صاحب کے لئے نئی خوراک تھی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لئے

[illegible]

انہوں نے اس خوراک پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی، بیسن بیل کی دال، سبزی اور آدھ پکی روٹی اور ایسی سبزی جو مویشیوں کو کھلانے کے قابل بھی نہ ہوتی تھی، قاضی صاحب کو پیش کی جاتی تھی، جسے وہ خندہ پیشانی سے کھاتے تھے۔ اس طرح گورداسپور جیل کی

صعوبتیں برداشت کر کے میعادِ اسیری احسن طریق سے گذارا۔

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی رات کوئٹہ میں جو زلزلہ آیا، تاریخ انسانیت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان دنوں مجلسِ احرار جو کشمیر، کپورتھلہ اور بہاولپور کی تحریکات سے فارغ ہو چکی تھی، کوئٹہ کے مظلوم انسانوں کی امداد کے لئے اپنا کیمپ لاہور کے دہلی دروازہ کے باہر کھولا۔ اس المیہ کے سلسلہ میں قاضی صاحب نے سارے پنجاب کو آگاہ کیا اور چندے کی اپیل کی اور عوام کو مظلومینِ کوئٹہ کی امداد کے لئے ابھارا۔ اس عظیم کارنامے پر اس وقت کے وائسرائے ہند نے مجلسِ احرار کی خدمات کو سراہتے ہوئے ایک سرٹیفکیٹ دینا چاہا اور اس کے لئے مجلسِ احرار کے راہنماؤں کو اپنے ہاں مدعو کرنے کی کوشش کی لیکن امیر شریعتؒ اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صرف دو شخصیتیں تھیں جنہوں نے انگریز کے اس سرٹیفکیٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور موقف یہ اختیار کیا کہ ہم نے کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی اگر کوئی امداد کی ہے، تو وہ ہمارا مذہبی اور انسانی فریضہ تھا، انگریز کی خوشنودی مقصود نہ تھی بلکہ خدا کی رضا مقصود تھی۔ یہی سال تھا کہ جولائی کی ۲۶، ۲۷ تاریخ کو لاہور لنڈا بازار کی مسجد، شہید گنج کو اپنی سیاسی ضرورت کے تحت اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے پیش نظر، احرار کی سیاسی قوت کو ختم کرنے کے لئے، ایک سازش کے تحت گرا دیا گیا۔ یہ ایام مجلسِ احرارِ اسلام ایسی فعال جماعت کے لئے بڑی کشمکش کے تھے۔ عوام و خواص مجلسِ احرار کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ اخبار زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں کے چند پالتو کرایہ کے آدمی، احرار راہنماؤں کی پگڑیاں اچھالتے اور برا بھلا کہتے پھرتے۔ ان دنوں احرار کا دفاع کرنے میں جن لوگوں نے شب و روز مصروفیت میں گزارے، پنجاب اور پنجاب کے باہر مجلسِ احرار کی صفائی اور موقف عوام میں پیش کیا، ان میں قاضی احسان احمد ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۱ء کو مجلسِ احرار نے قاضی احسان احمد اور مرزا غلام نبی جانباز کو شمالی پنجاب میں مجالسِ احرار کی تشکیل کے لئے روانہ کیا۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی اگرچہ ۱۹۳۰ء کی نمکین ستیہ گرہ میں مقامی طور پر شامل تھے لیکن گرفتار نہیں ہوئے تھے چونکہ ان کا رُوحانی تعلق حضرت امیرِ شریعتؒ کے ساتھ تھا، اور شاہ جی مجلسِ احرار کے بانیوں میں تھے لہٰذا قاضی صاحب کو بھی مجلسِ احرار میں شامل ہونا پڑا۔ اس طرح گویا قاضی احسان احمد سیاسیات کے دائرے میں عملاً داخل ہو گئے۔ لاہور سے راولپنڈی تک اور امرتسر سے گورداسپور تک کی ابتدائی مجالس کے قیام میں قاضی صاحب نے بڑی دلچسپی کے ساتھ حصّہ لیا۔

یہ زمانہ قاضی صاحب کی ابتدائی زندگی کا تھا۔ اُن کی عمر ان دنوں تقریباً ۲۰، ۲۱ سال تھی۔ ان دنوں وہ جہاں بھی گئے، کثیر اجتماعات کو خطاب کیا۔ اور قرآن کریم کی ایک آیت قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ الخ کی تفسیر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پنجاب کا نوجوان طبقہ ان کی گفتار اور کردار سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ جہاں بھی گئے، اُن کا استقبال والہانہ انداز سے کیا گیا۔ اُن دنوں سر پر ملتانی طرز کی پگڑی باندھتے تھے۔ سیاہ داڑھی، کشادہ پیشانی، گندمی رنگ اور ملیا قد، یہ تھے قاضی احسان احمد، جو آگے چل کر خطیبِ پاکستان کے نام سے معروف ہوئے

تحریکِ کشمیر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، راہنماؤں اور کارکنوں کے جذبات بھی جوان ہوتے گئے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو ان دنوں قاضی احسان احمد کی ڈیوٹی جہلم کے محاذ پر تھی لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ اس تحریک میں وہ گرفتار نہ ہو سکے، کیونکہ جماعت کا فیصلہ تھا کہ کچھ ذمہ دار لوگ باہر رہیں، تاکہ تحریک کی راہنمائی کی جا سکے۔ چنانچہ چودھری افضل حق صاحب کی گرفتاری تک تحریکِ کشمیر کو جن لوگوں نے سنبھالا، ان میں قاضی احسان احمد بھی شامل تھے۔

سیاسیات کے مدّ و جزر نے حالات کو اِس نہج پر آگے بڑھایا کہ تحریک کشمیر کے بعد اور دوسری گول میز کانفرنس سے کانگریسی راہنما شکست کھا کر جب لندن سے واپس آئے تو کانگریس نے دوبارہ تحریک شروع کی، لیکن وہ بات نہ ہو سکی جو ۱۹۳۰ء کی تحریک میں تھی۔ تاہم ہندو زعماء کثیر تعداد میں جیلوں میں گئے اور مجلس احرار کے راہنماؤں سے اِن کی ملاقات جیلوں میں ہوئی جو ہنوز تحریک کشمیر کے سلسلہ میں ایّام اسیری گذار رہے تھے، لیکن ۱۹۳۵ء کے آخری دنوں جب قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کے ذریعہ نماز جمعہ پر پابندی عائد کر دی گئی تو اس کی خلاف ورزی کرنے والوں میں حضرت امیر شریعت کے بعد تیسرے نمبر پر قاضی احسان احمد تھے جو ۲۰ دسمبر ۱۹۳۵ء کو گرفتار ہوئے اس تحریک میں قاضی صاحب کو باقی قیدیوں سے زیادہ سزا ہوئی۔ مثلاً امیر شریعت کو ۳ ماہ قید اور ۵۰ روپے جرمانہ، غلام نبی جانباز کو ۳ ماہ قید اور ۵۰ روپے جرمانہ۔ اسی طرح ایک نومسلم بشیر احمد (جو اس سے پہلے قادیانی تھا) کو یہی سزا ہوئی۔ لیکن قاضی صاحب کو چھ ماہ قید، سی کلاس، ایک ہزار روپیہ جرمانہ، عدم ادائیگی کی صورت میں ۳ ماہ کی سزا ہوئی۔ مجسٹریٹ عزیز احمد نے سزا دیتے وقت قاضی صاحب سے کہا، "میں آپ کی امتیازی حیثیت کے پیش نظر سزا دے رہا ہوں"۔ یہ سزا قاضی صاحب نے گورداسپور جیل میں بطور سی کلاس کے گذاری لیکن جرمانہ ادا کر دیا۔

گورداسپور جیل

قید کے دنوں میں قاضی صاحب نے جیل خانے کے ماحول پر اپنے کردار کے اعتبار سے جو اثر ڈالا، وہ بھی قابل ذکر ہے۔ چور اور ڈاکو ان کی شب و روز کی تبلیغ سے مستقل طور پر اپنے پیشے سے تائب ہوئے۔ ان میں ہزارہ سنگھ نامی اپنے علاقہ کا مشہور ڈاکو تھا جو ایّام اسیری میں قاضی صاحب کا بہت خدمتگذار رہا۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب کی مشقت (بان بٹنا) بھی اس کے ذمہ تھا۔ وہ مسلمان تو نہ ہو سکا تاہم وہ اپنے پیشہ، ڈاکہ زنی سے اس قدر نفرت کرنے لگا کہ رہائی کے

بالآخر تحریکِ شہید گنج ایک ایسے موڑ پر آگئی کہ بقول زمیندار اگر احرار تحریکِ شہید گنج میں شامل ہوتی تو مسجد مسلمانوں کو مِل جاتی۔ شہید گنج کے حصول کے لئے سول نافرمانی شروع کی۔ پہلا قافلہ مولینا مظہر علی کی قیادت میں مسجد وزیر خاں سے مسجد شہید گنج کو روانہ ہوا۔ لیکن دہلی دروازہ کے باہر گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے قافلہ کے سالار قاضی احسان احمد، ۵۰ احرار رضا کاروں کی معیت میں، وزیر خاں کی مسجد سے روانہ ہوئے، انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا، اور اس سلسلہ میں چھ ماہ قید کی سزا قاضی صاحب کو ہوئی، جو انہوں نے میانوالی جیل میں گزاری۔

تحریکِ شہید گنج سے مجلسِ احرار کو جو نقصان پہنچا، اس سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ہمتیں اور عزائم بڑی حد تک پست ہو گئے۔ تاہم اس ہنگامے کے باوجود مجلسِ احرار نے پنجاب کی سترہ سیٹوں پر قبضہ کر لیا، لیکن افضل حق کے حلقہ میں سکندر حیات نے اس حد تک زور دیا کہ چوہدری صاحب شکست کھا گئے۔ اس طرح ، پارٹی لیڈر کے اسمبلی میں نہ جانے کے باعث ماسوائے چودھری عبد الرحمٰن (راہوں والے) کے باقی سب ممبران یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔

۱۹۳۸ء میں قاضی صاحب کی گذشتہ جماعتی خدمات کے پیشِ نظر انہیں آل انڈیا مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اس خوبصورتی اور حُسنِ تدبیر سے نبھایا کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جیسے ہی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا مجلسِ احرار نے امرتسر میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بُلا کر جنگ کے خلاف اعلان کیا اور ساتھ ہی فوجی بھرتی اور انگریز کو کسی قسم کی امداد نہ دینے کا بھی فیصلہ کیا۔ مجلسِ احرار کو توڑ کر وار کونسل قائم کر دی۔ اس وار کونسل کا پہلا ڈکٹیٹر قاضی احسان احمد کو منتخب کیا۔ قاضی صاحب نے بحیثیت ڈکٹیٹر پہلی تقریر، امرتسر چوک فرید میں کی، جس کی صدارت بھی وہ خود ہی کر رہے تھے۔ مجلسِ احرار کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی صاحب نے اپنی علمی اور

سیاسی قابلیت کا جو مظاہرہ اس روز کیا، مجلسِ احرار کے ریکارڈ میں اس کا جواب نہیں۔
اور اس جلسہ کے دوسرے دن، نماز جمعہ کے بعد بھی قاضی صاحب کی تقریر کا اعلان کیا گیا
یہ دن امرتسر کی سیاسی تاریخ میں بڑا عظیم دن تھا، کیونکہ رات کی تقریر سے یہ خدشہ پیدا
ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب گرفتار کر لئے جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاضی صاحب
نماز جمعہ سے فراغت کے بعد تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو قانون نے اُنہیں اپنی حراست میں لے لیا۔

قاضی صاحب کی گرفتاری کا نظارہ جو اس روز امرتسر نے دیکھا، ایسا اعزاز شاید ہی
کسی دوسرے سیاسی راہنما کو نصیب ہوا ہو۔ ہال بازار میں خیرالدین کی مسجد سے کوتوالی
تک دو رویہ عوام کا ہجوم تھا۔ چھتوں پر مستورات اور بچّے اور غیر مسلم بھی اس ہجوم میں
شریک تھے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس گرفتاری کے بعد پھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے
قاضی صاحب کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر جب عوام کے ہجوم سے گذرے تو نعرہ ہائے تکبیر اور
چھتوں سے پھولوں کی بارش نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا۔ اس سے بڑا کمال نظم و ضبط
کا تھا کہ اتنے ہجوم میں ایک ہاتھ ایسا نہیں تھا جو بدامنی کی طرف اُٹھا ہو اور پولیس کو
موقع دیا ہو کہ وہ عوام پر تشدّد کرے۔ اس پُرامن گرفتاری کے بعد قاضی صاحب کو امرتسر
جیل میں محبوس کر دیا گیا، اور اس طرح سے احرار کی تحریک فوجی بھرتی کے خلاف شروع
ہو گئی۔ ان دنوں قاضی صاحب سے پیشتر جو لوگ امرتسر جیل میں گرفتار ہو کر آچکے تھے،
ان میں چوہدری افضل حق، مولانا عبدالسلام ہمدانی اور غلام نبی جانباز نمایاں تھے۔ آخر
اس مقدمے میں قاضی صاحب کو تین سال قید کی سزا ہوئی اور یہ سزا انہوں نے ملتان
اور راولپنڈی کی جیلوں میں گزاری۔ شیخ حسام الدین اور مولانا مظہر علی، حضرت امیر شریعت،
چودھری افضل حق بھی پنڈی جیل میں تھے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے ان دنوں کو غنیمت
جان کر شیخ حسام الدین اور مولانا مظہر علی اظہرؒ سے انگریزی بھی پڑھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ
اپنے احاطہ میں باغبانی کا شغل بھی کرتے رہے۔ ڈیڑھ برس کی اس قید نے قاضی صاحب کو

ایک نئی جلا بخشی اور وہ اس طرح کندن بن کر نکلے کہ باہر آتے ہی پنجاب مجلسِ احرار کے صدر منتخب کر لئے گئے۔ یہ فیصلہ اوکاڑہ ضلع ساہیوال کے اجلاس میں کیا گیا۔ جس کی صدارت قاضی صاحب نے فرمائی۔

بلاشبہ دوسری جنگِ عظیم میں انگریز اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر فتح یاب ہوا۔ لیکن جرمنی کی بڑھتی ہوئی جنگی قوت نے یورپ اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ کی صنعتی اور سیاسی ساکھ کو بہت حد تک پامال کر دیا۔ اور وہ برطانیہ جہاں سورج غروب نہ ہوتا تھا خود تنکوں کا سہارا تلاش کرنے لگا۔ کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" (QUIT INDIA) کی تحریک کو جنم دیا۔ اس کے اکثر راہنما کانگریس کی موجودہ عدم تشدد کی پالیسی سے منحرف ہو کر تشدد کی طرف مائل ہوئے۔ چنانچہ جے پرکاش نرائن، ارونا آصف علی تحریک کے لیڈر تھے۔ دوسری طرف سبھاش چندر بوس نے ہندوستان سے باہر رہ کر "آزاد ہند فوج" کی بنیاد انہیں دنوں رکھی۔

ہندوستان میں فسادات کی پھر سے نیو اٹھائی گئی۔ جس کے نتیجے میں "پاکستان" نے جنم لیا۔ اس تحریک کے پروان چڑھانے میں ہندو کی تنگ دلی کو بڑا دخل رہا ہے۔ کانگرسی راہنما بھی مسلمانوں کی سیاسی قوت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور مسلم لیگ کی مخالفت میں بھی یہی جذبہ کار فرما رہا ہے۔ دفاتر میں ہندو کلرک اور مسلمان کلرک کی باہمی چپقلش نے بھی تحریکِ پاکستان میں بڑا تعاون کیا۔ وہ مسلمان گروہ جو مذہب کو سیاسیات سے الگ نہیں سمجھتا تھا، انگریز کی اس بساط پر بکھرے ہوئے مہروں کی چال سمجھ کر تحریکِ پاکستان سے الگ تھلگ رہا، کیونکہ اس کی رو سے ہندوستان کا رجعت پسند مسلمان انگریزی حکومت کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔ لیکن جیسے ہی مسٹر محمد علی جناح اس تحریک کو لے کر اپنے خلوص کے ساتھ آگے بڑھے، احرار راہنماؤں نے پاکستان کے مستقبل کے لئے حکومت کا ایسا تصور پیش کیا، جو سہارن پور، یوپی میں مجلسِ احرار کا ایک تاریخی اجتماع مورخہ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ اپریل

۱۹۴۳ء میں ایک قرارداد کی صورت میں سامنے آیا جس کی نقل پیش خدمت ہے۔

مجلس احرار ہند نے اپنے اجلاس سہارنپور میں ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو موجودہ ملکی وسیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی ہے۔

"مجلس احرار اسلام ہند نے اکھنڈ بھارت، پاکستان، اور آزاد پنجاب وغیرہ سکیموں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جنگِ عالمگیر کی تباہ کاریوں اور جنگی رقیبوں سے ہزاروں میل دُور علاقوں میں جنگ کے تکلیف دہ اور فتنہ زا اثرات پر دھیان دیتی چلی آئی ہے۔"

"مجلس تمام غور وفکر کے باوجود اپنے آپ کو اپنا یہ پُرانا مسلک چھوڑنے پر آمادہ نہیں پاتی کہ ہندوستان کی سیاست کا پیچیدہ مسئلہ، بہرحال اس ملک کے رہنے والے لوگوں کے درمیان، امن و اعتمادِ باہمی کے ذریعہ ہی حل ہو سکتا ہے۔ اس لئے مجلس ان تمام سکیموں کے حامیوں سے بھی عرض کرنا چاہتی ہے کہ اکھنڈ بھارت، پاکستان، یا آزاد پنجاب جیسی کوئی سکیم بھی باہمی اعتماد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی فریق کا یہ خیال ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے سہارے اپنی سکیم منوا سکتا ہے تو اُسے یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ انگریزی بمبار کے سہارے جو سکیم بھی منوائی جائے گی، وہ انگریز کی غلامی پر مجبور کرے گی، اور اُسی وقت تک قائم رہ سکے گی، جب تک اس غلامی کا طوقِ گراں بار موجود ہو۔"

"ایسے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب کے نمونے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں انگریزی حکومت کی آمد کے وقت سے موجود چلے آئے ہیں۔ اسی لئے سیاسئین ہند کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی گرم روی میں ایسے حالات پیدا نہ کریں، جو بالآخر چند ایک اور مجبور ومحصور ریاستیں ہندوستان میں پیدا کریں اور بس۔ اندریں حالات مجلسِ احرارِ اسلام اپنی روش کا اظہار ان الفاظ میں کر دینا مناسب سمجھتی ہے"

مجلسِ احرار اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، جس کی کامیابی کے لئے لندن کے طواف کی ضرورت یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو۔ مجلسِ احرار اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہندوستان میں ایک مرکز قائم کیا جائے یا زیادہ، اور اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم کو روا رکھا جائے یا اس میں تبدیلی کرنے کی خواہش ہو، ہر حالت میں ـــــ صلح جویانہ عہد و پیمان اور امن و آشتی کا ماحول ہی بہترین فیصلہ میں مدد دے سکتا ہے۔ مجلسِ احرار اس منافرت انگیز پراپیگنڈے کو جو کسی طرف سے بھی کیا گیا ہو، یا کیا جا رہا ہے، ہندوستان کے مستقبل یا اکھنڈ بھارت یا پاکستان یا آزاد پنجاب وغیرہ کے قیام کے لئے مہلک سمجھتی ہے، اور اس ہر اسکیم کے حامیل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں، تحریروں، اور دیگر پراپیگنڈے سے باز رہیں اور اپنے راستے میں خود ہی کانٹے نہ بوئیں۔

مجلسِ احرار اسلام زمانہ کے موجودہ حالات میں فیصلہ کر چکی ہے کہ اب ہمیں ملک کے اندرونی فساد کے فرقہ وارانہ یا اقتصادی خطروں سے بچانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کام پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ پس جہاں مجلس اس وقت حکومت سے متصادم نہیں ہے، وہاں وہ مذہبی یا سیاسی اختلاف کی بنا پر بھی کسی فرقہ یا جماعت سے تصادم مناسب نہیں سمجھتی۔ اور جہاں وہ ہندو، سکھ یا عیسائی وغیرہ سے تصادم یا فتنہ انگیز اختلاف مناسب نہیں سمجھتی، وہاں وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنا ہرگز ہرگز پسندیدہ تصور نہیں کرتی۔ گو مجلس موجودہ وقت میں حکومتِ برطانیہ سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتی اور اپنی قسمت کو اللہ کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے، پھر بھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگرس کے سمجھوتے کی راہ میں سنگِ گراں بننے کی خواہشمند نہیں ہے۔ اُسے ایسے سمجھوتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ تاہم جو لوگ اس وقت سمجھوتے کی کوشش کرنا چاہیں، وہ اُن کو روکنا بھی پسند نہیں کرتی ان حالات

میں وہ سمجھوتہ کی علیحدہ کوشش کر کے مسلمانوں میں باہمی خلفشار کو ہوا دینا نامناسب سمجھتی ہے۔ اور واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جو کوئی سمجھوتہ چاہتا ہے وہ بیشک مسلم لیگ سے اور جس جماعت سے چاہے کرے لیکن وہ مجلس احرار سے امید نہ رکھے کہ وہ ایسے مخمصوں میں پھنس کر مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا دروازہ کھولے گی۔"

"مجلسِ احرارِ اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں کہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی یا قطعی فریضہ ہے، بلکہ ہر حالت میں خدا اور رسول کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا، دنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا، نیکی کی حکومت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا، خلقت انسان کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے، اور مجلسِ احرارِ اسلام دنیا کے جس حصہ میں بھی ممکن ہو، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ اسلام کے زرّین اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جاسکتا ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں مجلسِ احرار یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا، حکومت الٰہیہ کا مترادف نہیں، بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے رہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبہ لگایا اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی مجلس کسی ایسے تجربہ کو دہرانے کے لئے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ میں حکومت دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ مسلمانوں سے پُر زور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا فوری اور کلی احساس کریں، اور اپنی نگاہ سے حکومتِ الٰہیہ کو الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقع نہ دیں، بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعتِ خدا و رسول پر کمربستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔"

+

سہارن پور کی قرار داد کے بعد آزاد خیال مسلمانوں خصوصاً مجلس احرار میں ایک نمایاں مذہبی انقلاب آیا، یعنی اکثر و بیشتر کارکنوں اور رفقا کار ول نے سب سے پہلے اپنی وضع کو درست کیا۔ داڑھیاں رکھیں لباس میں تبدیلی آ گئی اور نماز کی طرف بھی باقاعدہ رجوع کیا۔ دوسرا فائدہ قرار داد مذکور کا یہ پہنچا کہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کے مقابل ایک قرار داد ایسی آئی جسے نیشنلسٹ مسلمان بطور حجت پیش کرنے لگا۔ اس سے پیشتر مسلم لیگ کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے خیال کے مسلمانوں کے پاس اپنے لئے کوئی جواز نہیں تھا۔ ہندوستان کے ہندو نے بھی اس قرار داد کی طرف توجہ دی، اور مطالبہ پاکستان کے مقابل سہارن پور کی قرار داد پر کافی بحث ہوئی۔

احرار راہنماؤں نے اس قرار داد کی کافی سے زیادہ تشہیر کی، اور اس طرح مطالبہ پاکستان کے مقابل دوسری قرار داد پر بحث کا دروازہ کھل گیا۔ ان دنوں دیگر احرار راہنماؤں کے ساتھ ساتھ قاضی احسان احمد نے بھی پورے ہندوستان کا سروے کیا۔ کوئی ایسا حلقہ نہیں تھا، جہاں حکومت الہیہ اور پاکستان کی بحث نہ چل نکلی ہو۔ قاضی احسان نے ان دنوں کافی سے زیادہ مجلس احرار کی خدمت کی۔

ان دنوں دوسری جنگ عظیم دم توڑ رہی تھی۔ ہٹلر کی فوجی یلغار نے انگلستان، فرانس اور روس کی فوجی طاقت کو پامال کر کے آئندہ تاریخ میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ سیاسیات کی لڑائی میں آج کے دوست کل کے دشمن ہو سکتے ہیں اور یہ ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر چلتے وقت سیاسیات سے آشنا اَفرکوئی راہ متعین نہیں کر سکتا۔ صبح و شام مختلف ادوار آتے اور گزرتے رہتے ہیں۔

جرمن کی فوجی طاقت نے فرانس، برطانیہ اور امریکہ ایسے سامراجی ملکوں کو روس ایسے کمیونسٹ ملک کے دروازے پر بطور دوست لا کھڑا کیا۔ اس اتحاد نے دوسری جنگ عظیم کا پانسہ پلٹ دیا اور جرمن دوسری جنگ کے میدان میں شکست کھا گیا۔ اتحادیوں کی

اس فتح کے باوجود برطانیہ ایسی عظیم طاقت دنیا میں دوسرے درجے کی طاقت بن کر رہ گئی۔ برطانیہ کی اس کمزوری سے ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آئے اور اُس عنصر کی جو آزادی کی لڑائی میں ہراول دستہ کے طور پر کام کر رہا تھا، مسکراہٹ نے برطانیہ کو رونے پر مجبور کر دیا، اور جیسے ہی ۱۹۴۶ء میں جنگ کا خاتمہ ہوا، برطانیہ کی لیبر پارٹی نے ہندوستان کی آزادی کے وعدے پر قدامت پسند پارٹی کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ یہی دن تھے جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی اور مجلسِ احرار کی قرارداد ماند پڑ چکی تھی۔ اس ضمن میں مجلس احرار کے راہنماؤں کو مسلم لیگ کے مطالبے کی اس لئے حمایت کرنا پڑی کہ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ برطانیہ کے لئے اب ملک کو تقسیم کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔ دوسری طرف کانگریسی راہنماؤں نے آزاد خیال مسلمانوں پر مسلم لیگ کو ترجیح دی۔ سیاسی معاملات میں مسلم حقوق کا سوال آیا تو کانگریس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھا۔ اس پر مہرِ تصدیق برطانیہ کے وزارتی مشن نے ثبت کر دی۔ کیونکہ اس مشن کی آمد نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی مسلّمہ حیثیت اور نمائندہ جماعت کے تشخّص کو اور بڑھا دیا۔ چنانچہ مجلسِ احرار کے راہنماؤں کو اب یقین ہو چکا تھا کہ ہندو کی حماقت اور برطانیہ کی اقتصادی پالیسی آج نہیں تو کل ملک کے دو حصّے کرنے پر مجبور ہوگی۔

قاضی احسان احمدؒ دوسرے احرار راہنماؤں کے ساتھ ان دنوں خاموش تماشائی کی حیثیت سے وقت گزار رہے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے سیاسی میدان سے ہٹ کر اپنے گھر میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ خود مجلسِ احرار کے اندر بھی دو گروہ بن گئے۔ مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور سیاسی دباؤ کے پیشِ نظر مجلسِ احرار نے اس یقین کے ساتھ کہ اب ملک تقسیم ہو کے رہے گا، کانگریس سے صاف کہہ دیا کہ اب آپ مسلمانوں کے حقوق کی گفتگو صرف مسلم لیگ سے کریں۔ اگرچہ کانگریس نے مجلسِ احرار کو بھی کرپس مشن سے ملنے کی سفارش کی، جس طرح جمعیۃ علماء ہند کو مشن سے ملایا گیا تھا، لیکن مجلسِ احرار نے یہ کہہ کر ملاقات کرنے سے انکار کر دیا

کہ مسلمانوں کے حقوق کی بات صرف مسلم لیگ سے کی جا سکتی ہے۔ اس پر خان لیاقت علی
خاں جنرل سیکرٹری مسلم لیگ نے، اُس وقت احرار کے صدر شیخ حسام الدین کے نام شکریہ
کا تار روانہ کیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد شیخ صاحب، ماسٹر تاج الدین انصاری اور قاضی صاحب
مولانا آزاد سے ملنے دہلی گئے، جس پر مولانا نے شکوہ کیا۔

۱۹۴۶ء کے آخر میں مجلسِ احرار کا آل انڈیا جنرل کونسل کا اجلاس اچھرہ لاہور میں
ہوا۔ جس میں مسلم لیگ سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تقسیم ملک کے فارمولا کو واقعی تسلیم کرنا ہے
تو پنجاب کو تقسیم نہ کیا جائے۔ لیکن کرپس مشن، کانگریس اور مسلم لیگ، تینوں فریق تقسیم
پنجاب کی تجویز بخوشی منظور کر چکے تھے۔ اے کاش! احرارِ اسلام کی یہ تجویز مان لی جاتی
تو آج کشمیر اور پانی ایسے سنگین مسائل جنم نہ لیتے اور ملک ترقی و عروج میں ایک اہم
مقام پر ہوتا۔ مگر لیڈرانِ کرام کچھ اس قدر عجلت میں تھے کہ آئندہ دونوں ملکوں کے مابین
جنگ چھڑنے کے امکانات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے تقسیمِ پنجاب پر راضی ہو گئے۔
اُس وقت کی قیادت کی طرف سے ایسی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ پاکستان کے وجود کے
ساتھ ساتھ یہ رستا ہوا ناسور ملّت اسلامیہ کو بھی کھاتا رہے گا۔ اور برصغیر کا خرمنِ امن
ہمیشہ انہیں غلطیوں کی پاداش میں بھسم ہوتا رہے گا۔ تاآنکہ کشمیر پاکستان کا حصّہ بن
جائے اور مشرقی پنجاب آزاد ہو کر سکھوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد آل انڈیا مجلسِ احرار کو توڑ کر مجلسِ احرار اسلام پاکستان
کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہندوستان چلے گئے۔ چودھری
افضل حق انتقال فرما چکے تھے۔ مجلس احرار کی باگ ڈور حضرت امیر شریعت، شیخ
حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور قاضی احسان احمد کے ہاتھ میں تھی ماسٹر صاحب
مجلس کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ دو سال بعد ۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار کی سیاسی
حیثیت ختم کر کے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کر دیا گیا۔ نیز ملک کے تحفّظ و بقا کی خاطر

اعلان کیا کہ جن کو سیاسی کام کرنا ہے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کریں۔

مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان نے ۱۹۴۹ء میں دفاعی کانفرنس لاہور کے اجلاس میں پاکستان کے تحفظ، مسلم لیگ سے تعاون کے لئے چند قراردادیں پاس کیں جو کتاب میں کسی دوسرے حصّہ میں درج کر دی گئی ہیں۔ اس طرح احرار کی سرگرمیاں عقیدہ ختمِ نبوّت کے تحفّظ تک محدود کر دی گئیں، الیکشن اور انتخابی گھما گھمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ احرارِ اسلام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ سیاسی کام کرنے لگا۔ جبکہ دوسرے گروہ نے تبلیغ و وعظ کو منزلِ مقصود بنا لیا۔ پہلے گروہ سے شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، نواب زادہ نصر اللہ خاں وغیرہ متعلق تھے جو اوّلاً مسلم لیگ سے تعاون کرتے رہے۔ تحریکِ ختمِ نبوّت کے بعد جب احرار کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تو وہ جناح عوامی لیگ سے منسلک ہو گئے۔ دوسرے گروہ میں حضرت امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر، اور مولانا عبد الرحمان میانوی شامل تھے، جنہوں نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کے تحفّظ کو تبلیغ و وعظ کا موضوع بنا لیا۔

ظفر اللہ خاں وزیرِ خارجہ اور قادیانیوں کی بڑھتی ہوئی انارکی اور ملک دشمن سرگرمیوں کے پیشِ نظر مجلسِ احرارِ اسلام کو اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنا پڑیں۔ چونکہ عقیدہ ختمِ نبوّت مسلمانوں کے چاروں مسلمہ فرقوں (دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، شیعہ) کا اجتماعی عقیدہ ہے۔ اس لئے ان فرقوں کے ممتاز راہنماؤں نے قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانانِ پاکستان کو آگاہ کرنے، ان کی "ریاست اندر ریاست" کا پردہ چاک کرنے، اور ان کے "سیاسی عزائم" سے باخبر رکھنے کے لئے متحد و متفق ہو کر میدان میں کود پڑنے اور ایک مجلسِ عمل کی تشکیل کی، جس کی سربراہی کے لئے مولانا ابو الحسنات قادری جیسے ممتاز عالمِ دین کا انتخاب کیا۔ جس کی تفصیل ایک علیحدہ کتاب ——

"تحریکِ ختمِ نبوّت ـــ ماضی و حال" میں پیش کی جائے گی۔ تاہم اس تحریکِ مقدّس کا اجمالاً ذکر کتاب ہٰذا کے کسی حصّہ میں کر دیا گیا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد احرار راہنماؤں کا کردار ملک کے تحفظ و پاسبانی میں نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔ ملک پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو احرار نے بچی کھچی طاقت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ جو افراد اور جماعتیں پہلے ہی روز یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ احرار کے باقیات کو "ملک دشمن، کانگریس نواز اور ہندوؤں کے ایجنٹ" کے القاب سے نوازتے رہنا ہے اور اس طرح تاریخِ حریّت کے ایک درخشاں باب کی حیثیت کو گھٹا کر اپنے سامراجی آقاؤں کو خوش رکھنا ہے۔ اِن سطور میں اُن کا ذکر ہی عبث ہے کیونکہ یہ "طائفہ" اُن "مقدس ارواح" کا جانشین ہے جو احرار ایسی حریّت پسند تحریک کو کچلنے کیلئے فرنگی آقاؤں سے ساز باز کر کے اس کی آشیرباد حاصل کرتے رہے ہیں کیونکہ فرنگی آقا کی گود صرف اس صورت میں میسّر آ سکتی تھی کہ حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں کی راہوں میں کانٹے بچھائے جائیں۔ البتہ تاریخ سے ناواقف یا غلط پراپیگنڈے سے متاثر نئی نسل کے نوجوانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مجلسِ احرار اسلام پاکستان سے منسلک علماء، مجاہدوں، کارکنوں اور رضاکاروں کی زندگیوں، سرگرمیوں اور کارگزاریوں کا ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک، غیر جانبدارانہ حیثیت سے مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ پاکستان دشمنی کا ایک معمولی سا چھینٹا بھی ان بزرگوں کے سفید دامن کو داغدار کرتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر سامراجی عزائم کو بے نقاب کرنے، "ریاست اندر ریاست" کا عملی نظام قائم کرنے والی قوتوں کا محاسبہ کرنے، اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کے خلاف سازشی عناصر کو بے نقاب کرنے میں جس جماعت نے بہادرانہ کردار ادا کیا، انہی کارہائے نمایاں کے معاوضہ میں اس جانباز جماعت کو وطن دشمن، اسلام دشمن اور ملک دشمن کے "تمغے" عطا کئے جائیں، اور جن افراد اور جماعتوں نے اپنے پچیس سالہ دورِ اقتدار میں وطن دشمنی، ملّت فروشی، اسلام دشمنی، رشوت ستانی،

اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اور عوام دشمنی کے بھرپور مظاہرے کر کے عملاً اندرون وبیرون ملک کا وقار ختم کر دیا ہو اور ملک کو موجودہ بحران سے دوچار کرنے کا موجب بنے ہوں، انہیں اسلام دوستی اور وطن دوستی کے سرٹیفکیٹ عطا کئے جائیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بانیِ پاکستان محمد علی جناح اور خان لیاقت علی خان کی وفات کے بعد ہمارے ملک کی سیاست میں وطن دشمن اور اسلام دشمن کی اصطلاحات عام ہو گئیں۔ اپنے مخالف کو ان الفاظ سے خطاب کرنا ایک فیشن سا بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ ملک دشمن اور اسلام دشمن کسے کہتے ہیں؟ کیا اپنے ہر مخالف کے لئے یہ اصطلاحات استعمال کی جاسکتی ہیں؟ کیا صاحبِ اقتدار گروپ، حزبِ اختلاف کے لئے ایسی اصطلاحات استعمال کرنے کا استحقاق رکھتا ہے؟ کیا مسلم لیگ سے منسلک اصحاب، ہر اُس جماعت کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنے کا پیدائشی حق محفوظ سمجھتے ہیں، اگرچہ اِسی مسلم لیگ کے مقدس اور معصوم راہنما اپنے کردار، اپنی سرگرمیوں اور وطن دشمن حرکتوں کی بدولت، نہ صرف اصطلاحی طور پر اسلام دشمن، وطن دشمن اور ملت فروش ثابت ہو چکے ہوں، بلکہ عملی طور پر اپنے آپ کو ان "القابات" کا اہل ثابت کر چکے ہوں۔ کون نہیں جانتا، کہ خان عبدالقیوم خان، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور محمد ایوب کھوڑو وغیرہ کو وطن دشمن سرگرمیوں کی پاداش میں سیاسیات میں حصہ لینے سے چھ سال تک روک نہیں دیا گیا تھا اور ان پر الزامات عائد نہیں کئے گئے تھے جنہیں ان اسلام اور وطن دوستی کے ٹھیکیداروں نے خاموشی کے ساتھ قبول کر کے ملت فروشی پر انگوٹھا ثبت کر دیا۔ بہرحال ان حقائق پر "مسلم لیگ اور احرار" کے عنوان سے کتاب ہذا کے کسی مقام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے تحریکِ ختمِ نبوت میں دیگر احرار راہنماؤں کے ساتھ بھرپور حصہ لیا۔ ان کی بعض تقاریر جو انہوں نے تحریک کے دوران کیں "معرکہائے خطابت"

کے عنوان کے تحت درج کر دی گئیں ہیں، ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ قاضی صاحب نے ملک کے نہ صرف مغربی حصہ میں کام کیا اور کراچی سے لے کر درہ خیبر تک تحریک کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا بلکہ ملک کے مشرقی حصہ میں بھی تشریف لے گئے اور وہاں بھی تحریک ختم نبوت کے مقاصد سے عوام کو روشناس کرایا۔ علاوہ ان خدمات کے انہوں نے ایک ایسے محاذ پر کام کیا، جس میں وہ منفرد مقام رکھتے ہیں، اور اس محاذ پر وہ تنہا ہیں ان کا کوئی شریک نہیں ہے اس نئے محاذ پر قاضی صاحب کی خدمات قابلِ قدر ہی نہیں بلکہ بے مثال اور دُور رس نتائج کی حامل ہیں۔ یہ محاذ صدرِ مملکت سے لے کر وزراء، سرکاری افسروں، کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور پولیس افسروں تک سے رابطہ قائم کر کے انہیں فتنہ قادیانیت سے آگاہ کرنا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سرکاری حکام یہ نہیں کہہ سکتے کہ قادیانیوں کے عزائم سے وہ بے خبر ہیں۔ میں نے تقریباً ہر بڑے چھوٹے افسر کو یہ بتا دیا ہے کہ قادیانیوں کے عزائم کس حد تک خطرناک ہیں۔ نیز عند اللہ بھی حجت تمام کر دی کہ وہ روزِ قیامت بارگاہِ خداوندی میں اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کر سکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے مختلف محاذوں پر ملک و ملت کی خدمت کی جس کی تفصیل تحریکِ ختمِ نبوت کے باب میں درج ہے۔ ملاحظہ فرمائی جائے۔

تحریکِ ختمِ نبوت کو ناکام بنانے کے لئے مسلم لیگی حکمرانوں نے مختلف ہتھکنڈے اختیار کئے۔ ایک ہتھکنڈہ قائدین تحریک کی گرفتاری کی صورت میں اختیار کیا گیا۔ چنانچہ سارے قائدین کو مختلف مقامات سے گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں رسوائے زمانہ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ قاضی صاحب کو ۲۸ فروری ۵۳ء کو شجاع آباد سے گرفتار کیا گیا۔ پولیس کا دستہ رات ۲ بجے، ان کے مکان پر پہنچا، تو قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں کئی روز سے آپ کا منتظر تھا۔ گھر گئے، اہلیہ کو سلام کیا، سوئے ہوئے بچوں کو ایک نظر دیکھا۔ بستر اٹھایا اور باہر نکل آئے۔ فرمایا۔ چلو بھائی!

ملزم حاضر ہے۔ یہ آپ کی پانچویں گرفتاری تھی۔ شجاع آباد سے سیدھا سنٹرل جیل ملتان لایا گیا۔ کچھ ایّام کے بعد ڈسٹرکٹ جیل ملتان منتقل کر دیا گیا۔

حکومت کی کوشش تھی کہ تحریکِ ختمِ نبوّت کی تمام تر ذمہ داری بعض احباب پر ڈال کر انہیں ہمیشہ کے لئے نظر بند کر دیا جائے۔ ان میں قاضی صاحب کا نام شامل تھا۔ قاضی صاحب جب بھی جیل گئے، ان کے تمام احباب میں خواجہ عبدالقدوس، ملتان کا نام نمایاں نظر آتا ہے کہ یہ قاضی صاحب کا ایسا ساتھی تھا، جس کے لئے اُن کے جیل جانے کے بعد، گھر میں چین ممکن نہ تھا۔ ماتحت افسران سے لے کر صوبہ کے اعلیٰ افسران تک ملاقاتیں کیں اور خود قاضی صاحب سے مختلف طریقوں سے ملاقاتیں کیں۔ خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق جب اُنہیں معلوم ہوا کہ حکومت قاضی صاحب پر تمام تر ذمّہ داری ڈال رہی ہے تو قاضی صاحب کی نظربندی کے کیس کی تیاری پورے غور و فکر اور تدبّر و انہماک کے ساتھ شروع کی گئی۔ اپنے کیس کی پیروی کے لئے قاضی صاحب نے جیل سے ہدایات بھیجیں۔ قاضی صاحب کی اشتعال انگیز تقاریر، بیانات اور خطبات کی جانچ پڑتال کی گئی۔ مگر ریکارڈ میں اُلٹا قادیانیوں کی اشتعال انگیزیوں، ملک کی سلامتی کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں اور ملّتِ اسلامیہ کی پیٹھ میں چھُرا گھونپنے کے منصوبوں کی تفصیلات مہیّا کی گئی تھیں۔ حکّام یہ انکشافات دیکھ کر حیران رہ گئے، حالانکہ حکومت کی خواہش تھی، کہ قاضی صاحب کے خلاف مضبوط بنیادوں پر تھوڑا سا مواد بھی مِل جائے تو انہیں مستقل جیل میں رکھنے کا جواز مل جائے گا۔ مگر معاملے کو اُلٹا دیکھ کر حکومت اور قادیانیوں کے اوسان خطا ہو گئے، جس کی وجہ سے وہ اپنے جال میں خود ہی پھنس گئے اور انہیں جیل سے رہا کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

قاضی صاحب مرحوم کی آخری گرفتاری جون ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ میں اُن دِنوں ایم۔ اے سیاسیات کا امتحان دے رہا تھا۔ دوسرا پرچہ تھا جس میں تحریکِ پاکستان میں

"مسلم لیگ کے کارناموں" پر مفصّل مقالہ لکھ رہا تھا کہ ایّوب خاں نے جو بعد میں مسلم لیگ کے صدر بننے والے تھے، کے عہدِ مارشل لا میں ایک تقریر کی بنا پر قاضی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ تقریر یہ مولانا عبدالحکیم صاحب ایم۔ این۔ اے، سیکرٹری نشریات و اطلاعات جمعیۃ علماءِ اسلام کے مدرسہ فرقانیہ کرتار پورہ راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ شجاع آباد سے ملتان لائے گئے۔ وہاں راولپنڈی سے سپیشل پولیس گارڈ پہنچی ہوئی تھی جو اپنے "ملزم" کو لے کر پنڈی روانہ ہوگئی۔ قاضی صاحب نے ملتان اسٹیشن ہی سے خواجہ عبدالقدّوس کو فون پر مطلع کیا کہ اسٹیشن پر ملو۔ وہ اسٹیشن پہنچے تو قاضی صاحب کو پولیس کی حراست میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مارشل لا، کا دَور تھا۔ اِس دَور میں یہ گرفتاری اور قاضی صاحب کا بڑھاپا، سب مسائل آنکھوں کے سامنے آگئے۔

قاضی صاحب تو پنڈی جیل چلے گئے۔ خواجہ عبدالقدوس راولپنڈی پہنچے، مولانا غلام اللہ خاں اور مولانا عبدالحکیم سے ملے۔ ان دنوں اللہ نواز خاں ترین' ایس۔ ایس۔ پی راولپنڈی تھے۔ ان سے ملاقات کی معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں موجودہ حکومت کو "لاش" کہا ہے۔ اس لئے ان کی گرفتاری عمل میں لائی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کو بتایا گیا کہ قاضی صاحب کو سمجھائیں، اب بڑھاپا آچکا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مارشل لا کا دور ہے۔ خدارا اپنے اوپر رحم کریں۔ خواجہ صاحب، قاضی صاحب سے ملے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ لفظ "لاش" پر مقدمہ قائم کیا گیا ہے، لیکن اُن کا خیال تھا "میں نے اپنی کسی تقریر میں موجودہ حکومت کے متعلق "لاش" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ البتہ مختلف مقامات پر مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ قاضی صاحب! موجودہ حکومت (صدر ایّوب کی) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ تو میں نے ایک ہی جواب دیا کہ اگر اس کا مقابلہ سابقہ حکومتوں سے کرتے ہو، تو یہ بہتر ہے۔ لیکن اگر اس کا تقابل خلفائے راشدین کے عہد سے کرتے ہو تو یہ اس کے مقابلہ میں "لاشئے" (کچھ نہیں) ہے۔ یہی جواب میں نے راولپنڈی میں بھی

دیا تھا۔ قاضی صاحب نے کہا ہو سکتا ہے کہ "پڑھے لکھے" رپورٹر نے "لاشئے" کی جگہ "لاش" لکھ دیا ہو"۔ خواجہ عبدالقدوس صاحب بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ لاہور پہنچے۔ میاں محمود علی قصوری اور مولانا مظہر علی اظہر سے ملے۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ گرفتاری کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جائے۔ کیونکہ یہ گرفتاری رپورٹر کی غلطی کی وجہ سے غیر قانونی طور پر عمل میں لائی گئی ہے۔

چنانچہ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ ایس۔ ایس۔ پی سے ملے۔ وہ حیران رہ گئے۔ تقریر کا اصل مسوّدہ منگوایا گیا۔ اور سرخ پنسل سے نشان زدہ اقتباس نکالے۔ تو رپورٹنگ میں لفظ "لاش" لکھا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے ترین صاحب سے کہا، ذرا اس کا سیاق و سباق ملاحظہ فرمالیں۔ جب انہوں نے ساری تقریر پڑھی تو وہاں "لاش" کا استعمال ہی عجیب نظر آیا۔ فوراً ڈی۔ سی سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ سابقہ ڈی۔ سی نئے ڈپٹی کمشنر کو چارج دے رہا تھا۔ جب گرفتاری، تقریر کی رپورٹنگ اور اس کا سیاق و سباق سمجھایا گیا اور ہوم سیکرٹری تک بات پہنچی تو سب "عقلمندوں" نے ایک بے گناہ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ قاضی صاحب پندرہ دن کی غیر قانونی گرفتاری کے بعد رہا ہو گئے۔ قاضی صاحب تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ پہلے حکومتوں پر تنقید کر کے گرفتار ہوتا تھا، اس دفعہ حکومت کی تعریف کر کے گرفتار ہوا۔

قیدوبند کی صعوبتیں

علّامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مُشکِ ازفر چیز کیا ہے، اِک لہو کی بوند ہے
مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت، مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام وقفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ وزغن دربند قید وصید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز وشاہیں کردہ اند

علامہ مرحوم نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں اس وقت لکھی، جب تحریکِ خلافت شباب پر تھی اور مسلمانانِ ہند اپنے ترکی بھائیوں کی حمایت میں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس ہونے کے لئے زور شور سے حصّہ لے رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی حریت پسند جماعت کے کردار پر تبصرہ کیا جائے گا تو علامہ مرحوم کے ان اشعار کو بطور ہیڈ نوٹ (HEAD NOTE) پیش کیا جاوے گا۔ مجلسِ احرارِ اسلام میں شاید ہی بڑے راہنما سے لے کر ادنیٰ رضاکار تک کوئی فرد ایسا ہو، جس نے فرنگی آقاؤں کے اقتدار کے خاتمہ کے لئے بڑی سے بڑی آزمائش پر لبیک نہ کہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچا احراری بن ہی نہیں سکتا جب تک وہ جیل نہ ہو آیا ہو۔ یہ جذبہ کس طرح پیدا ہوا

یہ ایک طویل داستان ہے۔ بہرحال احراریوں کے لئے جیل جانا ایسا ہی تھا جیسا ایک انسان کھیل کھیلنے گھر سے باہر نکلا ہو کر تفریح کے بعد واپس آجائے گا۔

ہم لکھ آئے ہیں کہ احرارِ اسلام سے متعلق ہر فرد اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ وہ چونکہ فرنگی اقتدار کے خلاف سینہ سپر ہو کر حق و صداقت کی آواز بلند کر رہا ہے، اس لئے وہ جہاد کر رہا ہے اور جہاد پر ایک سچا مسلمان سب کچھ قربان کر دینے کے جذبہ سے سرشار ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے جیل کی کال کوٹھڑی (CELL) کوئی ایسا ہوّا نہیں تھا جس میں جانے سے وہ خوفزدہ ہوتے ہوں۔ اس لئے جب مخالفین، احرار راہنماؤں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ ختمِ نبوّت میں حکومتِ وقت سے معافی مانگ لی تھی، اس لئے انہیں رہا کر دیا گیا تھا تو میں اسے کسی دلیل سے رد کرنے کی بجائے، ان کی عقل پر صرف قہقہہ لگانا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ یا تو احرار کو سمجھے ہی نہیں۔ یا اگر سمجھے ہیں تو وہ احرار کو اپنے اوپر محمول کرتے ہیں۔ بھلا جو جماعت ایک ایسے گروہ کی اپنے آپ کو وارث سمجھتی ہو جس نے ۱۸۵۷ء ہی سے انگریز کے خلاف تلوار سے جہاد کو فرض قرار دے دیا تھا اور ہندوستان کو دارالحرب، اور جس جماعت کے راہنما سے لے کر رضا کار تک نے ایک سال سے لے کر بیس سال تک انگریز کے ظلم و ستم اور جبر و قہر کا شکار رہ کر بھی حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا ہو، وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی حکومت میں ایک مقدّس تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل جا کر کیوں کر معافی مانگ سکتا ہے۔ احراری لیڈر، خانِ اعظم اور سرحد کے مردِ آہن خان عبدالقیوم خان کے پیروکار تو نہیں تھے جو پہلی مرتبہ جیل جاتے ہی' بائیس میل لمبا جلوس نکالنے کے وزن پر' بائیس انچ لمبا معافی نامہ لکھ دینے پر تیار ہو گیا ہو۔ وہ تو اس امام کے مقلّد تھے جس کا جنازہ جیل سے نکلا تھا۔ وہ اُس "سیّد" سے عقیدت رکھتے تھے جس نے انگریز کے خلاف جہاد کو عینِ اسلام قرار دیا تھا۔

قاضی صاحب اوائل عمر ہی میں چونکہ حضرت امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ

بخاریؒ کے دستِ حق پر بیعت کر چکے تھے۔ اس لئے انہیں بھی "دار و رسن کے اسرار و رموز" سے آگاہ ہونا پڑا۔ اس "کوچۂ رقیباں" سے نہ صرف یہ کہ وہ آشنا ہی ہوئے بلکہ اسی کے ہو کر رہ گئے اور زندگی کے سات آٹھ سال انہوں نے جیل میں گزار دیئے۔ جیل کی زندگی میں انہیں دو مرتبہ سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلی مرتبہ جب مجلسِ احرارِ اسلام نے جنگِ عظیم دوم کے وقت فوجی بھرتی کے خلاف محاذ کھولا اور قاضی احسان احمد کو پہلا ڈکٹیٹر منتخب کیا تو سکندر حیات نے دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف کے تحت قاضی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ دیگر احرار راہنماؤں کو بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا۔ قاضی صاحب کو ڈیرہ اسماعیل خاں جیل بھجوا دیا گیا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں جیل میں اُنہیں "سی" کلاس میں رکھا گیا اور وہ سختیاں کی گئیں کہ اُن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جون و جولائی کی انتہائی شدید گرمی میں ڈیرہ اسماعیل خاں جیل میں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا، جس سے نہ صرف مختلف سیاسی راہنما چیخ اُٹھے، بلکہ قومی پریس بھی صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ روزنامہ "پرتاپ" لاہور نے اپنے اداریہ مؤرخہ ۳؍ دسمبر ۱۹۳۹ء میں بعنوان "احرار سے سلوک" درجِ ذیل شذرہ سپردِ قلم کیا۔

"سر سکندر حیات ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت احرار کو پکڑ پکڑ کر جیل میں ڈال رہے ہیں۔ اُن کا شاید ہی کوئی لیڈر اس وقت باہر ہو گئی سزا یاب ہو چکے ہیں، اور سزائیں بھی معمولی نہیں۔ کئی کئی سال قید۔ یہ سزا واجب ہے یا غیر واجب، اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، جبتک کہ متعلقہ کاغذات سامنے نہ ہوں۔ لیکن ایک بات تو پوچھ سکتا ہوں کہ احرار کے ساتھ سیاسی قیدیوں کا سا سلوک کیوں نہیں ہو رہا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ پولٹیکل قیدی نہیں وہ صحیح معنوں میں پولٹیکل قیدی ہیں۔ ان کا عمل کسی کے خیال میں غلط ہو سکتا

ہے، لیکن اس میں کوئی ذاتی غرض ہے نہ اخلاقی گراوٹ۔ وہ جیل کو دعوت دے رہے ہیں تو اپنے خیال میں اپنے مذہب اور ملک کی خدمت کے لئے۔ وہ آج وہی کر رہے ہیں جو کل شاید کانگریسیوں کو کرنا پڑے۔ سر سکندر شوق سے انہیں جیل میں ڈالیں لیکن اُن سے ایک بہادر دشمن کی طرح تو پیش آئیں۔ میرا دھیان اس سلوک کی طرف دلایا گیا ہے جو قاضی احسان احمد اوّل ڈکٹیٹر آل انڈیا مجلسِ احرار کے ساتھ جیل میں ہو رہا ہے۔ انہیں "سی" کلاس میں رکھا گیا ہے جس سے وہ دو ماہ کے عرصہ میں اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ دوست بھی اُنہیں پہچان نہیں سکتے۔ اس سے پہلے وہ پانچ چھ بار قید ہو چکے ہیں اور اُنہیں بی کلاس دی جاتی رہی ہے۔ اس بار سی کلاس کیوں؟ جانتا ہوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں گورنمنٹ پنجاب کی باگ ڈور ہے اُن کی ذہنیت پُرانی نوکر شاہی کی سی ہے۔ اس لئے وہ پولٹیکل قیدیوں کے ساتھ کسی امتیازی سلوک کے روادار نہیں۔ وہ تو اے یا بی کلاس اُسے دیں گے جن کی دنیاوی حیثیت اچھی ہو، چاہے وہ بدترین اخلاقی جُرم کا مرتکب کیوں نہ ہو، لیکن جب قاضی صاحب کو پہلے پانچ بار بی کلاس دی گئی تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی دنیاوی حیثیت اس کلاس کی سی ہے؟ وہ ایک معزز خاندان کے ممبر ہیں۔ ایک شاہی مسجد کے امام ہیں، مسلمانوں کی مذہبی یونیورسٹی کے سند یافتہ ہیں۔ جمعیت العلماء ہند کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر ہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی ملتان کے صدر رہے ہیں۔ اگر وہ بھی اعلیٰ کلاس کے مستحق نہیں تو اور کون ہوگا۔ اُن کی ایک خوبی یا نقص یہ ہے کہ وہ سکندر وزارت کے بہادر مخالف ہیں۔ اُنہوں نے کالے بلوں کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔"

علاوہ ازیں شجاع آباد کے ہندو مسلم نے متحد ہو کر سکندر وزارت کے ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی کہ قاضی احسان احمد عام آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی اخلاقی مجرم ہیں کہ انہیں "سی" کلاس میں رکھا جائے اور جون جولائی کی شدید گرمی میں ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل میں قید تنہائی کی سزا دی جائے۔

شجاع آباد کے مسلم ہندو راہنماؤں، میونسپل کمیٹی کے وائس چیئرمین، ارکان، اور پنجاب اسمبلی کے متعدد ممبروں نے بیک زبان چیف منسٹر پنجاب کے ذریعہ سرحد کے گورنر کو تحریری درخواست پیش کی کہ قاضی صاحب کو اُن کی حیثیت کے مطابق "اے" یا "بی" کلاس دی جائے۔ درخواست انگریزی میں ہے جس کی فوٹو سٹیٹ کاپی پیش خدمت ہے۔ یہاں اُردو ترجمہ دے دیا گیا ہے۔

To

His Excellency
the Governor, N.W.F.P.
Peshawar.

Through Hon'ble the Chief Minister,
Punjab.

Sir,

We the undersigned want to bring to your kind notice the following facts:-

Qazi Ahsan Ahmad a resident of Shujabad - District Multan is being tried under Section 124-A/153-A I.P.C. at Dera Ismail Khan N.W.F.P., We have been given to understand that during the trial he was kept in a solitary cell in the month of July without fan or anyother convenience in the intense heat of D.I.Khan and his - application for A or B class was rejected by the trying Magistrate. We hear that the Qazi Sahib's health has suffered considerably due to the treatment meted out to him in the jail and it was on his breakdown that the - Sessions Judge released him on bail. We want to bring to His Excellency's notice that the Qazi Sahib comes from

a very respectful family. He is the Imam of Shahi Masjid and veeld considerable influence in the Province. His family status is such as to entitle him to A or B class.

His Excellency humble Petiti

بخدمت جناب عزت مآب گورنر شمال مغربی سرحدی صوبہ

بوساطت

عزت مآب چیف منسٹر صاحب پنجاب

جناب عالی

ہم دستخط کنندگان جناب کی توجہ مندرجہ ذیل حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ "قاضی احسان احمد ساکن شجاع آباد ضلع ملتان زیر دفعات ۱۲۴ الف، ۱۵۳ الف تعزیرات ہند ڈیرہ اسماعیل خاں (شمال مغربی سرحدی صوبہ) میں محبوس ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دوران سماعت مقدمہ انہیں کال کوٹھڑی میں قید تنہائی کی صورت میں ڈیرہ اسماعیل خاں کی شدید گرمی میں ماہ جولائی میں بغیر پنکھے اور دیگر سہولتوں کے رکھا گیا ہے۔ نیز اُن کی درخواست برائے "اے یا بی" کلاس کی متعلقہ مجسٹریٹ نے مسترد کر دی ہے۔ ہمیں یہ سُن کر تشویش ہوئی ہے کہ قاضی صاحب کی صحت جیل میں جارحانہ سلوک کی بنا پر خاصی متاثر ہو چکی ہے اور یہ حقیقت اس کی خطرناک حالت کی غمازی

کرتی ہے کہ سیشن جج نے انہیں ضمانت پر وقتی طور پر رہا کر دیا۔

ہم جناب کے حضور یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ قاضی صاحب ایک معزز خاندان سے متعلق ہیں۔ وہ خاندانی طور پر اس حیثیت کے حامل ہیں کہ اُنہیں جیل میں "اے یا بی" کلاس دی جائے۔"

دستخط کنندگان

منشی رام میونسپل کمشنر شجاع آباد، محمد علی میونسپل کمشنر شجاع آباد،.... لال ٹھاکر پلیڈر میونسپل کمشنر شجاع آباد، مرید حسین ایم۔ایل۔اے، سیّد ولایت حسین ایم۔ایل۔اے (پنجاب)، مخدوم زادہ سیّد محمد...... گیلانی ایم ایل اے پرتاپ سنگھ صدر میونسپل کمیٹی شجاع آباد، محمد انور وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی شجاع آباد، شمس الزماں میونسپل کمشنر شجاع آباد۔

اس ملک گیر احتجاج کے بعد پنجاب گورنمنٹ مجبور ہو گئی کہ قاضی صاحب کو یا تو رہا کر دے یا جیل میں اُنہیں بہتر کلاس دے، چونکہ جن جرائم کے تحت ان پر مقدمہ چل رہا تھا وہ حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں حصّہ لینے اور حکومت کے خلاف اشتعال دلانے کے الزامات کے تحت دفعات میں آتے ہیں۔ نیز ان دنوں ہندوستان جنگ کی لپیٹ میں آچکا تھا، اور مجلسِ احرارِ اسلام واحد سیاسی جماعت تھی جس نے فوجی بھرتی کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جہاد کر دیا تھا۔ اور جگہ جگہ جلسے اور احتجاجی قرار دادیں پاس کی جا رہی تھیں، جب کہ مسلم لیگ تعاون پر آمادہ تھی اور کانگرس بھی حکومت کی ہمنوا تھی۔ اس لئے احرارِ اسلام کا یہ جرأتمندانہ اقدام گورنمنٹ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ قاضی احسان احمد چونکہ پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے تھے، اس لئے حکومت دیگر احرار راہنماؤں کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب پر جس قدر سختیاں کر سکتی تھی، اُس نے کیں جسے احرار راہنماؤں نے بخوشی قبول کیں۔

قاضی صاحب کے حق میں پنجاب اسمبلی کے متعدد ممبران، اخبارات کے اداریوں اور

ملک بھر سے صدائے احتجاج نے حکومتِ پنجاب کو مجبور کر دیا کہ وہ قاضی صاحب کو جیل میں "بی" کلاس دیدے چنانچہ حکومتِ پنجاب نے اپنی چٹھی نمبر ۱۱۱۰۸/۴۰ - JL - ۹۸۵ مورخہ ۸-۳-۱۹۴۰ کو ان کے لئے جیل میں "بی" کلاس دینے کا اعلان کیا۔ اصل چٹھی انگریزی میں ہے جس کی فوٹوسٹیٹ کاپی پیش خدمت ہے۔ آخر میں اردو ترجمہ درج کر دیا گیا ہے۔

حکومتِ پنجاب چٹھی نمبر ۹۸۵ - جے ایل - ۱۱۱۰۸/۴۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۴۰ء

بنام: انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات، پنجاب۔

عنوان: ملزم نمبر ۹۲۵۳ قاضی احسان احمد ولد قاضی محمد امین کی کلاسیفیکیشن۔

آپ کی چٹھی نمبر ۱۶۲ - سی/۴۴ - پی آر مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۰ء مندرجہ عنوان پر مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ گورنر پنجاب نے بمسرت قیدی نمبر ۹۲۵۳ قاضی احسان احمد کو "بی" کلاس قیدی قرار دے دیا ہے۔

نمبر ۳۱۱ - سی مورخہ ۹ مارچ ۱۹۴۰ء

نقل سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کو برائے اطلاع بابت اس کی چٹھی نمبر ۱ - سی مورخہ ۵ فروری ۱۹۴۰ء کے مطابق ارسال کی گئی۔

دستخط انگریزی

سپرنٹنڈنٹ برائے

انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات پنجاب

تصدیق شد

دستخط کیپٹن آئی - اے

سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی

Punjab Government letter No.985-JL.40/11108 dated the 8th March 1940 to the Inspector General of Prisons Punjab.

....

Subject Classification of convict No.9253 Qazi Ahsan Ahmad son of Qazi Mohammad Amin.

With reference to your letter No.162-C/44-Pr dated the 8th February 1940, on the subject noted above, I am directed to say that the Governor of the Punjab has been please to classify prisoner No.9253 Qazi Ahsan Ahmad as a 'B' Class prisoner.

....

No.311-C

Dated the 9th of March 1940.

Copy forwarded to the Superintendent, District Jail Rawalpindi, for information, with referance to his latter No.1-C, dated 5/2/40.

Sd
Superintendent
for Inspr.Genl.of Prisoners.Pb

Attested [signature]

Captain I.A.,
Superintendent,
District Jail, Rawalpindi.

تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران جیل میں ایک بار پھر قاضی صاحب آزمائش میں مبتلا ہو
گئے۔ یہ آزمائش دوہری نوعیت کی تھی۔ حکومت کی خواہش تھی کہ تحریکِ ختمِ نبوت کی تمام تر
ذمہ داری چند افراد پر ڈال دی جائے، جن میں قاضی صاحب بھی شامل تھے تاکہ ان ذمہ دار

راہنماؤں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت غیر معینہ عرصہ کے لئے نظر بند رکھا جاسکے۔ مگر جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، اُسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرح حکامِ بالا کی یہ سازش اپنی موت آپ مر گئی۔ قاضی صاحب اور ان کے احباب صاف بچ گئے۔

قاضی صاحب اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کا کوئی حقیقی بھائی نہ تھا۔ صرف ایک بہن تھی۔ بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا قاضی صاحب تھے۔ جب قاضی صاحب گرفتار ہوئے تو بوڑھا والد اب تک تو اکلوتے بیٹے کی گرفتاریوں، نظر بندیوں اور مقدمہ بازیوں کو سہتا چلا آرہا تھا۔ مگر جب قویٰ نے جواب دیدیا اور عمر کے اس حصّہ میں پہنچ گئے جہاں انسان خالقِ حقیقی سے ملنے کی خاطر مکمل آرام چاہتا ہے تو بیٹے کی گرفتاری ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اسی طرح قاضی صاحب کی والدہ بھی اب چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں۔ ادھر قاضی صاحب خود نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ البتہ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں تھیں۔ ان حالات میں آپ کے والد قاضی محمد امین کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ نہ صرف ذمّہ داریوں میں اضافہ ہوا بلکہ بیٹے کی جدائی اور فراق نے بھی دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا، اور وہ اکلوتے بیٹے، بڑھاپے کی پونجی، اور زندگی کے آخری سہارے کے لئے تڑپ کر رہ گئے۔ اوّل اوّل جیل میں ملاقات کے لئے جاتے رہے بعض اوقات ملاقات کی اجازت مل جاتی، لیکن بسا اوقات بیٹے سے ملاقات کی تڑپ و حسرت لے کر واپس آجاتے۔

قاضی صاحب ۲۷، ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب گرفتار ہوئے شجاع آباد سے اُنھیں گرفتار کر کے نیو سنٹرل جیل ملتان لایا گیا۔ تقریباً اٹھارہ روز بعد قاضی صاحب کے والد مرحوم نے ایک درخواست ڈپٹی کمشنر ملتان کو لکھی کہ مجھے میرے بیٹے سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔

اس ملاقات کی روئیداد خود قاضی صاحب سُنایا کرتے تھے کہ جب جیل کی سلاخوں

سے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا تو دل بھر آیا۔ میں نے ضبط کیا مگر باپ کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ اور مجھے "چاند چاند" کہہ کر سلاخوں کے درمیان گلے سے لگا لیا۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ دل کو دھکا سا لگا اور باپ کی مغموم صورت، جسمانی نقاہت اور حزن و ملال کے آثار دیکھ کر معاً دل میں خیال آیا کہ میری گرفتاری کا اثر والد کے جسم و روح میں داخل ہو چکا ہے، خدا خیر کرے۔

باپ، بیٹے سے ملنے کے بعد گھر واپس لوٹے۔ بڑھاپے میں بیٹے کی جدائی کی وجہ سے قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس لئے بستر پر دراز ہو گئے۔ دل کی بیماری نے جسم کو دبوچ لیا، اور یوں قاضی محمد امین موت کا انتظار کرنے لگے۔ بعض "دوستوں" نے اس پر ستم یہ کیا کہ مشہور کر دیا کہ قاضی احسان احمد کو پھانسی دے دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس خبرِ وحشت کا اثر کس قدر دلِ امین پر پڑا ہوگا۔

آخر باپ کی حالت زیادہ بگڑ گئی اور وہ وفات پا گئے۔ چند دوستوں نے مسلم لیگ کی حکومت کے "شریف اور نیک نام" وزیر اعظم الحاج خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ملتان کے خواجہ عبد القدوس، وزیر اعظم سے ملے، اور اُن سے تمام حالات بیان کر کے قاضی صاحب کے والد کی وفات کی خبر دے کر، قاضی صاحب کو صرف ایک دِن کے لئے پیرول پر رہا کرنے کی درخواست کی۔ تاکہ اکلوتا بیٹا اپنے باپ کے کفن دفن میں شریک ہو سکے۔ اور زرِ ضمانت (CASH SECURITY) کے طور پر ایک لاکھ روپے تک جمع کرانے کی پیش کش کی۔ مگر شریف و رحمدل وزیر اعظم نے ختمِ نبوت کے سپاہی قاضی احسان احمد کو صرف ایک دن کے لئے اپنے باپ کے جنازہ میں شرکت کی اجازت دینے سے انکار کر کے نہایت سفاکی، درندگی اور بربریت کا ثبوت دیا، اور اس طرح قاضی صاحب اپنے والد کے جنازہ میں بھی شرکت نہ کر سکے۔ اس کے برعکس اُنہیں دِنوں جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا عبد الحامد بدایونی مرحوم کی والدہ فوت ہو گئیں تو ناظم الدین حکومت نے

بلیٹ دن کے لئے مولانا بدایونی کو پیرول پر رہا کرنے کی اجازت "بخوشی" عطا فرما دی۔ یہ معمہ آج تک حل نہ ہو سکا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ قاضی صاحب کے ساتھ سنگ دلی اور درندگی کی حد کر دی گئی جبکہ مولانا بدایونی کے ساتھ محبت کی انتہا کر دی۔

غرض قاضی صاحب کے لئے جیل میں، باپ کی وفات، ماں کی بے لبسی اور اپنی بے کسی ایک ناقابلِ برداشت مرحلہ تھا جس کی وجہ سے دِل کا دورہ پڑا، اور پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت میں جب پہلی دفعہ جیل سے رہا ہوئے تو اپنے ساتھ دل کی بیماری ساتھ لائے جو تا دمِ زیست رہی۔ یہ اُس صدمہ جانکاہ کا اثر تھا جو قاضی صاحب کو ناظم الدین وزارت نے جیل کے اندر پہنچایا تھا۔

چنانچہ علامہ طالوت نے باپ کی وفات پر اس کے اکلوتے بیٹے کی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کیا اور چند اشعار کہے جو قاضی صاحب کے والد کی قبر پر آج بھی کندہ ہیں۔

مومن پاک دل امین و شجاع — قاضیٔ وقت، حاکمِ باطن
جس کا بیٹا خطیبِ پاکستان — جس کا احسان، قوم کا ضامن
اس کا جب وقتِ آخری پہنچا — اس کا احسان قید تھا اس دن
ہاتفِ غیب نے، کہی تاریخ — مصرعِ آخری میں دیکھو سن

لختِ دل اس کا گو رہا نہ ہوا

قیدِ غم سے، رہا ہوا مومن (طالوت)

قاضی صاحب کی آزمائش یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ انہیں ایک اور آزمائش سے ابھی دوچار ہونا تھا۔ ہم سطورِ بالا میں لکھ آئے ہیں کہ حکومت کی خواہش تھی کہ تحریکِ ختمِ نبوت کی تمام تر ذمہ داری قاضی صاحب پر ڈال دی جائے اور انہیں رہا نہ کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ والد کی وفات پر پیرول پر رہا کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اب جیل کے حکام نے ایک اور گہری سازش تیار کی کہ قاضی صاحب کو جان سے مار دیا جائے۔

کیونکہ ریکارڈ کی جانچ پڑتال کر کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اگر کچھ آیا تو مواد جو قاضی صاحب نے وقتاً فوقتاً حکامِ بالا کو قادیانیوں کی سازشوں کے سلسلہ میں بھیجا تھا۔ اس انکشاف پر قادیانیت بوکھلا گئی۔ اب ایک اور چال چلی گئی۔ وہ یہ تھی کہ قاضی صاحب کو زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ اب اس زہر میں مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی شریک کیا گیا۔ چنانچہ دونوں حضرات کو دست و قے شروع ہو گئی۔ جیل میں سب کو پتہ چل گیا کہ مولانا احمد علی اور قاضی صاحب کو زہر دیدیا گیا ہے۔ بعد میں یہ معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔

حکومت اپنی تمام سازشوں میں بے نقاب ہو گئی اور ناکامی کو دیکھ کر قاضی صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ جب آپ واپس شجاع آباد پہنچے تو آپ کا زبردست استقبال کیا گیا۔ آپ سیدھے اپنے والد کی قبر پر پہنچے اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ بعد میں اپنے گھر آئے اور بچوں سے ملے۔

جیل سے رہائی کے بعد آپ خاموش گھر میں نہیں بیٹھ گئے بلکہ جب عدالتی انکوائری شروع ہوئی تو تمام اکابر کی نگاہ آپ پر پڑی کہ آپ ہی اسلام کے کیس کی بہترین وکالت کر سکتے ہیں، کیونکہ حوالہ کے لئے جس کتاب اور اخبار کی ضرورت پڑتی وہ کتاب کسی دوسری لائبریری میں ہو یا نہ ہو، مگر قاضی صاحب کے ہاں وہ حوالہ بہرصورت مل جاتا۔ اس کی تفصیل تحریکِ ختمِ نبوت کے باب میں پیش کر دی گئی ہے۔

معرکہ ہائے خطابت

برصغیر پاک و ہند میں جس قدر خطیب اور شعلہ مقال مقرر مجلس احرارِ اسلام نے پیدا کئے ہیں کوئی جماعت نہیں کر سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادیٔ وطن کے سلسلہ میں ہر خطیب ایک آتش فشاں پہاڑ کی مانند تھا، جب پھٹتا تو فرنگی اقتدار میں زلزلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ان خطیبوں کو قدرت نے زبان و بیان پر اس قدر دسترس بخشی تھی کہ مخالف انگشت بدنداں رہ جاتے۔ چنانچہ کسی تحریک میں جان پیدا کرنا خطبائے احرار کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ سرحد کے مشہور لیڈر خان غلام محمد خان لونڈخور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تقریریں سننے کے خاص شوقین نہیں ہیں مگر انہوں نے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی سحر آفرینی اور جادو بیانی کی بڑی دھوم سن رکھی تھی۔ ایک رات قدرتی طور پر وہ لاہور ہی میں تھے۔ معلوم ہوا کہ آج رات شاہ صاحب دہلی دروازہ کے باہر ایک جلسۂ عام سے خطاب کریں گے۔ چنانچہ خان صاحب اس نیت سے جلسہ گاہ میں پہنچے کہ تھوڑی دیر تقریر سن کر واپس آ جاؤں گا۔ شاہ صاحب نے تقریر شروع کی۔ خان صاحب ایسے مست ہوئے کہ انہیں واپس جانا یاد ہی نہ رہا اور جب صبح کی اذان کی آواز گونجی، تو احساس ہوا کہ ساری رات کھڑے کھڑے گذار دی۔

غرض قدرت نے چونکہ مجلس احرارِ اسلام سے دینی خدمات وافر صورت میں لینی تھیں، اس لئے مجلس کے ہر خطیب کی زبان جادو کا سا اثر رکھتی تھی۔ جماعت میں حضرت قاضی صاحب کو شاہ صاحب کی خطابت کی "کاپی" کہا جاتا تھا۔ کیونکہ قاضی صاحب خطابت

اور اندازِ بیان میں حضرت شاہ صاحب کی "کاپی" تھے۔ میرے اس استدلال کی تصدیق دو مثالوں سے واضح ہے۔ اولاً جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو اُن کی وفات کے بعد ۸، ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو بیرون موچی دروازہ لاہور میں ایک عظیم الشان ختمِ نبوّت کانفرنس ہوئی، جس میں شیخ حسام الدینؒ، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا محمد علی جالندھری اور دیگر زعماء موجود تھے۔ سب کی متفقہ نگاہ انتخاب آپ پر پڑی اور آپ کو تحفّظِ ختمِ نبوّت کا امیر چُن لیا گیا۔ اب تک شاہ جی کے بعد عارضی امارت کے فرائض مولانا محمد علی جالندھری انجام دیتے چلے آرہے تھے۔ ثانیاً حضرت قاضی صاحب کی وفات پر اخبارات کے اداریئے، مضامین اور تبصروں میں "جانشینِ بخاری" کے نام سے قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، اگرچہ امیرِ شریعت سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کے فرزندانِ گرامی حضرت مولانا سیّد عطاء المنعم بخاری اور ان کے برادران موجود ہیں، تاہم خطابت کی نسبت سے جماعت میں قاضی صاحب کو شاہ صاحب کی جانشینی کا شرف حاصل ہے۔

میرے نزدیک ایک کامیاب خطیب وہ ہے جو الفاظ کی روانی، ان کے جائز استعمال اور اُس زبان پر، جس میں وہ خطیب ہے، پوری طرح قدرت اور دسترس رکھتا ہو۔ مجمع پر پورا کنٹرول حاصل ہو، سامعین کو بور نہ ہونے دے، ان کو ہنسائے، رلائے اور جذبات میں اس حد تک لے جائے کہ اُن سے جو چاہے، کرا لینے کی طاقت رکھتا ہو۔ آپ قاضی صاحب کی تقریر سُنتے جائیں، بات سے بات نکلتی چلی جائے گی، بر وقت اور مناسب اشعار پڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ اشعار عربی، فارسی، اردو، پنجابی، سندھی اور ملتانی میں ہوں گے۔ پھر کسی ایک شاعر کے نہیں بلکہ قدیم و جدید شعراء کے الگ الگ اشعار ان کے نام لے کر پڑھتے چلے جائیں گے۔ تقریر میں مذہب و سیاست کی چاشنی کچھ اس طرح ہوگی کہ سامعین جھوم اُٹھیں گے۔ میں قاضی صاحب کو علمی لحاظ سے کوئی بلند پایہ

عالمِ دین نہیں سمجھتا مگر بلند پایہ خطیب ضرور سمجھتا ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان نے قاضی صاحب کی ایک تقریر سے مسحور ہو کر یہ کہا تھا کہ قاضی صاحب آپ تو خطیبِ پاکستان ہیں۔ اس کے بعد زندگی بھر قاضی صاحب کو خطیبِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہاں یہ نکتہ نہ صرف تعجب انگیز ہے بلکہ عقل وخرد اس کی حکمت معلوم کرنے سے نا آشنا ہے کہ السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو جو لقب متکلّمِ اسلام مولانا السیّد انور شاہ کشمیری کی زیرِ قیادت شیر انوالہ جلسہ عام میں پانچ صد جیّد علماء نے متفقہ طور پر "امیرِ شریعت" عطا کیا تھا وہ عطاء اللہ کے نام عطاءِ الٰہی بن گیا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں میں سے بھی کسی نے اپنے کسی بزرگ کے ساتھ "امیرِ شریعت" کا لقب چسپاں نہیں کیا ورنہ حضرت شاہ جی سے بڑے بڑے متکلّمین اسلام اور زاہد شب زندہ دار بھی تھے مگر "امیرِ شریعت" کے لقب سے دنیائے اسلام میں عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کو یاد کیا جائے گا۔ امیرِ شریعت کا لفظ آتے ہی دوست دشمن کے سامنے شاہ جی کی تصویر آجاتی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ کسی کانفرنس یا جلسہ میں اگر قاضی صاحب مدعو نہیں ہیں تو وہ کانفرنس اور جلسہ پھیکا پھیکا سا لگتا تھا۔ قاضی صاحب کیا آتے کہ خزاں پہ بہار آجاتی۔ عام طور پر ان کی تقریر آخری اجلاس میں ہوا کرتی یا پھر کسی وزیر یا افسر کی صدارت میں قاضی صاحب کی تقریر کا پروگرام رکھا جاتا، کیونکہ جو باتیں قاضی صاحب وزیر یا کسی ذمہ دار افسر کی موجودگی میں اپنی خداداد صلاحیّت اور حکمتِ عملی کے پیشِ نظر کر سکتے تھے وہ کسی دوسرے مقرر کے بس کی بات نہ تھی۔ آپ نے صدرِ مملکت سے لے کر ایک عام شہری تک کی زیرِ صدارت تقریریں کیں اور کراچی ڈھاکہ، لاہور، پشاور، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دہلی سے لے کر عام دیہاتوں تک خطابت کے جوہر دکھائے۔ وہ ہر جگہ، ہر مقام اور ہر مجلس میں نہایت کامیاب و سرخرو رہتے۔ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ موقع ومحل کے مطابق بات کرتا اور بات کو نبھانا جانتے تھے۔ اس لئے

مَیں سمجھتا ہوں کہ خطیب کو زبان و بیان پر دسترس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طور پر بھی ماہر ہونا چاہیئے۔ جو خطیب سامعین کی نفسیات کو نہیں سمجھتا وہ کامیاب خطیب نہیں کہلا سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک مشہور خطیب شاہی مسجد کروڑ پکا میں ہمارے مدرسہ کے سالانہ جلسہ پر خطاب کر رہے تھے۔ قاضی صاحب اسٹیج پر موجود تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ خطیب صاحب بڑے اچھے اور علمی انداز میں تقریر کر رہے تھے اور موضوع کو خوب نبھا رہے تھے، مگر مجمع سُن تھا اور لوگ اُٹھ کر آہستہ آہستہ جانے لگے۔ میں نے اُس وقت اعلان کیا کہ مفصّل تقریر تو رات کو ہوگی البتہ چند لمحات کے لئے حضرت قاضی صاحب تمہیدی کلمات بیان فرمائیں گے۔ بس پھر کیا تھا، لوگ جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ جونہی خطیب صاحب کی تقریر ختم ہوئی اور قاضی صاحب نے مائیکروفون سنبھال کر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی پڑھا۔ شاہی مسجد کا وسیع و عریض صحن چند منٹوں میں بھر گیا، اور قاضی صاحب کی دس منٹ کی تقریر میں قہقہوں کے ساتھ سسکیوں کی آوازیں سنی گئیں اور فضا نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اُٹھی۔

اندازِ تقریر قاضی صاحب مرحوم ہمیشہ مختصر خطبہ جیسا سطور بالا میں آچکا ہے پڑھتے تھے۔ ایک مختصر آیتِ قرآن تلاوت کرتے اور اس کے بعد مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے یہ اشعار پڑھتے۔

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست — محمدؐ چشم بر راہِ ثنا نیست
محمدؐ از تو می خواہم خدارا — خدا از عشقِ مصطفیٰ را
خدا مدح آفرینِ مصطفیٰ بس — محمدؐ حامدِ حمدِ خدا بس

دورانِ تقریر یا پرائیویٹ مجلس میں، جب بھی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکرِ مقدّس زبان پر آتا، آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی، آواز بھرّا جاتی، زبان لڑکھڑانے لگتی اور قلب پر رقّت طاری ہو جاتی، سامعین وجد

میں آجاتے۔ مجھے دس سالہ عرصہ میں قاضی صاحب کی بیشمار نجی مجالس میں بیٹھنے اور سُننے کا اتّفاق ہوا۔ حضور علیہ السّلام کا ذکرِ مقدّس آتے ہی ان کی کیفیت عجیب ہو جاتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ تقریر یا نجی مجلس میں قہقہے بلند ہو رہے ہیں، مزاح اور لطیفہ گوئی زوروں پر ہے۔ اچانک ذکرِ رسول زبان پر آتے ہی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، آواز بھرّا جاتی ہے، استغفار پڑھتے ہیں اور زبان پر دُرود پاک کا وِرد شروع ہو جاتا ہے۔ مجلس فوراً سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب حد درجہ رقیق القلب تھے۔ زبان پر ذکرِ رسول آتے ہی چند سیکنڈوں میں آنسوؤں کی لڑی بندھ جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے الفاظ کے ساتھ آنسو بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ آپ جب بھی دُرود شریف تلاوت فرماتے، آخری الفاظ عموماً یہ ہوا کرتے تھے بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ اَلْفَ اَلْفَ مَرَّۃٍ۔

قاضی صاحبؒ کی تقریر کا ایک خاص انداز اور معمول تھا۔ جب مخالف پر تنقید کرتے تو اگرچہ ان کی طنز ہمیشہ بھرپور اور مزاح کا دلچسپ پہلو لئے ہوتی تھی، تاہم وہ کسی مخالف مولوی یا مقرر کا نام نہیں لیتے تھے، اور حتی الوسع بات اشارے اور کنائے میں کرتے۔ کسی کی دل آزاری ان کے مذہب میں شامل نہیں تھی، البتہ قادیانیوں کے متعلق ہر بات کو بیان کرنا اور بانی سلسلہ مرزا غلام احمد کے متعلق رازہائے درونِ پردہ سے نقاب کشائی کرنا ان کا عین ایمان تھا۔ آپ نے مسلمان فرقوں کے مابین ہمیشہ تشدّد و اشتعال انگیزی کی مذمت کی، یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کی تلقین کی۔ تقاریر میں بھی آپ نے فرقہ بازی کو مطعون قرار دیا اور مخالف کا نام تک لینے سے احتراز کیا۔

آپ کی ہر تقریر، مختلف اشعار سے مزیّن، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے آراستہ اور واقعات و حقائق سے لبریز ہوا کرتی تھی۔ مطالعہ کا ازحد شوق تھا اور یہ شوق اس حد تک تھا کہ کوئی اچھا رسالہ یا کتاب کسی کے ہاں مِل جاتی، اسے حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے میں ہر حربہ استعمال کر گزرتے تھے، چنانچہ آپ کی لائبریری میں دوسروں کی متعدد کتابیں

موجود ہیں۔ آپ اپنی تقریر سے قبل مطالعہ ضرور کرتے۔ یہ چیز آج کے خطیبوں میں یکسر مفقود ہے۔

قاضی صاحب اگرچہ دینی یا دنیاوی تعلیم میں کسی مدرسہ و یونیورسٹی سے باقاعدہ سند یافتہ نہیں تھے تاہم انہیں اردو، پنجابی، ملتانی، سندھی اور فارسی پر عبور حاصل تھا ان زبانوں کے روزمرہ کے محاورات، اصطلاحات اور اشعار، انہیں سینکڑوں کی تعداد میں ازبر تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ جو شعر بیس سال قبل پڑھا تھا، وہ بیس سال بعد سُن لیجئے اِن زبانوں کے بلند پایہ شعراء کا کلام بھی آپ کو یاد تھا۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور اکبر الٰہ آبادی کے کلام کا کثیر حصّہ آپ کو یاد تھا اور ایک ہی وقت میں وہ سینکڑوں اشعار بلا تکلف سُنا سکتے تھے۔ قدیم شعراء میں غالبؔ، حالیؔ، مومنؔ، ابراہیم ذوقؔ اور داغؔ دہلوی کے کئی اشعار انہیں یاد تھے۔ جدید شعراء میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور دوسرے شعراء کا کلام ازبر تھا۔ شیخ سعدیؒ اور خواجہ فریدؒ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔

ان کا تلفّظ صاف اور واضح تھا۔ وہ جب بھی کلام کرتے یا شعر سناتے تو ادائیگی کا انداز ایسا دلنشیں ہوتا، گویا معانی بھی بتلا رہے ہیں۔ زبان عام فہم تھی۔ اردو نہایت شستہ اور ادیبانہ بولتے۔ دورانِ تقریر جب وہ طنز و تنقید پر آتے تو زیادہ کھُلتے۔ تنقید و طنز میں اس قدر نشتر چبھوتے کہ مخالف کو ایک دفعہ تو چت ہونا پڑتا۔ ان کی تحریر میں بھی تقریر کا رنگ جھلکتا ہے اور طنز بھی موجود ہے۔ اس نسبت سے اگر وہ مضمون نگاری کی طرف رُخ کرتے تو شاید طنز میں وہی مقام حاصل کر لیتے جو اکبر الٰہ آبادیؒ کو اردو نظم میں حاصل تھا۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ اس باب کے آخر میں پیش کیا جا رہا ہے جو انہوں نے مولینا سید نور الحسن بخاری کی کتاب "عادلانہ دفاع" کے مقدمہ کے طور پر لکھی ہے۔ یہ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے مگر مولینا کی ساری کتاب کا خلاصہ ہے۔

تحریر سے گریز مجلس احرار اسلام کا شاید نصب العین رہا ہے۔ بیچارے چوہدری

افضل حق مرحوم اور حافظ علی بہادر اور اس طرح چند دوسرے حضرات نے انفرادی طور پر مختلف عنوانات پر اپنے رشحاتِ قلم پیش کئے ہیں اور ان تحریروں میں جماعتی رنگ بھی موجود ہے، تاہم کسی منصوبہ بندی کے تحت ان بزرگوں نے کتابیں نہیں لکھیں جس طرح آج کی بعض جماعتیں باقاعدہ تحریک کی صورت میں لٹریچر فراہم کر رہی ہیں۔ قاضی صاحب کی تقریروں میں خزاں کا پت جھڑ، بہار کی رنگت، آبشار کا بہاؤ، موسموں کا تغیر و تبدل، بجلی کی چمک، رعد کی کڑک، دریا کی روانی، ہوا کا چلاؤ، چاند کی ملاحت اور سورج کی تیزی شامل تھی۔ وہ سیلِ رواں کی طرح بولتے چلے جاتے۔ زبان میں اگرچہ معمولی لکنت تھی لیکن یہی لکنت تقریر میں لطف پیدا کرتی تھی۔

موضوعات

قاضی صاحب تقریباً ہر موضوع پر بڑی روانی سے تقریر کر سکتے تھے۔ بعض خاص موضوعات پر انہیں عبور حاصل تھا۔ مثلاً توحید و رسالت، ختمِ نبوت، مقامِ صحابہ و اہلِ بیت، امنِ عالم اور اسلام۔ ان کی ہر تقریر ایک نیا رنگ لئے ہوتی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ ملک کے اُس وقت کے حالات پر ضرور تبصرہ کرتے اور ایک صحیح مسلمان کی حیثیت سے اپنا نکتۂ نظر پیش کرنے کے عادی تھے۔ قاضی صاحب کی تقریر کا ایک حصّہ معاشرتی اور سماجی برائیوں کے لئے وقف ہوتا تھا جس سے آج کل کے خطیبوں کی زبانیں ناآشنا ہیں۔ وہ معاشرتی برائیوں کی محض نشاندہی اور تجاویز پیش کرنے پر قناعت نہ کرتے بلکہ جہاں تک بس چلتا، انسدادِ بدی میں عملی حصّہ بھی لیتے تھے۔ چنانچہ اغوا، چوری اور ڈاکہ زنی جیسے جرائم کے سلسلہ میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ آپ نے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ حالانکہ موجودہ معاشرہ میں ڈاکوؤں اور مجرموں کو پناہ دینے والا لیڈر کہلاتا ہے اور مجرموں سے لڑائی مول لینے والا کبھی امن سے نہیں بیٹھ سکتا۔ قاضی صاحب سے جس طرح راشی اور ظالم افسر خوف کھاتے تھے، اسی طرح علاقہ بھر کے بدمعاش اور غنڈے بھی ڈرتے تھے۔ اکثر تنازعے تھانوں اور عدالتوں میں جانے کی بجائے

آپ کی عدالت واقع شاہی جامع مسجد میں پیش ہوتے تھے جن پر آپ فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وفات سے چند روز پیشتر ایک غریب مزارعہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ڈاکٹر خاں صاحب کے ہسپتال ملتان چھاؤنی میں آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میری بیٹی کو فلاں زمیندار نے اغوا کر لیا ہے اور اپنے ہاں رکھا ہوا ہے۔ کئی دفعہ تھانہ میں گیا ہوں، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ آپ براہِ کرم امداد فرمائیں۔ آپ نے مجھ سے پن اور کاغذ مانگا، اور کہا کہ سہارا دے کر بٹھا دو۔ مَیں نے چند تکیے ان کی پُشت پر لگا کر اُنہیں بٹھا دیا۔ کانپتے ہاتھوں اور آنکھوں میں آنسو لئے دو حروف لکھنے پر اکتفا کیا۔ الفاظ یہ تھے۔

محترم ! .... میرے پاس اپنی فریاد لے کر پہنچا ہے۔ میں ابھی زندہ ہوں

والسّلام احسان احمد

تین روز کے بعد وہی شکستہ حال کسان شاداں و فرحاں ہسپتال میں دعائیں دیتا ہوا پہنچا کہ بیٹی مل گئی ہے۔

آپ نے اپنی زندگی میں شجاع آباد میں کبھی ٹورنگ ٹاکیز کا مستقل اڈہ قائم نہیں ہونے دیا۔ اُدھر ڈی۔ سی صاحب سے کوئی تھیٹر یا سنیما چلانے کے لئے پرمٹ لے کر آیا، اِدھر آپ نے فوراً جا کر بند کرا دیا۔ بارہا ٹاکیز والوں نے پختہ سنیما بنانے کی سر توڑ کوششیں کیں، اجازت نامے لئے، چُپکے سے تعمیر شروع کی، مگر آپ کے علم میں آتے ہی تعمیر رُک جاتی۔ اُنکی وفات کے بعد اب کئی سنیما پختہ عمارتوں کی صورت میں موجود ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، کہ مَیں اپنے شہر کی بہو بیٹیوں میں بے حیائی نہیں پھیلنے دوں گا۔ اُن کے خطاب کا اکثر حصّہ عموماً خواتین کے لئے وقف ہوا کرتا تھا۔ جس میں پردے کی تلقین، شوہروں کی اطاعت، اولاد کی پرورش و تربیت، گھر کی دیکھ بھال اور معاشرہ میں ان کا مقام جیسے اہم مسائل زیر بحث آتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی عمر سے بڑی خواتین کو "ماں"، ہم عمر کو "بہن" اور اپنی عمر سے چھوٹی عورت کو "بیٹی" کہا کرتے تھے۔ ملک میں اُن کی ہزاروں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں

تھیں، اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے جس کو بھی ماں، بہن یا بیٹی کہا، زندگی بھر اُس سے حسنِ سلوک سے پیش آئے۔

غرض وہ عام مولویوں کی ڈگر سے ہٹ کر ایک مولوی، عام خطیبوں سے جُدا ایک خطیب تھے۔ میرے نزدیک جس طرح ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہونا چاہیئے، اسی طرح خطیب اور عالم کو بھی برائے زندگی ہونا چاہیئے۔ اس کا منصب وسیع تر اور نازک تر ہے وہ اس چیز کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کرتے تھے۔

آئندہ صفحات میں قاضی صاحب مرحوم کے بعض خطبات اور تقاریر جو انہوں نے مختلف کانفرنسوں میں کیں، پیش کی جا رہی ہیں۔ ان خطبات اور تقاریر کے علاوہ ان کی ایک تحریر کا نمونہ بھی پیش کیا جا رہا ہے جس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے گا کہ قاضی صاحب تحریر کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ تقریر و تحریر میں طنز و مزاح یکساں نظر آتا ہے۔ اس تحریر میں اُنہوں نے جناب مودودی صاحب کی تحریروں پر تبصرہ کیا ہے، ان کا ایک خاص انداز ہے۔ کاش کہ وہ میدانِ تحریر میں قدم رنجہ فرماتے تو آج ان کی تحریر کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہوتا، مگر وہ زندگی بھر تحریر کے خلاف رہے اور اس کے حق میں دلائل پیش کرتے تھے۔

شعر و شاعری میں ان کا ایک خاص ذوق تھا۔ وہ ہر اچھے شعر کی داد دیتے تھے۔ اور انہیں قدیم و جدید شعراء کے کلام ازبر تھے۔ انہیں ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ اگرچہ خود شاعر نہیں تھے تاہم کبھی کبھی موڈ بن جاتا تو شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ ان کی ایک رُباعی تو مشہور ہے۔ ہم نے ان کی ایک نظم آخر میں دے دی ہے جو اُنہوں نے گاڑی میں دورانِ سفر لکھی جو میری بچی کی طرف سے اپنی بیٹی کے نام پیغام کی صورت میں ہے۔

نورُالحق

(۱) خطبات

خطبۂ استقبالیہ

ڈسٹرکٹ احرار اسلام کانفرنس

منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ مئی ۱۹۳۳ء

جسے

جناب مولانا مولوی قاضی احسان احمد صاحب امام و متولّی شاہی جامع مسجد شجاع آباد

صدر مجلس استقبالیہ ڈسٹرکٹ احرار اسلام کانفرنس ملتان نے بمقام حسین آگاہی سکول ملتان شہر پڑھا

اَللّٰہُ اَکْبَرُ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الّذین اصطفٰی

بزرگانِ ملّت و برادرانِ اسلام!

اوّل میں اُن اکابر و علمائے ملّت اسلامیہ کا پُرخلوص شکریہ ادا کرتا ہوں جو اطراف و اکناف ملک سے مسافتِ بعیدہ طے فرما کر اس اجتماعِ عظیم کی رونق کا باعث ہوئے ہیں

نیز ان مخلص اور ملی بہی خواہوں کے لئے اظہارِ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں جو جذبۂ ملیہ سے متاثر ہو کر شریکِ اجلاس ہوتے ہیں۔

اعترافِ عجز

گرمی کے ایام اور پھر ملتان کی گرمی جس کے باعث یہ تاریخی مرکز خصوصی شہرت و امتیاز حاصل کر چکا ہے اور رہنمایانِ احرار کے جلیل القدر افراد جنہیں اتفاق سے ملتان کی وسیع و عریض جیل میں سرکاری مہمان ہونے کا فخر گذشتہ سال ان دنوں حاصل ہوا ہے، وہ حضرات ملتان کی گرمی کی تکالیف سے بخوبی واقف ہوں گے، پھر کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ کوئی یہاں آنے کا نام بھی لیتا۔ مگر یہ کس قدر خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے ارد گرد ملتِ بیضا کے جلیل القدر رہنماؤں کا گروہ دیکھتا ہوں جن کی مایۂ ناز شخصیتیں طول و عرضِ کشور سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں اور جن کے باطل سوز مواعظِ حسنہ سے اسلامیانِ ہندوستان کا بچہ بچہ آگاہ ہے اور جن کے گرامی منزلت وجود کے باعث اسلامی تعلیمات کا سلسلہ شد و مد سے جاری ہے۔ اس اجتماع پر بارگاہِ ایزدی میں جس قدر سجدہ ریز سپاس ہوں کم ہے میں اپنے واجب الاحترام مہمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانانِ ملتان کی مدت سے یہ آرزو رہی کہ کسی طرح یہاں بھی ایک بے نظیر اجتماع عمل میں لایا جاوے جس سے تشنگانِ رشد و ہدایت مستفید ہو سکیں۔ مگر کئی مرتبہ یہ نوشگفتہ تمنائیں خاکِ نامرادی میں دفن ہوتی رہیں قطار اندر قطار مشکلات اور رکاوٹیں راہ میں حائل ہوئیں مگر اس خالقِ لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ باوجود رکاوٹوں اور مشکلات کے خلوصِ دینی رکھنے والے حضرات اور مجلسِ احرار کے پیکرِ ایثار کارکن اپنے عزائم و مقاصد میں کامیاب ہو گئے جس کو میری حیرت زدہ آنکھیں آج عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں۔

ثانیاً، میں ان تمام فرد گذاشتوں کے لئے عفو و مسامحت کا خواستگار ہوں جو ادائے مراسمِ مہمان نوازی میں ظہور پذیر ہوئیں، یا ہوں گی۔ اُمید کہ معذرتِ صادقانہ کو قبول فرمایا جائے گا۔

مُلتان کی تاریخی و اسلامی اہمیّت

ایہّا الکرام! یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے جس حصّے کے صدر مقام میں "احرار" کا یہ عظیم الشان اجلاس ہو رہا ہے، چند کلمات اس سرزمین کے اور اس مقام کی تاریخی و اسلامی اور تمدنی و معاشرتی اہمیت کے متعلق عرض کروں۔

ملتان کو اسلام کے قدومِ میمنت لزوم کی سابقیت اور مسلمان آبادی کی اکثریت کی وجہ سے پنجاب کے باقی اضلاع میں ایک ناقابلِ انکار تفوق و امتیاز حاصل ہے۔ مُلتان کسی زمانہ میں اپنی تاریخی عظمت، سیاسی اہمیت، اسلامی تہذیب، علمی و فنی تعلیم و روحانی تلقین کی وجہ سے ایک مرجع خلائق شہر تھا۔ علم و عرفان کے مرکز و منبع علمائے دین و عارفان حق کے مولد و منشا ہونے کا بھی اس مقدّس سرزمین کو افتخار حاصل ہے۔ جہاں سلطان العارفین حضرت موسیٰ پاک شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریّا رحمہ اللہ و شاہ رکن عالم جیسے بزرگانِ عظام و عالمانِ ذیشان اپنی روحانی تقدّس کی تجلّیاں بکھیرتے رہے۔ اُن ایمان افروز ارشادات کا ہی یہ اثر ہے کہ ملتان کے لوگ نہایت رقیق القلب واقع ہوئے ہیں اور اسلامی تعلیمات سے ان کو خصوصی شغف ہے۔ یہ سب انہی واجب العزّت مذہبی پیشواؤں کی بیش قیمت ہدایات و ارشادات کا اثر ہے۔ ملتان کو یہ شرف خصوصی قرونِ گذشتہ میں ہی حاصل نہ تھا بلکہ وہ قدسی نفس علمائے کرام آج بھی یہیں مدفون ہیں اور اگرچہ وہ آج ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں مگر ان کا علم و عمل برابر کام کر رہا ہے اور مغربی عہد کی عبرت بخش تحریکات ان سادہ منش لوگوں کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکیں، ورنہ اس عہد میں جب کہ باطل حق کا لباس پہن کر جلوہ گر ہو چکا ہے اور تمدنی معاشرتی دنیا کی کایا پلٹ گئی ہے۔ افرنجیت کے صدقے میں مشرقیت ہم سے رخصت ہو چکی ہے، مگر میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری لُٹی ہوئی شہرت اور پامال شدہ عظمت کے سینکڑوں آثار خاص ملتان اور اس کے گرد و نواح میں بکثرت

ملتے ہیں۔ یکشنری کے جس صدر مقام میں رہنمایانِ امّتِ مسلمہ کا یہ عظیم الشان اجتماع ہو رہا ہے اسے تجارتی پہلو سے بھی ہندوستان بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ قندھار، ایران، بلوچستان تک کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ دیسی صنعتیں یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مٹی کے اور چمڑے کے برتن، نقاشی و کانشی کا کام یہاں بہت ہوتا ہے۔ مقابر و معابد کا یہ شہر مرکز ہے ہندوستان کے ہر حصّے سے زائرین ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ مغربی پنجاب کا یہ صدر مقام ملتان موجودہ وقت کے لحاظ سے کچھ اہم خصوصیّات کا جامع ہے۔ اگرچہ قبل اس کی آبادی فصیل کے اندر تھی مگر گذشتہ چند سالوں سے آبادی سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ گویا ملتان اب تمدّن و حضارت کے ارتقائی منازل طے کرکے اب اس درجہ کو پہنچ چکا ہے۔ نیز یہ تجارت کی بھی زبردست منڈی ہے۔ صنعت و حرفت کی گرم بازاری ہے۔ جبریہ تعلیم کے نفاذ نے گذشتہ ۱۰سال میں مسلمانوں کی موجودہ نسل کو روشن خیال بنا دیا ہے، اور علم کی فراوانی و نشر و اشاعت کے ذرائع بھی وسعتِ معلومات کے ساتھ اس حد تک بڑھے ہیں کہ جہاں کل تک مسلمان اخبار پڑھنا گناہ سمجھتے تھے وہاں شہر کے بعض مقامی اخبارات اپنی شان کے ساتھ چل کر مولانا لعل دین عاصی نظامی، کامریڈ محمد امین امین اور ایم عبدالرحمٰن خاں کی ادیبانہ سرگرمیوں کا اظہار کر رہے ہیں اور آج گھر گھر مقامی اخبارات "صادق"، "محسن"، "مجاہدِ اسلام" پڑھے جا رہے ہیں۔ علوم و فنون کے چرچے روز افزوں ترقی پر ہیں۔ اس لحاظ سے بھی احرار کانفرنس کا انعقاد اس مقام پر نہایت موزوں اور مناسب معلوم ہوا۔

تحریکِ خلافت اور مُلتان

بہی خواہانِ قوم!

علمی پسماندگی اور جغرافیائی دور افتادگی کے باوجود بھی مسلمانانِ ملتان سیاسیاتِ اسلامیہ میں برابر کے حصّہ دار رہے۔ خلافت کی وہ شہرۂ آفاق تحریک جس نے اقصائے عالم میں غیر معمولی

شہرت حاصل کر لی تھی، جس سے اسلامی ہندوستان کا چپہ چپہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا یہاں بھی اس مبارک تحریک کو نمایاں ترقی ہوئی، اور ملتان کے مسلمانوں میں وہ غیر معمولی جوش پیدا ہوا، جس کی مثالیں دوسرے صوبوں میں بہت کم ملیں گی۔

شہیدِ ملت نواب شیر محمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

معزز حاضرین یہاں مجھے اُس مردِ مجاہد کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی گرامی قدر شخصیت آج ہم میں موجود نہیں مگر وہ ایثار پیشہ توحید پرست، اُن نادر الوجود افراد میں سے تھا جن پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ خلافت کی تحریک کی بنا ملتان میں مرحوم نواب شیر محمد خاں کے مبارک ہاتھوں سے ڈالی گئی۔ نواب صاحب ممدوح کی ذاتِ ستودہ صفات مسلمانوں کے لئے مایۂ حیات اور وطن کے لئے باعثِ نازش تھی۔ اگرچہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو چکے ہیں مگر وہ اسلامی رُوح جو آپ نے ملتان میں زندہ کی تھی، برابر آج تک اپنا کام کئے جاتی ہے۔ تحریکِ خلافت کو اُنہوں نے اس کامیابی سے چلایا اور خود ایک رضا کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ مسلمانوں کے مُردہ قلوب میں اس تحریک سے دوبارہ جان آگئی تھی۔ وہ اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری کے لئے بیدار ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جب خلافت کمیٹی ایک بے روح لاش ہو کر رہ گئی تو یہاں بھی اس کا اثر ہوا اور کارکنانِ خلافت نے ایک نئی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ جس کا نام "انجمن خدام المسلمین" رکھا گیا۔ نواب شیر محمد خان صاحب و دیگر کارکن جو خلافت کمیٹی میں شامل تھے سب کے سب انجمن مذکور کے معاون بن گئے۔ انجمن کو چند ہی دنوں میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ جس میں نواب صاحب مذکور کا وجودِ گرامی اسلامیانِ ملتان کے لئے موجبِ ناز رہا۔

مجلسِ احرار کا قیام

نواب صاحب نے ملتان و گرد و نواح کے مسلمانوں کو مذہبی طور پر اچھی طرح تیار

کر لیا تھا اور مسلمانوں میں اسلامی اخوت و مودّت کے یثربی مراسم پھر سے زندہ ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں امیر الشریعت صوبہ پنجاب حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری تشریف فرمائے ملتان ہوئے اور انہوں نے سیاسی زندگی کی وہ لہر دوڑائی، کہ مسلمانانِ ملتان سیاسی لحاظ سے بھی دوسرے اضلاع کے مسلمانوں سے دو قدم آگے نکل گئے، جس کا عملی ثبوت اس کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میں اپنی، اور اپنی جماعت و جملہ مسلمانان علاقہ ملتان کی طرف سے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ خدائے عزّ و جلّ مولانائے محترم کا سایۂ ہما پایہ تا دیر ہم سب پر قائم رکھے آمین، اور وہ حریّت و صداقت کا شجر جسے مولانا موصوف نے خونِ جگر دے کر سینچا ہے، اپنی زندگی میں بار آور دیکھیں۔ آمین ثم آمین۔

آپ کی خطیبانہ ساحری اور ولولہ انگیز طرزِ بیان نے ملتان کی پبلک پر ایمان افروز اثر کیا اور حضرت شاہ صاحب نے مسلمانانِ ملتان کے قلوب کی گہرائیوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ انہی ایام میں کشمیر کی تحریک شروع ہوئی اور احرار اسلام کی جماعت نے اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جس کے فوراً بعد ہی طول و عرضِ کشور میں ایک ہنگامۂ دار و گیر بپا ہو گیا۔ مسلمانانِ کشمیر کی مظلومیّت حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس لئے رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ سینکڑوں سرفروش میدان میں آ گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں والنٹیر بھرتی کئے گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں، قید و بند کا بے پناہ سلسلہ شروع ہوا۔ چونکہ ملتان میں واجب العزّت قبلہ بخاری صاحب کے مواعظِ حسنہ نے فضا کو گرما رکھا تھا، تحریک کشمیر کے لئے یہاں بھی بھرتی شروع ہوئی، کثرت سے دستے کشمیر کو روانہ کئے گئے۔ چنانچہ ایک احراری دستے کی قیادت آنجہانی نواب شیر محمد صاحب مغفور نے قبول فرمائی اور محترم نواب صاحب ـــ باوجود ضعیف العمر ہونے کے جوشِ اسلامی میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح ایک دستے کے ہمراہ عازمِ کشمیر ہو گئے۔ مگر کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ احکم الحاکمین کی ان دیکھی

اور ان سوجھی مصلحتوں کا علم کسے ہو سکتا ہے۔ دفعتہً لائل پور پہنچنے پر نواب صاحب راہئے ملکِ بقا ہوئے، شہادت کا مرتبہ پایا۔ لائل پور میں جوشِ اسلامی کے بےنظیر مظاہرے ہوئے۔ نواب صاحب کے جنازے کو وہ عزت و افتخار بخشا گیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ بغرض تجہیز و تکفین آپ کو ملتان لایا گیا، جہاں تمام شہر کے مسلمانوں نے مل کر نمازِ جنازہ ادا کی۔ مسلمانوں میں بہت زیادہ جوش پھیل گیا۔

چنانچہ احرارِ ملتان نے اپنے فرائض کو زیادہ مستعدی سے سرانجام دینا شروع کر دیا۔ ایک دو دستے قید ہوئے۔ رضاکار تکالیف و شدائد کی مصیبت جھیل کر بفضلِ ایزد سب کے سب بخیر و خوبی پھر ملتان آگئے۔ یوں تو قید و بند کی سختیاں کسے معلوم نہیں، مگر برادر عزیز ملک عبدالغفور[1] جو اسی تحریک میں باقی سب احرارِ ملتان کی نسبت زیادہ دیر تک قید و سلاسل سے دوچار ہوئے، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ میں انہیں اس ایثار پیشگی اور جوشِ اسلامی کے لئے قابلِ مبارکباد سمجھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسے سرفروش اور مجسمۂ اخلاص افراد کو اس سے بھی زیادہ توفیق عطا فرمائے، تاکہ وہ ملّی خدمات کی انجام دہی کے لئے ہر وقت و ہر لحظہ سربکف رہیں۔

اگرچہ نواب صاحب کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد تمام تر بوجھ مختلف حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور ناقابلِ برداشت ذمہ داریاں قابلِ برداشت ہو گئیں مگر نواب صاحب مرحوم کی جگہ آج تک خالی ہے، وہ تشریف لے گئے، مگر اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔ جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ آیندہ بھی ان کے پایہ کی شخصیت کا حاصل ہونا صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ قطعی محال ہے۔ اس دورِ قحط الرجال میں بعض رجال اللہ کا ہونا اسلامیانِ ہند کے لئے عموماً و اہالیانِ ملتان کے لئے خصوصاً ایک عطیۂ الٰہی و نعمتِ ربّانی ہے۔

ملک و ملّت کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس دورِ نازک میں اُن کے زعماء و رہنما رحلت و مفارقت اختیار کر جاتے ہیں۔ ملتان کے لئے مرحوم نواب صاحب نے جو بےنظیر ایثار اور

---

[1] ملک عبدالغفور انوری مراد ہیں جو مدرسہ خیر المدارس ملتان کے ناظم ہیں۔

قربانیاں کیں اور جو جو اذیتیں و مصیبتیں برداشت کیں، اُن کی حقیقت و واقفیت سے ملتان کا بچہ بچہ آگاہ ہے۔ اس دورِ انقلاب اور زمانۂ کشمکشِ موت و حیات میں اسیے جری اور مدبّر فرزندِ اسلام کی اشد ضرورت تھی۔ مگر قدرت کے اٹل قانون کے سامنے کس کی پیش جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں صبر اختیار کر کے بارگاہِ ایزدی میں مستقبل کے لئے خیر و برکت کا مستدعی ہونا چاہیئے۔ دُعا ہے کہ خداوند قادر و توانا، مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے کر قوم و ملک کے لئے ان کا کوئی نعم البدل پیدا کر دے آمین۔

مُسلمانانِ مُلتان کی زبوں حالی
قرضے اور سُود کے عبرت بخش نتائج

خیر خواہانِ مِلّت!

یوں تو دوزخ نشان ہندوستان کا کوئی حصّہ ایسا نہیں، جہاں قرض خواہاں کی چیرہ دستیاں کسی تعارف و تشریح کی محتاج رہ گئی ہوں۔ ان گرگ صفت شائیلاکوں کی ہوسِ طلبِ منفعت نے ایسے ماتم انگیز عواقب سے مسلمانوں اور خصوصاً زمینداروں کو ہمکنار کر دیا ہے، جس کی عبرت انگیز داستان بیان کرتے ہوئے قلم کا سینہ بھی شق ہو جاتا ہے مگر ضلع ملتان کے تہی دست زمینداروں کی فلاکت زدہ جماعت کے لئے تو یہ فتنہ قیامت ہوا چاہتا ہے۔

حکومتِ وقت کی پر اسرار غیر جانب داری کے کیا کہنے کہ ایک طرف تو زمینداروں کو "ریڑھ" کی ہڈی کہا جا رہا ہے، مگر جب کہ یہی ریڑھ کی ہڈی موت و حیات کی کشمکش میں نڈھال ہے اور سرمایہ دار قوتیں ہر لحظہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑنے میں مصروف ہیں اور ہر سال حکومت کی ہمیانیوں میں روپہلی ٹکلیوں کی سب سے زیادہ تعداد اس جماعت کے گاڑھے پسینے کی کمائی کی ہوتی ہے، سرمایہ پرست اربابِ اقتدار کے آئین و قانون کی موجودگی میں یہ سب

کچھ ہو رہا ہے مگر ان کے عدل و انصاف کے دیدے ایسے پتّھر ہو گئے ہیں کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ شرحِ سود کی کوئی مقدار معیّن نہیں، ساہوکار جس قدر سود چاہے بلا خوف و خطر لے سکتا ہے اور باقاعدہ عدالتوں کے ذریعے وصول کر سکتا ہے۔ ملتان کے ضلع میں مسلم زمینداروں کی اکثریت ہے اور وہ سب کے سب اسی سود در سود کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اربابِ مجالسِ اسلامیہ اور اپنے رہنماؤں کو متوجہ کریں کہ وہ اپنی اوّلین فرصت میں زمینداروں کی اس ہلاکت آفرین مصیبت کے سدّباب پر متوجہ ہوں اور خُون چُوسنے والے سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں سے نجات دلائیں۔

مُلتان میونسپل کمیٹی اور نشستوں کی ترتیب

دردمندانِ اسلام!

برادرانِ وطن کی طرف سے ہمیشہ اس امر کی شکایت سُنی جاتی ہے کہ سندھ میں ہم تباہ ہو گئے، صوبہ سرحد میں ہم پر مظالم توڑے گئے، یوپی میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا اور ہندوؤں کو پنجاب میں اسی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ شکایات ہوتی ہیں، اخبارات میں شور مچایا جاتا ہے، احتجاجی جلسے منعقد ہوتے ہیں مگر کس قدر حیرانی کی بات ہے کہ ہندو قوم اطراف و اکنافِ ملک میں تو اپنی مظلومیّت کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے اور پھر بھی ان کی حسِ قانون دانی کا دامن داغدار نہیں ہونے پاتا۔ ہم کو دکھایا جائے، کوئی ایسا شہر، کوئی ایسا قصبہ، کوئی گاؤں جہاں مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کے ناپاک عزائم کو عملی شکل نہ دے دی گئی ہو۔ یہ کس قدر غضب کی بات ہے کہ آبادی کے لحاظ سے تو مسلمان اکثریت میں ہوں اور ہندو اقلیت میں، مگر حقوقِ شہریت کا تناسب ایسا بھونڈا ہو کہ مسلمان ہمیشہ خسارے میں ہی رہیں۔ ہم اسی تاریخی شہر کی کمیٹی کو لیتے ہیں جس میں مسلمان ۶۷ ہزار اور ہندو چالیس ہزار آباد ہیں۔ پھر کمیٹی کی نشستوں پر نگاہ ڈالی جائے تو حیرانی

ہو گی کہ دونوں کی نشستوں کا تناسب مساوی ہے۔ یعنی جتنے ہندو ممبر اتنے مسلمان ممبر۔ یہ سچ ہے کہ نظامِ بلدیات کی باگ ڈور آج کل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے ہاتھ میں ہے جو اپنی قانونی تاویلات سے آنکھوں میں خاک جھونکنے کی خاص دسترس رکھتے ہیں۔ مگر نامعلوم وہ کن وجوہات کی بنا پر اس شدید ناانصافی کا ازالہ نہیں فرماتے۔ جب ایک قوم اکثریت میں ہے ان کی نشستیں بھی اکثریت میں ہونی چاہئیں۔ کیا یہ تمسخر نہیں کہ ہندو اقلیت میں ہونے کے باوجود بھی نصف نشستوں پر قابض ہیں۔

حق و انصاف کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے اس جائز و فطری حق کو تسلیم کرایا جائے اور رہنمایانِ ملک و ملت کو اس کے حصول کیلئے پوری سرگرمیوں کا اظہار کرنا چاہیئے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ بزرگانِ اُمتِ محمدیہ اس سب سے ضروری مسئلہ کی طرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے۔

ہندو پراونشل کانفرنس مُلتان

حضرات!

گذشتہ ہفتے اسی میدان میں ہندو پراونشل کانفرنس کا اجلاس ہوا، جس میں اسلامیانِ پنجاب کے جائز مطالبات کی مختلف طریقوں سے شدّ و مد کے ساتھ مخالفت کی گئی۔ سندھ کے مسلمانوں کی وحشت و بربریت کی مفروضہ داستانیں، صوبہ پشاور کے من گھڑت قصّے اور یوپی کی دل آزار داستانِ انتخاب دُھرا دُھرا کر راجہ نریندر ناتھ جاتی کو گرماتے رہے برادرانِ وطن کی یہ دل آزار روش تھمتی نظر نہیں آتی۔ ایسے نازک وقت میں، جب کہ ہندوستان ایک نہایت خطرناک دَور میں سے گذر رہا ہے جس کے تصوّر سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی دو ممتاز قومیں اگر اسی طرح گاؤ زوری میں مصروف رہیں، تو ملک کا پھر خدا حافظ ہے۔ سنگھٹنی ذہنیت کے افتراق انگیز مظاہرے روز بروز ترقی پر ہیں۔ اس کے گھناؤنے چہرے کے کریہہ منظر خط و خال اب اچھی طرح

منظرِ عام پر آگئے ہیں۔ یہ لوگ نفرت اور عدمِ اعتماد باہمی کی خلیج کو وسیع کرتے جاتے ہیں۔ مگر ہم سرِدست مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ان شور بیروں، اور بھارت بھوشنوں کی زہر آلود تقاریر سے متاثر نہ ہوں، اور پُرامن رہ کر اپنی اصلاح و تنظیم کے پروگرام پر عمل پیرا ہوں۔

آزادئ تلوار کا مطالبہ

حکومتِ ہند نے پنجاب کے چند اضلاع کو تلوار رکھنے کی عام اجازت دے دی ہے، اور اس کے ساتھ چند شرائط ہیں جو تلوار رکھنے والے کو پوری کرنی پڑتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ملتان جیسے ضلع کو کیوں اس رعایت سے محروم رکھا گیا ہے۔ مسلمان قوم ہمیشہ سے پُرامن رہی ہے۔ اس نے ہر مصیبت اور ہر تکلیف کا سامنا نہایت صبر و سکون سے کیا ہے اور بعض دفعہ ہمسایہ قوموں کے متعدد افراد کو اپنے گھروں میں پناہ دے کر بچایا ہے۔ چونکہ ملتان میں انہی کی اکثریت ہے اور اکثریت کا مطالبہ ہے کہ ملتان میں تلوار رکھنے کی عام اجازت ہونی چاہیئے۔ اُمید کہ حکومت اپنی اوّلین فرصت میں اس مسئلے پر غور کر کے مطالبہ مذکورہ بالا کو پورا کرے گی۔ میں نہایت عجز سے نمائندگانِ ملّت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس اہم ترین مطالبہ پر خاص توجہ مبذول فرمائیں۔

اظہارِ تشکّر

خاتمۂ سخن پر میں معاونینِ کرام کی خدمات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فرصت سوز کاروباری مصروفیتوں سے وقت نکال کر دامے، درمے، قدمے، سخنے امداد فرما کر کانفرنس کو کامیاب بنایا اور اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آخر میرے ایثار پیشہ معاونین و رفقاء کی مساعئ جمیلہ کامیاب ہوئیں۔ بعض مخیر حضرات نے

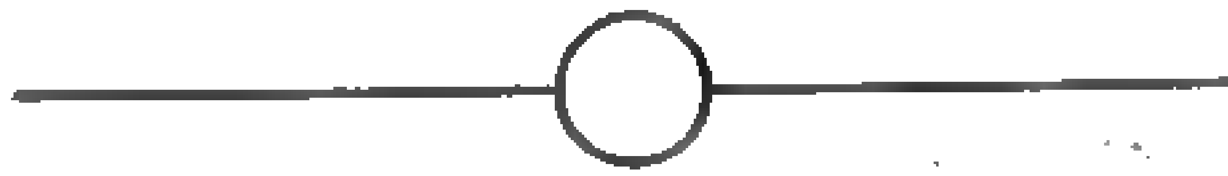
مالی امداد فرما کر اپنی ملّت نوازی اور دریا دلی کا ثبوت دیا اور بعض جفاکش حضرات نے ذاتی طور پر انعقادِ کانفرنس کی تیاریوں میں میرا ہاتھ بٹایا۔ کس قدر مسرّت کا مقام ہے کہ ایک آدمی کا ناقابلِ برداشت بوجھ متعدد حصّوں میں تقسیم ہو کر قابلِ برداشت ہو گیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

معذرت

عدیم الفرصتی اور کثرتِ کار کی وجہ سے سطور زیرِ نظر نہایت عجلت کی حالت میں ترتیب دی گئی ہیں۔ اہلِ نظر حضرات اگر کہیں خامیاں پائیں، تو نظر انداز فرمائیں۔

العذر عند کرام الناس مقبول۔

احقر العباد : قاضی احسان احمد
امام و متولّی شاہی جامع مسجد شجاع آباد
صدر مجلس استقبالیہ ڈسٹرکٹ احرار اسلام کانفرنس ملتان شہر



اللہ اکبر

خطبۂ استقبالیہ

جو نوجوانانِ اسلام حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب

خطیب و متولی شاہی مسجد شجاع آباد

و صدر مجلس استقبالیہ پنجاب پراونشل احرار تبلیغ کانفرنس ملتان

نے منعقدہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ مئی ۱۹۳۷ء بمقام احرار نگر عام خاص باغ پڑھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، خصوصاً علیٰ سید الاوّلین و الاٰخرین خاتم النبیین و المرسلین سیدنا و شفیعنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین بعدد کل ذرۃ الف الف مرۃ امابعد

بزرگانِ ملت !

اس وسیع پنڈال میں یہ مہتم بالشان اجتماع تبلیغ کانفرنس کے نام سے منعقد ہوا ہے قبل اس کے کہ میں اس اجتماع کی غرض و غایت کے متعلق کچھ عرض کروں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ اسلامیانِ ملتان کی طرف سے عموماً اور اراکینِ مجلسِ استقبالیہ کی طرف سے خصوصاً ان تمام بزرگانِ ملت کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں، جنہوں نے ہندوستان کے دُور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے کانفرنس کو شرفِ قدوم سے نوازا اور اپنی شرکت کی سعادت سے بہرہ اندوز فرمایا۔ میں ادائے فریضۂ شکر سے اپنے عجز کا اعتراف

کرتے ہوئے تمام معزز و محترم مہمانوں اور حاضرینِ مجلس کا اپنی بساط کے مطابق شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے احساساتِ دینیہ و جذباتِ ملّیہ کا صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ خصوصی طور پر سحبان الہند حضرت صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ صاحب سجادہ نشین آلو مہار شریف دام فیضہم کا شکر گذار ہوں کہ موصوف نے باوجود ناسازیٔ طبع اور عوائق مہمہ کے مجلس استقبالیہ کی مخلصانہ استدعا کو قبول فرما کر کانفرنس کی قیادت و رہنمائی منظور فرما لی اور اُمّتِ اسلامیہ کے لئے اس نازک مرحلہ پر راست روی کا موقع بہم پہنچایا۔ خصوصاً ان ایّام میں جب گرمی اور وہ بھی ملتان کی گرمی جس کے باعث یہ تاریخی شہر پنجاب بھر میں خصوصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس اہم اور عظیم الشان کانفرنس کا ملتان میں منعقد ہونا طبعی طور پر اس امر کا ضامن ہے کہ اس کا اثر پنجاب کے تمام اطراف و جوانب کو محیط ہو گا کیونکہ ملتان کو ـــــ مبدا رفیاضی سے ایسی مرکزیت حاصل ہوئی ہے جس کو پنجاب کے تمام سلیم الذوق حضرات تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ملتان صدیوں سے اسلامی علوم و معارف کا مرکز اور اہلِ علم و فضل کا مرجع رہا ہے۔ یہی ملتان مسلمانوں کے علوم و فنون، اور حاکمانہ سیاست کا محور اور ہر قسم کی سیاسی اور علمی اور روحانی ہدایت کا مصدر تھا۔ اگر اس کی سرزمین میں ایک طرف اسلامی سطوت و شوکت کے حامل اولو العزم سلاطینِ اسلام محو خواب ہیں تو دوسری جانب علم و حکمت اور ارشاد و طریقت کے اساطینِ عظام کے مزارات و مشاہد جلوہ ریز برکات اور مہبطِ انوار ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ کی برکت اور حق تعالےٰ کی رحمت سے مسلمانانِ ملتان میں ایک خاص جذبۂ مہمان نوازی و مفادِ ملت کے ساتھ والہانہ شیفتگی مسلمانانِ عالم کے ساتھ برادرانہ عطوفت و ہمدردی، اسلامیات میں حُسنِ عمل، اور مشکلاتِ ملکی و ملّی کے حل کے لئے مخصوص قوتِ ممیزہ نمایاں طور پر موجود رہی ہے لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ غلامی اور [illegible] بھی اغیار کی غلامی کے اثرات نے رفتہ رفتہ اسلامی خصائص کی جگہ ہم میں وہ وہ رذائل پیدا کر دیئے کہ آج اُسی ملتان میں اعلانیہ کفر و استعمار کی

پرستش کی جارہی ہے۔

دردمندانِ اسلام!

اس وقت جتنی تحریکیں ہندوستان میں موجود ہیں اُن سب میں صحیح اور متعین قابلِ عمل راہ شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند ہی کی ہے کیونکہ باقی تحریکات نتائج میں اختلاف پیدا کرنا چاہتی ہے اور یہ علل واسباب کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک راسخ اور محکم اعتقاد اور وحی الٰہی کے پیدا کئے ہوئے یقین پر ہے، اور باقی تحریکات کی بنیاد اوہام وظنون پر۔ اس وقت ان تحریکات کے علمبرداروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱: ایک تو وہ لوگ ہیں جن کی تمام دینی و دنیوی آرزوئیں برطانوی استعمار سے وابستہ ہیں اور جو ہر حال میں راضی برضائے برطانیہ ہیں۔ اسلامی ممالک کو غلام بنانے کی کوششیں کی جارہی ہوں یا مقاماتِ مقدّسہ فلسطین و حجاز کے باشندگان پر مظالم ڈھائے جارہے ہوں، سرحد کے آزاد اسلامی قبائل کو تحفّظِ انسانیت (آزادی) کے جرم بے جرمی میں فنا کے گھاٹ اتارا جارہا ہو یا اسلامیانِ عالم کی آخری متاع سیّد دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت و تاجِ ختمِ نبوّت کی توہین کی جارہی ہو اور کُھلم کُھلا تاجدارِ مدینہ سے بغاوت کی تبلیغ کرائی جارہی ہو، تو اُن کی وفاداری میں سرِمو فرق نہیں آتا اور وہ حکومت کو فخریہ یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ ؎

اےؔ در بقائے عمر تو خیر جہانیاں   باقی مباد ہر کہ نخواہد بقائے تو

۲: دوسرے وہ لوگ ہیں جو مفادِ ملّت سے بے نیاز ہو کر غیر ملکی حکومت کی بجائے ملکی سرمایہ داری کی غلامی پر قانع نظر آتے ہیں، جو کہیں تو گاندھی جی کی لنگوٹی پرستار نظر آتے ہیں، اور کہیں اسلام کی عالم گیر امتیازی شان کا استخفاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

لہ منقول از "سپاسِ عقیدت" جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ملتان ڈویژن کے نام نہاد نمائندگان نے کمشنر ملتان کو پیش کیا۔

مسلمان کی بجائے ہندوستانی اور اسلامی تہذیب وتمدّن کی بجائے ہندی یا ہندوستانی تہذیب وتمدّن کا علمبردار ہونا ان کے لئے باعثِ فخر ہے۔

۳: تیسری ان لوگوں کی جماعت ہے جو نہ تو برطانوی استعمار کے آلۂ کار بننا چاہتے ہیں اور نہ ہندوستانی سرمایہ دار کے دبیل۔ وہ ملک کو آزاد کرانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور ہمسایہ اقوام کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنا اپنا جزوِ ایمان یقین کرتے ہیں مگر انہوں نے زیادہ غور و فکر سے کام لیا اور سمجھ گئے کہ ملکی وملّی مشکلات کے لئے ظواہر و فروعات سے متاثر ہونے کی جگہ کسی اُصولِ حقیقی کی تلاش میں نکلنا چاہیئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اغیار کے سہارے تلاش کرنا اور محض سیاسی اُمور کے لئے سعی کرتے رہنا، قبل اس کے کہ کوئی اساسی اُصولی اصلاح ہو جائے، بیکار ہے۔ اوّل تو یہ تمام امور اصل مرض کا علاج نہیں ہیں بلکہ کسی حقیقی مرض کے نتائج وعوارض ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تمدّنی حالت درست نہیں ہے تو یہ غفلت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی تمدّنی ترقی کا ساتھ نہیں دیا، لیکن غفلت کیوں ہے، قوائے عمل کیوں معطّل ہیں اور ذہن اور دماغ کیوں بیکار ہو گئے؟ پس ضرور ہے کہ اس سبب کو دُور کیا جائے جس کی وجہ سے بیداری کے بعد یہ غفلت طاری ہوئی۔ اگر ابتدا سے تلاشِ اصل وحقیقت کی وجہ، انہیں امور کو بنیادِ کار قرار دیا گیا تو پوری کامیابی نہ ہوگی کیونکہ یہ آنکھوں کی جلن، سر کے درد اور اعضا شکنی کا علاج ہوگا، حالانکہ ان سب کا باعث اصل یعنی بخار باقی ہے، اور اگر کامیابی ہوئی اور پیشانی پر کوئی ایسی سردشے لگا دی گئی جس کی بدولت بخار کی حدّت وحرارت کم محسوس ہونے لگی تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کا شفایاب ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ تب انہوں نے مسلمانوں کے موجودہ اعمال واطوارِ حیات کا مطالعہ کیا تو انہیں نظر آیا کہ ان اعمال کی موجودگی میں محال ہے کہ حسبِ سننِ طبعیہ کوئی قوم زندہ رہ سکے۔ وہ تمام اعمالِ صحیحہ وصالحہ جو حیاتِ اجتماعی وملّی کے لئے بمنزلہ روح وحرارت کے ہیں، مسلمانوں میں سے مفقود ہو رہے ہیں اور ہر عمل یا محرّف ہے

یا مسخ شدہ۔ پھر اس جماعت کے اکابر نے قوۃ روحانیہ عالیہ کو دیکھا جو آج تک مسلمانوں کے دلوں پر حکمران ہے تو اس کے احکام و تعلیمات صادقہ کی روشنی میں نظر آیا کہ مسلمانوں کے تمام موجودہ اعمال و اطوار یکسر اس کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور اس کی تعلیم میں وہ تمام ارکان و اصول اکمل و اجمل صورتیں میں موجود ہیں جن کا عمل و انقیاد کسی قوم کی حیات اجتماعی و سیاسی اور قیام مدنی و عمرانی کے لئے ضروری ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

پس اس جماعت کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے اس فہم حقیقت کے لئے کھول دیا، کہ مسلمانوں کے موجودہ امراض کا علاج اسی قانون کا اتباع ہے اور بس! ان کو یقین ہو گیا کہ اصلاح و تبلیغ کا کام شروع کرنے سے پہلے کوئی بنیاد و اساس عمل قرار دینی چاہیئے محض سیاسی تحریکوں سے آغاز عمل کرنا یا ترقی یافتہ اقوام کی نقالی پر اصلاح کی بنیاد رکھنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ یہ تمام امور کسی جڑ کی شاخیں، کسی بنیادِ باطن کے آثار وظواہر، یا کسی روحِ حیات بخش کی پیدا کی ہوئی حرکت ہیں مگر خود نہ تو بنیاد ہو سکتی ہیں اور نہ کسی شجرِ انقلاب کا بیج اور نہ کسی جسم کے لئے روح۔

پس مندرجہ بالا مراتب کے پیش نظر اس جماعت کے محترم ارکان کو یقین ہو گیا کہ جب تک مذہبی ارشاد و ہدایت کی کوئی سچی حرکت مسلمانوں میں پیدا نہ ہوگی، اسوقت تک تمام مساعیِ اصلاح بے نتیجہ ہیں۔ شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام اسی اجتہاد فکر و تفحصِ صحیح کا نتیجہ ہے جس کے ماتحت مجالس تقریباً سارے پنجاب و ہندوستان میں قائم ہو چکی ہیں اور جس کے اہتمام سے یہ تبلیغی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں حضرت استاذیم مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری امیر شریعت پنجاب، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر مجلس احرار اسلام ہند، حضرت صاحب زادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب سجادہ نشین آلو مہار شریف، صاحبزادہ مظہر قیوم صاحب

سجادہ نشین مکان شریف، صاحبزادہ مقبول الرسول صاحب سجادہ نشین بلہ شریف، مولانا ظہور احمد صاحب بگوی امیر حزب الانصار و دیگر علمائے دین و مشائخ طریقت شامل ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱: "ہندوستان اور بیرون ہند میں اسلام کے مقدس اصولوں کی اشاعت کرنا" یہ واضح ہے کہ اصلاح دینی کا کام انجام نہیں پا سکتا جب تک قوم کو اسلام کی صحیح تعلیم نہ دی جائے اور تمام طبقاتِ امت کا جہلِ دینی دُور نہ ہو۔

۲: "مسلمانوں میں تبلیغِ اسلام کا جذبۂ صادق پیدا کرنا اور مبلغین کی ایک سرگرم کارکن جماعت تیار کرنا" اس کا ذریعہ صرف علمائے حق ہیں جو روز بروز ہم میں قلیل اور مفقود ہوتے جاتے ہیں، اور جن کی قلت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم میں حیاتِ دینی کے نتائج و ثمرات مفقود ہیں۔

۳: فتنۂ قادیان کے تباہ کن اثرات سے تعلیم اسلامی کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں کو ان کے دجل سے بچانا۔

انقلاب حالات نے بعض ضرورتیں ایسی بھی پیدا کر دی ہیں جو کل تک نہ تھیں، مثلاً یہی فتنۂ مرزائیت، جس نے قصرِ اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رکھا اور جس کو حقیقی رنگ میں زعمائے احرار اسلام نے پہچانا، اور بہت حد تک اُمتِ مسلمہ کو اس کے دشمنِ انسانیت عزائم سے آگاہ کیا۔

احیاءِ ملت و ردِ مفاسد کا وہ مقصدِ عالی جس کو گو سمجھنے والوں نے سمجھا، پر اس کے انجام دینے کی ہمت کسی نے نہ پائی مگر چند ہممِ عالیہ اور افکارِ صحیحہ کی کوشش کی بدولت شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام کے نام سے وجود میں آیا اور باوجود فقدانِ اشخاص و احاطہ جہل و جمود، و موانع چند در چند و صدماتِ پے در پے و مخالفت اناس و تصادم اغراض و اہوا کے تمام مشکلات سے گذر کر اس حد تک آ گیا کہ ایک محکم ادارہ ملیہ کی صورت اختیار

کرلیتا اور شاید چند تغیرات و مساعی کے بعد ایک وقت آتا کہ اصلاحِ ملّت کے جن نتائج کو سلاطینِ عہد و فرمانبرداران عصر حاصل نہ کر سکے، کفر آباد ہند کے ایک شعبۂ تبلیغ سے ظاہر ہوتے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

لیکن جب کہ ایسا ہوا اور مشکلوں اور مصیبتوں کا عہد گزر گیا۔ جب مرض و بیچارگی کے مصائب جھیلنے والے جھیل چکے اور صحت و تندرستی کی صحبتوں کا وقت قریب آیا جب کہ دہقان راتوں کی نیند اور دن کے آرام قربان کر چکے اور ہل جوتنے کا نہیں بلکہ ہری بھری فصل کا دور شروع ہوا، جب باغیانِ ختمِ نبوّت کے لئے چلنا پھرنا محال ہو گیا تو اس وقت نیّتوں کے عدوان، طبائع کے طغیان، اغراض کے فساد اور نفس کی شرارت نے سر اٹھا لیا۔ تا خدمتِ اسلامی کی اس کوشش کو اپنے مقاصدِ ردیہ اور اغراضِ فاسدہ سے ناپاک کریں اور بندگانِ مخلصین نے جو نتائجِ حسنہ اپنے سالہا سال کے مساعی سے حاصل کئے ہیں انہیں پامال خود پرستی و خودنمائی کر کے باوجود اپنی پوری نااہلیت کے اس شعبہ کو بھی اپنے تکبّر و تفاخر کی بھینٹ چڑھاویں۔ استکباراً فی الارض ومکر السیّ۔

کچھ شک نہیں کہ شیطان کے افساد اور غرورِ باطل کا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جو ایک عظیم الشّان دینی تحریک کی تخریب کے لئے بصورتِ اشخاص و اعمال متشکل و متمثّل ہوا ہے اور وہ جب کبھی دنیا میں کام کرنا چاہتا ہے تو اس کا قدیمی قاعدہ ہے، کہ وہ خود نہیں آتا، اور جہل و باطل کے اندر سے اپنی آواز نکالتا ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔

پھر کیا وہ قوم جس نے اپنی بیداری و احتسابِ اعمال کے دعووں سے گذشتہ چھ سال کے عہدِ جدید میں ایک رستخیز ہنگامہ برپا کر دیا تھا، اس کو گوارا کر لے گی، کہ اس طرح محض اس کی غفلت و اغماض سے فائدہ اٹھا کر کفر ایمان کو اور باطل حق کو اور فساد اصلاح کو شکست دے دے۔

معزّز حاضرین! میرے لئے ناگزیر تھا کہ میں ان مشکلات کو آپ کے سامنے پیش

کروں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ اپنے محترم صدر کی ہدایت و رہنمائی سے مسلمانوں کیلئے ظروف و احوال کے مطابق کوئی صحیح اور موثر طریق کار تجویز فرمائیں گے جس سے ہم مسلمانوں میں صحیح اسلامی تڑپ پیدا کر سکیں اور تمام ان طاقتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ہماری دینی و دنیوی تباہی کے درپے ہیں۔ میں یہاں دلی رنج و اندوہ کے ساتھ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمہم اللہ تعالےٰ کی وفات حسرت آیات کا ذکر بھی آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں جن کے انتقال سے ملّتِ اسلامیہ کو نقصانِ عظیم پہنچا ہے۔ حضرت مرحوم کا وجودِ اقدس مشائخِ پنجاب میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا۔ حضرت کی امتیازی شان جو تمام مشائخ میں آپ کو ممتاز کئے ہوئے تھی وہ کذّاب قادیانی کے مقابلہ میں آپ کا علمی جہاد تھا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی نُصرت فرمائی اور آپ کی متعدد کتب فتنۂ مرزائیت کے استیصال کے لئے مقبول عوام و خواص ہیں، جن میں "سیف چشتیائی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ سب دعا فرمائیں۔ خداوند کریم حضرت پیر صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرماویں اور فتنۂ مرزائیت کے استیصال کے لئے ہمارے باقی مشائخ عظام کو ان کے اتباع کی توفیق ارزانی ہو۔

بہت بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے رفقائے کار خصوصاً حافظ محمد یار صاحب، حاجی محمد عبدالرشید صاحب صدیقی جنرل سیکریٹری مجلس احرار اسلام ملتان، خواجہ غلام حسن صاحب سوداگر و خازن مجلس، حاجی محمد عبدالرحمٰن صاحب نائب صدر مجلس احرار اسلام، برادرم ملک عبدالغفور صاحب انوری جنرل سیکریٹری مجلس استقبالیہ پنجاب پراونشل احرار پولیٹکل کانفرنس، حاجی محمد علی صاحب عزیزی شیخ اقبال احمد صاحب و جیوش احرار اسلام کا شکریہ ادا نہ کروں، جن کی انتھک شبانہ روز مساعی کا نتیجہ اس کانفرنس کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہو۔ اور ان دینی خدمات کا اجر جزیل انہیں دارین میں عطا فرمائے

آمین ثم آمین۔

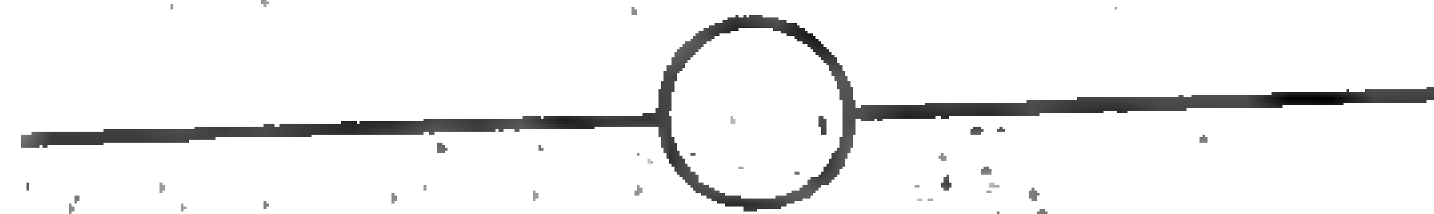
میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا، لیکن یہ اس دردناک داستان کا ایک ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے جس کے سننے اور طریقِ کار تلاش کرنے کے لئے آپ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں نے بعض گوشوں کے متعلق اشارات کر دیئے ہیں اور بس۔

آخر میں میں محترم صدر اور معززِ مہمانوں کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ان کے مکارمِ اخلاق سے امید کرتا ہوں کہ ان تمام کوتاہیوں کو جو مجلسِ استقبالیہ کی طرف سے فرائض میزبانی ادا کرنے میں واقع ہوئی ہیں، معاف فرما کر مستحقِ اجرِ جزیل ہوں گے۔

احقر

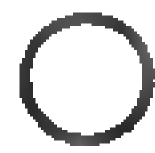
احسان احمد عفی عنہ

صدر پراونشل تبلیغ کانفرنس، ملتان

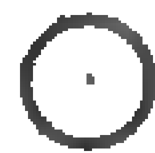


تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

تحریکِ عمل



یعنی وہ "خطبۂ صدارت" جو فخرِ نوجوانانِ اسلام مقرّرِ فصیح البیان سحبانِ پنجاب حضرت مولانا **قاضی احسان احمد صاحب** خطیب و متولی شاہی جامع مسجد شجاع آباد نے چیچہ وطنی کی احرار پولٹیکل کانفرنس منعقدہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اگست ۱۹۳۹ء میں ارشاد فرمایا



امیر! جمع ہیں احباب دردِ دل کیلئے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

بزرگانِ قوم! برادرانِ ملّت! و خواتینِ محصنات!

سب سے پہلے تو مجھے آپ کے شہر کے قومی معاملات کے اربابِ بست و کشاد کی غلط بخشیوں کا شکوہ و شکریہ کہنا ہے۔ شکوہ اس بات کا کہ موجودہ دور میں جبکہ سیاسیات کی کشمکش اپنے انتہائی عروج پر ہے، اور قومی معاملات کا الجھاؤ درجۂ کمال پر۔ قوم کو قوموں کے عروج و زوال کی داستان سنانے، اور اس کے سامنے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل رکھنے کے لئے مجھ ایسے ہیچمدان سے زیادہ عقل مند، زیادہ فصیح البیان اور زیادہ

نام آور بزرگوں کی ضرورت تھی۔ میری حیثیت تو (جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے) ایک سپاہی سے زیادہ نہیں، جس کا کام اطاعت و فرماں برداری کے حدود سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ خدا گواہ ہے کہ صدارت کے کانٹوں کا ہار نہ میرے قابل ہے اور نہ میں اس کے لائق۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس عزت افزائی کو غلط بخشی سے تعبیر کیا۔ لیکن بہر حال چونکہ سپاہی کا کام محض اطاعت ہے اور غلط بخشی ہی سہی مگر جب کہ صدارت کے اہم فرائض کا مجھے متحمل بنا دیا گیا ہے، اس لئے شکوہ ستم کے ساتھ ساتھ شکریہ ستم بھی ضروری ہے۔ میں آزارِ صدارت کا حریص نہیں تھا۔ یہ سچ ہی سہی مگر "یاروں نے بھی ستم سے ہاتھ نہ کھینچنا" ہی پیشہ بنا لیا۔ اس لئے اب "شکریہ ستم" بھی واجب آتا ہے۔ شاید "حریصِ لذتِ آزار" سمجھ کر آئندہ کیلئے جاں بخشی فرمائیں۔ بہر حال اس عزت افزائی کا شکریہ۔

مجلس احرار اسلام اور برادرانِ یوسف

ہمدردانِ ملت! مجلس احرار اسلام کی مقبولیت اور عوام میں اس کے اثر و رسوخ کے ہوتے ہوئے اگرچہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ آپ کے سامنے مجلس کے وجود کی ضرورت یا مجلس کے لائحہ عمل کی تشریح اور مجلس کے دائرہ عمل کے متعلق کسی قسم کی وضاحت کی جائے، مگر چونکہ "برادرانِ یوسف" نے مجلس کی تخریب و تکذیب کے سلسلے میں "اکلہ الذئب" کی قسم کے بہت سے اکاذیب و اباطیل کی بیش از بیش اشاعت کر رکھی ہے اور "دروغ گوئم بر روئے تو" کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مجلس کی پوزیشن واضح صورت میں ایک بار پھر آپ کے سامنے پیش کر دی جائے۔ تاکہ اس معاملے میں آپ کی بصیرت "لیطمئن قلبی" کا درجہ اختیار کر لے اور حق الیقین کی معارف پرور وادی میں آپ گامزن ہو سکیں۔ اور علیٰ وجہ البصیرت میری بات کی تصدیق کر سکیں جبکہ میں مجلس کی طرف سے گوش گذار کروں ؂

مجھ سا مشتاق نہ پاؤ گے جہاں میں ہرگز
گرچہ ڈھونڈھو گے چراغِ رُخِ زیبا لے کر

میرے بزرگو! مسلمانوں میں قومی کام کرنے والے اس وقت تین حصّوں میں تقسیم ہیں۔

۱: ایک تو وہ لوگ ہیں جن کی تمام دینی و دنیاوی آرزوئیں برطانوی استعمار سے وابستہ ہیں اور جو ہر حال میں راضی برضائے آقایانِ سفید فام ہیں۔ اسلامی ممالک کو غلام بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہوں یا مقاماتِ مقدّسہ فلسطین و عراق و حجاز کے باشندگان پر مظالم ڈھائے جا رہے ہوں، سرحد آزاد کے اسلامی قبائل کو تحفّظِ انسانیت (آزادی) کے جرمِ بے جرمی میں فنا کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہو اور ان کے بیوت و اموال کو ہوائی تاخت کے ذریعہ نیست و نابود کیا جا رہا ہو، یا اسلامیانِ عالم کی آخری متاع سیّدِ دو عالم فخرِ اُمم صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت و تاجِ نبوّت و ختمِ نبوّت کی توہین کی جا رہی ہو اور کھُلم کھُلا تاجدارِ مدینہ سے بغاوت کی تبلیغ کرائی جا رہی ہو، تہذیب کے نام پر اسلامی شعائر کے استیصال کی کوشش کی جا رہی ہو یا فوجی سپرٹ اور عسکریت کی نمائش میں اسلام کی سیزدہ صد سالہ بنیادوں کو الحاد و بے دینی کے بیلچوں کے ساتھ ہلایا جا رہا ہو، تو اُن کی وفاداری میں سرِمو فرق نہیں آتا۔ فخریہ لہجے میں حکومت کے آستان پر جبہ سائی کر کے اور ہاتھ جوڑ کے وہ لوگ ہمیشہ یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں ؎

اے در بقائے عمرِ تو خیرِ جہانیاں
باقی مباد ہر کہ نخواہد بقائے تو

ایسے لوگوں سے امید رکھنا کہ وہ آڑے وقت میں اسلام کے کام آئیں گے یا کسی وقت بھی اسلام کی کوئی اہم یا غیر اہم خدمت ادا کرنے کے قابل ہو سکیں گے، نہایت ہی غلط اُمید اور حد درجہ بے جا توقع ہے۔ ان لوگوں کا ایمان رسولِ عربی اور قرآن کی بجائے اساطینِ دولت اور تعزیراتِ ہند پر ہے اور اساطینِ دولتِ علیہ جو کچھ چاہتے یا کرتے ہیں وہ مسٹر الفنسٹن

کی یادداشت کے الفاظ میں یہ ہے۔

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے، اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخائر نسیا منسیا ہوتے جاتے ہیں۔"

بنابریں ایسے لوگوں کا تو خاتمہ پڑھئے اور قومی کاموں کے لئے ان کا دخل نہ صرف یہ کہ ناجائز ہے بلکہ مضر بھی ہے کیونکہ وہ تو اپنی افتاد طبیعت کے مطابق روایتی اعرابی کی طرح کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔

۲: دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو مفادِ ملّت سے بے نیاز ہو کر غیر ملکی حکومت کی بجائے ملکی سرمایہ داری کی غلامی پر قانع نظر آتے ہیں، جو کبھی تو گاندھی جی کی لنگوٹی کے پرستار نظر آتے ہیں اور کبھی اسلام کی عالمگیر شان کا استخفاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستانی کہلوانا بجائے خود کتنا ہی پرشوکت اور پرمحبّت کیوں نہ ہو، مگر وہ تو ہندوستانی اس لئے ہیں کہ کہیں مسلمان سمجھے جا کر ان کی قوم پرستی میں فرق نہ آ جائے اسلامی تہذیب و تمدّن کی بجائے ہندی یا ہندوستانی تہذیب و تمدّن کا علمبردار ہونا ان کے لئے باعثِ فخر اور وجہِ فوز و نجات ہے۔

ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اگر مسلمانوں کی قیادت دے دی جائے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لئے بھی یقیناً وہی راہِ عمل تجویز کریں گے جو وہ اپنے لئے کر چکے ہیں۔ اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے لئے آزادی و حریت کی انتہا یہ رہ جائے گی کہ ان کا آقا تبدیل کر دیا جائے۔ پہلے وہ سفید فام آقا کی خدمت میں مصروف کار تھے۔ تو آئندہ وہ سیہ فام آقا کے اشارہ چشم و ابرو پر رقص کا پروگرام بنائیں گے اور یہ یقینی بات ہے کہ کوئی صحیح الفطرت اس قسم کی قیادت کی اطاعت کا طوق برضا و رغبت اپنے

گلے میں نہیں ڈال سکتا۔

۳: تیسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو نہ تو برطانوی استعمار کے آلۂ کار بننا چاہتے ہیں اور نہ ہندوستانی سرمایہ دار کے دبیل۔ جو ملک کو آزاد کرانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور ہمسایہ اقوام کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنا اپنا جزوِ ایمان یقین کرتے ہیں، جن کا مطمحِ نظر علوِّ اسلام اور آزادیؔ و حریت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اسلام کی راہ میں جان نثار کر دینا اور اپنے خون کے آخری قطرہ تک کو بہا دینا وہ اپنا ایک اہم ترین فرض خیال کرتے ہیں۔ اور آزادی کی جنگ میں ہر قسم کی مساعی کو جاری رکھنا ان کا لازمۂ زندگی ہے۔ ہمسایہ اقوام اگر اس راہ میں کوشاں ہوں تو باعزت سمجھوتے کے ساتھ باوقار اشتراکِ عمل کرنے کو یہ ہر وقت تیار ہیں، اور اگر خدانخواستہ ہمسایہ اقوام غلامی پر قانع رہنے کا ارادہ کر لیں تو یہ اکیلے بھی آزادی کی راہ میں مٹ جانے کو فخر خیال کر کے غلامی پر قناعت کرنے کو ننگ خیال کریں گے۔

اس جماعت حقہ نے سالہا سال غور و فکر سے کام لیا اور سمجھ گئے کہ ملکی و ملّی مشکلات کے لئے ظواہر و فروعات سے متاثر ہونے کی جگہ کسی اصولِ حقیقی کی تلاش میں نکلنا چاہیئے انہوں نے دیکھا کہ اغیار کے سہارے تلاش کرنا اور محض سیاسی اُمور کے لئے سعی کرتے رہنا قبل اس کہ کوئی اساسی و اصولی اصلاح ہو جائے بیکار ہے۔ اوّل تو یہ تمام امور اصل مرض کا علاج نہیں ہیں بلکہ کسی حقیقی مرض کے نتائج و عوارض ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تمدنی حالت درست نہیں تو اس کا نتیجہ غفلت ہے کہ انہوں نے دنیا کی تمدنی ترقی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن غفلت کیوں ہے؟ قوائے عمل کیوں معطّل ہیں؟ اور ذہن و دماغ کیوں بے کار ہو گئے؟ اس کا سبب دریافت کیا جائے اور پھر اس کو دُور کیا جائے۔ جس کی وجہ سے بیداری کے بعد یہ غفلت طاری ہوئی۔ انتہائی غور و خوض اور مسلمانوں کے موجودہ اعمال و اطوار کا مطالعہ کیا تو انہیں نظر آیا کہ ان اعمال کی موجودگی میں محال ہے کہ حسبِ سنن طبعیہ کوئی قوم زندہ

رہ سکے۔ وہ تمام اعمالِ صحیحہ صالحہ جو حیاتِ اجتماعی و ملی کے لئے بمنزلہ روح و حرارت غریزی کے ہیں، مسلمانوں میں سے مفقود ہو رہے ہیں اور ہر عمل یا محرف یا مسخ شدہ ہے۔ پھر اس جماعت کے اکابر نے قوتِ روحانیہ عالیہ کو دیکھا جو آج تک مسلمانوں کے دلوں پر حکمران ہے۔ تو اس کے احکام و تعلیمات صادقہ کی روشنی میں نظر آیا کہ مسلمانوں کے تمام موجودہ اعمال و اطوار یکسر اس کی تعلیمات کے خلاف ہیں، اور اس کی تعلیم میں وہ تمام ارکان و اصول اکمل و اجمل صورت میں موجود ہیں جن کا انقیاد و عمل کسی قوم کی حیاتِ اجتماعی و سیاسی اور قیام مدنی و عمرانی کے لئے ضروری ہے۔ پس اس جماعت کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے اس فہم حقیقت کے لئے کھول دیا کہ مسلمانوں کے موجودہ امراض کا علاج اسی قانون کا اتباع ہے جس کے لئے قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

اور اس قانون کے سوا جو بھی عادات و اطوار ان میں رائج و ساری ہیں۔ ان کو یکسر موقوف کر دیا جائے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر اس جماعت نے اپنا دستور العمل اس طرح بنایا کہ سیاست و مذہب ممتزج ہو کے رہ گئے اور اگر اس دستور العمل پر صدق نیت سے عمل کیا جائے تو دنیا و دین سدھر جائیں۔ اس جماعت کا نام ہے "مجلسِ احرارِ اسلام"۔ اب یہ بات آپ کے عقل و نظر پر موقوف ہے کہ آپ پہلی دو جماعتوں میں سے کسی کو حقِ قیادت دیتے ہیں، یا آخری جماعت کے نظریہ کے ساتھ متفق ہو کر ایک مسلمان اور ایک حریت طلب سپاہی کی طرح اسلام و انسانیت کبریٰ (آزادی) کی خاطر سربکف ہو کر میدان میں آتے ہیں۔

موجودہ مسائل

بزرگانِ قوم! ان تمہیدی کلمات کے بعد جنہیں امید ہے کہ آپ نے غور و انہماک کے ساتھ سنا ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت قوم کے سامنے کیا مسائل درپیش ہیں، ان کا حل کیا ہے اور ان کے متعلق ہمیں کیا طریقِ عمل اختیار کرنا ہے۔ اور اس اجتماعِ عظیم میں ہمیں یہ

سوچنا ہے کہ ہم جو راہِ عمل اختیار کر رہے ہیں کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو وہ کونسے وسائل ہیں جن کے ذریعے سے ہم منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

کسان اور اس کے مصائب

موجودہ مسائل میں سے سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ کسانوں کا ہے۔ اس وقت جن مصائب و نوازل میں یہ غریب مبتلا ہیں ان کا بیان نہیں ہو سکتا۔ دن بھر محنتِ شاقہ کرنا اور راتوں کو فاقہ مستی کے ساتھ تارے گننا بلکہ اکثر راتوں کو بھی محنتِ شاقہ میں منہمک رہنا ان لوگوں کا ہمیشہ کا پروگرام ہے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ وہ محنتِ شاقہ میں مبتلا ہے کیونکہ اگر اتنی سی بات میں اس کی جان چھوٹ جاتی تو وہ صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کر لیتا۔ مگر اس کے بعد اُسے مالیہ اور معاملہ کے چکر میں پھنسا کر ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے اُسے قرض کے بوجھ تلے دبا دیا جاتا ہے جس سے موت سے پہلے اس کی نجات ناممکن ہو جاتی ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ قرضؔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی قرض سے چھوٹ پائے کیوں

معاملہ زمین کی تشخیص ہمیشہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کے لحاظ سے کی جاتی ہے، مگر ہندوستان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ قیمتیں آئے سال گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر معاملہ ہے کہ کسی صورت میں گھٹنے میں نہیں آتا۔ ۲۸ء اور آج کی نسبت اگر نکالی جائے تو قیمتیں آج آدھی رہ گئی ہیں اور قیمتوں کے اس قدر گر جانے سے کسانوں اور زمینداروں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ دنیا میں آج جو زرعی اور اقتصادی انقلاب آ رہا ہے، اس کے پیشِ نظر قیمتوں کے بڑھنے کی قطعاً کوئی امید نہیں کیونکہ یورپ اور امریکہ نے زراعت میں حیرت انگیز طور پر ترقی کر لی ہے۔ اس ترقی کے تین بڑے بڑے نتائج ہیں۔

۱: جھاڑ پیداوار فی ایکڑ بڑھ گئی ہے۔ مثلاً جاوا میں گنے کی پیداوار پہلے سے تگنی ہے۔

۲ : وہ علاقے جو پہلے بنجر تھے، اب زراعت کے کام آتے ہیں۔ کینیڈا میں دس کروڑ ایکڑ زمین میں جو پہلے خالی پڑی رہتی تھی، اب گیہوں بویا جاتا ہے۔ اسی طرح رُوس میں لاکھوں مربع میل خشک علاقے میں جہاں پہلے اُلّو بولا کرتے تھے، اب ہرے بھرے کھیت کھڑے لہلہاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پیداوار بڑھ جائے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آج پیداوار مانگ سے کہیں زیادہ ہے۔ دو تین سال ہوئے، جاوا میں گنے کی فصل بہت اچھی تھی مگر کاٹی نہیں گئی۔ کاٹ کر کیا کرتے۔ جب گاہک ہی موجود نہیں تھے۔ اسی طرح ممالک متحدہ شمالی امریکہ میں گیہوں ایندھن کی طرح ریل کے انجنوں میں جلایا گیا۔ برازیل میں قہوے کی لاکھوں بوریاں آگ کی نذر ہوئیں اور سمندر کی بھینٹ چڑھائی گئیں۔ کیوں؟ اس واسطے کہ ان کی پیداوار مانگ سے زیادہ تھی۔

۳ : یورپ اور امریکہ میں کھیتوں میں بھی کلوں کا استعمال ہوتا ہے جس کے باعث فصل پیدا کرنے کے اخراجات بہت کم ہو گئے ہیں اور کلوں نے یورپ اور امریکہ کی زراعت کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ کلیں کیا ہیں، بھوت ہیں جو دِنوں کا کام گھنٹوں میں کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کل والا ہل ایک دن میں بیس ایکڑ زمین میں ہل چلا دیتا ہے۔ ایک اور کل ہے جو فصل کاٹتی ہے، دانے الگ کرتی ہے اور اناج کو بوریوں میں بھر دیتی ہے۔ ہاتھ لگانے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ جو کام یہ کل ۴۵ منٹوں میں کرتی ہے۔ ہاتھوں سے کرو تو ۴۵، ۵۰ گھنٹے صرف ہو جائیں۔

زراعت میں کلوں کا استعمال، پیداوار کا بے تحاشا بڑھنا اور قیمتوں کا ایک دم گر جانا، ایک بڑے بھاری زرعی انقلاب کی نشانیاں ہیں۔ اس انقلاب کا ہمارے مُلک پر اور خاص کر کسانوں اور زمینداروں پر تباہ کن اثر ہوا ہے۔ ذرا غور تو فرمائیں کہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں ۱۷ کروڑ روپے کا گیہوں غیر ممالک نے ہندوستان سے خریدا، اور ۹۱ کروڑ روپے کی کپاس خریدی۔ پھر ۳۴-۱۹۳۳ء میں گیہوں کی برآمد کی کُل قیمت ۳ لاکھ روپے تھی۔ اب

۱۷ کروڑ کے مقابلے میں ۳ لاکھ کی حیثیت ملاحظہ فرمایئے۔ اور ۳۴-۱۹۳۳ء میں کپاس کی برآمد ۹۱ سے ۲۶ کروڑ رہ گئی۔ برطانیہ سے ایک معاہدہ ہوا جس کی تعریف کرتے حکام کی زبانیں خشک ہوئی جاتی ہیں۔ مگر اس معاہدہ سے جو فائدہ عظیم مترتب ہوا، اُسے بھی پیش نظر رکھئے۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے ہم سے کُل ۱۱ کروڑ روپے کا گیہوں خریدا اور ۳۴-۱۹۳۳ء میں کُل ۷ کروڑ روپے کا۔ ادھر ہمارا کپاس کا سب سے بڑا گاہک جاپان ہے۔ جاپان نے ۳۴-۱۹۳۳ء میں ½۱۰ کروڑ روپے کی کپاس خریدی۔ برطانیہ نے ½۳ کروڑ کی۔ چین نے بھی تقریباً ½۳ کروڑ کی۔ اور اٹلی نے ½۲ کروڑ کی۔ جب برطانیہ سے تجارتی معاہدہ کے متعلق بات ہوئی تو ہمارے نمائندوں نے برطانوی نمائندوں سے صاف کہا کہ برطانیہ میں غیر ملکی کپاس کی درآمد پر محصول لگانا چاہیئے اور ہندوستانی کپاس کے ساتھ ترجیحی سلوک ہونا چاہیئے جس طرح کہ ہم برطانوی کپڑے کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے ہوئے جاپانی کپڑے پر بھاری محصول عائد کرتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں صاف صاف جواب دے دیا گیا کہ یہ ممکن نہیں۔ وجہ یہ کہ ہماری کپاس کی خاطر برطانیہ اپنی صنعت کیوں خراب کرے۔ نیز اس کے سامنے تو بہرصورت اپنا ہی مفاد ہے اسے کیا ضرورت ہے کہ غلام اور ذلیل ہندوستان کے مفاد کو بھی پیش نظر رکھے۔ وہ مجبور تھوڑا ہی ہے یا یہ معاہدے کوئی مساویانہ معاہدے تھوڑے ہی ہیں۔ یہ معاہدے تو صرف دکھاوے کے معاہدے ہیں۔ اصل میں تو وہ بوٹ کی نوک سے یہ خدمت ہم سے لے رہے ہیں اور جب تک ہماری یہی حالت رہی کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس وقت تک ہماری یہی حالت رہے گی۔ خیر، گیہوں اور کپاس کی برآمد کا ذکر اس وجہ سے ضروری تھا کہ پنجاب کے کسان اور زمیندار کا انحصار اس برآمد پر ہے۔ ان دو چیزوں کی قیمتوں کے گرنے اور برآمد کے گھٹنے سے کم از کم بیس کروڑ روپے سالانہ پنجاب کو نقصان

ہوا ہے۔ جس طرح گیہوں کی برآمد گئی اسی طرح کپاس کی برآمد بڑھنے کی بھی توقع کم ہے اور اجناس کی طرح کپاس کی پیداوار بھی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ امریکہ کو کپاس کے کھیتوں میں دوبارہ ہل چلوا کر کھیتی کو ضائع کرنے کی ضرورت پڑی۔ امریکہ میں جان بوجھ کر پیداوار گھٹاتے ہیں تاکہ قیمت بڑھے، اور امریکہ نے ہمیں بھی پیداوار گھٹانے کو کہا ہے، بلکہ دھمکیاں دی ہیں۔ یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ جاپان ہماری کپاس زیادہ خریدے گا۔ جاپان تجارتی معاہدے کے سلسلے میں برطانیہ سے ناراض ہے، اور جاپان کا غصہ بجا ہے۔ برطانوی تجارت کو فروغ دینے کے باعث ہم اپنے کپاس کے سب سے بڑے گاہک سے بگاڑ بیٹھنے پر مجبور ہیں، کیونکہ ہم غلام ہیں اور برطانیہ کے اشارۂ چشم و ابرو کے سوا ایک قدم ہلا سکنے کے قابل نہیں ہیں۔ جاپان مانچوکو میں کپاس کی پیداوار بڑھا رہا ہے اور جوں جوں یہ پیداوار بڑھے گی، جاپانی کارخانہ دار ہندوستانی کپاس کے محتاج نہ رہیں گے۔ ایسے حالات میں جبکہ اجناس کی قیمتیں گر گئی ہوں اور برآمد کم سے کم ہو رہی ہو، تو زمیندار اور کسانوں کے معاملہ اور محصول ادا کرنے کی قابلیت بھی حد سے زیادہ گر گئی ہے اور اقتصادی حالات اور مذکورہ بالا حقائق کے ہوتے ہوئے آئندہ اس قابلیت کے بڑھنے کی کوئی اُمید بھی نہیں ہو سکتی۔ تو کیا گورنمنٹ کا فرض نہیں کہ وہ معاملۂ زمین میں بھی معتدبہ کمی کرے، جب کہ حکومت کا دعویٰ یہ بھی ہو کہ وہ زمینداروں کی حکومت ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ حکومت اس معاملہ کے معاملہ میں اپنی ضد اور ہٹ پر اڑی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ہونہار زمیندار کارکن میاں نور اللہ اور اپنے عزیز ترین دوست مخدوم رضا شاہ صاحب گیلانی کو ہاتھ سے کھو بیٹھی ہے۔ مگر ووٹ لیتے وقت جن وعدوں کی توثیق کی تھی، ان کے پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان حالات میں جب کہ گورنمنٹ کی رگِ گردن اکڑی ہوئی ہے اور وہ اپنے خیر خواہوں اور دوستوں تک کی پروا نہیں کرتی اور ان کی باتیں نہیں سُنتی، تو ہم تم کس شمار قطار میں ہیں۔ خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ سارے ہندوستان کی وزارتیں خواہ وہ

کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی (جیسے سندھ گورنمنٹ) وہ تو وزراء کے لئے پانسو ماہوار پر کفایت کرتے ہیں۔ مگر ہمارے وزراء ہیں کہ ان کے لئے پانچ ہزار سے کم کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ اگر یہ لوگ کسانوں اور زمینداروں کے خیر خواہ ہوتے تو کم از کم اپنی تنخواہوں میں بھی کفایت کرتے، اور خصوصاً انہیں تنخواہیں لینے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ وہ تو بڑے سرمایہ دار اور سب کے سب صاحبانِ جائداد ہیں۔ ان کا تو فرض تھا کہ وہ بغیر تنخواہوں کے اپنے بھائی بندوں کی خدمت کرتے مگر ایک طرف تو یہ کہ اپنی تنخواہوں میں ایک پیسہ کی کمی برداشت نہیں ہو سکتی، اور دوسری طرف یہ ضد کہ غریب زمیندار اور کسان کے ساتھ معاملہ کے بارے میں پائی بھر رعایت کرنے کے روادار نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ان لوگوں کو کس طرح اپنا ہمدرد اور خیر خواہ تصوّر کریں۔

زمیندارو اور کسانو! زمانہ بدل گیا ہے اور بدل رہا ہے۔ پہلے کے نرخ گئے اور پہلے کے سے منافع بھی گئے۔ اس وقت تو ناداری اور بربادی کا سامنا ہے۔ بھلائی چاہتے ہو تو مِل کر کام کرنا سیکھو۔ آپس کی سر پھٹول اور تفرق کو یکسر ختم کر دو۔ آپس کی مقدمہ بازیاں اور عدالتی کارروائیاں یک قلم بند کر دو۔ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے کی بجائے آپس میں گھر بیٹھ کر فیصلہ کر لیا کرو۔ بُری رسوم و عادات یکسر بند کر دو اور سر جوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ اپنی اقتصادی حالت پر غور کرو، ابتری کے اسباب معلوم کرو اور بہتری کی سبیل نکالو۔ آخر کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہو گے۔ اپنے مفاد کی خاطر لڑنا سیکھو۔ اپنے اندر تنظیم اور جتھہ بندی کی طاقت پیدا کرو۔

مجلس احرار تمہاری ہر قسم کی امداد کو تیار ہے۔ بلکہ حالات ایسے بناؤ کہ تم خود مجلس احرار بن جاؤ، اور پھر خود ہی آپ اپنی امداد کر سکنے کے قابل ہو جاؤ۔ اس موقع پر مجھے اپنے ایک بزرگ کا ایک خطاب یاد آگیا جو انہوں نے نہایت بلیغ انداز میں ہندوستان اور پنجاب کے کسانوں سے عموماً اور مسلمان زمینداروں اور کسانوں سے خصوصاً کیا تھا۔ اسے دہرائے بغیر

میں آگے نہیں چل سکتا۔ بہت ممکن ہے، ان الفاظ سے آپ بھی اثر پذیر ہو سکیں۔ سنیئے :۔

"اے ہندوستان اور پنجاب کے مزدورو اور کسانوں! اپنی خوابِ غفلت سے جاگو اور اپنی حالت کو بدلنے کے لئے خود تیار ہو جاؤ۔ اگر تم اپنی مصیبتوں کو دُور کرنے کے لئے جد و جہد نہ کرو گے تو کوئی تم پر رحم کیوں کرے گا۔ افلاس اور تنگدستی کی بیماریوں کو دُور کرنے کے لئے تمہاری قوتِ عمل ہی بہترین دوا ہے۔ اُٹھو، اور خود ہی اپنا علاج کرو اور ایسے ڈاکٹروں کے بھروسے پر نہ رہو جو مریض کی حالت کو دیکھ کر فوراً یہ کہتے ہیں کہ ہاں اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا، لیکن ساتھ ہی فیس طلب کرنے میں جلدی کرتے ہیں، اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ ایک اور مریض کو دیکھنے جانا ہے حالانکہ فکر یہ ہوتی ہے کہ مریض جلدی جان نہ دے دے اور اپنے کشتہ ناز کی لاش پر کھڑے ہو کر فیس مانگنا مشکل نہ ہو جائے۔ میں مسلمان مزدوروں اور کسانوں سے خاص طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم کو کیا ہو گیا، تم کو کون سا سانپ سُونگھ گیا۔

اے ہندوستان کے مسلمان! کیا تو اس بات کو نہیں دیکھتا کہ تیری حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ تیری جائیدادیں رہن اور بیع ہوتی جاتی ہیں۔ تیرا قرضہ اور قرضہ کا سود روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تیری روزی کم ہوتی جا رہی ہے۔ تیری بیکاری میں اضافہ ہو رہا ہے اور پھر تُو اس خیال میں ہے کہ برطانوی حکومت سے منصفانہ تعاون ہی تیری نجات کا ذریعہ ہے۔ ذرا یہ تو سوچ کہ انگریز کے آنے سے پہلے تو کیا تھا اور انگریز کے آنے کے بعد تُو کیا ہو گیا۔ انگریز کے آنے سے پہلے تو اس علاقے میں بھی حاکم و بادشاہ تھا، جہاں آج تو تین فیصدی اور چار فیصدی ہے، لیکن انگریز کے آنے کے بعد تو اس علاقہ میں بھی مصیبت زدہ اور مقروض ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ تو غلاموں کا غلام ہے جہاں تیری آبادی ۸۰ یا ۹۰ فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، کیا مظفر گڑھ اور اس کے ارد گرد کے اضلاع کی یہ کیفیت نہیں ہو چکی کہ وہاں قرضہ میں بہو بیٹیاں گرو ہوتی ہیں؟ حالانکہ کوئی قانون ایسے

رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کمزور اور بزدل افراد اور قوموں کو کوئی قانون نہیں بچا سکتا۔"

میں پوچھتا ہوں کہ مسٹر منوہر لال اور چھوٹو رام اور سندر سنگھ مسلمان ہیں؟ آپ کہیں گے نہیں۔ تو ان کے ساتھ تعاون جائز ہے؟ ان کے ساتھ مل کر وزارتیں بنائی جا سکتی ہیں؟ ان کے ساتھ شیر و شکر کی طرح مِلا جا سکتا ہے، لیکن ستیہ پال اور گوپی چند کے ساتھ مل کر وزارت بنائی جائے تو یہ ہندوؤں کے ہاتھ بکنا متصور ہوگا۔ خدا کے واسطے ذرا تو سوچو، منوہر لال اور ستیہ پال میں کونسا بزرگ زیادہ متعصب اور مسلمانوں کے لئے زیادہ خطرناک ہے؟ اگر سر سکندر، منوہر لال کے ساتھ مل کر وزارت کا کام چلائے تو وہ تو پکّا مسلمان اور اس کے اسلام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ لیکن مظہر علی اظہر، ستیہ پال یا گوپی چند کے ساتھ مل کر وزارت مرتّب کرے تو کافر ہی نہیں، کافر پرست ٹھہرے۔ اللہ اللہ۔ سر سکندر حیات خان اگر راجہ نریندر ناتھ کو چچا بھی کہہ دیں تو ان کے اسلام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن افضل حق اگر چمن لال کو برخوردار کہہ کے بھی پکارے تو وہ نا مسلمان اور غدار۔ مسلمانو! خدا کے لئے ذرا تو سوچو کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میرے بزرگو! اصل بات یہ ہے کہ انگریز کی استعمار پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آج ہندو مسلم آپس میں مل کے نہ بیٹھ سکیں۔ وہ ایک طرف ہندو کی پیٹھ ٹھونکتا ہے کہ خبردار مسلمان کے پاس تک نہ پھٹکنا۔ دوسری طرف مسلمان سے کہتا ہے، کہ دیکھنا کہیں ہندو کا سایہ تم پر نہ پڑ جائے، اس کا واحد مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپس میں لڑ کر اسکی حکومت کو مضبوط بنائیں۔ ہم آپس میں دست و گریباں رہیں، اور وہ مزے سے حکومت کریں۔ غرض ہندو اور مسلمان دونوں کو سوچنا چاہیئے کہ ان کا اصلی دشمن کون ہے؟ پہلے اس سے نپٹ لیں۔ باقی رہا بھائی بھائی کا معاملہ تو یہ گھر کا کام ہے، بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔

تنظیم اور عسکری قوت کا جال

عزیزانِ قوم! جس طرح کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہمارا فائدہ جتھہ بندی اور تنظیم

میں ہے۔ اس واسطے ہمیں آپس میں متحد ہو جانا چاہیئے۔ اسی طرح قوم کے راہنماؤں نے یہ بھی سوچا ہے کہ تنظیم کے ساتھ ہمارے لئے عسکری قوت اور رضا کارانہ سپرٹ بھی ضروری ہے تاکہ ہم وقت آنے پر جانبازانِ قوم کو آگے رکھ سکیں اور اپنے حقوق اور آزادی کی خاطر لڑ سکیں۔ یہ سب درست اور سب ٹھیک ہے۔ لیکن آپکو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے نیک کام اور ایسے پاک مقصد میں بھی ہمارے ساتھ، قوم کے ساتھ اور ملّت کے ساتھ دھوکا اور فریب ہو رہا ہے۔ بعض سرکاری پنشن خواروں سے ایسی تحریکیں بھی جاری کرا رکھی گئی ہیں جن کا مقصد بظاہر عسکری تنظیم اور جتھہ بندی ہے مگر در اصل یہ مسلم نوجوان کے ساتھ دھوکا بازی ہے۔ چونکہ معلوم ہے کہ اب مسلمان بیدار ہو رہا ہے اور ضروری طور پر ایسے موقع پر وہ تنظیم کے اندر آنے اور اپنے اندر عسکری ڈسپلن پیدا کرنے کی خواہش کرے گا، اس لئے پہلے ہی ایک خود کاشتہ پودے کو اس کام کے لئے تیار کر دیا گیا کہ وہ بغیر کسی مقصد، بغیر کسی مطمحِ نظر کے ملّت کو اکٹھا کرنے کا کام کرے اور اس کا واحد مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس ظاہری فریب میں پھنس کر حقیقی راہِ نجات سے بھٹک جائیں، اور پھر جب اس تنظیم کے ساتھ ساتھ الحاد و زندقہ کی دکان بھی کھول لی گئی ہے تو سمجھئے استعمار پرستانہ مقاصد کو اور بھی تقویت پہنچ رہی ہے۔ کیا کوئی نیک نیّت آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تنظیم اگر مسلمانوں کے مقاصد کے لئے ہو تو اس میں یہ شرائط بھی ہوں کہ انگریز بچہ تو جہاں ملے، اس کے لئے مرغی انڈے اور دوسرا سامانِ عیش مہیا کرو۔ اس کے گھوڑے کی لید تک بھی صاف کر دو۔ لیکن اگر ایسا مسلمان مل جائے، جسے تمہارے ساتھ کچھ اختلاف ہے، تو اُسے قتل کر دو۔ ایسے مسلمانوں کو زندہ رہنے کا حق بھی نہ دیا جائے، جو اُن سے نیک نیّتی کے ساتھ اختلاف رکھتے ہوں ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

کیا یہ مسلمانوں کی تنظیم ہے، کہ مسلمان کو تو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دیا جاتا

اور انگریز کی لید تک صاف کرنے سے عار نہیں ؟ پھر اس کے ساتھ ساتھ کبھی اس پر بھی غور ہوا کرے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہمارے منہ سے ذرا سا کوئی لفظ ایسا نکل جائے جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہو، کہ ملک معظم کی رعایا کے درمیان اس سے تفریق ہو سکتی ہے، تو ہمارے اُوپر مقدمے چلائے جاتے ہیں۔ ہمیں جیل بھیج دیا جاتا ہے، لیکن ہمارے منظم صاحب لوگوں کو علانیہ قتل کی دھمکیاں دیتے پھرتے ہیں اور ان سے نہیں پوچھا جاتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ آخر یہ بھید کیا ہے؟ کیا جنہیں قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں وہ ملکِ معظم کی رعایا نہیں سمجھے جاتے، یا تفریق پیدا کرنے سے قتل کرا دینا زیادہ جرم نہیں ہے؟

میرے دوستو! اصل بات صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ خود سرکار کے کاشتہ پودے ہیں ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلم نوجوان کے رجحانات کے مطابق انہیں ایک سراب دکھایا جاتا رہے تاکہ اصل پانی اور مارزلال کی تلاش کرتے کرتے کہیں وہ منزلِ مقصود پر نہ پہنچ جائیں۔ ایسے لوگوں کی تنظیم کا واحد مقصد صرف مسلمان نوجوان کو سیاسی کارکنوں کی زد سے بچانا ہے اور بس۔ اس واسطے میں نوجوان دوستوں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ انہیں عسکری تنظیم کے لئے مجلس احرار اسلام کے جھنڈے تلے ہی جمع ہونا چاہیئے، جس کی جانبازی ایک مجرّب اور آزمائی ہوئی چیز ہے اور ایسے ہر ادارے سے بچنا لازمی ہے جو بظاہر تو عسکری تنظیم کا حامل ہے مگر بباطن اہمال و بےکاری اور بےعملی و بےحسی کا پیدا کرنے والا اور اغیار کے ہاتھ مضبوط کرنے والا ہو۔ اُمید ہے کہ آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

کچھ خواتین کے متعلق

چونکہ اوّل میں خطاب خواتین سے بھی تھا۔ اس لئے ان کے متعلق خطبے میں کسی قسم کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی اور جب کہ ہماری زندگی میں ان کی حیثیت برابر کی شریک ہے اور بعض حیثیتوں سے شریک غالب کی ہے تو ان کے متعلق خاموشی شاید جرم ہی شمار ہوگی خواتین محترمات کی حیثیت ہماری ملت کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت ہے۔ بچوں کے لئے ان کی حیثیت اوّلین مربّی اور اوّلین استاد کی سی ہے۔ بچپن میں جس قسم کے خیال ماؤں کی گود میں ان کے ذہن نشین ہوں گے، وہی خیالات جوانی میں پختہ ہو کر قومی عادات بنیں گے ؎

سبق آموزِ فطرت، فطرتِ خاموش ہے اس کی
جہاں کی درس گاہِ اوّلیں آغوش ہے اس کی
نکل پڑتے ہیں بے کھٹکے جہادِ زندگانی میں
نوا زن گوش میں اب تک صدائے دوش ہے اس کی

قومیں افراد سے بنتی ہیں۔ قوموں کے اخلاق کی شستگی اور شائستگی افراد کے اخلاق کی شستگی اور شائستگی پر موقوف ہے، اور افراد کے اخلاق تب شستہ و شائستہ ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے گھر کی تربیت ایسی ہو جس سے شستگی و شائستگی ٹپکے اور گھر کی تربیت تب بہتر ہو سکتی ہے جب گھر کی ملکہ اس قابل ہو کہ وہ گھر کو جنت نگاہ بنا سکے اور گھر کی مالکہ ایسی ہو جو اپنے زیر نگران افراد کی ہر قسم کی علمی و عملی تربیت کر سکنے کے قابل ہو۔ علامہ مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشف اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما — موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما　　　　در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

مائیں اگر عبداللہ بن زبیر کی والدۂ محترمہ کی طرح ہوں تو بچے سرفروش پیدا ہوں گے، اور ملک و ملّت کے بہی خواہ - وہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا کہ جب حجاج کے مقابل میں ابنِ زبیر کی ساری فوج کام آگئی اور آپ اکیلے رہ گئے تو اپنی والدۂ محترمہ کے پاس پہنچے، کہ اب آپ فرمائیں تو میں حجاج سے صلح کر لوں - مائیں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ وہ اپنے بچوں کی جان بچانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتیں - لیکن ابوبکرؓ کی تربیت یافتہ بیٹی نے گرج کر فرمایا تم اپنے آپ کو پہلے حق پر سمجھتے تھے یا نہیں - ابنِ زبیر نے عرض کی کہ میں اپنے آپ کو ہمیشہ حق پر سمجھتا تھا اور حق کی خاطر ہی میں نے یہ لڑائی مول لی - تو ماں نے جلال میں آکر فرمایا، کہ مسلمانوں کی گردنیں کٹ جانے کے بعد اب وہ حق، حق نہیں رہا؟ عبداللہ ابن زبیر کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا اور وہ باچشمِ پُرنم والدہ سے رخصت ہو کر دشمن کی فوج کے مقابل میں گئے اور سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر خود شہید ہو گئے، اور دنیا پر ثابت کر گئے کہ حق کی خاطر جان دے دینا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔

لیکن اگر مائیں آج کل کی مائیں ہوں، جو بچپن ہی سے بچوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں - کبھی ان کو بلّی سے ڈرایا جاتا ہے اور کبھی چوہے سے - کبھی کتّے سے خوف دلایا جاتا ہے اور کبھی نادیدہ بلا سے، تو بچّے بھی ماشاءاللہ ہمارے جیسے سورما اور بہادر پیدا ہو رہے ہیں - جو رات کا اندھیرا تو بجائے خود دن کی روشنی میں اپنے سائے سے ڈرتے پھرتے ہیں، اور ہر اس مصیبت کو برداشت کر لیتے ہیں جو اُن کے سر پر ناکردہ گناہی کی وجہ سے آجائے۔

خواتین و حضرات! اگر آپ سوچیں تو قوموں کی سیرت ماؤں کی گود میں بنتی ہے علّامہ فرماتے ہیں

نیک اگر بینی امومت رحمت است　　　　زانکہ او را با نبوّت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است　　　　سیرتِ اقوام را صورت گر است

گفت آں مقصود حرفِ کن فکاں　　　زیرِ پائے امّہات آمد جناں
ملّت از تکریمِ ارحام است و بس　　　ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

اگر آپ چاہتے ہوں کہ آپ کے بچے بھی کل عمرو بن کلثوم تغلبی کی طرح دُنیا سے علی الاعلان یہ کہہ سکنے کے قابل ہو سکیں ؎

متی ننقل الیٰ قوم رحانا　　　یکونوا فی اللقاء لها طحینا
نسمی الظالمین وما ظلمنا　　　ولکنا سنبدأ ظالمینا
الا لا یجهلن احد علینا　　　فنجهل فوق جهل الجاهلینا
متی یبلغ الفطام لنا صبی　　　تخر له الجبابر ساجدینا

تو آپ کو ماؤں کی سیرت بدلنی ہو گی۔ وہ سیرت کیا ہونی چاہیئے؟ اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے کہ وہ سیرتِ فاطمۃ الزہرا ہو ؎

نورِ چشمِ رحمۃ اللعالمین　　　آں امامِ اوّلین و آخرین
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید　　　روزگارِ تازہ آئین آفرید

اور یہ سیرت دینیات کی خانگی تعلیم سے میسّر آئے گی، یہ سیرت قرآن پڑھنے پڑھانے سے آئے گی۔ حاشا و کلا یہ سیرت آپ کے گرلز سکول ہرگز ہرگز نہیں پیدا کر سکتے۔

حضرات! آپ نے میرے معروضات کو جس طرح ہوش سے سُنا۔ اس کا شکریہ، اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ حتی الامکان ان معروضات پر عمل پیرا ہونے کی بھی کوشش کریں گے اگرچہ بعض باتیں اشاروں کنایوں میں کہی گئی ہیں مگر امید ہے کہ آپ مقصود کو پہنچ گئے ہوں گے۔

ز بیرونِ در گذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

ب تقاریر

روزنامہ "آزاد" لاہور، ۲۴ر جنوری ۱۹۴۷ء

مولانا قاضی احسان کا دورۂ یوپی

متعدد مقامات پر اہم اجتماعات

کرتپور۔ ضلع بجنور، ۱۶ر جنوری ۱۹۴۷ء کو حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب، شجاع آبادی صدر شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند صوبہ یوپی کے دورہ کے لئے پروگرام کے مطابق روانہ ہو کر کرتپور ضلع بجنور تشریف لائے اور جناب مفتی اقتدار حسین صاحب نائب صدر مجلس احرار اسلام صوبہ یوپی کے دولت کدہ پر قیام پذیر ہوئے۔ صبح و شام بلکہ ہمہ وقت مذاکرات ہوتے رہے اور ہر مجلس میں مختلف موضوع زیر بحث رہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ علم و عرفان کی بارشیں ہو رہی ہیں اور تشنہ کام سیراب ہو رہے ہیں۔ مختلف ذہن کے لوگوں نے اپنے اپنے شبہات کو ظاہر کر کے ان جلسوں میں کچھ اور ہی رنگ پیدا کر دیا۔ بحمد اللہ ہر شخص مطمئن ہو کر جاتا رہا۔ بروز جمعہ جامع مسجد میں جلسہ ہوا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ حضرت مولانا نے خطبۂ جمعہ و نماز جمعہ پڑھائی۔ خطبۂ جمعہ اگرچہ عربی میں تھا لیکن کچھ پڑھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ حاضرین پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور ہر ایک نمازی کی چشم پرنم تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر جلسہ زیر صدارت الحاج نظام الدین صاحب صدر مجلس

احرار اسلام کرنٹ پور شروع ہوا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد منشی احتشام الحسن صاحب
سالار نے ایک پُر جوش نظم پڑھی۔ زاں بعد مولوی یقین الدین آفس سیکرٹری احرار
صوبہ یو پی نے حضرت قاضی صاحب کا تعارف کرایا۔ حضرت قاضی صاحب نے
خطبۂ مسنونہ اور آیاتِ قرآنی تلاوت کرنے بعد اسلامی تعلیمات کو بیان فرماتے ہوئے
مسلمانانِ ہند کی موجودہ مشکلات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ہم پر یہ مادی ادبار کیوں آیا۔
اس لئے کہ کلمہ طیّبہ کے اقرار کے بعد ہم نے عملاً اسلام کے ہر اصول سے بغاوت کی۔ نہ
ایمان رہا نہ جذبۂ جہاد۔ اسی وجہ سے ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ آج بھی اگر
ہم خالقِ حقیقی کے تابعدار ہو جائیں، تو اس کی مخلوق بھی ہماری مطیع ہو جائے اس پر
مزید آیاتِ قرآنی تلاوت فرمائیں اور ابو داؤد کی حدیث پڑھتے ہوئے فرمایا کہ میرے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت پر سب سے بُرا وقت وہ ہوگا، کہ جب
میری اُمّت وہن میں مبتلا ہو جائے گی۔ عرض کیا غلامانِ نبی نے کہ یا رسول اللہ وہن
کیا ہے تو فرمایا کہ دنیا کی محبت اور خدا کا ڈر۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ بدقسمتی سے
آج مسلمانوں میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ آج مسلمان کو یہ سبق دیا جاتا ہے
کہ تجھ کو غیر مسلم کہا جائے گا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور مسلمان کی توہین نہیں
ہو سکتی کہ اس میں احساس کہتری پیدا کیا جائے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر آج
مسلمان اللہ کے رسول کی اطاعت اور مرنے کا جذبہ پیدا کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت
ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں پر مولانا نے رضا کارانہ نظام کو مضبوط
کرنے کے لئے اپیل کرتے ہوئے فرمایا کہ جن صوبوں میں ہم اقلیّت میں ہیں، وہاں
ہمیں باعزّت زندگی بسر کرنا ہے اور جہاں ہم اکثریت میں ہیں، وہاں غیر مسلموں کے
ننگ و ناموس کی حفاظت کرنا ہمارا مذہبی و مِلّی فریضہ ہے، اور اسلامی زندگی سے
ہم کنار ہو کر زندگی گذارنا ہے۔ بہار کے حادثۂ عظیم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

اگر اتنے مسلمانوں کا خون کسی بہادرانہ اور اسلامی نظام کے ماتحت بہا ہوتا، تو مسلمانانِ ہند کی تقدیر بدل گئی ہوتی، اور ان کا سر بجائے ناکامی کے کامیابی سے سرفراز ہوتا۔ موت بہادر کو بھی آتی ہے اور بزدل کو بھی۔ بہادر میدانِ جنگ میں مرتا ہے، اور بزدل گھر میں۔ یہاں پر موت و حیات کا نظریہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ؎

کھول کے بیان کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگِ حیات بے شرف

اقبؔال کی زبان نے کیا خوب ہی ادا کیا ہے اور اعلان فرمایا کہ ہم اپنا نظام زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور دیکھیں گے کہ ہماری مرضی و منشا کے بغیر جو آئین ہم پر مسلّط کیا جائے گا ہم اُسے خاکِ نامرادی میں دفن کر دیں گے مسلمانو! اگر برطانیہ کے مظالم ہمیں نہیں مٹا سکے تو عددی ہندوستان کی اکثریت بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہاں ہمارا یہ خطرہ صحیح ہے کہ جنہوں نے انگریز کی تہذیب کو اپنا لیا وہ ہندو کی تہذیب کی بھی نقالی کریں گے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اسلامی سیرت و صورت اختیار کرنے کے لئے ایمان افروز انداز میں خطاب فرمایا جس کا حاضرین پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ زاں بعد قاضی صاحب نے احرار رضا کاروں کو جو صف بصف کھڑے تھے، ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم کو سچا اسلام کا سپاہی بنتے ہوئے بلا امتیاز مذہب و ملّت ہر ایک کی حفاظت کرنا ہے اور خود بھی ہندوستان میں باعزّت رہنا ہے اور دوسروں کی عزّت کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ مسلمان نوجوانو! خود اعتمادی پیدا کرو۔ سیرت و صورت اسلامی بناؤ، اور ثابت کرو کہ حقیقی امن نبی امّی ہی کی اُمّت قائم کر سکتی ہے۔ اس نعرہ کو چھوڑ دو کہ ہمیں ہندو کھا جائے گا۔ مسلمان کو ہندو تو نہیں کھا سکتا۔ ہاں یہ ڈر ضرور ہے کہ

مسلمان کو نبی کریمؐ کی نافرمانی ضرور کہا جائے گی۔

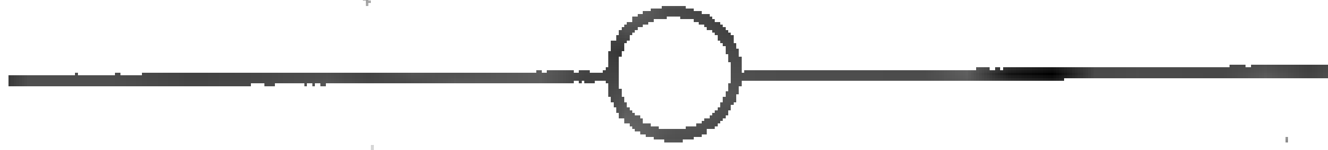
مسلمانو! خدا کے آگے جھکو اور خدائی جھکا لو۔ تقریر کیا تھی، اسلامی تعلیمات کا نچ[ڑ]
تھا۔ یہ حیاتِ اسلامی کا درس مسلسل ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا اور آپ کی تقریر د[عا]
پر ختم ہوئی۔ اختتامِ جلسہ پر کئی بے نمازیوں نے جو جوان تھے، نماز کو پابندی سے پڑھنے [کا]
اقرار کیا۔ کئی نوجوانوں نے داڑھی رکھنے کا اقرار کیا۔ نیز اپنے آپ کو نوجوانوں نے رضاکار[ی]
کے لئے بھی پیش کیا۔

مراد آباد - ۱۸ر جنوری ۴۷ء کو حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی
صدر شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند، دفتر احرار مراد آباد میں تشریف لائے۔ آتے ہی
مذاکرات اور بحث و مباحث شروع ہو گئے۔ قاضی صاحب موصوف کی اطلاع مراد آباد
شہر میں پہلے ہی سے ہو چکی تھی۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ روانگی کے وقت تک جاری رہا۔

۱۹ر جنوری کو بعد نماز عشاء شاہی مسجد میں زیر صدارت جناب بھائی محمد ابراہیم صاحب
جلسہ شروع ہوا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد کیپٹن ریاض الدین صاحب
جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام نے پُر جوش نظمیں پڑھیں اور مولوی یقین الدین صاحب
آفس سیکرٹری صوبہ یوپی نے مختصر الفاظ میں قاضی صاحب کا تعارف کرایا۔ زاں بعد قاضی
صاحب موصوف نے تقریر شروع کی۔ نعرہ ہائے تکبیر سے شاہی مسجد گونج اٹھی۔ موجودہ
حالات کی روشنی میں مسلمانوں کی تباہ حالی کا نقشہ اور اس کا حل جس انداز میں پیش کیا،
وہ قاضی صاحب کا ہی حصہ ہے۔ نبی کریمؐ اور سلف صالحین کی زندگی پیش کرتے ہوئے
فرمایا کہ مسلمانو! اپنی زندگی اور صورت و سیرت کو دیکھو۔ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے
ہیں لیکن اللہ و رسول کے ہر احکام سے بغاوت کئے ہوئے ہیں اور پھر کہتے ہو کہ ہمیں ہندو
کہا جائے گا۔ امن کی تلاش ہے لیکن کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمانو! اللہ اور اللہ کے رسول
سے وفاداری کرنا سیکھو۔ امن صرف معلم محمدؐ کے لائے ہوئے پروگرام پر ہی عمل کرنے سے

حاصل ہوگا۔غرض اسلامی تعلیمات کی ضیا باریاں عجب سوز سے ہورہی تھیں۔حاضرین تھے کہ عجیب وجدانی کیف میں تھے۔نوجوانوں اور بوڑھوں نے قاضی صاحب سے عہد کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت مجاہدانہ رنگ ہی میں اختیار کریں گے۔جلسہ بڑی کامیابی سے دُعا پر ختم ہوا۔

۲۰ر جنوری کو انصار سکاؤٹ نے قاضی صاحب اور دیگر کارکنوں کو چائے کی پُرتکلف دعوت دی۔کیپٹن صاحب اسکاوٹ نے بڑی محبت وخلوص سے استقبال کیا۔چائے نوشی کے بعد قاضی صاحب نے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ بھائی اسلام کے باعمل سپاہی بنو۔خدا غازی بننے کی توفیق بخشے، اور موتِ شہادت نصیب فرمائے۔



روزنامہ آزاد، ۱۲ر فروری ۴۷ء

قاضی احسان کی تقریرِ سیرت

"مدینہ کی گلیوں میں چلنے پھرنے والا قرآن جس نے راہزنوں کو راہبر بنا دیا"۔

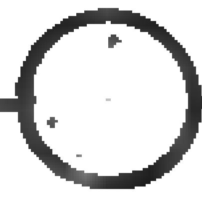
گجرات۔ ۳۱ر جنوری۔ آج مجلس احرار اسلام گجرات کا ایک عظیم الشان جلسہ زیرِ صدارت ڈاکٹر عبدالقادر صاحب جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ چونکہ حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی تشریف آوری کی اطلاع بذریعہ روزنامہ آزاد پہلے ہو چکی تھی اور اعلانات بھی کر دیئے گئے تھے، اس لئے مہر جوہر صاحب میونسپل کمشنر جہلم معہ ارکان مجلس و جیش احرار جہلم سے ۳۰ر جنوری کو تشریف لے آئے تھے۔ لالہ موسیٰ اور جلال پور جٹاں و دیگر ملحقہ جات کے لوگ بھی جوق در جوق پہنچ گئے۔ جامع مسجد اشاعۃ القرآن ٹھیک دس بجے بھر گئی۔ علاقہ کے علمائے کرام بھی تشریف فرما تھے۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد جناب جوہر جہلمی صاحب نے نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے دل آویز انداز میں کلامِ حق سے نظامِ حق پر مفصل تقریر فرمائی۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے جناب قاضی صاحب صدر شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند تشریف لائے اور صدر صاحب کے تعارف کے بعد تقریر شروع فرمائی۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد آیۃ کریمہ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰن اور اس کا ترجمہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ جس طرح قرآن کریم انسانی ترقیوں کے تمام مدارج و مراحل میں صحیح راہنمائی کرتا ہے، اس طرح سیرت رحمۃ اللعالمین بھی انسانی زندگی کی تمام ممکن راہوں کی راہبر ہے۔ قرآن کریم علم الادیان کی لامحدود کائنات ہے اور سیرتِ پیغمبر

آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم ، اسی عمل کا، تاقیامِ قیامت لامحدود عالم کائناتِ اسلامی نہ قرآن کے علم کا جواب لاسکی اور نہ حضور کے عمل کا۔ حضور نبیؐ کی سیرت کے متعلق محبوبۂ حبیبِ خدا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد کتنا جامع ہے کان خلقه القران ۔ قرآن کریم کی عملی تفسیر ہی کا دوسرا نام سیرت ہے۔ یہ اسی سیرت مقدس کا اثر تھا جس نے چوروں کو چوکیدار، راہزنوں کو راہبر، دختر کُشوں کو یتیم پرور بنادیا تھا ہزارہا اصنام کے پجاری خدائے وحدہٗ لاشریک کے صرف پرستار ہی نہیں، بلکہ توحیدِ خالص کے علمبردار بن گئے۔ یہاں پر قاضی صاحب نے سیرتِ صحابۂ کرام کے حصص بھی پرسوز طریقے سے بیان کئے۔ دبستانِ مصطفٰے کے تربیت یافتگان جن کا تزکیہ نبی مزکّی نے کیا تھا، سیرتِ رسولؐ کا نتیجہ کے لحاظ سے ایک اہم حصہ ہے، اور زندگی کی ہر اہم ضرورت کے متعلق حضورؐ کی صحیح راہنمائی کو بالوضاحت بیان کرتے ہوئے اسی سیرتِ اقدس کے اتباع کی تلقین کی حق و صداقت کے غلبہ کی اہمیت جتلاتے ہوئے آپ نے کہا کہ حق و صداقت پر ثابت قدم رہنا ہی بڑی کامیابی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اہلِ حق بظاہر کامیاب بھی نظر آئیں، لیکن ان کا نصب العین ایسا ہوتا ہے کہ ؏

بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر

آج مشرک بھی توحید کا دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آج ہندو ہو یا عیسائی سب یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی توحید کو مانتے ہیں۔ یہ ہے حضورؐ کی سیرت کی فتح۔ احرار حضور کے دین کے ادنیٰ سپاہی ہیں اور اسی نظام کو ہندوستان میں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انگریز کی مخالفت قرآن کریم سے سیکھی۔ انگریز نے ہماری عالم گیر قوت کا خاتمہ کیا، اور ہندوستان ہی میں، ہمیں غلاموں کا غلام بنانے کے منصوبے باندھے۔ ہم نے کہا انگریز کے خطابات ایک لعنت ہیں۔ سیاسی لیڈروں نے کہا۔ نہیں۔ لیکن پھر لعنت پر لعنت بھیجنی ہی پڑی۔ ہم نے اسلام و عالمِ اسلام و شعائر اسلام کے لئے قید و بند کو لبیک کہا۔ اور

زندگیوں کے بہترین حصّے وہیں گذارے۔ ہمیں شوریدہ سر بدمعاش وغیرہ کے القاب سے نوازا گیا، لیکن کل جسے حرام کہا تھا، الحمدللہ کہ آج اُسے حلال کہا گیا۔ اگرچہ مقصد وزارتوں کو توڑنا بتایا جارہا ہے۔ کل کے وزیر اور وزیر زادے آج جیل میں ہیں۔ آج کے وزیروں کا حال کل کیا ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مسلمان بزرگو اور دوستو! یہ عروج و زوال کا سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ ہمیں اسلام کا سچّا سپاہی بن کے ملک کے امن کو قائم رکھنا ہے۔ پڑوسی کو یہ یقین دلانا ہے، زبان سے نہیں عمل سے کہ اُمّتِ محمدؐ مصطفٰے ہمارے جان و مال کی حقیقی محافظ ہے۔ رضاکارانِ احرار سے کہا کہ اپنی زبانوں کو بند رکھو۔ گالی کا جواب دُعا سے دو۔ اپنے نظام کو وسیع تر کرو۔ ہر مسلمان رضاکار بنے رضاکار غازی بھی ہو اور نمازی بھی۔ مسلمان قوم کو بے دین لیڈروں اور بزدل متّقیوں نے یہ دن دکھایا ہے۔ اب بھی وقت ہے، ہم اپنا مقام دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں، اگر حضورؐ کی سیرت کا اتباع کریں۔ تقریر دو گھنٹے جاری رہی۔ اجتماع مسرور و مسحور تھا۔ جامع مسجد گجرات کی مرمّت کی طرف قاضی صاحب نے اشارہ کیا۔ تقریباً پانچ صد روپیہ اسی وقت جمع ہوگیا اور یہ اجتماع بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔



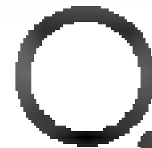
روزنامہ آزاد، لاہور۔ ۲۵ر فروری ۱۹۴۷ء

کاشی میں نعرۂ توحید کی گونج و گرج

مولانا قاضی احسان احمد کا ورودِ مسعود

"اسلام کا اتباع تمام مصائب کا علاج ہے"

مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری کے مواعظِ حسنہ



بنارس۔ ۲۲ر فروری۔ سیرت کانفرنس مورخہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ر فروری کو زیر صدارت حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی صدر شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند منعقد ہوئی۔ جس کا پہلا اجلاس شب درمیانی ۱۵، ۱۶ر فروری ایک عظیم الشان پنڈال میں شروع ہوا۔ تلاوتِ کلام مجید کے بعد متعدد شعراء کی نظمیں ہوئیں جو بہت پسند کی گئیں۔ زاں بعد صاحب صدر نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دار العلوم دیوبند سے درخواست کی اور حضرت موصوف نے ڈیڑھ گھنٹہ ابواب سیرت النبی نہایت ہی دلفریب انداز میں بیان فرمائے۔ حضرت قاری صاحب کے بعد جناب قاضی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کائناتِ انسانی کے محسنِ اعظم، اسلام کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی اکمل شریعت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور یہ نشست رات کے ایک بجے اختتام پذیر ہوئی۔ مورخہ ۱۶ر فروری کی شب کو پھر اسی منظر افروز پنڈال میں اجلاس کی کاروائی شروع

ہوئی جس میں قاری ظاہر القاسمی نے — جو آل انڈیا ریڈیو پر تلاوت کلام مجید کرتے ہیں، تلاوت فرمائی، اور حضرت مولانا ابو الوفا شاہجہان پوری نے "سیرت نبوی اعدائے اسلام کی نظروں میں" کے دلچسپ موضوع پر تقریر فرمائی۔ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند نے دو گھنٹے مسلسل رحمۃ للعالمین کے عنوان پر فاضلانہ تقریر فرمائی۔ تقریر نے حاضرین کو مسحور کر دیا، اور حاضرین کے شدید اصرار پر حضرت قاری صاحب نے ایک گھنٹہ میں اپنی گذشتہ تقریر کو مکمل فرمایا۔

۱۷ ر فروری کو تیسری آخری نشست اسی پنڈال میں منعقد ہوئی۔ علمائے حق کی تقریروں نے سارے شہر بنارس میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ آج پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ قاری ظاہر صاحب کی قرات اور صابری صاحب کی نظموں کے بعد حضرت قاضی صاحب نے تمام ادیانِ باطلہ کی ناکامی اور نبی اُمّیؐ کے لائے ہوئے دین کی کامیابی کو بہت ہی شاندار طریقہ سے بیان فرماتے ہوئے کہا کہ آج ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پجاریوں کو بھی اسلام کی تعلیمی سطوت، رُوح، مادہ و خدا تک تو لے آئی ہے۔ آج یورپ کے تثلیث پرست بھی موحد ہونے کے مدعی ہیں۔ حضرت اکبر نے سچ کہا تھا ؎

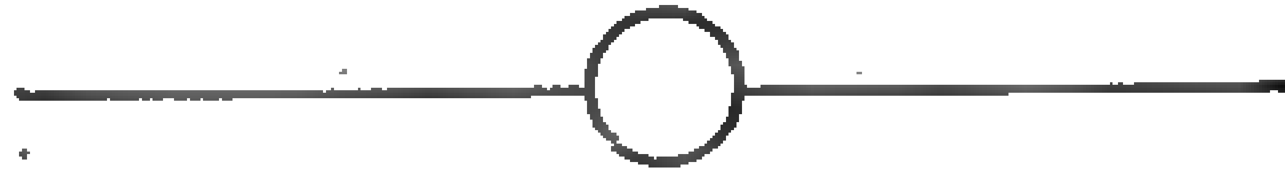
تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک
تھی تین پہ سوئی مری ہیبت سے بجا ایک

یہ ہے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کی تفسیر۔ آج کہیں طلاق بل بنوایا جا رہا ہے، اور کہیں وراثت بل منظور ہو رہا ہے۔

یہ سب اپنے مذاہب کے بطلان کا اقرار ہے اور اسلام ہی کی اکملیت کا عملی اعلان ہے انسانیت کی فلاح نہ امپریلزم میں ہے۔ نہ کمیونزم، نہ سوشلزم مداوا ہے اور نہ نیشنلزم۔ ان تمام ازموں سے منہ موڑ کے اسلام اور صرف اسلام ہی کے اتباع میں انسانیت کو ابدی امن و سکون میسر آسکتا ہے۔ مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر قسم کے شرک و

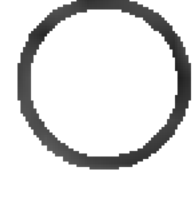
بدعات کی مفصّل تشریح فرمائی اور ان سے مجتنب رہنے کی تلقین کی۔ یہ حیات افروز درس جس نے ہر فرقہ اور طبقہ کے مسلمانوں کو سرشار کیا ہوا تھا، تقریباً چار گھنٹے جاری رہا اور یہ سیرت کانفرنس ہر لحاظ سے کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ مسلمانانِ شہر کے شدید اصرار پر قاضی صاحب نے علی پورہ، بنارس کی ختمِ نبوّت اور اکملیتِ اسلام پر ایک عظیم الشان اجتماع کو خطاب فرمایا۔ ۱۹ر فروری کو پھر سارے شہر کے معززین اور علمائے کرام نے استدعا کی کہ قاضی صاحب ایک دن اور ضرور قیام فرمائیں اور نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر ایک جلسہ بمقام کچی باغ میں منعقد کیا جائے۔ قاضی صاحب کو اپنا جگراؤں کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا، اور کچی باغ میں زیر صدارت حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امام جامع مسجد بنارس ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت قاضی صاحب نے "سیرت مقدسہ اور مسلمانانِ ہند کی مشکلات کا حل" کے موضوع پر تقریباً تین گھنٹے تقریر فرمائی۔ شہر بنارس کے کونے کونے سے شہسوارانِ خطابت کو مدعو کیا گیا، مگر آپ اپنے پروگرام کی وجہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکتے تھے، لہٰذا احباب و عمائدین شہر نے بادیدۂ پُرنم آپ کو وداع کہا۔

ان تمام اجلاسوں کی کامیابی کے لئے جناب حکیم حافظ صاحب، آفتاب احمد صاحب جامعیٔ پنجابی صرافاں و انصاری احباب کی اَن تھک مساعی قابلِ صد شکریہ ہیں۔ خدا کرے کہ یہ ذوق تازیست قائم رہے اور ذکر سیرت سے ہماری سیرتیں عملاً بھی مستفید ہوں آمین۔



منقول از روزنامہ البلال دہلی - ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء صفحہ ۲ -

جامع مسجد دہلی میں مجلس احرار کے لیڈر قاضی احسان احمد کی دلپذیر تقریر



دہلی - ۲۶ اپریل - مجلس احرار کے خلاف یہ الزام غلط ہے کہ وہ اپنے اصول سے منحرف ہو گئی - برطانوی شکنجۂ غلامی سے ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان میں مساویانہ حیثیت سے ملّتِ اسلامیہ کی حاکمانہ سربلندی، احرار اسلام کا نصب العین تھا اور ہم آج بھی اسی نصب العین پر سختی سے کاربند ہیں - انہیں اصولوں کو کانگرس نے خاک میں ملا دیا ہوا ہے - وہ قوم پروری کے اعتبار سے مر چکی ہے اور اس کی موت کی ذمہ داری مسٹر پٹیل پر عائد ہوتی ہے - کانگرس اب ایک خالص فرقہ دارانہ جماعت ہے جو ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے اور جس نے اسلامی سیاست کو فٹ بال بنا رکھا ہے ہم نے ہندوستان کی آزادی کے لئے کانگرس سے غیر مشروط اشتراک کیا - اسکی لاٹھیوں سے اپنی ہڈیاں تڑوائیں - قید و بند کے مصائب برداشت کئے - بندوق کی گولیوں اور پھانسی کے تختوں کو لبیک کہا، اور ساتھ ہی اپنی مسلمان قوم کی گالیاں کھائیں - اگر ہندوستان کی آزادی کے لئے ہمیں دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور نہرو کے ساتھ غیر مشروط اشتراک سے نہیں روک سکتی تو ملت اسلامیہ کے وجود اور ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے ہمیں دنیا کی کوئی طاقت محمد علی جناح کے ساتھ غیر مشروط اشتراک سے نہیں روک سکتی - مجلس

احرار نے کانگرس سے اشتراک اسلئے کیا تھا کہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دشمن برطانیہ کے قبضہ سے ہندوستان آزاد ہو اور مسلمان مساویانہ حیثیت سے آزاد ہندوستان میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اسلئے نہیں کہ کانگرس ہندوستان پر اپنا قبضہ جما کر مسلمانوں کو اچھوت بنا دے۔ یہ ہیں رنگِ حقیقت میں ڈوبے ہوئے — الفاظ جن کا اعادہ آل انڈیا مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور شعبہ تبلیغ کے صدر مولانا قاضی احسان احمد نے اللہ اکبر اور اسلام زندہ باد کے نعروں میں فرمایا مجلس احرار کی آل انڈیا کونسل کے اس فیصلے کے بعد کہ کانگرس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ مقامی مجلس احرار کا پہلا عظیم الشان جلسہ کل نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد عبداللہ فاروق کی زیر صدارت جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا سخت گرمی اور تپش کے باوجود مجمع کا اندازہ تیس ہزار تک کیا جاتا ہے۔ مولانا قاضی احسان احمد صاحب کی تقریر بہت پرجوش تھی تیز اور حقائق سے لبریز تھی۔ کانگرس کے دو چار گروہوں نے جلسہ میں انتشار پیدا کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کی تھی، اور قاضی صاحب کے اس برموقع سوال کے بعد کہ اگر ہم ہندوستان کی آزادی کیلئے پٹیل اور نہرو سے اشتراک کر سکتے ہیں تو دس کروڑ مسلمانوں کے وجود اور ننگ و ناموس کیلئے محمد علی جناح سے اشتراک کیوں نہیں کر سکتے، منافقوں پر اوس پڑ گئی اور سوالات کرنے کے بعد دکانوں میں دب کر بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب نے پھر کہا مسلمانوں کی مساویانہ ملکیت کی پر مسلمانوں کی تمام جماعتیں متفق اور متحد ہیں۔ خواہ کانگرس سے مسلمانوں کا یہ متفقہ مطالبہ ہی منظور کرا دیں اس کے بعد ہم سب پھر کانگرس میں شامل ہو جائیں گے اور قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی زبردستی کانگرس میں شامل کر دیں گے۔ قاضی صاحب کے اس زبردست چیلنج کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ قاضی احسان احمد صاحب نے کانگرس کی رجعت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا، کہ مجلس احرار آج بھی اپنے اصول پر مستحکم چٹان کی طرح قائم ہے لیکن کانگرس نے اپنے تمام بنیادی اصولوں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ کانگرس مر چکی ہے اور اسکی موت کے ذمہ دار مسٹر پٹیل ہیں

تلوار کی دھمکی

کانگرس کی تعمیر کا بنیادی پتھر اہنسا یعنی عدم تشدد ہے۔ یعنی مسٹر سبھاش

چندر بوس جیسے مخلص راہنما نے جب یہ کہا کہ میں عدم تشدد کو بطور پالیسی کے تو تسلیم کر سکتا ہوں لیکن بطور عقیدت کے نہیں، تو گاندھی جی مہاراج نے ناراض ہو کر کہہ دیا کہ سبھاش چندر بوس کیلئے کانگرس میں کوئی جگہ نہیں۔ تو گاندھی جی کے ان الفاظوں سے کانگرس کے اس مخلص لیڈر کو صرف کانگرس ہی سے نہیں بلکہ ہندوستان سے بھی نکلنا پڑا۔ لیکن مسٹر پٹیل جو اہنسا تک ستیہ گرہ کے بہت بڑے جرنیل تسلیم کئے جاتے ہیں، میرٹھ کے ایک اجلاس کانگرس میں علی الاعلان کہا کہ مسلمانوں کی تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا تو کسی کانگرسی لیڈر کے کان پر جوں بھی نہ رینگی اور مسٹر سبھاش چندر بوس کی طرح پٹیل کو گاندھی یا ان کے دوسرے رفیقوں نے کانگرس سے نہیں نکالا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ سبھاش بابو انگریزوں کے مقابلے میں تشدد کو جائز سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کی گاؤ ماتا کے ٹکڑے

مسلمانوں نے مسلم لیگ کے زیر علم تقسیم ہند کا مطالبہ کیا تو گاندھی جی نے فرمایا کہ ہندوستان کی تقسیم کے معنی ہیں کہ ہندوستان کی گاؤ ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور اس بات کے تصور سے بھی میرا دل لرز جاتا ہے۔ ہم احراریوں نے بھی کہا کہ اچھی بات ہے، آپ ہندوستان کی گاؤ ماتا کے دو ٹکڑے نہ کیجئے لیکن آزادیٔ وطن کی راہ میں ہماری تمام قربانیوں اور کانگرس نوازیوں کے باوجود اب کے سکھوں کو خوش کرنے کے لئے کانگرس، تقسیم پنجاب کا مطالبہ پیش کر رہی ہے۔ کیا انصاف اس کا نام ہے؟ اگر دس کروڑ مسلمان تقسیم ہند کا مطالبہ کریں، تو گاندھی جی فرمادیں اور ہندوستان مہاراج پکار اُٹھے، لیکن جب پنجاب مسلم اکثریت کو حکومت سازی کے جائز حق سے محروم رکھنے کے لئے صرف تین لاکھ سکھ تقسیم پنجاب کے نعرے لگائیں تو وہی تقسیم ہند جو دس کروڑ مسلمانوں کے لئے ناجائز تھی، بیس لاکھ سکھوں کے لئے جائز ہو جاتی ہے اور کانگرسی رہنما اپنے فیصلے سے ثابت کر رہے ہیں کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر کے ہندوستان کی گاؤ ماتا کے دو ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے لیکن بنگال کے بھائی

ہندوؤں اور پنجاب کے سکھوں کو مسلم اکثریت کے حقِ حکمرانی سے محروم اور بچانے کے لئے اس گاؤ ماتا کی ٹانگیں ضرور کاٹی جا سکتی ہیں۔ اگر کانگرس دو صوبوں میں بھی مسلمانوں کو حکمرانی کا حق دینے کیلئے تیار نہیں تو انہیں مسلمانوں سے یہ توقع کرنے کا کیا حق ہے، کہ وہ پورے ہندوستان میں ہندو اکثریت کا راج منظور کر لیں۔

افسوسناک دو رنگی سیاست

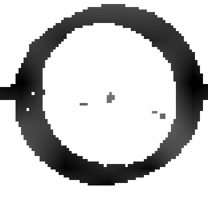
قاضی احسان احمد صاحب نے کانگرس کی اصول شکنی اور دو رنگی سیاست پر مزید روشنی ڈالی اور فرمایا کہ کانگرس نے مسلمانوں کی سیاست کو بالکل فٹ بال سمجھ رکھا ہے۔ صدر مسلم لیگ نے جب مسلمانوں کے لئے مرکز میں مساویانہ نمائندگی کا مطالبہ کانگرس کے سامنے پیش کیا، تو انہیں جواب ملا کہ قائدِ اعظم صاحب! آپ یقیناً بہت بڑے قانون دان ہیں اور ماہرِ سیاست بھی۔ مہاتما گاندھی جی آپ کو "ڈیر برادر" کہتے ہیں اور آپ کے بلند کریکٹر کی تعریف کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ آپ کے ساتھ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مجلس احرار، جمعیتہ العلماء، مومن کانفرنس وغیرہ دوسری مسلمان جماعتیں آپ سے متفق نہیں۔ اس لئے آپ کا مطالبہ منظور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد مجلس احرار، جمعیتہ العلماء اور تمام دوسری مسلمان انجمنوں کی جانب سے متفقہ طور پر مسلمانوں کی ساری نمائندگی کا وہ مطالبہ کانگرس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۹۳۱ء میں مرتب کیا تھا کانگرس کے دربار میں ہم نیشنلسٹوں کو جواب ملتا ہے کہ ہمارے دل میں آپ کی قربانیوں کا احترام ہے۔ آپ لوگ کانگرس کے بہت دوست بھی ہیں اور اچھے مقرر بھی، لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کے ووٹ آپ کے ساتھ نہیں، مسٹر جناح کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا آپ کا مطالبہ منظور نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارے ہاں بھی بڑے بڑے قانون دان ہیں اور جناح صاحب بھی بڑے ماہر قانون دان۔ اب قانون دانوں کی ٹولی قانون دان ہی فیصلہ کریں۔ ہم راہ میں حائل کیوں ہوں۔ کانگرس سن لے کہ اب مجلس احرار، کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مسلمانوں کا سر پھوڑنے والا روڑہ

نہیں بنے گی۔ اور کانگرس کو ہم اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے نام سے فائدہ اٹھائے اور مسلمانوں کے حقوق پامال کرے۔

فسادات پنجاب کی ذمہ داری

قاضی احسان احمد صاحب نے اپنی پرجوش تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ فسادات پنجاب کی ذمہ داری کانگرس اور سکھ لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ دھرم یدھ کا اعلان کیا اور کہا کہ اب تو پنجاب پر سکھوں کا کیسری جھنڈا لہرائے گا۔ مجلس احرار نے کانگرس کے ساتھ اس لئے اشتراک نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کو بالکل اچھوت بنا دیا جائے اور انہیں اسلامی اکثریت کے صوبوں میں بھی حکمرانی کے حق سے محروم رکھا جائے۔ امرتسر میں جب کشت و خون کا بازار گرم کیا گیا تو حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا تھا کہ آج مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے اپنے تمام اختلافات دریا میں غرق کرتا ہوں۔ ہم دنیا کی کسی قیمت پر بھی پنجاب کو تقسیم نہ ہونے دیں گے اور دس کروڑ مسلمانوں کی عظمت و بلندی کیلئے مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کیا جائے گا۔

قاضی صاحب کی تقریر کا سلسلہ تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہا۔ اور بار بار پرجوش [illegible] نعرے بلند کئے گئے۔ قاضی صاحب کی تقریر لبریز حقائق کے ساتھ خطابت کا بھی اچھا نمونہ تھی۔



روزنامہ آزاد، لاہور - ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء

تقریر

احرار تبلیغ کانفرنس سیالکوٹ

احرار تبلیغ کانفرنس بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہو کر رات کے دو بجے ختم ہوئی۔ کانفرنس کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اس نظارہ کو دیکھا۔ اسی سیالکوٹ میں امیر بھی آئے اور وزیر بھی، اہلِ حکم بھی آئے اور اہلِ زر بھی، مگر کہاں باسامانوں کا جاہ و جلال اور کہاں بے سامانوں کا دربار۔ رام طلائی کے میدان میں، گیلریوں پر، مکانوں کی چھتوں پر، بازاروں میں انسانوں کا ایک سمندر رات کے دو بجے تک اکائی کی طرح جما رہا۔ احرار کانفرنس کی کامیابی ــــ اس تبلیغ و تلقین کا ردِ عمل تھا جو کہ مرزائی مبلغ اور افسر عرصہ سے اس علاقہ میں کر رہے ہیں۔ عوام یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر اس تبلیغ کی حقیقت و ماہیت اور اس مذہب کے خدوخال کیا ہیں، اور احرار زعماء جن کے دل و دماغ دینی آب و رنگ سے رنگین ہیں اس سلسلہ میں کیا رائے ظاہر کرتے ہیں۔

حق گو نے دلائل کے پھول بکھیرے اور ہر خوش نوا نے پردۂ زر نگار کو تار تار کیا تو مرزائیت ہزاروں انسانوں کے سامنے برہنہ ہو کر رہ گئی۔ جب تاج و تختِ نبوت کا سپاہی صاعقہ بن کر کڑکا تو بہشتی مقبرے کے قبے کانپ اُٹھے۔ تاج الدین انصاری اور حسام الدین نے جب اپنے اپنے انداز میں مرزائیت کی کہانی کہی تو در و دیوار جھومنے لگے۔ پہلے اجلاس میں مولوی حیات محمد اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں۔ دوسرے اجلاس میں صدر کانفرنس مولانا محمد علی جالندھری نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ آخری اجلاس میں شیخ حسام الدین کی تقریر کے بعد قاضی احسان احمد نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

مَیں ایک طویل عرصہ کے بعد سیالکوٹ حاضر ہؤا ہوں۔ رام طلائی کا یہ میدان میرے لئے نیا نہیں۔ مجھے ۱۹۲۹ء کے دن بھی یاد ہیں جبکہ قضیۂ کشمیر کے سلسلہ میں مَیں نے آپ کو یہیں خطاب کیا تھا۔ دیوانوں کی اس جماعت نے جسے آپ مجلس احرار کا نام دیتے ہیں اپنی بصارت کی بنا پر آج سے بیس برس پیشتر کشمیر پر ہاتھ ڈالا تھا، اور ہزاروں انسانوں نے قید و بند کی صعوبتوں اور بیسیوں نوجوانوں نے دار و رسن کی آزمائش کے لئے خود کو پیش کیا تھا۔ اور آج پھر کشمیر کا مسئلہ درپیش ہے لیکن کل اور آج میں ایک فرق ہے۔ کل مَیں بغاوت کا پیغام لے کر آیا تھا کہ آؤ مسلمانو! غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ پھینکیں اور محکومی کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ مگر مسلمانوں نے کہا کہ انگریز، توپوں اور بندوقوں والا انگریز، پیروں پیغمبروں والا انگریز، ولیوں نبیوں والا انگریز جا نہیں سکتا۔ لیکن آج میں سر افتخار بلند کر کے کہتا ہوں کہ انگریز گیا۔ میرے دوستو! میرے بزرگو! مکڑی تو چلی گئی مگر کچھ جالے ابھی باقی ہیں۔ میں کہتا ہوں، سیالکوٹ انگریز کے ان جالوں سے بچے۔ آج میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے خطاب کرنے آیا ہوں۔ پہلے بغاوت میرا فرض تھا، اب حکومت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ مجھے گندگی سے گھِن ہے جگہ سے نہیں۔ مرض سے نفرت ہے مریض سے نہیں۔ مجھے ان برتنوں کو دھونا ہے توڑنا نہیں۔ خدا کا شکر ہے، انگریز گیا۔ بیگانوں کی جگہ اپنے آئے۔ بت کی جگہ ستارا آیا۔ یونین جیک کی جگہ ہلال آیا اور دعا کرو، تعزیراتِ ہند کی جگہ قرآن آئے۔

طرزِ جمہوری نہ شانِ کجکلاہی چاہیئے
جس کے بندے ہیں اسی کی بادشاہی چاہیئے

اُن کی روش اور ہمارا فرض

میرے سرحدی بھائیو! ملک تقسیم ہؤا، اور اس کے ساتھ دس کروڑ مسلمان تین حصّوں میں بٹ گئے اور تیس کروڑ ہندو ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، اور یہ تیس کروڑ ہندو کیا کر رہا ہے، کیا سوچ رہا

ہے۔ "ہندے ماترم" نے ایک مستقل عنوان قائم کر رکھا ہے کہ "ہمارے بچھڑے ہوئے دیس کی خبریں" ویر بھارت" لکھتا ہے۔ "ہمارے کٹے انگ کی خبریں"۔ سوچو کہ ان سرخیوں سے ہندو نوجوان کیا سوچتا ہوگا اور اس کے دل میں کیا جذبات بیدار ہوتے ہوں گے۔ جس کی کوئی چیز چھن جائے وہ اُسے لینے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا، اور دیکھو پٹیل اور مکر، کانگریس اور ہندو مہا سبھا، سب ایک ٹیم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ فوجی مساعی دن بدن تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ آخر سوچو تو سہی یہ تمام تیاریاں کس لئے ہیں۔ کیا امریکہ ان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ چین کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی کا ہر طالب علم صبح تین بجے جاگتا ہے۔ یہ اس کے پروگرام میں داخل ہے۔ مگر میرے نوجوان سینما دیکھ کر رات کے تین بجے سوتے ہیں۔ کیا کہوں کفر کی تقدیر جس وقت جاگتی ہے میری تقدیر اس وقت سوتی ہے۔

میرے نوجوان دوستو! صبحِ آزادی نے حیات کے نئے ہنگاموں کو جنم دیا ہے۔ تمہاری ذمہ داریوں کا ایک نیا احساس اُبھر آیا ہے۔ تم ملت کی متحرک نبض ہو۔ دشمن کی نیت تمہیں پکارتی ہے اور زندگی کے تقاضے تمہیں بلاتے ہیں۔ میں صرف دعا کا قائل نہیں تدبیر تمہاری ہو تقدیر خدا کی۔ قطرے تم مہیا کرو، دریا خدا بہا دے گا۔ یاد رکھو بندوق اُٹھا کر ایک رات کا پہرہ دینا، ہزار رات کی شب بیداری سے افضل ہے۔ خدایا! ہم میں سے ہر ایک کو نمازی بنا اور ہر نمازی کو غازی بنا۔

مسئلہ کشمیر اور مرزائی

میرے دوستو! میں پاکستان کو ادھورا پاکستان سمجھتا ہوں ایک مکان بنایا، ساری پونجی اس پر لگا دی مگر ابھی تک اس پر چھت نہیں پڑی۔ وہ نہ رہنے کے قابل ہے اور نہ گرانے کے قابل۔ ہم نے پاکستان بنایا، ساری پونجی اس پر لگا دی۔ دیوبندی نے دیوبند دیا، بریلوی نے بریلی دیا۔ چشتی نے اجمیر دیا، صابری نے کلیر دیا، نقشبندی نے سرہند دیا۔ آگرے کا تاج دیا اور دہلی کا

لال قلعہ دیا۔ سب کچھ دے کر پاکستان لیا، مگر جب تک کشمیر کا کٹ پاکستان میں شامل نہیں ہوتا، اس وقت تک پاکستان ادھورا رہے گا۔ کشمیر پاکستان کا جزوِ لاینفک ہے۔ مگر کیا کہوں، کشمیر بیچا جا رہا ہے اور قادیان خریدا جا رہا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں دلائل؟ میں کہتا ہوں، دلائل کیسے۔ جموں کشمیر کانفرنس کے صدر اللہ رکھا ساغر، چوہدری غلام عباس کی موجودگی میں، جہلم، راولپنڈی اور آلو مہار شریف میں، تین پبلک جلسوں میں ہزاروں کے سامنے کہہ چکا ہے کہ کشمیر آتا ہے مگر سر ظفر اللہ اور مرزا محمود راستہ روکے کھڑے ہیں، اور صدر کانفرنس نے کیا ہی درست کہا ہے کہ اگر اللہ رکھا ساغر درست کہتا ہے تو پھر ظفر اللہ کو جیل میں ہونا چاہیئے اور اگر وہ غلط کہتا ہے تو پھر ابھی تک وہ آزاد کیوں پھر رہا ہے۔

مرزائیت کی حقیقت

شاید آپ پوچھیں کہ اس وقت آپ مذہبی فرقوں کا جھگڑا کیوں لے بیٹھے۔ میرے دوستو! مرزائی ہم سے جدا ہیں۔ وہ مذہبی فرقہ نہیں، ایک پولیٹیکل گروپ ہے۔ ایک شخص کے دو بیٹے ہو سکتے ہیں، لیکن ایک بیٹے کے دو باپ نہیں ہو سکتے۔ ایک خاوند کی دو بیویاں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بیوی کے دو خاوند نہیں ہو سکتے۔ ایک نبی کے پیروکاروں کے دو فرقے ہو سکتے ہیں لیکن ایک مذہبی فرقہ کے دو نبی نہیں ہو سکتے۔ مرزائی ایک خالص پولیٹیکل گروپ ہے اور میں اپنے اس دعویٰ کی حقانیت پر مُصر ہوں۔ آپ پوچھیں گے ثبوت! مرزا غلام احمد اپنی کتاب "تریاق القلوب" میں فرماتے ہیں:۔

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور اطاعتِ انگریزی کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار تقسیم کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالکِ عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچایا۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ مسلمان اس سلطنت کے

پکے خیر خواہ بن جائیں اور مہدی خونی اور مسیحی خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل، جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں" ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ میں اس سلطنت کا بد خواہ ہوتا یا کوئی ناجائز یا باغیانہ منصوبہ اپنی جماعت میں پھیلاتا، جبکہ میں بیس ۲۰ برس تک یہی تعلیم اطاعتِ انگریزی کی دیتا رہا ہوں اور اپنے مریدوں میں یہی ہدایتیں جاری کرتا رہا، تو کیونکر ممکن تھا کہ ان تمام ہدایات کے برخلاف کسی بغاوت کے منصوبے کی تعلیم کروں، حالانکہ میں جانتا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میری جماعت کی پناہ اس سلطنت کو بنایا ہے۔ یہ امن جو ہمیں اس سلطنت میں حاصل ہے۔ نہ مکہ میں مل سکتا ہے، نہ مدینہ میں اور نہ سلطانِ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں" (صفحہ ۲۵-۲۶)

دوسری کتاب "تبلیغ رسالت" جلد ہفتم صفحہ ۱۹ میں ارشاد ہے:۔

"صرف یہ التماس ہے کہ سرکار دولتمدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں، اس خود کاشتہ پودا کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر میری جماعت کو خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں"

اس خود کاشتہ پودے نے آگے چل کر کیا گل کھلائے اور انگریز نے اس پودے سے کیا پھل حاصل کیا، وہ خود مرزا صاحب کی اس کتاب سے واضح ہے۔ جس میں وہ حکومت کے باغیوں کی فہرستیں تیار کر کے حکومت کو بھیجتے اور مسلمانوں میں جوشِ جہاد کو ختم کرنے میں

پوری عمر کوشاں رہے "خطبہ الہامیہ" میں فرماتے ہیں :۔

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا ہے اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ رسولِ کریمؐ کی نافرمانی کرتا ہے۔"

نہ صرف نثر پر اکتفا کیا۔ بلکہ نظم پر بھی طبع آزمائی کی گئی۔ ان واضح حقائق کے ہوتے ہوئے مرزائیوں کو مسلمانوں کا مذہبی فرقہ سمجھنا اور ان کی تردید کرنے والوں پر سوال طعن دراز کرنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

وہ اتحاد اتحاد پکارتے کشمیر کو بیچ ڈالیں۔ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنالیں۔ فوج پر قبضہ کرلیں اور ہم ملکی مصلحتیں ہی دیکھا کریں ؎

وہ لئے ہاتھ میں تلوار جو چاہیں سو کریں
اور ہم دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھایا نہ کریں

غریب اور امیر

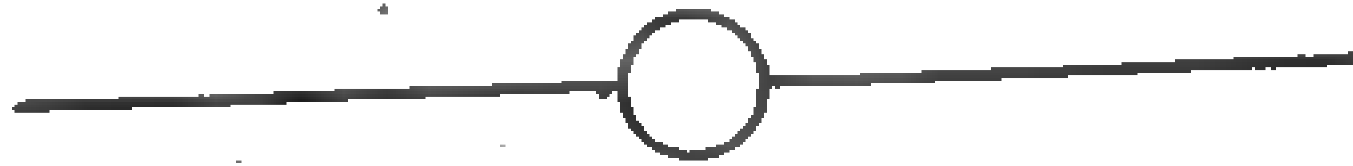
آپ نے تقریر کا رُخ موڑتے ہوئے فرمایا :۔

غریبو! احرار تمہارے دکھ کا احساس ہے، مگر اپنی خودی کو بلند کرو۔ ان امیروں کی طرف مت دیکھو۔ ان کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرو۔ ان کو سلام مت کرو۔ اسلام کہتا ہے، بلند پست کو سلام کرے۔ متکبر کو سلام کرنا حرام ہے۔ ان کے غرور سے معمور چہرے عنقریب زرد پڑ جائیں گے، اور عیش و نشاط کی آوازوں سے گونجتی ہوئی محفلیں درد و پکار کی چیخوں سے بدل جائیں گی۔

اور میں امیروں سے کہتا ہوں۔ اپنی اس شان و شوکت پر ناز نہ کرو۔ زمین کی پشت پر اکڑتے ہو، اس کی گود میں جا کر روؤ گے۔ غریبوں کو دو تو خود بھی بچ جاؤ گے، اور اسلام کو بھی بچا لو گے۔ یہ دنیا صرف تمہاری ہی نہیں، اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے۔

خواتین سے خطاب

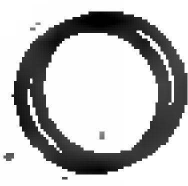
میری ماؤ اور بہنو! مجھے تم سے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ عورت کی گود میں قوم پلتی ہے۔ دنیا عمرؓ کی تعریف کرتی ہے کہ اگر ایک عمرؓ اور ہو جاتا تو دنیا سے کفر مٹ جاتا۔ میں کہتا ہوں، اس سے پہلے اس بہن کی تعریف کرو جس نے عمرؓ فاروق بنادیا۔ اگر وہ بہن نہ ہوتی، عمرؓ، عمرؓ نہ ہوتا۔ لوگ حسینؓ کی تعریف کرتے ہیں کہ بیٹے دیئے، بھتیجے، بھائی دیئے، اپنی جان دی اور گھر کی عزت دے دی مگر فاسق کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں، فاطمہؓ کی تعریف کرو۔ فاطمہؓ کی گود نہ ہوتی حسینؓ، حسینؓ نہ ہوتا۔ ماں وہ تھی کہ آٹا پیستے قرآن پڑھتی اور بیٹا وہ نکلا کہ نیزے کے سر پر قرآن پڑھا۔ میری بہنو! تہذیبِ جدید تمہیں عریاں دیکھنا چاہتی ہے۔ یاد رکھو، عورت سپاہی بنتی نہیں، سپاہی جنتی ہے۔ اسلام نے کہا کہ کنگھی کرتے وقت عورت کے سر سے جو بال اتریں، اُسے دفن کردو، مبادا کسی کے دِل میں بال دیکھ کر کوئی خیال پیدا ہو، مگر تہذیبِ جدید تمہیں شاہراہوں پر بے حجاب دیکھنا چاہتی ہے۔ اب خود فیصلہ کرو تمہیں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔



روزنامہ "آزاد" لاہور۔ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۰ء مطابق ۱۱ رجب المرجب ۱۳۶۹ھ

تقریر

برموقعہ احرار تبلیغ کانفرنس لاہور



حضرات! اب تک مرزائیت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کچھ کاملۃً نظریاتی اور اعتقادی اعتبار سے تھا۔ لیکن یہ مسئلہ صرف اعتقادات کا ہی نہیں۔ حیاتِ مسیح، وفاتِ مسیح، اجرائے نبوت، ختمِ نبوت، ان مسائل کا تذکرہ تو ہم محض اس لئے کرتے ہیں کہ مرزائیوں نے خود کو چھپانے اور حقیقتِ حال کو ہجوم تشنہ نگاہ سے اوجھل رکھنے کیلئے ان مسائل و مباحث کو کھڑا کر رکھا ہے، ورنہ درحقیقت مرزائیت کا اسلام، مذہب، دین، خدا، رسول سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ ایک پولیٹیکل گروپ ہے جسے انگریز نے اپنی خدمت گذاری کے لئے جنم دیا اور مرزائی دنیا کے ہر کونے اور گوشے میں حکومتِ برطانیہ کی خدمات بجالاتے رہے۔ یہ مسائل انہوں نے صرف مسلمانوں کو فریب میں مبتلا رکھنے کو شروع کر رکھے ہیں۔ ان مسائل سے قطع نظر مرزائیت کے متعلق جو دوسرا سوال درپیش ہے وہ مرزائیوں کی پاکستان سے وفاداری کا سوال ہے۔

الہامی عقیدہ

آپ کو یاد ہوگا پچھلے دنوں اسی وقت اسی جگہ خطاب کرتے ہوئے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ نہ صرف یہ کہ مرزائیوں کی پاکستان سے وفاداری مخدوش ہے اور وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھنے کی بجائے قادیان جانے کے لئے بیتاب ہیں

بلکہ ان کا الہامی عقیدہ یہ ہے کہ پاکستان کا وجود مسلم و غیر مسلم کا افتراق عارضی ہے اور اس عقیدہ کی پاکستان میں بیٹھ کر تشہیر کی جا رہی ہے۔ انجمن خدام احمدیہ کے شائع کردہ پمفلٹ کو چھوڑیئے، خود الفضل نے اپنی ۵ر اپریل ۱۹۴۷ء اور پھر ۱۲ر اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کے اسی رویہ کو اکھنڈ ہندوستان کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جب پولیس نے احتساب کیا تو خلیفہ قادیان نے بوکھلا کر اپنے الہام ہی سے انکار کر دیا۔ میں اب اس پر مزید بحث کی تو ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ میں خلیفہ قادیان اور جلال الدین شمس اور ایڈیٹر الفضل سے پوچھتا ہوں کہ اکھنڈ ہندوستان کے عنوان سے ۵ر اپریل ۱۹۴۷ء کو جو کچھ الفضل میں شائع ہوا ہے، آخر وہ کیا ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟

میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ عقیدہ مرزائیوں کا الہامی عقیدہ ہے۔ اس کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ جہاں تک حضرت مسیح موعود کے الہامات اور مشیتِ الٰہی کا تعلق ہے، دونوں قوموں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔ اور اگر کبھی افتراق ہوا تو وہ عارضی ہوگا۔ یہ کوئی سیاسی نوعیت کا اختلاف نہیں بلکہ مشیتِ الٰہی اور الہامِ نبی کی روشنی میں مرزائیوں کا مذہبی عقیدہ ہے اور عقیدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ بدل جائے۔ خلیفہ قادیان کی اس تردید کے تحریر سے پیشتر اس میں یہاں دجل و فریب کا کچھ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مرزا محمود احمد لکھتا ہے۔

> "اس مفتری نے احمد کے آگے جو حضرت موعود کا نام ہے صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے۔ یہ بھی اس کی جہالت نہیں بلکہ شرارت پر دلالت کرتا ہے۔ جماعت احمدیہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی نبی یا مامور کو صلی اللہ علیہ وسلم نہیں لکھتی۔"

یعنی کہ احمد، مرزا غلام احمد قادیانی کا نام ہے اور مرزائی احمد کے آگے کبھی بھی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں لکھتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسی مضمون میں اسی اشتہار میں یعنی بالکل ہی احمد آیا ہے

اس پر ۲ کا نشان یعنی صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہوا ہے۔ ہم خلیفہ صاحب اور آپ کے حواریوں سے پوچھتے ہیں کہ خدارا سوچئے تو سہی۔ آپ لکھ کیا رہے ہیں اور کہہ کیا رہے ہیں۔ جو کچھ کرتے جا رہے ہیں اسی کی تردید ہو رہی ہے۔ آخر یہ کیا ہے؟۔

اسی اشتہار میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اگر اس اشتہار میں تم نے سچ بولا ہے، تو میں ایک ہزار روپیہ تمہارے لئے انعام مقرر کرتا ہوں کہ وہ میری تحریر پیش کرو جس میں میں نے لکھا ہو کہ اکھنڈ ہندوستان کی تائید میں الہام ہوا ہے۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ کی تحریر پیش کرو، جس میں میں نے یہ الہام لکھا ہو۔ یہ کتنا ہی بڑا فریب ہے۔ کیا ان کا اخبار ان کی تصانیف ان کی تحریر نہیں ہیں اور کسی نے ان کی تحریر بھی پیش کر دی تو پھر فرماویں گے کہ تحریر تو میری ہی ہے لیکن سیاہی وہ نہیں جس سے میں نے لکھا تھا۔ جیسا کہ آپ نے ایک مقدمے میں مجسٹریٹ کے روبرو فرمایا تھا کہ دستخط تو میرے ہیں لیکن روشنائی وہ نہیں جس سے میں نے لکھا تھا اور اسی تردید میں اشتہار کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہندو مسلمان میں اختلاف انتہا کو نہیں پہنچا میری کوشش تھی کہ کسی طرح ملک تقسیم نہ ہو اور اس کے بارے میں میں نے اپنے ذاتی خیالات کئی دفعہ ظاہر کئے تھے، مگر کوئی الہام شائع نہیں کیا تھا۔ مگر جب مئی ۱۹۴۷ء میں یہ بات پورے طور پر ظاہر ہو گئی کہ اب اختلافات مٹائے نہیں مٹ سکتے تو میں نے رائے بدل لی اور پورے زور سے پاکستان کی تائید شروع کر دی"

یعنی کہ ۳۱ مئی ۱۹۴۷ء تک تو مرزا صاحب پاکستان کے خلاف تھے لیکن اس کے بعد جب آپ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہو گیا، کہ پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا۔ ۳ جون کو اعلان بھی کر دیا گیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی رائے بدل لی اور پھر قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی

تائید و حمایت شروع کر دی۔

باپ کے نقش قدم پر

آج مرزا بشیرالدین محمود پریس کے احتساب، رائے عامہ کی گرفت سے بوکھلا کر اپنے الہام سے مکر رہا ہے اور یہ اس کے لئے معیوب بات نہیں۔ ان کے باواجان اور ان کے نبی مرزا غلام احمد قادیانی بھی اسی طرح کئی بار عوام کی گرفت سے گھبرا کر اپنے الہامات سے مکر جایا کرتے تھے۔

مرزا صاحب نے ایک دفعہ اپنے دو مریدوں کو بتایا کہ مجھے آج رات الہام آیا ہے کہ "سلطنتِ برطانیہ تا ہشت سال، بعد ازاں ایامِ ضعف و اختلال"۔ یعنی کہ حکومتِ برطانیہ آٹھ سال تک ہے، اور اس کے بعد حکومت میں کمزوری اور انتشار کے ایّام شروع ہو جائیں گے۔

یہ الہام مرزا صاحب کے ایک مرید نے مولوی محمد حسین بٹالوی جو کہ انگریزی حکومت کا پرانا حاشیہ بردار تھا، بتا دیا اور اس نے اسے "اشاعت السنۃ" میں شائع کر دیا، کہ مرزا غلام احمد انگریزی ملک میں رہ کر اس طرح کے الہامات بیان کرتا ہے۔ مرزا صاحب کو معلوم ہوا اور حکومت کی گرفت کا اندیشہ دیکھا تو فوراً مکر گئے اور "کشف الغطاء" لکھ ماری۔ اس کتاب کے صفحہ اوّل پر حکومت اور حکام سے عاجزانہ درخواست کی کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "یہ مؤلف تاج عزت جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند دام اقبالہا کا واسطہ ڈال کر گورنمنٹ عالیہ انگلشیہ کے اعلیٰ افسروں اور معزز حکام سے باادب گذارش کرتا ہے کہ براہ کرم غریب پروری و کرم گستری اس رسالے کو اوّل سے آخر تک پڑھا جائے یا سن لیا جائے"۔ (کشف الغطاء ص۱)

اس کتاب میں مرزا صاحب اپنے الہام سے صاف مکر گئے۔ لکھتے ہیں:-

"دوسرا امر جو اس رسالے میں محمد حسین نے لکھا ہے، وہ یہ ہے کہ گویا میں نے کوئی الہام

اس مضمون کا شائع کیا ہے کہ گورنمنٹ عالیہ کی سلطنت آٹھ سال کے عرصہ میں تباہ ہو جائیگی میں اس بہتان کا جواب بجز اس کے کیا لکھوں کہ خدا جھوٹے کو تباہ کر دے میں نے ایسا الہام ہرگز شائع نہیں کیا میری تمام کتابیں گورنمنٹ کے سامنے موجود ہیں با ادب گذارش کرتا ہوں ...... کہ گورنمنٹ اس شخص سے مطالبہ کرے کہ کس کتاب یا خط یا اشتہار میں میں نے ایسا الہام شائع کیا ہے، اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ گورنمنٹ عالیہ اس کے اس فریب سے خبردار رہے گی کہ یہ شخص اپنے اس جھوٹے بیان کی تائید کے لیے یہ تدبیر نہ کرے کہ اپنی جماعت اور اپنے گروہ میں سے ہی جو مجھ سے اختلافِ مذہب کی وجہ سے دلی عناد رکھتے ہیں، جھوٹے بیان بطور شہادت گورنمنٹ کو پہنچا دے۔ اس شخص اور اس کے ہم خیال لوگوں کی میرے ساتھ کچھ آمد و رفت اور ملاقات نہیں کہ میں نے ان کو کچھ زبانی کہا ہو۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں اپنی کتابوں میں اشتہاروں میں شائع کرتا ہوں اور میرے خیالات اور میرے الہامات معلوم کرنے کے لیے میری کتابیں اور اشتہارات مستقل ہیں اور میری جماعت کے معتبرین گواہ ہیں۔ غرض میں با ادب التماس کرتا ہوں کہ ہماری گورنمنٹ عالیہ اس خلافِ واقعہ تحریر کا اس شخص سے مطالبہ کرے۔ کپتان ڈگلس صاحب سابق ڈپٹی کمشنر ضلع گورداسپور مقدمہ ڈاکٹر کلارک میں جو میرے پر دائر ہوا تھا، لکھ چکے ہیں کہ یہ شخص مجھ سے عداوت رکھتا ہے" اس لئے جھوٹ سے کبھی بھی پرہیز نہیں کرتا۔

(کشف صـ ۲۲)

لیکن مرزا صاحب کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے مرزا بشیر احمد ایم اے نے اپنی کتاب سیرت المہدی میں لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو یہ الہام ہوا تھا۔ سیرت المہدی حصہ اول کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں۔

بیان کیا ہم سے حاجی عبدالمجید صاحب نے کہ ایک دفعہ جب ازالہ اوہام شائع ہوتی ہے حضرت صاحب لدھیانہ میں باہر چہل قدمی کے لئے تشریف لے گئے تھے اور

حافظ حامد علی ساتھ تھے۔ راستے میں حافظ حامد علی نے مجھ سے کہا کہ آج رات یا اِن دنوں میں حضرت صاحب کو الہام ہوا ہے کہ سلطنتِ برطانیہ تا ہشت سال، بعد ازاں ایام ضعف و اختلال۔ خاکسار عرض کرتا ہے کہ اس مجلس میں جس میں حاجی عبدالمجید صاحب نے یہ روایت بیان کی کہ میاں عبداللہ صاحب سنوری نے بیان کیا ہے کہ میرے خیال میں یہ الہام اس زمانے سے بھی پرانا ہے۔ حضرت صاحب نے خود مجھے اور حافظ حامد علی کو یہ الہام سنایا تھا اور مجھے الہام اس طرح پر یاد ہے کہ "سلطنتِ برطانیہ تا ہفت سال بعد ازاں باشد خلاف و اختلال"۔ میاں عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ دوسرا مصرع تو مجھے پتھر کی لکیر کی طرح یاد ہے کہ یہی تھا اور ہفت کا لفظ بھی یاد ہے۔ جب یہ الہام ہمیں حضرت صاحب نے سنایا تو اس وقت مولوی محمد حسین بٹالوی مخالف نہیں تھا۔ شیخ حامد علی نے بھی اُسے جا سنایا۔ پھر جب وہ مخالف ہوا تو اُس نے حضرت صاحب کے خلاف گورنمنٹ کو بدظن کرنے کے لئے اپنے رسالے میں شائع کیا ہے۔ خاکسار عرض کرتا ہے کہ میاں عبداللہ صاحب اور حاجی عبدالمجید صاحب کی روایت میں جو اختلاف ہے وہ اگر کسی صاحب کے ضعفِ حافظہ پر مبنی نہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ الہام حضور کو دو وقتوں میں دو مختلف قراتوں پر ہوا ہو۔ واللہ اعلم۔

نیز خاکسار عرض کرتا ہے کہ اس الہام کے مختلف معنی کئے گئے ہیں۔ بعضوں نے تاریخِ الہام سے میعاد شمار کی ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے بعد سے اس کی میعاد شمار ہوتی ہے کیونکہ ملکہ کے لئے حضور نے بہت دعائیں کی تھیں۔ بعض اور معنی کرتے ہیں۔ میاں عبداللہ صاحب کہتے تھے کہ میرے نزدیک آغازِ بیسویں صدی سے اس کی میعاد شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور ۷۶ واقعات کے ظہور کے بعد ہی میں نے اس کے یہ معنی سمجھے ہیں۔ خاکسار عرض کرتا ہے کہ میرے نزدیک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت صاحب کی وفات سے

اس کی میعاد شمار کی جائے۔ کیونکہ حضرت صاحب نے اپنی ذات کو گورنمنٹ برطانیہ کے لئے بطور حرز کے بیان کیا ہے۔ پس حرز کی موجودگی میں میعاد کا شمار کرنا میرے خیال میں درست نہیں۔ اس طرح جنگ عظیم کی ابتدا اور ہفت، ہشت سالہ میعاد کا اختتام آپس میں مل جاتے ہیں واللہ اعلم۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ برطانیہ کے ہم لوگوں پر بڑے احسانات ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ اُسے فتنوں سے محفوظ رکھے۔"

یہ تو ایک بیٹے کی گواہی تھی۔ اب دوسرے بیٹے مرزا محمود احمد موجودہ خلیفہ کا بیان سُنیئے۔ لکھتے ہیں :۔

حضرت مرزا صاحب نے وہ کام کر دیا ہے جو آنے والے مسیح کے لئے مقرر تھا۔ اب آنے والے مسیح کے لئے اور کوئی کام باقی نہیں اور اس کے لئے کسی اور کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ کسی کے لئے خدا تعالیٰ نے کوئی کام مقرر کیا ہو اور اُسے دوسرا آ کر کر جائے۔

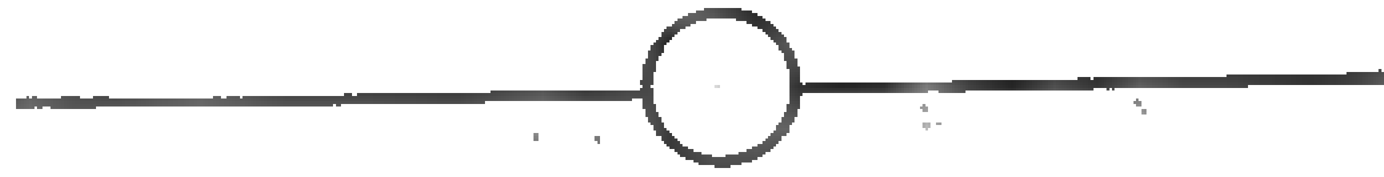
عیسائیت میں بھی تنزل کے آثار شروع ہو چکے ہیں اور عیسائیوں کا غلبہ مٹ رہا ہے۔ آج سے پچاس برس قبل کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریز کبھی حقوق ہندوستان کو دے دیں گے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ دے رہے ہیں۔ پھر ان کی تجارتی طاقت بھی ٹوٹ رہی ہے۔ کوئی زمانہ تھا کہ انگریز کہتے تھے کہ ہم یورپ کی دو بڑی طاقتوں سے دو گنا بحری بیڑا رکھیں گے۔ اس زمانہ میں حضرت مرزا صاحب نے پیش گوئی فرمائی :۔

سلطنت برطانیہ تا ہشت سال
بعد ازاں آثارِ ضعف و اختلال

اخبار الفضل ۷ مارچ ۱۹۳۰ء

میرے دوستو! میرے بزرگو! اس وقت ان کے اعمال و افعال، ان کے

اخلاق پر غور کرو۔ دو بیٹے گواہ ہیں کہ یہ الہام ہوا، لیکن باپ جو خود کو نبی بتاتا ہے مہدی مسیح بتاتا ہے، مجدّد بتاتا ہے۔ محض انگریزی حکومت کی گرفت کے خوف سے اپنے الہام سے مُکر گیا۔ جن کے نبیوں کا یہ عالم ہو، جن کے بزرگوں کی یہ حالت ہو، اگر اُن کی اولاد، اُن کا خلیفہ اکھنڈ ہندوستان کا الہام شائع کر کے مُکر جائے تو اس میں حیرانگی کی کونسی بات ہے۔ میں کہتا تھا اور کہتا ہوں کہ یہ مرزائیوں کا الہامی عقیدہ ہے۔



روزنامہ "آزاد" لاہور۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء

ہم مرزائیوں کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

قاضی صاحب کی ایک اہم تقریر

برادرانِ ملت!

آپ حضرات نے صدر مرکزیہ اور ناظمِ اعلیٰ کے خیالات سن لئے۔ ان حضرات نے نہایت سُلجھے ہوئے اور مؤثر انداز میں جماعتی پالیسی بیان کی اور مرزائیت کی اندرونی سازشوں کو پوری طرح بے نقاب کیا۔ اب مجلس احرار کا ایک ادنیٰ رضا کار بھی اپنی چند معروضات عرض کرنا چاہتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ حضرات پوری توجہ کے ساتھ سُنتے رہیں گے۔

مجلس احرار اسلام نے ہمیشہ اپنی تمام تر کوششیں اور مساعی، ملّی اور ملکی خدمات کے لئے وقف کر رکھی ہیں، اور قیام پاکستان کے بعد ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ملکی حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ وقت کی نزاکت کو پہچانا اور یہ کہ پاکستان ایک نوزائیدہ مملکت ہے، ہمیں اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ ہم اس ملک میں کسی قسم کی بدامنی کو گوارا نہیں کر سکتے۔

میرے بزرگو اور میرے دوستو! ہمارے اس فیصلے کو ساری دنیا نے مستحسن قرار دیا۔ پاکستان کے ایک ایک فرد نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مجلس کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر جو وہ تحفظِ ختمِ نبوّت کے سلسلہ میں کر رہی ہے۔ بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں، کہ قاضی صاحب! آپ خواہ مخواہ کیوں مرزائیوں پر حملے کر رہے ہیں؟ اپنے مسلمان بھائیوں

کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر مجھے دُکھ ہوتا ہے ؎

مجھ سے کہتے ہیں کہ تُو نالہ و فریاد نہ کر
ان سے کوئی نہیں کہتا کہ تو بیداد نہ کر

میں کہتا ہوں جس طرح سورج کو حق ہے کہ وہ سیاہی اور تاریکی پر حملہ کرے، اسی طرح ہمیں بھی حق ہے کہ فخر دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تاج و تختِ ختم نبوت کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں۔ حق، باطل کی ریشہ دوانیوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

ہماری پوزیشن

حضرات! ہماری پوزیشن اس باطل کے مقابلے میں OFENCIVE نہیں بلکہ DEFENCIVE ہے۔ ہم جارحانہ اقدام نہیں کرتے۔ بلکہ ہم دشمنوں کے حملوں کی مدافعت میں صف آرا ہو کر کھڑے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا، کہ وہ آوازیں جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے لئے اُٹھ رہی ہیں، اُنہیں آپ دنیا کے کسی گوشہ سے نہ اُٹھنے دیتے۔ وہ آواز فوراً دبا دی جاتی، جو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی نئی نبوت و شریعت کا دعویٰ کرتی۔ اس وقت مرزائیوں کا متعفن لٹریچر پیش کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ شریفوں کی محفل میں ایسے بداخلاق انسانوں کا لٹریچر پڑھ کر سُنایا جائے۔ میں نے اپنے حالیہ دورہ میں پاکستان کے گورنر جنرل سے لے کر ایک ایک وزیر کے سامنے جب یہ لٹریچر پیش کیا تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

ایک کمشنر کے سامنے جب یہ مرزائیت کی لاش رکھی تو انہوں نے حیرت سے پوچھا قاضی جی! کیا یہ لٹریچر جو مرزا غلام احمد نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہے اسے کوئی شریف آدمی پڑھ سکتا ہے؟

مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآن مجید کی آیت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط سے مراد میں ہوں۔ یہ آیت محمدؐ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہیں، بلکہ میرے متعلق ہے۔"

ابھی مجھ سے پہلے اس آیت کی تشریح میں حضرت مولانا محمد علی صاحب نے مفصل واقعات بیان فرما دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ جب مرزائی اس آیت کو پڑھتے ہیں تو ان کے ذہن محمدؐ عربی کی طرف نہیں جاتے، بلکہ قادیان کی طرف جاتے ہیں۔ پھر یہ اپنی تبلیغ کے ذریعہ بھولے بھالے مسلمانوں کو ورغلا کر اُن کا رشتہ مدینہ منورہ سے توڑ کر قادیان سے جوڑ رہے ہیں۔ کیا کوئی غیرت مند مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اپنا تعلق محمد عربی سے توڑ کر سرکاری نبی مرزا غلام احمد سے جوڑے؟

حضرات! مجھے آج مرزائیوں کی طرف سے اس قسم کے پمفلٹ ملے ہیں جن میں انہوں نے نہایت چالاکی اور دیدہ دلیری سے شعائر اسلام کی توہین کی ہے۔ سر ظفر اللہ کی وزارت پہ یہ اچھل کود؟ تم ایک وزارت پر ناز کرتے ہو۔ میں نے سلطنتوں کا حشر دیکھا ہے ؎

تمہیں خبر نہیں شاید کہ دینِ حق کا چراغ
ہوائے تند کے باوصف جلتا رہتا ہے
وزارتوں کے مقدّر پہ ناچنے والو!
وزارتوں کا مقدّر بدلتا رہتا ہے،

ابھی کل ہی واقعہ ہے۔ نیپال ہی کو لیجئے۔ کل جو وزیر تھے انہیں آج اسیر ہوتے بھی دیکھا۔ کل جو امیر تھے وہ آج گداگری کر رہے ہیں لیکن روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اپنی وزارتوں کی عزّت بچانے کے لئے سیفٹی ایکٹ استعمال کرنے والو! محمدؐ عربی کی عزّت و عظمت کی حفاظت کے لئے بھی آپ کے پاس کوئی قانون ہے؟

بد معاملہ میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو مرزا غلام احمد کی نبوّت و رسالت کا

اقرار کرتے ہیں۔ آپ نے ایک بد اخلاق، بد کردار، بد افعال، بدزبان اور بد معاملہ، انسان کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت پر کیوں بٹھایا ہے۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں مرزا غلام احمد کو بد معاملہ کہا ہے۔ یہ شاعرانہ گفتگو نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ میں بغیر دلیل اور ثبوت کے کوئی چیز عرض نہیں کروں گا۔ جہاں تک مرزا صاحب کی معاملگی کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مرزا صاحب کی اپنی کتاب "براہین احمدیہ" ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مرزا غلام احمد نے یہ اپیل کی تھی کہ میں حضور سرورِ کائنات کی شان میں پچاس جلدوں کی کتاب لکھنا چاہتا ہوں جس کے لئے مجھے کافی روپے کی ضرورت ہے۔ لوگوں نے سرور کائنات کے ساتھ عقیدت کی بناء پر کافی رقم دی۔ کتاب کی طباعت کے سلسلے میں لوگوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ جب پچاس جلدوں کی کتاب پوری ہو جائے گی تو رقم کے عوض اس کتاب کا ایک ایک مکمل حصہ ضرور دیا جائے گا۔ مرزا صاحب نے وہ کتاب "براہین احمدیہ" پانچ حصوں میں لکھ کر ختم کر دی۔ لوگوں نے پچاس جلدوں کا مطالبہ کیا تو مرزا صاحب ارشاد فرمانے لگے، اگرچہ میں نے پچاس جلدوں کا وعدہ کیا تھا اور ابھی اس کی پانچ جلدیں مکمل یا پوری ہو گئی ہیں۔ پانچ اور پچاس میں صرف ایک نکتہ کا فرق ہے، اس لئے میں اپنے وعدہ میں پورا اتر آیا ہوں۔

حضرات! اس سے بڑھ کر چالاکی اور عیاری کیا ہو سکتی ہے۔ میں ملتان کلاتھ ہاؤس کے مالکوں سے پوچھتا ہوں جو ملتان میں مرزائیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ آپ کی دکان سے کوئی شخص پانچ سو روپے کا کپڑا خرید کرلے اور جب آپ کو اس کپڑے کا بل پیش کرے تو وہ بجائے پانچ سو روپیہ دینے کے آپ کو صرف پانچ روپے عنایت کر دے، کیا آپ ایسے سودے کے لئے تیار ہیں؟

کیا یہ معاملہ آپ کو منظور ہے؟

بدزبان | میں نے اپنی تقریر کے دوران میں مرزا غلام احمد کو بدزبان کہا ہے۔ یہ اپنی طرف

سے نہیں کہہ رہا۔ بلکہ مرزا کی اپنی کتاب "نور الحق" صفحہ ۱۲۱ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"جو شخص میری تحقیر کرتے ہیں ان پر میری طرف سے ایک ہزار مرتبہ لعنت ہے"

آپ حضرات میں سے کوئی شخص اسٹیج پر آ کر ملاحظہ فرمائے۔ اس کتاب میں پورے کے پورے کئی صفحات پر سوائے لعنت لعنت لعنت ...... کے اور کچھ نہیں لکھا ہوا ہے۔

ایسا شخص اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں محمدؐ ہوں —— ؟ معاذ اللہ

کیا محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی تھی —— ؟ وہ رحمۃ اللعلمین تھے آپ پر دنیا پتھر پھینکتی، آپ کو گالیاں دیتی، آپ کو زخمی کرتی، لیکن آپ کی زبان مبارک سے سوائے اِن کلمات کے اور کچھ سرزد نہ ہوتا۔

"اے اللہ اگر میں اس قوم سے دُکھی ہو کر ناراض اور خفا ہو کر کوئی بددُعا مانگوں تو میری اس بددُعا کو قبول نہ فرمانا۔"

"اے اللہ میری قوم کو وہ سمجھ عطا فرما دے جس سے یہ تیرے ارسال کردہ قرآن کو مان جائیں اور تیرے دین اسلام کو قبول کر لیں۔"

قُربان جاؤں ایسی پاکیزہ اخلاق والی ذات سے جس کے اخلاق و عادات کا مشرکین عرب اور کفّاران مکّہ بھی اعتراف کرتے تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی اپنی ایک کتاب میں تحریر کرتا ہے :۔

"جو شخص میری صداقت کا قائل نہیں ہے، تو اُسے صاف سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ولد الحرام ہے۔" انوار الاسلام صفحہ ۳۲

میں پوچھتا ہوں کہ حضرت قائدِ اعظم نے مرزا غلام احمد کی صداقت کا اعتراف کیا؟

ہمارے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان، مرزا صاحب کو نبی اور رسول مانتے ہیں؟

آپ حضرات جو بے پناہ سمندر کی طرح میرے سامنے موجود ہیں۔ کیا آپ تمام حضرات مرزا غلام احمد کی نبوّت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں؟ —— اب آپ خود ہی

فیصلہ کریں کہ یہ ولدالحرام کا لفظ کن حضرات کے لئے استعمال کیا ہے؟

صرف اسی پر بس نہیں مسلمانانِ عالم کو خنزیر اور کتوں کا خطاب دیا اور مسلمان عورتوں کو یہ کہا کہ یہ سب کُتیاں ہیں۔ ایسا شخص اپنے آپ کو نبی اور رسول کہے، یہ تو دنیا میں اپنے آپ کو ایک شریف انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

توہینِ رسالت یہ تو وہ الفاظ ہیں جو مرزا غلام احمد نے مسلمانانِ عالم کے حق میں استعمال کئے۔ اب چند چیزیں وہ بھی عرض کئے دیتا ہوں جو مرزا صاحب نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں استعمال کئے ہیں۔

مرزا صاحب خطبہ الہامیہ میں لکھتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلی رات کا چاند تھے اور میں چودھویں رات کا چاند ہوں"۔

اس چودھویں رات کے چاند کا اگر آپ نے فوٹو دیکھنا ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔ اس پر قاضی صاحب نے مرزا صاحب کا ایک فوٹو عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔ لوگوں نے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ختم نبوت زندہ باد اور سرکاری نبوت مردہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

شعورِ انبیاءؑ مرزا غلام احمد کے شعور کا ایک واقعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دفعہ مرزا غلام احمد کا ایک مرید آپ کے لئے گرگابی لایا اور مرزا صاحب کے سامنے لاکر رکھ دی۔ مرزا صاحب نے اُسے بے حد پسند فرمایا، اور اس جوتے کو اسی وقت اپنے پاؤں میں ڈال لیا۔ جوتہ پہننے میں آپ نے دائیاں پاؤں بائیں جوتہ میں اور بایاں پاؤں دائیں جوتا میں ڈال دیا۔ (سیرت المہدی ج۲، صفحہ ۲۸)

مرزا غلام احمد کے ایسے شعور کے واقعات بہت سے ہیں۔ خوفِ طوالت کی وجہ سے ان کا ذکر مناسب نہیں ہے۔ ویسے آپ حضرات ان واقعات سے تو واقف ہیں کہ مرزا صاحب چونکہ گڑ کھانے کے عادی تھے اور گڑ اور پیشاب کے لئے مٹی کے ڈھیلے ایک

ہی جیب میں رکھا کرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسے بھی ہوتا کہ آپ گڑ کی جگہ پیشاب کا ڈھیلا کھا لیا کرتے تھے۔

کھانڈ کی جگہ چونہ پھانک لیا کرتے تھے۔ اپنی واسکٹ کے بٹن لگاتے تو نچلا بٹن اُوپر کے سوراخ میں اور اُوپر کا نچلے سوراخ میں لگایا کرتے تھے۔ ع

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

واقعی دنیا کو ایسے بے شعور نبی کی بڑی ضرورت تھی۔ قاضی صاحب نے مرزائیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :۔

اے بھولے ہوئے انسانو! آپ پیغمبر آخر الزمان حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ توڑ کر بے شعور انسان کے ساتھ جوڑ رہے ہو۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تم اپنی فکر و دانش کو کہاں کھو چکے ہو؟

حضرات! یاد رکھیئے، انبیا علیہم السّلام مہد (بچپن کے دوران) میں بھی باشعور ہوتے ہیں۔ ایک ایک نبی کی زندگی کے حالات سامنے رکھیئے اور پھر بچپن کے شعور کو دیکھئے حضرت حلیمہ سعدیہؓ رضی اللہ عنہا واقعہ بیان فرماتی ہیں کہ جب حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ابھی دودھ پیتے تھے۔ اس وقت آپ اپنے حصّے کا دودھ پیتے تھے۔ کئی دفعہ میں نے کوشش کی کہ آپ دوسرے بھائی کے حصّے کا دُودھ پی لیں۔ آپ منہ پھیر لیتے اور اگر زبردستی آپ کے منہ میں دودھ دیتی تو آپ منہ بند فرما لیا کرتے تھے۔

قربان جاؤں ایسے نبیؐ کے جو بچپن میں بھی مساوات اور انصاف کا سبق دے رہا ہے۔

توہینِ اُلُوہیّت

حضرات میں نے مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے مرزا غلام احمد قادیانی کے بدمعاملہ، بدزبان، بداخلاق اور بدکردار ہونے کے واقعات عرض کر دیئے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر اس کی دیدہ دلیری اور عیّاری ملاحظہ فرمایئے۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے الہام فرمایا۔ اَنْتَ مِنِّیْ وَ

اَنَا مِنْکَ - یعنی اے مرزا تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے۔

صاف لفظوں میں یوں سمجھئے، اللہ تعالےٰ مرزا صاحب سے فرماتے ہیں کہ اے مرزا تو میری اولاد ہے اور میں تیری (لا حول ولا قوۃ)۔

سوال: اس پر ایک دفعہ ایک مرزائی نے اعتراض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے فرمایا تھا کہ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ۔ حالانکہ حضرت علیؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین جُدا جُدا تھے۔ پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا، کہ اے علیؓ تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔

جواب: حضرات سیرت سے معمولی واقف انسان کو بھی یہ معلوم ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا اور حضرت علیؓ کے دادا کا نام بھی وہی عبدالمطلب ہی تھا تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں ایک ہی دادا کے پوتے ہوئے۔ اب اس میں کیا اشکال باقی رہ جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی خون کے رشتے ہوئے۔

ایک دوسرے مقام پر مرزا صاحب اپنے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"میں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ میں خود خدا ہوں۔ پھر میں نے یقین کر لیا کہ واقعی میں خدا ہی ہوں۔ پھر میں نے زمین و آسمان پیدا کئے"۔ (استغفراللہ)۔

اندازہ فرمایئے کہ یہ کس انسان نے جرأت کی ہے۔ یہ تو اپنے متعلق تھا۔ اب مرزا بشیرالدین کی بابت بھی سنئے:۔

"جب مرزا محمود پیدا ہوا تو اس کی مثال یوں ہے کان اللہ متزل من السماء۔ جیسے اللہ تعالیٰ آسمان سے اُترے ہیں"۔

ایک مرزائی نے اعتراض کیا کہ "قاضی صاحب! مرزا صاحب نے یہ تو اپنا خواب

بیان کیا ہے کہ میں خواب میں خدا بن گیا تھا۔"

میں ایسے عیّار اور دھوکہ باز انسان سے پوچھتا ہوں، کہ یہ الہامات جو کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ بھی سارا معاملہ خواب کی حالت میں چلتا رہا، اور کتابیں تیار ہوتی رہیں۔

یاد رکھئے۔ خداوند قدیر سے لے کر تمام انبیاء اور اولیاء کی توہین اور ان کی مقدس اور پاکیزہ زندگی کو داغ دار کرنے کے لئے انگریز نے مرزا غلام احمد قادیانی جیسے بد اخلاق، بد معاملہ، عیّار اور دھوکہ باز انسان کو تیار کیا۔ اگر یہ شخص صحابہ کرام کے زمانہ میں اس قسم کی توہین و حرکات کرتا، تو اسے یک قلم ختم کر دیا جاتا۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے حقانیتِ اسلام کو نیست و نابود کیا ہو۔

حرفِ آخر

حضرت قاضی صاحب نے ولولہ انگیز لہجہ میں فرمایا کہ آپ حضرات پورے ہوش اور پوری ذمّہ داری سے جواب دیں کہ کیا ایسے دشمنِ اسلام، ملک و ملت گروہ کا استیصال ضروری ہے یا نہیں؟ ہم مرزائیوں کو اسلام اور پاکستان کا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں، اور اس کے استیصال کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حاضرین نے جوش آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ خدا آپ کو کامیابی دے۔

قاضی صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ:۔

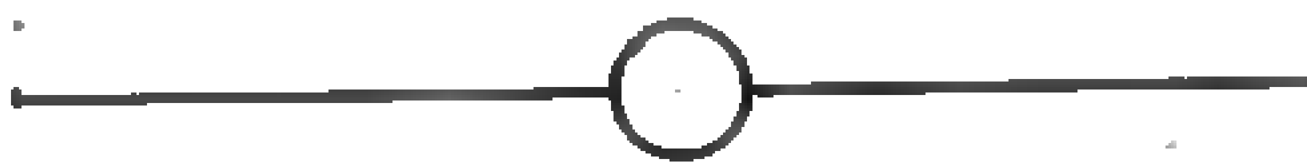
"ہم نے اپنے تاریخی فیصلہ میں کہا تھا کہ ہمیں یہ کام وقت کے اہم مقتضیات کے تحت کرنا ہے، اور اگر اس کام کو ملک کی واحد نمائندہ جماعت، مسلم لیگ سنبھال لے تو ہم احرار کا بورڈ اتار دینے کیلئے تیار ہیں"۔

آپ نے حکومت کو وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ پچھلے دنوں راولپنڈی اور اوکاڑہ میں دو آدمی کسی گھریلو مناقشات کی وجہ سے قتل ہو گئے تھے۔ تو مرزائیوں نے سارے ملک میں شور مچانا شروع کر دیا کہ ان دونوں کے قتل میں دراصل مجلس احرار کا ہاتھ ہے۔ آج یہاں جلسہ گاہ میں ایک مرزائی جو پوسٹ آفس ملتان کا ایک ملازم ہے مرزائی لٹریچر اور اشتہارات تقسیم کرتا ہوا پکڑا گیا۔ احرار رضاکاروں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اور اسے نہایت پُرامن طریقہ سے مقامی پولیس کے سپرد کر دیا۔

حضرات! اب آپ فرمائیے۔ یہ پیش قدمی کس کی جانب سے ہے۔ اگر یہاں کوئی مسلمان مشتعل ہو کر اسے مارپٹائی کر دیتا تو ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی۔ وہ کس بل بوتے پر مسلمانوں کے اس عظیم اجتماع میں گمراہ کن لٹریچر تقسیم کرنے کی جرأت کرتے ہیں

دراصل مرزائی اپنی خطرناک سازشوں سے اسلام اور پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے تمام مسلمانوں اور حکومت کو ان کی ریشہ دوانیوں سے باخبر رہنا چاہیئے

وما علینا الاّ البلاغ۔



روزنامہ آزاد، لاہور - ۱۹ر فروری ۱۹۵۱ء

پاکستان اور مرزائی

مسلمانوں کیلئے لمحۂ فکریہ ——— ایک اہم تقریر

مریدکے - ۱۶ر فروری - آج بعد نماز جمعۃ المبارک جامع مسجد مریدکے ضلع شیخوپورہ میں اسلامیانِ علاقہ کا عظیم الشان اجتماع ہوا - جس میں صدر مرکزیہ مولٰنا تاج الدین انصاری، خطیب پاکستان مولٰنا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور ناظم اعلیٰ جمعیۃ المشائخ حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب نے شرکت فرمائی - تلاوتِ قرآن مجید کے بعد، صاحبزادہ صاحب نے قاضی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا - مسلمانانِ علاقہ کی خوش بختی ہے کہ آج اس علاقہ میں پاکستان کے فقید المثال خطیب اور مفکرِ احرار جیسی مایۂ ناز ہستیاں موجود ہیں - آپ نے ان مختصر تعارفی کلمات پر اکتفا کرتے ہوئے فرمایا ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

اُس کے بعد خطیبِ پاکستان حضرت قاضی صاحب نے خطبۂ مسنونہ کے بعد اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا :-

حضرات ! جہاں تک مجلس احرارِ اسلام پاکستان کی پالیسی کا تعلق ہے، اگرچہ یہ بات اخبارات کے ذریعہ عوام الناس پر پوری طرح عیاں ہو چکی ہے، اور اس کا اعادہ ضروری معلوم نہیں ہوتا - تاہم اتنا عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس وقت مجلس احرارِ اسلام نے اپنی تمام تر مساعی ملّی اتحاد اور ختم نبوّت کے لئے وقف کی ہوئی ہیں - قیامِ پاکستان کے بعد انہی مقدّس مقاصد کے لئے مجلس احرارِ اسلام نے ملکی انتخابات سے دست برداری کا اعلان

کر دیا تھا۔ جب اس نوزائیدہ مملکت میں حزبِ مخالف برداشت نہیں کی جاسکتی تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم الیکشنی سرگرمیوں سے قطع تعلق کرلیں اور اُمّتِ مرزائیہ کے کفر و ارتداد کا قلع قمع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی پاکستان دشمنی کو پوری طرح بے نقاب کر دیں۔ ملک و ملّت کو اس فتنۂ مرتدہ سے آگاہ کریں، اور بتائیں کہ یہ نام نہاد ٹولی پاکستان جیسی اسلامی سلطنت میں کیا کچھ کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔

یہ ابھی کا واقعہ ہے کہ مرزا محمود نے کوئٹہ میں آئندہ عزائم کو واشگاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں صوبہ بلوچستان کو علیحدہ مرزائی صوبہ بنانا چاہیئے۔ مرزائی ٹولے کا یہ پروگرام ایک طرف ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں، بلکہ پھر پاکستان اور ہندوستان کو ایک کرنے کا رویا شائع کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے لیکن اگر قوموں کی غیر معمولی منافرت کی وجہ سے عارضی طور پر الگ بھی کرنا پڑے تو یہ اور بات ہے۔ بسا اوقات عضو ماؤف کو ڈاکٹر کاٹ دینے کا بھی مشورہ دیتے ہیں لیکن یہ خوشی سے نہیں ہوتا بلکہ مجبوری اور معذوری کے عالم میں اور صرف اسی وقت جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو، اور اگر پھر یہ معلوم ہو جائے کہ اس ماؤف عضو کی جگہ نیا لگ سکتا ہے تو کون جاہل انسان اس کے لئے کوشش نہ کرے گا۔ اس طرح ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے، اور پھر کوشش کریں گے کہ یہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائے۔" (الفضل مورخہ ۱۶ر مئی۔ جلد ۳۵ شمارہ ۱۱۶)۔

اس اقتباس کے علاوہ قاضی صاحب نے اکھنڈ ہندوستان کے متعلق ۵ راپریل ۱۹۴۷ء، ۱۲ راپریل ۱۹۴۸ء کے الفضل کی عبارات بھی پڑھ کر سنائیں۔

قاضی صاحب نے ولولہ انگیز لہجہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ اسلامی ملک کی باگ ڈور مرزائیوں کے سپرد کرنے والو! مسلمانوں کے متعلق مرزائیوں کے عقائد بھی ملاحظہ

فرما لیجئے۔

مرزائی عقائد

۱: "کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں"۔ (آئینہ صداقت مصنفہ بشیر الدین محمود)

۲: "ہر ایک شخص جو موسیٰؑ کو مانتا ہے مگر عیسیٰؑ کو نہیں مانتا، یا عیسیٰؑ کو مانتا ہے مگر محمدؐ کو نہیں مانتا، یا محمدؐ کو تو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا، وہ نہ صرف کافر بلکہ پکّا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے"۔ (کلمۃ الفصل مصنفہ مرزا بشیر احمد قادیانی)

۳: "پس جبکہ مسیح موعود کے انکار سے خدا اور محمدؐ رسول اللہ علیہ وسلم کا انکار لازم ہے تو لاالٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ میں خود مسیح موعود کا اقرار آجاتا ہے۔ اس لئے جو شخص مسیح موعود علیہ السلام کا منکر ہو کر منہ سے لاالٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کہتا رہے وہ اسی طرح مسلمان نہیں ہو سکتا، جس طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کا اقرار کرتا رہے مگر ساتھ ہی گذشتہ انبیاء علیہم السلام میں سے بعض یا تمام یا دیگر ایمانیات کا منکر رہے"۔ (الفضل قادیان نمبر ۱۲۲ جلد ۳)

آپ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ اس سے بڑھ کر دیدہ دلیری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مرزا محمود ان تمام مسلمانوں کو جنہوں نے کذّاب و دجال قادیانی کا نام تک نہیں سُنا وہ تمام کافر اور خارج از اسلام بتاتا ہے۔ بالغ مسلمان تو اپنی جگہ ان کے نابالغ اور معصوم بچوں تک کے جنازہ کو حرام بتاتا ہے۔

مُسلم لیگی ٹکٹوں کی تقسیم

آپ نے مسلم لیگ کے اس رویہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نہیں سمجھ سکے کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے کن مصلحتوں کی بنا پر مجلس احرار اسلام کے مطالبے کو ٹھکرا کر مرزائیوں کو ٹکٹ دینا ضروری سمجھا ہے۔

مرزائیوں کو ٹکٹیں دے کر خوش کرنے والو! قائداعظم مرحوم کا جنازہ پڑھنے سے

کس نے انکار کیا تھا ؟ کیا یہی ظفر اللہ خاں نہیں تھا، جس کھونٹے پر یہ مرزائی اچھل کود رہے ہیں۔

پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان نے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح مرحوم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا ؟ لیجئے اس کی داستان بھی سُن لیجئے۔

سر ظفر اللہ کی نرالی منطق، چوری اور سینہ زوری

ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں جب سر ظفر اللہ خان قادیانی، ایبٹ آباد آئے تو حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب خطیب الجامع ایبٹ آباد تحقیقِ واقعہ کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا واقعی تم نے قائد اعظم مرحوم و مغفور ۷۵ کروڑ مسلمانوں کے لیڈر کا جنازہ کراچی میں موقع پر موجود ہوتے ہوئے بھی نہیں پڑھا۔؟

سر ظفر اللہ کا جواب

سر ظفر اللہ نے بے باکی اور جرأت سے کہا۔ بیشک میں نے قائد اعظم کا جنازہ عمدًا نہیں پڑھا۔ مولانا نے پوچھا کیوں ؟

سر ظفر اللہ نے جواب دیا۔ میں اس کو سیاسی لیڈر سمجھتا تھا۔

حضرت مولانا نے دریافت فرمایا کہ تم مرزا قادیانی کو پیغمبر نہ ماننے والے سارے مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہو حالانکہ تم اسی حکومت کے وزیر بھی ہو ؟

سر ظفر اللہ خان : آپ مجھے کافر حکومت کا مسلمان ملازم سمجھ لیں یا مسلمان حکومت کا کافر نوکر۔ تم کو بھی ایسا سمجھنے کا حق ہے۔ (الفلاح پشاور۔ ۲۸ / اگست ۱۹۴۹ء)

اب آپ خود ہی اندازہ فرمائیں، کہ ظفر اللہ کراچی میں موجود ہے لیکن مرزائی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے محبوب رہنما کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر رہا ہے اور جنازہ کے وقت اچھوتوں کی طرح علیحدہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب ایسے مرزائیوں

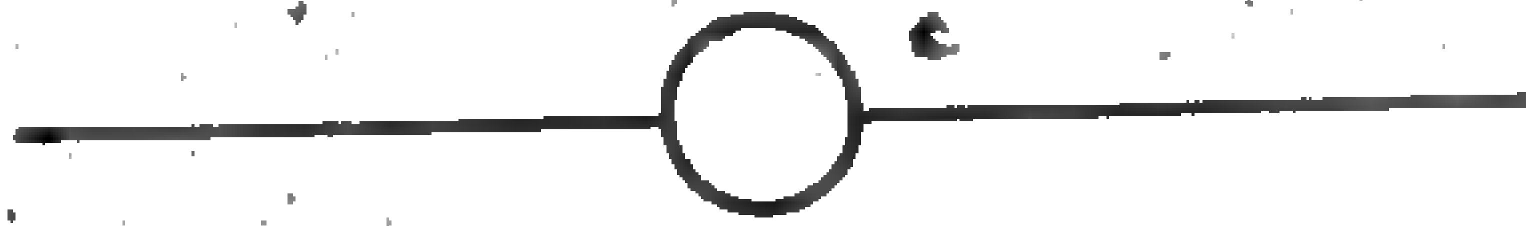
کو مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے مسلم لیگ نے ٹکٹیں دے دی ہیں اور پھر انہیں کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ بھی کی جا رہی ہے۔

معزّز حاضرین!

مسلمانوں نے ایک ظفراللہ خان کو ڈسکہ سے منتخب کر کے عالمِ اسلام پر کفر و ارتداد کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اب اگر باقی مرزائی بھی اسی طرح مسلمانوں پر مسلّط ہوتے گئے تو اس ملک و ملّت کا خدا حافظ!

اس پر تمام حاضرین نے دیوانہ وار ہاتھ اُٹھا کر عہد کیا کہ ہم اسلامی سلطنت کا اقتدار کسی صورت بھی کسی مرزائی کو دینے کیلئے تیار نہیں۔

جلسہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا اور زعمائے احرار لاہور تشریف لے گئے۔



روزنامہ آزاد لاہور ۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء

مولانا قاضی احسان احمد صدر مجلس احرار پنجاب کا بیان

"ختم نبوت کو دنیاوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا داعیٔ اسلام کی توہین اور کمینہ حرکت ہے"

"خدا کے فضل سے مجلس احرارِ اسلام ایسے قبیح فعل کا ارتکاب نہ کرے گی"

لاہور ۔ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی صدر مجلس احرار اسلام پنجاب نے ایک بیان جاری کیا جس میں مجلس احرار کے متعلق بعض پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے اور اس امر کا یقین دلایا کہ ختمِ نبوت کی تحریک خالص مذہبی تحریک ہے اور مجلس احرار اسلام، اب یا آگے چل کر کسی مرحلہ پر بھی اسے سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی اور نہ وہ انتخابات میں کبھی اور کسی مرحلہ پر حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔

آپ نے اپنے بیان میں فرمایا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں مرزائی پارٹی کے مقابلہ میں بہت سے علماء و مشائخ نے کام کیا جن میں حضرت اقدس پیر صاحب گولڑہ شریف، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا کرم الدین صاحب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب حضرات نے صرف مسئلہ ختم نبوت پر ہی اپنی توجہ کو مرکوز رکھا۔ لیکن قادیانی پارٹی کا اپنی حکومت کے خواب دیکھنا اور قادیان کے مسلمانوں کا اقتصادی بائیکاٹ کر کے اپنی رعایا بنا لینے کی جد و جہد کرنا۔ فوجداری دیوانی مقدمات کی عدالت قائم کر کے متوازی حکومت قائم کرنا، قتل کرانا، مکانات جلانا وغیرہ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ جب مرزائی پارٹی نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلمانوں کی تبلیغ کو اپنی قوت

سے قادیان میں روک دیا اور کسی مسلم فرقہ کا کوئی مبلّغ اس عرصہ میں تقریر و تبلیغ نہ کر سکا، تو مظلومینِ قادیان کی درخواست پر قادیان میں مجلسِ احرار نے اپنا دفتر کھولا اور جب قادیانی گروہ کی اندرونی سازشوں کو مجلس احرار نے بے نقاب کر دیا اور انگریزی دور کی عدالتوں نے قادیانی تحریک پر فیصلہ میں لکھا کہ انہوں نے متوازی حکومت بنا رکھی ہے، قانون شل ہو چکا ہے، قادیان میں دن دہاڑے قتل ہوتے ہیں لیکن پولیس گواہ مہیا کرنے سے قاصر ہے وغیرہ۔

قادیانی پارٹی کی ان سیاسی سرگرمیوں کو مجلسِ احرار ہی نے بے نقاب کیا۔ ملکی تقسیم کی جدوجہد میں مرزائی پارٹی انگریزی سیاسیات کی تکمیل کی آلۂ کار رہی۔ ہمارا خیال تھا، کہ تقسیم کے بعد قادیانی گروہ اپنی روش بدل کر پاکستانی شہریوں کی حیثیت سے وفادار رہیں گے اور اب ملک و ملت کے خلاف کوئی سازش نہ کریں گے۔ لیکن قادیانی گروہ نے پہلے سے زیادہ سازشوں کا جال بچھانا شروع کیا اور یہ چودھری ظفراللہ کا اقتدار اس کا بہت بڑا محرک ہوا مجلسِ احرار کا فرض تھا کہ وہ اس نوزائیدہ مملکت کو دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیوں سے بچائیں۔ تین سال میں تقریر و تحریر کے ذریعہ سے عوام کو اور خاص ملاقاتوں میں صوبجاتی اور مرکزی وزراء کو آگاہ کیا۔ پریس کانفرنسوں کے ذریعہ اخبارات کو (جو ملک کی صحیح آواز ہیں) خبردار کیا۔

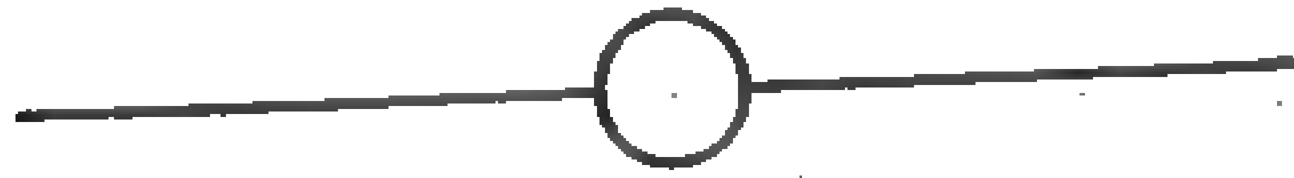
الحمدللہ کہ تمام اہلِ اسلام، قادیانی گروہ اور ظفراللہ کی سازشوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ مجلس احرار اس وقت صرف تبلیغی جماعت ہے اور تبلیغی جماعت کا فرض صرف پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجلس اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر چکی ہے۔ کیونکہ اخبارات نے (جو ملک کے ترجمان ہیں) اعلان کر دیا ہے کہ ان سازشوں اور مسئلہ ختم نبوت کی وجہ سے مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا اور ظفراللہ کی علیحدگی متفقہ مسئلہ ہے۔ چنانچہ "نوائے وقت" نے تو اہلِ پاکستان کی رائے عامہ کے پیش نظر ظفراللہ سے مستعفی ہونے کا مطالبہ بھی کر دیا ہے۔

مجلس احرار کا فرض ہے کہ اس مسئلہ کو جمہور اہلِ اسلام کے مذہبی نمائندوں کے سپرد

کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے اور اس کی تکمیل کے لئے ملک کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت مسلم لیگ سے درخواست کرے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی نمائندگی کا حق ادا کرے۔ چنانچہ مجلس نے ایسا ہی کیا۔ مجلسِ احرار اپنا فریضہ ادا کر چکی ہے۔ اب مجلس احرار اسلام جمہور پاکستان سے الگ کوئی تحریک جاری نہ کرے گی۔

بعض احباب اور بزرگوں کا یہ شبہ کہ مجلس احرار اس طریق سے آگے آنا چاہتی ہے اور اپنا وقار بحال کرنا چاہتی ہے۔ یہ مجلس احرارِ اسلام کے ساتھ شدید بے انصافی اور ظلمِ عظیم ہے۔ هٰذا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

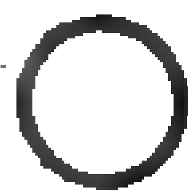
مجلس احرارِ اسلام ایسے دوستوں کو یقین دلاتی ہے کہ وہ الیکشن کے متعلق جو قرار داد ۱۹۴۹ء میں منظور کر چکی ہے، اس قرار داد اور اپنے عہد پر قائم ہے جس پر گزشتہ انتخابات شاہد ہیں۔ خدا تعالیٰ گواہ ہے کہ اراکین مجلس کے دل میں یہ وہم کبھی نہیں آیا کہ مجلس احرارِ اسلام کو اس بہانہ سے آگے لائیں۔ ختمِ نبوت جیسے مدارِ نجات اور اسلام کے بنیادی مسئلہ کو کسی سیاسی مفاد اور دنیاوی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانا صرف اسلام اور داعیٔ اسلام کی توہین ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، بلکہ یہ انتہائی ذلیل اور کمینہ حرکت ہے۔ انشاء اللہ مجلس ایسے قبیح فعل کی کبھی مرتکب نہ ہوگی۔



روزنامہ آزاد لاہور - ۲ر نومبر ۵۲ء

تحفظ ختم نبوت کا جلسۂ عام

مولانا قاضی احسان احمد کی تقریر



بعد نماز عشاء بوقت ۱/۲ ۷ بجے شب زیر اہتمام مجلس احرار اسلام چک ۱۲۲/۹-۱۰ تحصیل و ضلع منٹگمری میں ایک جلسۂ ختم نبوت شروع ہوا۔ جس میں حضرت مولانا حاجی احمد علی صاحب نے کرسی صدارت کو رونق بخشی۔ حافظ ثناء اللہ صاحب رکن مجلس مذکور نے تلاوت قرآن فرمائی۔ مولوی محمد شریف رکن مجلس نے پنجابی نصیحت نامہ ایک نظم پڑھی۔ پھر شاعر حریت حریف قادیان حضرت سائیں محمد حیات صاحب حیات نے "فرضیت جہاد" اور "ردِ مرزائیت" پر دو نظمیں پڑھیں۔ مابعد بلبل پنجاب فخر ملت حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی نے مختصر خطبہ کے بعد السلام علیکم سے پُرجوش لہجہ میں اپنی تقریر دل پذیر شروع کی۔ رات کا سہانا سماں تھا۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار مرد و زن پیر و جواں کا مجمع حضرت موصوف کے الفاظ کو سننے کے لئے بالکل تصویر کی طرح خاموش تھا۔ قاضی صاحب نے شروع میں قرآن مجید و فرقان حمید کی چند آیات کے کچھ حصے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاس۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاس ط تلاوت فرمائے۔

پھر فرمایا خدائے قدوس نے کلام مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں خطہ روئے زمین کے

کُل انسانوں کے لئے ایک خدا ہوں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی علیٰ ہذا القیاس تمام بنی نوع کا رب ہوں۔ رب نے کُل انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے تمام انسانوں کے لئے رسول بھیج کر فرمایا کہ میں نے تم کو تمام دُنیا کے انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے تمام انسانوں کے لئے رسول بھیج کر اس پر کتاب بھی بھیجی، جس کی تعریف میں فرمایا۔ ھُدًی لِّلنَّاسِ، تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ راہِ مستقیم دکھانے والی کتاب ہے۔ اسی کتاب میں فرمایا ہے کہ سب سے مقدس گھر دنیا کے انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے، بیت اللہ شریف۔ خدا کیا ہے رَبّ النّاس۔ رسول اکرم کیا ہیں، کافۃً للنّاس۔ کتاب کلام مجید کیا ہے، ھدیً للنّاس۔ اور دُنیا، پہلا اور مقدس گھر، اَوَّلَ بیتٍ وُّضِعَ للنّاس۔ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا

کلامِ پاک سے ثابت ہوا کہ خدائے قدوس کے بعد کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے رسول اکرمؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں، نہ ظلّی نہ بروزی۔ کلامِ پاک فرقان حمید کے بعد کوئی کتاب اللہ نہ آئے گی۔ اور بیت الاوّل، بیت اللہ کے بعد کوئی گھر طواف کے قابل نہ ہوگا۔ نہ قادیان نہ ربوہ۔ دورانِ تقریر میں مقرر موصوف نے فرمایا کہ آپ اور ہم جب کتبِ اسلامیہ میں پڑھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے رحم دل تھے جو بڑھیا اُن پر گندگی پھینکا کرتی تھی، اس کی عیادت کے لئے گئے اور صحت کے لئے دُعا کی۔ جس نے گالیاں دیں اُس کو گلے لگایا۔ جس نے دانت شہید کئے، اس کے لئے دُعائے ہدایت کی تو دِل بڑا خوش ہوتا ہے۔ مگر کبھی آپ کی سختی بھی دیکھی کہ جس پر غضب ناک ہوئے اس سے کیا کیا۔ سُنیئے۔

ایک جنگ میں دو مسلمان مردِ میدانِ جہاد میں نہ گئے۔ پوچھا تو کوئی وجہ معقول نہ تھی

مسلمانوں سے کہا کہ ان سے بائیکاٹ کردو۔ اس پر زمین ان کے لئے تنگ نظر آئی ۔ وہ بازاروں اور گلیوں میں اس طرح پھر رہے تھے کہ گویا وہ اجنبی ہیں ۔ جب ان کی عورتوں کو اس بات کی خبر ہوئی، تو انہوں نے بھی بائیکاٹ کردیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تم بھی ان لوگوں سے جو خدا و رسول کے نافرمان ہیں، بائیکاٹ کر سکتے ہو۔ حالانکہ روزانہ ۲۴ گھنٹے کے بعد عشاء کے وتروں میں وعدہ کرتے ہو نَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ۔ پھر بھی ان عورتوں کی سی بھی ہمت نہیں کہ اپنے ایمان کا ثبوت دیں۔ قرآن میں احکامِ الٰہی سے جہاد فرض ہے ۔ مگر انگریزی نبی کہے کہ میرے آنے سے جہاد حرام ہوا۔ جہاد میں نماز قضا کی جاسکتی ہے ۔ حضور اکرم ؐ نے نماز ظہر قضا کی۔ ایک مقام پر قصر کی گئی ۔ ایک جہاد میں مجاہدین کی صفوں کے دو حصے کر دیئے گئے ۔ جنہوں نے باری باری سے نماز دو رکعت ادا کی سامعین سے خطاب فرمایا کہ ہاتھ اُٹھاؤ، کیا تم بھی چاہتے ہو کہ خداوند کریم ہم پر جہاد کا وہ وقت لائے کہ ہم بھی اسی طرح نماز ادا کریں ۔ آمین کہتے ہوئے سامعین نے دونوں ہاتھ تین فٹ اُٹھا رکھے تھے ۔ آج جناب مسیح اور امام مہدی، مرزا اپنے آپ کو بتا رہا ہے ۔ وقت کی قلت کی وجہ سے مختصر بیان کر رہا ہوں کہ اُن کا اصلی نام عیسیٰ ہوگا، اِس کا نام غلام احمد ۔ اُن کی والدہ کا نام مریم ہوگا، اِس کی والدہ کا نام .... سامعین نے کہا۔ چراغ بی بی اور مذاق اُڑایا چاہا تو فرمایا۔ زیادتی مت کرو، بُرا بھلا مت کہو۔ خدا کے دربار میں جواب دینا ہے ۔ والدہ کی تو کوئی غلطی نہ تھی ۔ یہ ہی منحوس نکلا۔ اُن کا باپ کوئی نہیں مگر اِس کے باپ کا نام غلام مرتضیٰ ۔ وہ غلام مرتضیٰ جس نے مجاہدینِ بالاکوٹ کو قتل کرنے میں پوری پوری ہمت سے کام کیا اور امداد کی ۔ اس کا فرزند اب یہ مسیح موعود مردود نکلا ۔ جس نے جہاد کو انگریز کے خلاف حرام قرار دیدیا ۔

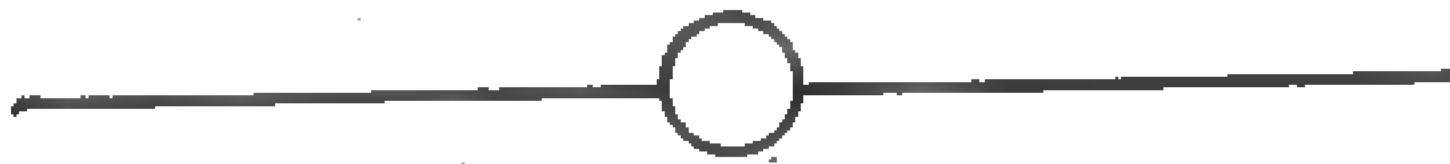
آج مسلمان نماز سے گریز کرتا ہے ۔ نہ تجارت میں اسلام، نہ سکولوں اور کالجوں

میں اسلام ۔ نہ زراعت میں اسلام ۔ امیروں کے بچے کالجوں میں پڑھیں، ملازمتوں کی خاطر اور وزارتیں حاصل کرنے کے لئے ۔ اور غرباء کے بچے اور یتامیٰ کے لئے مسجدوں کے حجرے اور گھروں سے مانگی ہوئی روٹیاں ۔ پھر مسلمان کے منہ سے نکلے "اسلام زندہ باد" معلوم نہیں کہ اسلام کس جگہ ہے ؟ پھر زندہ باد کے کیا معنی ؟

مقامی پولیس کے موجودہ سب انسپکٹر اور رپورٹروں سے خطاب فرمایا کہ میرے یہ الفاظ پورے کے پورے لکھ کر حکومت کو بھیج دینا ۔ میں نے چیچہ وطنی سے آتے ہوئے راستہ میں فلم کے پردوں کو لٹکتے ہوئے دیکھا ۔ برادران اور بہنوں کو مبارک ہو ۔ وہ ضرور اس کنجر خانہ کو دیکھتے ہوں گے ۔ کیا ایسے ماحول میں مسلمان، مسلمان رہ سکتا ہے؟ اسلامی ذہنیت ہی ختم ہو جائے گی ۔

دعا کریں کہ خداوند کریم ایسی لعنتوں سے بچائے اور ہدایت دے ۔ اعمال صالح کی توفیق دے اور نظامِ اسلامی پر عمل کرنے کی پوری پوری ہمت بخشے ۔

صدائے آمین فضائے آسمانی میں گونجی اور دس بجے شب جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا ۔

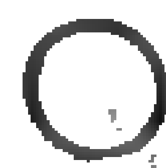


روزنامہ آزاد لاہور۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء

مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی

کا

بصیرت افروز بیان



لاہور ۲۴ر دسمبر

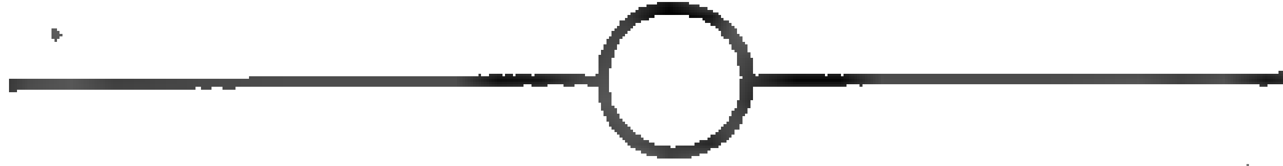
مرزائی انبیاء کرام کی سیرت کا موضوع اس سطح پر لانا چاہتے ہیں، جس پر انگریز کا پروردہ مرزا غلام احمد پورا اُتر سکے۔ راج پال نے بھی یہی کیا تھا کہ بعض مصنّفین کی کتابوں سے کتر بیونت کر کے ایسے حوالہ جات جمع کئے جس نے پورے عالم اسلام کو مشتعل اور پریشان کر دیا تھا۔ آج مرزا محمود نے بھی راج پال جیسی حرکت کی ہے۔ یہ حرکت دُور رس نتائج پر منتج ہوگی۔ کیا ملتِ اسلامیہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کسی قسم کے اشتعال انگیز اور گستاخانہ الفاظ سُننے کے لئے تیار ہے؟ یہ ہیں وہ الفاظ جو مجلسِ احرار اسلام پنجاب کے صدر مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے آج اپنے ایک بیان میں فرمائے!

آپ نے فرمایا۔ فتنہ مرزائیت کی بنیاد ہی اس چیز پر ہے کہ اسلام، احکامِ اسلام اور شعائرِ اسلام کی توہین و تذلیل کی جائے۔ مرزا محمود نے اپنے خطبہ میں، تاج دارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں جس قسم کے گستاخانہ الفاظ استعمال کر کے عزت و ناموسِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے

شمعِ محمدی کے جان نثار پروانے کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ صبر اور بے غیرتی میں بڑا فرق ہے۔

آپ نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے اربابِ حکومت سے مخاطب ہوکر فرمایا:
"وزارتوں اور صدارتوں کے تحفظ کے لئے قوانین بنانے والے سرورِ دو عالم کی توہین پر کیوں چپ ہیں؟

آپ نے فرمایا:۔ میں آل پارٹیز کنونشن کی مجلسِ عمل سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اوّلین فرصت میں مرزا محمود کی اس اشتعال انگیز حرکت کا ایکشن لے، ورنہ مسلمانوں کے مشتعل جذبات پر قابو پانا مشکل امر ہوگا۔



منقول از روزنامہ "کوہستان" لاہور - ۱۲ر فروری ۱۹۶۳ء

تعلیمی اداروں میں رقص و سرود کی تعلیم سے اظہارِ نفرت

تنظیمِ اہلِ سُنّت کا ایک جلسہ

(احسان بی اے)

اتوار کو صبح ساڑھے نو بجے تنظیم اہل سنّت کے زیر اہتمام باغ بیرون موچی دروازہ رمضان المبارک کے موضوع پر ایک جلسہ عام ہو رہا تھا جس کی صدارت وزیر ریلوے مغربی پاکستان خان عبدالوحید خان فرما رہے تھے۔ رمضان المبارک کی بیشمار برکتوں میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ یہ مبارک مہینہ ہمیں پابندیٔ اوقات کی تربیت بڑے حسین انداز میں دیتا ہے۔ جلسہ کی صدارت کیلئے خان عبدالوحید خان صاحب کا انتخاب شاید اسی لئے عمل میں آیا تھا کہ ہم ریلوے کی گاڑیوں سے بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ وقت پر آئیں جائیں گی۔ دونوں کے درمیان یہی قدر مشترک وزیر ریلوے کو جلسے کا جائز صدر بنا دیتی ہے لیکن میرے بھی کچھ ذاتی تجربات ہیں۔ میں اکثر پلیٹ فارم پر آدھ پون گھنٹہ لیٹ پہنچنے کے باوجود دوستوں اور سیاسی لیڈروں کا استقبال کر لینے میں کامیاب ہوا ہوں اور میں نے ریلوے کی مہربانی سے کبھی اپنے آپ پر لیٹ ہونے کا الزام نہیں آنے دیا۔ اس خوشگوار تجربہ کے پیش نظر میں نے وزیر ریلوے کی آمد کو غنیمت جانا اور نہایت بے تکلّفی سے لیٹ ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گیا تھا یا جلسہ واقعی ٹھیک وقت پر شروع ہو گیا۔ بہرحال واقعہ جو بھی ہوا جب میں جلسہ گاہ میں حاضر ہوا، خان عبدالوحید خان صاحب تقریر فرما رہے تھے موچی دروازہ کے باہر تقریر کر لینا بچوّں کا کھیل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جلسہ گاہ میں پہنچتے ہی مجھے سخت حیرت ہوئی۔ خان عبدالوحید خان تقریر کر رہے تھے اور جلسہ گاہ میں سے کسی کو اُٹھ کر جانے کی ضرورت

محسوس نہیں ہوئی۔ لوگ بڑی توجہ سے خان صاحب کی باتوں کو سُن رہے تھے۔ سب سے پہلے میں نے سامعین کا جائزہ لیا۔ خیال تھا کہ موچی دروازہ کا جلسہ سُننے والے نئے لوگ ہیں جو وزیر ریلوے کو بھی برداشت کرنے کی ہمت کر رہے ہیں۔ مجھے ان متوجہ صفوں میں کچھ نئے چہرے یقیناً نظر آئے لیکن ان کے ساتھ اس جلسہ گاہ کے سچے سامعین کی بھی کمی نہ تھی اور یہ سب متوجہ تھے۔ میں نے دل ہی دل میں "یا حیرت" کا نعرہ مارا، اور خان صاحب کی تقریر کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے بہت جلد اس جادو کا پتہ چل گیا جس کی مدد سے خان صاحب موچی دروازہ کے باہر تقریر کرنے پر قادر ہو گئے تھے خان صاحب سرے سے تقریر کر ہی نہیں رہے تھے محض اپنے دل کی باتیں سنا رہے تھے اور کیونکہ یہ سب باتیں اس اجتماع کے دل میں بھی تھیں اس لئے ہر آدمی انہیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ وہ دیر سے آنے والی ریلوں کے وزیر نہیں بلکہ اس قوم کے ایک حسّاس فرد معلوم ہو رہے تھے۔ جس کی اکثر گاڑیاں لیٹ ہو رہی ہیں اور چاہتی ہے کہ اس کی ساری گاڑیاں وقت پر چلیں اور کسی حادثے کے بغیر چلتی رہیں۔ اس ضمن میں وہ مغرب پسندی کے حادثے کا ذکر فرما رہے تھے۔ فرمایا کہ ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہم مغربی ممالک سے مدد لیتے ہیں لیکن اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر مدد کس سے لیں اور آخر مدد لینے کا یہ مطلب کیوں ہے کہ ہم اس مدد کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافت اور حماقت سب کو اپنا لیں۔ اور اپنے اس نصب العین سے غافل ہو جائیں جس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ پچھلے دنوں کافی دیر کے بعد ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا، اور وہاں ایک مشاعرے میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں لیکن ان مسلمانوں کے دلی عزائم کا اظہار اس مشاعرے کی ایک غزل میں ہوا جس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔ شعر تھا ؎

زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہو گی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہو گی

کبھی نہ مٹنے کا یہ شعور موت کے بعد بھی ابدی زندگی کا احساس اور مستقبل کے متعلق ہمیشہ پُر اُمید رہنے کا یہ جذبہ مسلمان کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ وہ دنیا کی ثروت اور دولت پر

ہی زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اخلاقی کردار ہے جس کی بنا پر وہ زندہ ہے اور رہے گا۔ جب تک یہ اخلاقی کردار زندہ ہے، ہمارا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ خان عبدالوحید خان نے کہا، کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ دین سے بے بہرہ ہوتا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ علماء کے گروہ کو جدید تعلیم یافتہ لوگ کچھ بھی کہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ علماء ہی کا طبقہ ہے جن کی برکت سے دینی ڈھانچہ قائم ہے۔ آپ نے کہا کہ اس مبارک مہینہ میں ہمیں دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈالنا چاہیئے۔ ہم گیارہ مہینے دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اس مبارک مہینے میں ہمیں دوسروں کی اچھائیاں اور اپنی برائیاں دیکھنی چاہئیں۔

خان صاحب کو گیارہ بجے ایک میٹنگ میں شامل ہونے کے لئے جانا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی تقریر سننے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ میرے اور مولانا کے سیاسی اختلافات بہت پرانے ہیں۔ مولانا کٹر احراری اور میں کٹر مسلم لیگی لیکن ان اختلافات کے باوجود مجھے مولانا کی علمیت سے کبھی انکار نہیں ہوا، اور ان کی خطابت کا میں ہمیشہ سے مداح ہوں۔ چنانچہ اس خواہش کے احترام میں مولانا احسان احمد شجاع آبادی مائیکروفون پر تشریف لائے۔

سر پر سفید رومال، چہرے پر سفید داڑھی، جسم پر لمبا سفید کرتا، بائیں ہاتھ کی کلائی پر گھڑی، آنکھوں میں سُرمے کی گہری شام۔ پچھلی کرسیوں پر سے مولانا کا سٹیج پر اُبھرنا صفائی و پاکیزگی اور طہارت کی تصویر کا بے نقاب ہونا تھا۔ اس قسم کا تاثر صرف علماء ہی کی محفل میں نصیب ہوتا ہے۔ ورنہ رنگ برنگے استری کئے ہوئے سوٹ وہ تاثر پیدا نہیں کرتے۔ مولانا آنکھوں کے راستے دل کے کسی نرم اور گرم گوشے میں اُتر گئے۔ انہوں نے مائیکروفون پر آ کر ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا کی۔ کلام مجید کی ایک آیت تلاوت کی۔ ایک حدیث قدسی پڑھی اور اس کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ اگر آپ کسی عظیم، حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ڈیلٹے کا تصوّر کر سکیں، تو اس تقریر کے تاثر کے قریب آ جائیں گے۔ ایک دریا تھا جس کی مختلف شاخیں ہر موضوع

کو گھیر رہی تھیں۔ اس کا نقشہ پیش کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ صرف حصولِ برکت کے لئے حدیث قدسی اور اس کے متعلق چند باتیں پیش کر سکوں گا۔

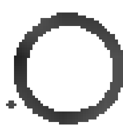
حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ ارشاد ہوا ہے کہ جب تمہارے امیر نیک ہوں گے تمہارا مالدار طبقہ سخی ہوگا اور تمہارے کام کاج باہمی مشوروں سے طے پائیں گے، تو زمین کی پیٹھ پر تمہارا اثر ہوگا اور تمہاری ہر بات کی آبرو کی جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس اگر تمہارے امیر شریر ہو جائیں، تمہارا مال دار طبقہ بخیل ہو جائے اور تمہارے کام کاج تمہاری بیگمات کے ہاتھوں میں چلے جائیں، تو تمہارے لئے زمین کا پیٹ زمین کی پیٹھ سے بہتر ہوگا۔ حدیث قدسی کا ترجمہ کرنے کے بعد مولانا نے لفظ "امیر" کی تفسیر کی۔ فرمایا عربی میں امیر کے معنی مالدار کے نہیں ہوتے بلکہ پیر اپنے مریدوں کا امیر ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کا امیر، تھانیدار اپنے ماتحتوں کا امیر، ڈپٹی کمشنر ضلع کا امیر، گورنر صوبے کا امیر، اور صدرِ مملکت پورے ملک کا امیر ہے۔ یہ معنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد جب مولانا نے حدیث کے الفاظ کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تمہارے امیر نیک ہوں گے"۔ تو یقین کیجئے کم از کم میرے تصوّر میں عجیب وغریب نقشے بن بن کر مٹنے لگے۔ مولانا کے ارشادات کسی عظیم دریا کی طرح مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر ایک بہت بڑا ڈیلٹا بناتے چلے گئے اور ہر آدمی اپنے ذوق کے مطابق ان سے مستفید ہوتا رہا۔ اقبال کے اشعار کا بھی ترجمہ ہوا۔ حکایات بھی سنائی گئیں۔ بزرگانِ دین کی زندگی کے واقعات بھی آئے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ آپ بھی سُنیں۔ مولانا نے کہا کہ ایک دن حضرت بایزید کی ملاقات ایک عارف لڑکے سے ہو گئی۔ لڑکا چل رہا تھا تو حضرت نے اس سے کہا۔ بیٹے دیکھ کر چل، کہیں پھسل نہ جانا۔ لڑکے نے کہا۔ بایزید اگر میں پھسلا تو اکیلا گروں گا۔ تُو سنبھل کہ اگر تُو پھسلا تو امتِ مسلمہ گر جائیگی۔ میں یہی بات ملّت کے امیروں سے کہتا ہوں سنبھلو کہ اگر تم پھسلے تو پوری اُمّت پر زوال آجائے گا۔ ایک اور فقرہ سُنیئے۔ فرمایا کہ کافر خدا پر بھی ایمان رکھتا ہے لیکن مسلمان خدا پر ہی ایمان رکھتا

ہے۔ کفر اور اسلام میں صرف "بھی" اور "ہی" کا فرق ہے۔ اگر یہ ملحوظ رہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دنیوی کامیابی پیر چومتی ہے۔ اور پھر "جب تمہارے کام کاج تمہاری بیگمات کے ہاتھ میں چلے جائیں گے" کے ارشادِ قدسی پر اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے مولانا نے ہمارے موجودہ معاشرہ کی تصویر پیش کی۔ اس میں وزیر تعلیم بیگم محمودہ سلیم کا یہ ارشاد سرفہرست تھا کہ وہ طلباء کو مُلا بنانا نہیں چاہتیں۔ مولانا نے پوچھا کیا بیگم صاحبہ سب کو ایکٹر بنانا چاہتی ہیں۔ آپ نے وزراء سے اپیل کی کہ وہ یہ غیر اسلامی تصورات پیش کرنے کی مشق ترک کر دیں۔ فرمایا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ دین کو بچاؤ۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنی آنے والی نسلوں کو بچاؤ۔ اور اس بات کی فکر کرو کہ تمہاری آنے والی نسلیں مسلمان رہتی ہیں یا نہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ سکولوں سے رقص و سرود کی محفلوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کوئی ہاتھ نہ تھا جو بیگم محمودہ سلیم کے حق میں اٹھا ہو۔ بارہ، پندرہ ہزار کا یہ مجمع محترمہ کے اس ارشاد کی مخالفت میں اپنے یقیناً انتہائی دُور رس ہاتھوں کو آسمان کی بلندیوں تک کھینچ دینا چاہتا تھا۔ خان عبدالوحید خان اس وقت تشریف لے جا چکے تھے۔ وہ میٹنگ کے لئے گیارہ بجے تشریف لے گئے۔ اگر وہ ہوتے تو وہ بیگم محمودہ سلیم اور شیخ مسعود صادق کی عظیم الشّان عدمِ مقبولیت کا تماشہ دیکھتے۔ اس تماشے کی خبر گورنر مغربی پاکستان تک ضرور پہنچنی چاہیئے تھی۔

نصیحت آمیز خطاب

پیش کردہ : محمد اکرم شاہد لبتی ۲۷۶ ج ب

۱۳ر جنوری ۱۹۶۴ء بمطابق ۲۷ر شعبان ۱۳۸۳ھ بروز سوموار صبح علماء کرام کے دورۂ تفسیر کے دوران حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ خطیب پاکستان مسجد شیرانوالہ لاہور میں تشریف لے گئے۔ جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی حضرت مولانا عبید اللہ صاحب انور مدظلہ العالی کے کہنے پر حضرت قاضیؒ نے بہت مختصر وقت میں عجیب نصائح سے بھرپور ایک مفید خطاب فرمایا۔ جسے احمد عبد الرحمٰن صاحب صدیقی نوشہروی شریک دورۂ تفسیر ۱۳۸۳ھ لاہور نے قلمبند کیا۔



بزرگو اور دوستو! دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے اس فیض کو جاری وساری رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ جو امانت ہمیں سلف نے دی ہے وہ ہم خلقت تک پہنچا سکیں (آمین)۔ مجھے ندامت ہوتی ہے جب بزرگ مجھے اس طرح نوازتے ہیں۔ میں تعمیلِ ارشاد کے لئے۔ جو ایک بڑی سعادت ہے چند باتیں عرض کر دیتا ہوں ہمارے اکابر ومشائخ جب کوئی حکم دیں، اور وہ ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم نہیں کرتے، بلکہ ان کو اپنی منواتے ہیں جس سے نقصان ہوتا ہے۔

مخدوم بننا آسان ہے، خادم بننا مشکل ہے۔ مثلاً عرض کرتا ہوں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم معہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے، مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ

تشریف لائے تو اہلِ مدینہ استقبال کے لئے نکلے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے معانقہ شروع کر دیا۔ لوگ انہیں نبی سمجھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے نور کا عکس حضرت صدیق رضی اللہ عنہ پر یوں تھا کہ لوگ فرق نہ کر سکتے تھے۔ جب دھوپ ہونے لگی تو یہی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ چادر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر تان کر کھڑے ہو گئے تاکہ سایہ ہو اور بتا دیا کہ میں خادم ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخدوم ہیں۔ نفع حکم کی تعمیل سے ہوتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ درباریوں نے محمود غزنویؒ سے پوچھا کہ اس کو ایاز کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کیوں ہے تو آپ نے فرمایا کہ کسی وقت بتلاؤں گا ایک دن ایک بیش قیمت ہیرا آیا۔ درباریوں میں سے ہر ایک کو محمود غزنویؒ وہ ہیرا دکھلاتا رہا۔ سب نے اس کی خوب تعریف کی تو محمود ہر ایک سے کہتا کہ اسے توڑ دو۔ سب نے انکار کر دیا۔ کہ اس قیمتی ہیرے کو کیسے توڑیں۔ ایاز بھی سرہانے کھڑا تھا۔ محمود نے اس سے کہا، کہ توڑ دو۔ اُس نے فوراً توڑ دیا۔ سب درباری اس پر ناراض ہوئے، کم عقل یہ تُو نے کیا کیا۔ وہ کہنے لگا۔ میں نے موتی توڑا ہے، موتیوں والے کا حکم نہیں توڑا جو پھر مل نہیں سکتا، موتی کا ملنا تو آسان ہے۔ واللہ العظیم، میں بھی اسی طرح کہہ رہا ہوں کہ حضرت کے حکم کی تعمیل کے لئے کچھ عرض کر رہا ہوں۔ سب کچھ ادب سے آئے گا۔ اگر ادب نہ ہو تو حروف آجاویں گے مگر نُورِ قرآن سینے میں نہیں اُترے گا جب تک عقیدت کامل نہ ہو۔

آپ حضرات کو باہر جن فتنوں سے پالا پڑے گا، ان میں سب سے بڑا یہی ہے، کہ اسلاف پر اعتماد ختم کیا جا رہا ہے۔ سب جدید ملحدین، مفسّرین، مجدّدین کا یہی نظریہ ہے کہ سلف صالحین کے اعتماد کو ختم کر دیا جائے۔

یہاں میں امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک لطیفہ سناؤں فرمایا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں نور و بشر کا جھگڑا لوگ کرتے ہیں مگر غلط طور سے۔ اکثر سوال یوں ہوتا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم آدمی ہیں تو ہم نہیں، اور اگر ہم آدمی

ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمی تسلیم کر لیتے تو تو بہتر تھا، یعنی وہی عبدِ کامل تھے، ہم نہیں۔ مگر ان لوگوں کو غلطی لگی، اپنے آپ کو آدمی سمجھ بیٹھے جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آدمیت سے انکار کر دیا۔ یہ ان کو دھوکا لگا آج جو فساد ہے وہ عدم اعتماد علی السلف کی وجہ سے ہے۔ آج سب کہتے ہیں، قرآن کے جو معنی ہم کرتے ہیں یا سمجھتے ہیں وہ صحیح ہیں حالانکہ کسی سے پڑھا بھی نہیں ہوتا۔

آپ کو مبارک ہو۔ جس گروہ سے آپ تعلق رکھتے ہیں حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ و حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا گروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی انہی سے متعلق رکھے اور انہی کے ساتھ حشر فرمائے (آمین) یہ سلسلۃ الذہب ہے۔ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں سب کی سند موجود ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت شیخ لاہوریؒ تک بڑے بڑے اکابر و اولیاء موجود ہیں۔ جس طرح سلسلہ نسب منقطع ہو جائے تو وراثت کا حقدار نہیں ہوتا۔ اسی طرح جسے سلسلہ بسلسلہ فہمِ قرآن و حدیث نہ پہنچا ہو وہ عالم نہیں ہو سکتا۔ اب پرویز و مودودی نے کس سے پڑھا ہے جو شارحینِ قرآن بن بیٹھے ہیں۔ بتائیں تو سہی۔

ایک ہے کلام، ایک ہے معنی کلام اور ایک ہے مفہوم متکلم۔ مثلاً "جی" کا لفظ ہے۔ اس سے تائید بھی ہوتی ہے اور چیلنج بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی فرمایا کرتے ہیں کہ "کیا بات ہے" ایک حیثیت سے سوال ہے، دوسری طرف سے تحسین ہے اور تیسری طرف سے توہین ہے، تو لفظ ایک ہے معانی تین ہیں، اور وہ متکلم کو دیکھ کر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ صرف نقوش سے فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ تو اس کو معلوم کرنے کے لئے متکلم کے چہرے کو دیکھنا ہو گا۔ جب دیکھنے کو درمیان سے ہٹا دو تو سمجھ میں کیسے آوے گا۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ پر اور سلف صالحین پر اعتماد کرنا ہو گا۔ مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی نے ترجمان السنۃ میں ایک شعر لکھا ہے۔ بہت عمدہ ہے۔

خدا نہیں ملتا مصطفےٰؐ کے بغیر　　　اور مصطفےٰ نہیں ملتا صحابہؓ کے بغیر

قرآن مجید کی یہ خدمت و فکر جو جاری ہے جو سلف نے محنت سے ہم تک پہنچائی ہے، اللہ تعالیٰ سمجھنے سمجھانے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین۔

جہاں جہاں تراویح ہوں گی اس کا ثواب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی ہوگا۔ آپ جو کہا کرتے ہیں کہ "رفض" میں "حفظ" نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ روافض تراویح پڑھتے ہی نہیں۔ پہلے تو قرآن حفظ نہیں ہوتا، اگر ہو جائے تو دوہراتے نہیں جس کی وجہ سے حفظ باقی نہیں رہتا، تو یہ صلوٰۃ التراویح طریقہ حفظ ہے۔

ہمارے اس ملک میں قرآن سمجھنے پڑھنے کا ذوق حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے پیدا کیا ہے۔ سب علماء کو متوجہ کر دیا ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ جب تک شمس و قمر اور زمین و آسمان ہوں گے، حضرت کو ثواب انشاءاللہ ملتا رہے گا۔

سمجھنے کے لئے محبت و عقیدت ضروری ہے۔ اگر کوئی پیاسا کنوئیں کے قریب آ بھی جائے جس میں خوب پانی ہو مگر اپنا برتن اُلٹا کر کے بیٹھ جائے تو قیامت تک پیاس بُجھ نہیں سکتی۔ اسی طرح ظرفِ عقیدت و محبت کو سیدھا کر کے بیٹھو، تاکہ فیض مل سکے۔

اب دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل قرآن وحدیث کی سمجھ دے اور اکابرین حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلائے۔ خاتمہ بالایمان فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

خطیبِ پاکستان کی ایک تاریخی تقریر

مرتبہ : جانباز مرزا

کراچی کے ایک لاکھ کے مجمع میں خطبہ مسنونہ کے بعد خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا :-

صدر گرامی قدر و بزرگانِ ملّت ! میں اسی سال ماہ جنوری میں اسی میدان میں حاضر ہو کر اپنی ابتدائی معروضات پیش کر گیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ تقسیمِ ملک کے بعد حالات کے مطابق ——— ہم نے اپنی مساعی ملّی اتحاد اور جذبۂ جہاد کے لئے وقف کر دیں اور اپنا یہ فرض سمجھ لیا کہ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ، بستی بستی پھر کر اپنی مملکت کے عوام کو وقت کے تقاضوں سے آگاہ کریں، اور ان میں جہاد و اتّحاد کے جذبات کو پیدا کریں۔ ختمِ نبوّت کانفرنس کے نام سے شاید بعض دوستوں کو یہ خیال ہو کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی فقہی، مونشگافیاں ہوں گی۔ کوئی نظریاتی اختلاف ہوگا۔ یہ محض ایک دھوکہ ہے۔ یہ کانفرنس بھی بالواسطہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کیونکہ یہاں بھی ہمیں اپنی مملکت کے عوام کو مذہب و ملّت اور مملکت دشمن ایک گروہ اور اس کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنا ہے۔ جہاں تک ختمِ نبوت کا تعلق ہے ہم صرف نبوّت ہی کو ختم نہیں مانتے بلکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزوں کو ختم مانتے ہیں۔ دیکھو کیا ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، کہہ میں پناہ میں آتا ہوں نسلِ انسانی کے رب کی۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ (ترجمہ) رمضان کا مہینہ جس میں اُتارا گیا قرآن نسلِ انسانی کے لئے ہدایت ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (ترجمہ) بیشک پہلا گھر (خانہ کعبہ) جو بنایا گیا نسلِ انسانی کے لئے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاس (ترجمہ) تم خیرالامت ہو نکالی گئی نسلِ انسانی کے لئے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اب ہمارا رب بربّ النّاس، کتاب ھدًی للنّاس، قبلہ بیت وضع للنّاس، اُمّت اخرجت للنّاس۔ یعنی ہمارا رب تمام انسانیت کا رب، ہماری کتاب تمام انسانیت کے لئے موجبِ ہدایت، ہمارا کعبہ تمام انسانیت کے لئے جائے مرکزیت، اور ہم انسانیت کے لئے اُمّتِ خیر۔

نسلِ انسانی کے لئے ربِّ اکبر کے سوا اور کوئی رب نہیں۔ کعبہ کے سوا اور کوئی مرکز نہیں قرآن کے سوا اور کوئی قانون نہیں، اور محمدؐ عربی کے سوا اور کوئی نبی نہیں۔ ربوبیت رب پرختم ہے۔ کتب قرآن پر ختم ہیں۔ اُمّتیں اسلام پر ختم ہیں اور نبوّت محمدؐ عربی پر ختم۔

ربِّ اکبر کے بعد کوئی رب نہیں ہوسکتا۔ کعبہ کے بعد کوئی گھر نہیں ہوسکتا، تو محمدؐ کے بعد اور کوئی نبی بھی نہیں ہوسکتا۔

اور نبی بھی آئے مختلف وقتوں میں آتے۔ مختلف قوموں کی طرف، مختلف نسلوں کی طرف آئے، مختلف خطّوں کی طرف آئے۔ کوئی کہیں آیا، کوئی کہیں آیا۔ اپنی اپنی باری سب آئے لیکن پھر ایک آیا۔ خالقِ کائنات نے فرمایا۔ قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ نبی کہہ دے، اے تمام نسلِ انسانی، مَیں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور پھر ہر رسول نے بعد میں آنے والے رسولوں کی بشارت دی لیکن جب عیسٰیؑ رُوح اللہ آئے تو "رُسُل" کا لفظ نہیں کہتے بلکہ نام لے کر یہ فرمایا۔ من بعدی اسمہٗ احمد جو میرے بعد آئے گا اُس کا نام احمدؐ ہوگا۔ اور جب احمدؐ آیا تو اعلان کر دیا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

یہ مسئلہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے تمام طبقوں اور ملّت کے تمام فرقوں میں اسی طرح متفقہ علیہ چلا آرہا ہے، اور آج تک کسی ایک کو بھی اس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہوئی۔ سوا اُن چند لوگوں کے، جنہوں نے خود نبی بننا چاہا۔

جہاں تک مرزائیت کا تعلق ہے، ان کا ہمارا اختلاف کوئی مذہبی و دینی اختلاف نہیں۔ ہماری اور اُن کی بحث مسائل کی بحث نہیں۔ اس لئے کہ وہ کوئی دینی گروہ اور مذہبی فرقہ نہیں۔ بلکہ ایک پولٹیکل پارٹی ہے۔ اسے انگریز اپنی سیاسی اغراض کے لئے برسرکار لایا۔ اس پارٹی سے اس کا مقصد مذہب کی آڑ میں مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے سینوں میں جو جذبۂ جہاد موجزن ہے اس کے خلاف شکار کھیلنا تھا۔ چنانچہ خود مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب "تحفۂ گولڑیہ" کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دِیں کے لئے حرام ہے اب جنگ و قتال
اب آگیا مسیح جو دِیں کا امام ہے
دِیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نُورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا خیال فضول ہے

تم میں سے جس کو دِین و دیانت سے پیار ہے
اب اس کا فرض ہے کہ وہ دل کو کرے استوار
لوگوں کو یہ بتائے، کہ وقت مسیح ہے
اب جنگ اور جہاد حرام اور قبیح ہے
ہم اپنا فرض دوستو، اب کر چکے ادا
اب بھی اگر نہ سمجھو، تو سمجھائے گا خدا

یہ تو اندرونِ ملک میں مساعی تھیں، اور بیرونِ ملک میں بھی وہ مبلّغوں کے لباس میں انگریزی حکومت کے جاسوسوں اور برٹش امپیریلزم کے ففتھ کالموں کی حیثیت سے کام

کرتے رہے، اور اس بات کے لئے کوشاں رہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے آزاد ممالک بھی برطانیہ کی دسترس میں آجائیں۔ چنانچہ اپنی کتاب "فریادِ داد" کے صفحہ ۲۳ پر مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "بیشک ہمارا فرض ہے کہ ہم اس گورنمنٹ محسنہ کے سچے دل سے خیر خواہ ہوں اور غیر ملکوں میں اپنی محسن گورنمنٹ کی نیک نامی پھیلانی چاہتے ہیں کہ کس طرح اس عادل گورنمنٹ نے دینی امور میں ہمیں پوری پوری آزادی دی ہے یہ عملی نمونے ہزاروں کوسوں تک چلے جاتے ہیں اور دِلوں پر ایک عجیب اثر ڈالتے ہیں اور صدہا نادانوں کے دِلوں سے وسوسے دُور ہو جاتے ہیں۔ یہ مذہبی آزادی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی خبر پاکر بہت سے اور ملک بھی چاہتے ہیں کہ اس مبارک گورنمنٹ کو اپنا صدق اور اخلاص دکھائیں کیونکہ جس طرح اچھے دکاندار کا نام سُن کر خریدار دوڑتے ہیں۔ اسی طرح جس گورنمنٹ کے ایسے بے تعصب اور آزاد اُصول ہوں وہ گورنمنٹ خواہ مخواہ پیاری اور ہر دلعزیز معلوم ہوتی ہے، اور بہت سے غیر ملکوں کے لوگ حسرت کرتے ہیں کہ کاش ہم اس کے ماتحت ہوتے۔"

اکھنڈ ہندوستان

آپ شاید یہ خیال کریں کہ مرزائیوں کے یہ عقائد تو قیامِ پاکستان سے قبل کے ہیں، پاکستان سے ان کا کیا واسطہ ہے لیجئے پاکستان کے متعلق بھی مرزائیوں کا عقیدہ سُن لیجئے۔ مرزائی پارٹی کے سرکاری ترجمان "الفضل" کی ۱۶ امئی ۴۷ء کی اشاعت میں صفحہ ۲ پر مرزا بشیر الدین محمود امیر جماعت مرزائیہ اپنی مجلسِ علم و عرفان میں اپنے ایک رویا۔ کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے لیکن اگر قوموں کی غیر معمولی منافرت کیوجہ سے عارضی طور پر الگ بھی کرنا پڑے تو یہ اور بات ہے۔ بسا اوقات عضوِ ماؤف کو ڈاکٹر کاٹ دینے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن یہ خوشی سے نہیں ہوتا، بلکہ مجبوری اور معذوری کے عالم میں، اور صرف اسوقت ہوتا ہے جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس عضوِ ماؤف کی جگہ دوسرا عضو لگ سکتا ہے تو کون جاہل انسان

اس کیلئے کوشش نہ کریگا۔ اس طرح ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوئے ہیں تو وہ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں۔"

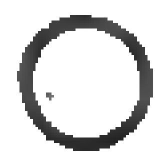
یہ ہے پاکستان کے متعلق قادیانیوں کا عقیدہ۔ وہ خدا کی مشیت اور اپنے خلیفہ کے رویا کے مطابق پاکستان کے وجود کو عارضی سمجھتے ہیں۔ وہ ملک کے وجود کو خوشی سے نہیں بلکہ ایک مجبوری سے قبول کئے ہوئے ہیں، اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح متحد ہو جائیں۔ آپ غور فرمائیں کہ اپنی مجلسِ علم و عرفان میں ایسے خیالات کا اظہار کرنے والا اور اسے اپنا رہنما ہی نہیں بلکہ روحانی امام ماننے والے کبھی اس ملک کے وفادار ہو سکتے ہیں اور یہ رویا صرف ایک بار ہی نہیں بلکہ مختلف الفاظ میں کم و بیش تین بار مرزائیوں کے سرکاری گزٹ "الفضل" میں شائع ہوا ہے۔

میں اپنی ملت اور اپنی حکومت سے درخواست کروں گا کہ اس اعلان اور اس بیان کے بعد وہ سوچے کہ پاکستان میں مرزائیت کے عزائم کیا ہیں۔ اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے قاضی صاحب نے عوام کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

حضرات! پورے فہم اور ذمہ داری سے جواب دیں کہ ایسے غدارانِ ملک و ملت کی سرگرمیوں کا استیصال ضروری ہے یا نہیں۔ آپ نے ابرِ بہار کی طرح گرجتے ہوئے فرمایا:۔ ہم مرزائیوں کو اسلام اور پاکستان کا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں اور اس فتنہ کے استیصال کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہیں، اور ہم نے اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ قاضی صاحب کی تقریر میں بار بار اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے تھے، مگر رات کا ایک بج چکا تھا، اس لئے جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

جامعہ حمیدیہ لاہور کے افتتاحی اجلاس کی جھلکیاں

تحریر: ملک ممتاز



علمی ادارے مولٰنا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اپنی تقریر کے دوران کہا بد قسمتی سے موجودہ تعلیمی اداروں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بھی تعلیمی ادارے تصوّر کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات خلافِ حقیقت ہے۔ یہ ادارے اچھّے کلرک اور انجنیئر تو پیدا کرسکتے ہیں، لیکن انہیں علمی ادارے کہنا قطعاً نا انصافی ہے آپ نے بتایا کہ علم وہ ہے جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو اور اس معرفت کی روشنی میں حقوق العباد کا احساس ہو۔

سب سے بڑا اعزاز، مُلّا قاضی صاحب نے بتایا کہ انگریز نے قرآن پاک سے انتقام لینے کے لئے مولوی اور مُلّا کے الفاظ کو گالی بنا دیا۔ اگر مولوی یا مُلّا نہ ہوتے تو مسلمانوں میں جذبۂ اسلام بھی پیدا نہ ہوتا، اور نہ پاکستان بنتا۔ آپ نے کہا کہ اسلام میں سب سے بڑا اعزاز "مُلّا" ہے۔

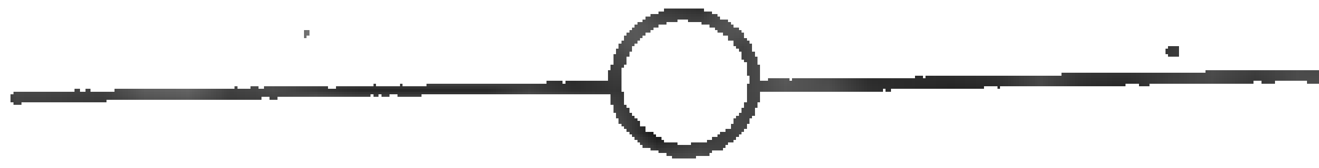
ہمارا مذہب یہ نہیں قاضی صاحب نے بتایا کہ میرا مذہب جامد ہے، متحرک نہیں ہے۔ میرا مذہب حکومت کو تابع کرنا چاہتا ہے حکومت کے تابع نہیں ہے۔ ہمارا مذہب یہ نہیں ہے کہ اقتدار جو کہے ہم وہی کہتے چلے جائیں۔

بھیڑیں اور بھیڑیئے

قاضی احسان احمد نے دورانِ تقریر کہا کہ بھیڑوں کو جنگل میں اس وقت آزاد چھوڑا جا سکتا ہے جب بھیڑیوں کو قابو میں کر لیا جائے۔ آپ نے کہا کہ مستورات کو پردہ کے بغیر ہرگز کھلے منہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب جوان مردوں اور جوان عورتوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں، تو معاشرے میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔

اجتماعی اور انفرادی رعُونت

قاضی صاحب نے مذہب اور مُلک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مذہب اور مُلک کے لئے اکڑ کر چلنا رحمت ہوتا ہے، اور اپنی ذات پر فخر کرنا اور اس کی رعُونت سے اکڑ کر چلنا لعنت ہوتا ہے۔



روزنامہ "مشرق" لاہور۔ یکم جنوری ۶۵ء

آل پاکستان تحفّظِ ختمِ نبوّت کانفرنس چنیوٹ

میں

قاضی صاحبؒ کی تقریر

قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جماعت اسلامی نے اسلام کو سیاست میں گھسیٹ کر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اس نے خاتون کو سربراہِ مملکت بنانے کے بارے میں جو دلیل دی ہے وہ ہر غیر اسلامی فعل کے ارتکاب کے لئے حجت بن سکتی ہے۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ "پردہ اور اسلام" کا فاضل مصنّف آج ان باتوں کو پس پُشت ڈال رہا ہے جن کو تسلیم کرانے کے لئے وہ اپنے قلم کا پورا زور لگاتا رہا ہے۔ انہوں نے مولانا مودودی کی ان تحریروں کا بھی حوالہ دیا جس میں انہوں نے برطانوی پارلیمانی نظام اور امریکہ کی صدارتی حکومت دونوں کو نامعقول قرار دیا تھا۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے ۱۹۵۳ء کے حالات اور تحفّظِ ختمِ نبوّت کے مظاہروں کے دوران جنرل محمد اعظم خاں کے کردار پر کڑی نکتہ چینی کی۔ انہوں نے کہا کہ یہی جنرل اعظم تھے، جنہوں نے اُس وقت مسلمانوں پر ظلم روا رکھا تھا، آج جمہوریت کے دلدادہ اور داعی بن کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(ج) تحریر

مقدمہ ——— "عادلانہ دفاع"

خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب مدظلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

مودودی صاحب نے حضراتِ صحابہؓ خصوصاً حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہ اموی حضرات رضی اللہ عنہم کو انتہائی بے دردی کے ساتھ مجروح کیا ہے۔

وہ اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی کئی اشاعتوں میں بالکل بلاوجہ یہ "کھیل کھیلتے" رہے ہیں، اور اسلامیانِ پاکستان کے قلوب کو نہایت بری طرح زخمی کرتے رہے ؎

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

خدا کا شکر ہے کہ ملّتِ اسلامیہ زندہ ہے اور ملّت کے ایک فرزند برادرم حضرت مولانا سیّد نور الحسن شاہ صاحب بخاری نے مودودی صاحب کی اس ایمان سوز "تفریح" کا مسکت جواب دیا ہے جس کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جواب تریاق ہے مودودی صاحب کے اس زہرِ قاتل کا، جس سے پڑھے لکھے نوجوانوں کے اذہان و ایمان مسموم و متاثر ہوئے۔ جن سادہ دل اور علمِ دین سے بے خبر نوجوانوں نے خود ساختہ "مفکرِ اسلام" اور عہدِ حاضر کے اس متجدد کے یہ زہریلے مضامین پڑھے ہیں،

اگر وہ یہ جوابی تحریر پڑھ لیں گے تو انشاء اللہ صحابہ کرامؓ کے خلاف اور خود دین کے خلاف اس جدید فتنہ سے محفوظ رہیں گے۔

مودودی صاحب کا یہ کھیل کوئی نیا نہیں۔ یہ تو ان کا پرانا تفریحی مشغلہ (HOBBY) ہے، اور ان کے اس تفریحی "شغل و شکار" سے حضرات انبیاء علیہم السلام تک نہیں بچ سکے۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے سیدنا یونس علیہ السلام کو یوں ہدفِ ناوکِ بیداد بنایا۔

"تاہم قرآن کے ارشادات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئیں تھیں، اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۳۱۲)

جو شوخ و بے باک قلم ایک معصوم نبی کو فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں کرنے والا اور بے صبر لکھ سکتا ہے وہ حضراتِ صحابہؓ کے خلاف کیا کچھ نہیں لکھے گا۔

پھر اس قلم کی آوارہ خرامی سے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں بچ سکے لکھتا ہے :۔

"حضور کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجّال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو، لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور کا اندیشہ صحیح نہ تھا۔"

(رسائل و مسائل طبع اوّل ستمبر ۵۱ء صفحہ ۵۷)

غیور اہلِ علم و ایمان نے اس ایمان سوز تعبیر کے خلاف احتجاج کیا تو طبع دوم (جون ۵۴ء) میں یہ لکھا کہ :۔

"حضور کا اندیشہ قبل از وقت تھا۔"

جب ملّت نے اس "گل افشانی" کو بھی برداشت نہ کیا، تو طبع سوم (جون ۶۲ء

صفحہ ۴۹) میں لکھا :-

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گذر چکے ہیں اور ابھی تک دجّال نہیں آیا"

کیا یہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح توہین اور فکرِ نبوّت کی صاف تغلیط نہیں؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ گستاخی! اور ایک ہی قلم سے یکے بعد دیگرے ادلتی بدلتی متعدد تحریریں! پھر یہ دعویٰ کہ "ابھی تک دجّال نہیں آیا" ستم ظریفی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟

۲: اسی خروجِ دجّال ہی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں، وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے"۔

(رسائل و مسائل طبع اوّل صفحہ ۵۵)

۳: پھر معاذ اللہ یہ شک حضورؐ کو عمر بھر رہا۔ لکھتے ہیں :-

"کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے، اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے، پھر کبھی آپ نے ابنِ صیّاد نامی اس یہودی بچے پر، جو مدینہ میں (غالباً ۲ھ یا ۳ھ میں) پیدا ہوا تھا، یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجّال ہو۔ اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا ...." (صفحہ ۵۵)

جب یہ ایک مسلّمہ حقیقت اور متفقہ بنیادی عقیدہ ہے کہ نبوت کوئی کسبی اکتسابی منصب نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے تو جس اللہ ربّ العزّت نے معاذ اللہ بے صبر، کوتاہ کار اور شکّی نبی مبعوث فرمائے، اُس خدا کے متعلق مودودی صاحب

کی "رائے گرامی" کیا ہوگی ؟

مودودی صاحب نے سرے سے عصمتِ انبیاء کا انکار کر کے حضرات انبیاء علیہم السّلام کو عام غلط کار انسانوں کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوّت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اُٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں، تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں"[1]

ہر نبی حتّٰی کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک دو لغزشیں سرزد ہوتی ہیں مگر مودودی صاحب سے ایک لغزش بھی تو نہیں ہوئی۔ اور غالباً اسی لئے آپ کے معتقدین، حضرات انبیاء علیہم السّلام پر تنقید تو برداشت کر سکتے ہیں، مگر آپ کے خلاف تنقید کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

مودودی صاحب کے قلم سے لوگ متاثر ہوئے ہیں مگر موصوف نے جدید اسلام کے قریب تھوڑوں کو کیا ہے، صحیح اسلام سے دُور بہتوں کو کیا ہے۔ ہر اجہل کو اعلم پر اور ہر ادنیٰ کو اعلیٰ پر تنقید کا حق دے کر آپ نے اسلاف و عمائدِ امّت کا اعتماد مجروح کیا ہے۔ یہ لوگ علماء معاصرین سے شروع ہوتے ہیں، فقہاء و مجتہدین اور حضرات محدّثین پر جرح و تنقید کرتے کرتے اس مقدس جماعت کو بھی ہدفِ مطاعن بناتے ہیں جن پر خود ذاتِ باری عزّ اسمہٗ نے اعتماد کر کے اپنی مرضیات کی سند عطا فرمائی، اور جن کو اللہ کے محبوب آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا

---

[1] "تفہیمات" جلد دوم صفحہ ۴۳ طبع اوّل اگست ۱۹۵۱ء

اوّلین مخاطب و معتمد بنایا۔ مودودی صاحب نے انہیں بھی نہیں بخشا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکی جماعت عموماً پوری امّت کے اکابر کے خلاف تو سُننے سُنانے کو ہمہ وقت تیار ملتی ہے مگر مودودی صاحب کے خلاف کچھ نہیں سُن سکتی۔

ان تمام واضح اور روشن حقائق کی موجودگی میں اقامتِ دین و احیائے اسلام کے بلند بانگ دعوے ایک شاطرانہ چال ہے اور اسلام اسلام کی پکار ایک دانہ ہے محض بھولے بھالے عوام کو اپنے دامنِ فریب و سیاست میں پھنسانے کا ؎

اللہ رے اسیریٔ بلبل کا اہتمام — صیّاد عطر مل کے چلا ہے گلاب کا

جو اللہ کا بندہ ساری امّت حتّیٰ کہ نبیٔ کریم کے صحابہ کرامؓ کو مجروح کر کے سب اسلافِ اُمّت سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل کرنے کی کوششوں میں مصروف و منہمک ہو، تا کہ تمام اہلِ اسلام کی عقیدت و اعتماد اس کی ذات میں مجتمع و مرتکز ہو کر رہ جائے ؎

چُوس کر شاخ کا لہو گُل نے — اپنا جوبن سنوارنا چاہا

اور اس کا اپنا "اجتہادی شاہکار" یہ ہو کہ وہ جوازِ متعہ کی صورتیں تلاش کرتا پھرے اور منسوب بغلاف کعبہ پارچات کی نمائش کر کے سستی شہرت اور عوامی مقبولیت کا بھوکا ہو۔ اسکے متعلق اور اسکی تحریک کے متعلق اور اسکے عزائم کے متعلق غور کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا اہلِ عقل و بصیرت کیلئے کوئی مشکل نہیں۔

ربِّ عزیز و منتقم نے اپنے منعم علیہم اور محبوب بندوں کی توہین و تنقیص کا یہ بدلہ و انتقام لیا کہ یہ عنقائے "بلند آشیانہ" ایک مس صاحبہ کی قیادت و امارت میں "اسفل السافلین" تک پہنچ گیا اور حصولِ اقتدار کی ہوس و طلب میں آج اس مقام پر نظر آتا ہے جو اس کا واقعی مقام تھا ؎

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

احسان احمد عفی عنہ

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ — شاہی جامع مسجد شجاع آباد!

۵ شاعری کا نمونہ

بلقیسؔ[سہ] سلمہا کا پیغام
شاہدہ بتولؔ[عہ] کے نام



از : چلتا ڈبہ

ایک ننھی سی لڑکی ہے بلقیس گل
جو مچاتی ہے اُودھم نہ کرتی ہے غُل

کیا بتاؤں کہ وہ کس قدر نیک ہے
سینکڑوں اور لاکھوں میں بس ایک ہے

دل سے کرتی ہے ساری نمازیں ادا
رُوح میں نُور بھرتی ہے اس کی صدا

لے کے قرآن بستر پہ چڑھتی ہے [illegible]
رکھ کے تکیے پہ قرآن پڑھتی ہے وہ

ہاتھ اُٹھا کے دعا مانگتی ہے وہ جب
دیکھتے ہیں اُسے ہو کے حیران سب

خود ہی پانی کا لوٹا اُٹھاتی ہے وہ
خود ہی منہ دھو کے سرمہ لگاتی ہے وہ

کھیلتی وہ نہیں خاک اور دُھول میں
اب وہ جائے گی پڑھنے کو اسکول میں

ایک قصہ میں اس کا سناؤں تمہیں
کتنی اچھی ہے وہ، یہ بتاؤں تمہیں

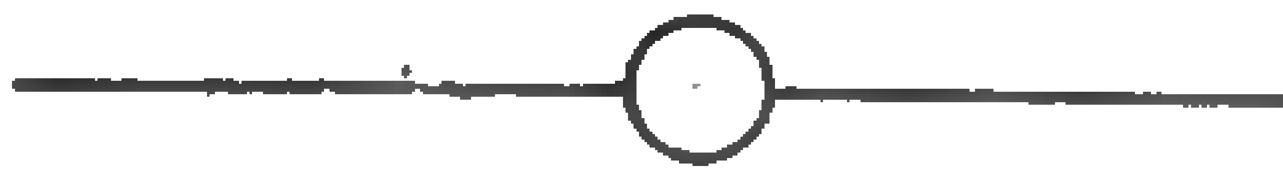
ایک دن جنگ کرتی تھیں دو بلّیاں
دیکھ چھیچھڑے، ہڈیاں، جھلیاں

خود جو آتی نہیں ہے لڑائی اُسے
یہ بُرائی ذرا بھی نہ بھائی اُسے

سہ میری بیٹی کا نام ۔ عہ قاضی صاحب کی چھوٹی بیٹی کا نام۔ (مرتّب)

بلّیوں کی جو چیخوں سے گھبرا گئی — دوڑی دوڑی وہ امّی کے پاس آ گئی
اور پھر اُن سے بولی، کہ امّی چلو — بلّیوں کو ذرا چل کے پنکھا کرو
اُن کا غصّہ ہوا، دم میں ہو جائے گا — شرم آ جائے گی، رنج کھو جائے گا
اس کی امّی نے جب اس کی پرواہ نہ کی — اُٹھ کے جانے کی مشکل گوارا نہ کی
بلّیاں دونوں لڑتی جھگڑتی رہیں — غرغراتی رہیں، اور اکڑتی رہیں

جا کے دونوں کا حصّہ جُدا کر دیا
ننھی بلقیس نے فیصلہ کر دیا[سے]



سے شعراء کرام فیصلہ کریں کہ یہ نظم کس حد تک شاعری کے معیار پر پوری اُترتی ہے۔ میں نے ہو بہو نقل کر دی ہے۔ (مرتب)

کانگریس، احرار اور مسلم لیگ

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو تہذیب و معاشرت اور ہندو دھرم موجود تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی برصغیر میں مذہباً دو قومیں آباد ہو گئیں۔ ہندو اور مسلم۔ ہندوستان میں مسلمان دو حیثیتوں سے آئے۔ اولاً عرب تاجروں کے لباس میں ثانیاً ایک فاتح قوم کی حیثیت سے محمد ابن قاسم کی زیر سرکردگی ہند میں وارد ہوئے، اور اس وقت سے لے کر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء تک کسی نہ کسی حیثیت سے برصغیر پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس ہزار سالہ دورِ حکمرانی میں برصغیر کی دونوں قوموں میں کبھی فرقہ وارانہ اختلاف اور مذہبی تعصب و تنگ نظری پیدا نہیں ہوئی، اور نہ ہی دونوں کے مابین مذہبی اختلاف نے سنگین نوعیت اختیار کی۔ مسلمانوں نے اپنا دینی مقام، تبلیغ و وعظ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ تبلیغ و وعظ اور محبت و پیار کی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں روز بروز اثر و نفوذ بڑھتا گیا، اور یوں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد میں کئی جنگیں اسلام اور کفر کے نام پر لڑی گئیں، اور اسلام کے مقابلہ میں کفر متحد بھی ہوا۔ مگر مجموعی طور پر دونوں قومیں باہم شیر و شکر رہیں۔ اس کی دو توجیہات کی جا سکتی ہیں۔ پہلی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ مسلمان حکمران طبقہ سے متعلق تھے، اور ہندو محکوم، اسلئے ہندو اپنے بغض باطنی اور مخفی عزائم کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی رعایا کے ساتھ کچھ اس قسم کا

حسنِ سلوک کیا اور اُن سے شادی بیاہ کی صورت میں "باہمی غیریت" کا جذبہ ختم کرکے اپنائیت کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح محکوم قوم کا دل جبر و قہر سے نہیں بلکہ محبت و پیار سے موہ لیا۔

مجھے دوسری توجیہہ سے کلی اتفاق ہے اور اس کے ثبوت میں ایک ہزار سالہ دورِ حکمرانی موجود ہے کیونکہ کسی قوم کو خوف و ہراس میں مبتلا کرکے زیادہ دیر تک محکوم نہیں رکھا جا سکتا۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ جب تک غیر ملکی حکمرانوں نے یہاں قدم نہیں جمائے، اس وقت تک دونوں قومیں مجموعی طور پر باہم شیر و شکر رہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے حاکمانہ رعب و دبدبہ کے باوجود اپنے آپ کو دیسی باشندوں میں اس طرح جذب کر لیا، کہ وہ غیر نہ رہے، بلکہ یہاں کے باشندے کہلائے۔ اس طرح انہوں نے دیسی لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ ان کے اخلاقِ کریمانہ اور اسلام کی روایتی تعلیم کا اثر تھا کہ انہوں نے ڈنڈا چلانے کی بجائے زبانِ شیریں کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ مسلمان حکمرانوں نے دیسی باشندوں کو شریکِ حکومت بنا لیا۔ اُن میں سے مشیر اور وزیر مقرر کئے۔ بلکہ بعض مسلمان حکمرانوں نے ہندو جرنیلوں کو بڑے بڑے عہدے تک عطا کیے، تاکہ وہ اپنے آپ کو رعایا نہ سمجھیں، اور اس طرح حاکم و محکوم کا رشتہ بھائی چارگی میں تبدیل کر دیا۔

مسلمانوں نے اپنے روایتی حُسنِ ظن، اعلیٰ اخلاق اور حُسنِ تدبّر کا یہ مظاہرہ نہ صرف اس وقت تک برقرار رکھا جب تک وہ حکمران تھے، بلکہ غیر ملکی حکمرانوں کی آمد کے بعد بھی انہوں نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ وہی تعلق برقرار رکھا اور ان کی کوشش رہی کہ اب چونکہ دونوں قومیں محکوم بنا دی گئی ہیں، اس لئے پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے درد و غم میں حصّہ لیں گی اور متحد ہو کر غیر ملکی غاصبوں کو نکال باہر کریں گی۔

فرنگیوں کی آمد سے مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے یکسر مختلف ہو گئی۔ فرنگیوں نے

مسلمانوں سے براہ راست حکومت چھینی تھی، اس لئے وہ غاصب تھے اور مسلمانوں نے کبھی بھی فرنگیوں کی حکومت کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ سرسید احمد خاں اور ان کے متبعین نے اس سلسلہ میں سر توڑ کوششیں کیں مگر انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے مسلمان حکمرانوں کی جگہ غیر ملکی حکمرانوں کو نہ صرف دل و جان سے تسلیم کر لیا بلکہ انہوں نے نئے حکمرانوں کے دل میں گھر کر لینے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ ابتداءً دیسی باشندوں نے مسلمانوں سے مل کر فرنگی غاصبوں کے خلاف میدانِ کارزار میں نہایت بہادری سے قدم رکھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں تقریباً تمام قوموں نے مل کر انگریزوں کے خلاف علمِ آزادی بلند کیا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ ہندوؤں نے انگریزوں کی حکومت کو تسلیم کر کے ان سے وفاداری کا عہد کر لیا، جب کہ مسلمانوں کی حالت مختلف تھی، کیونکہ انگریز غاصبوں نے حکومتِ ہند، مسلمانوں سے چھینی تھی، اس لئے انہیں زیادہ خطرہ بھی مسلمانوں کی طرف سے تھا۔

ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزی مظالم کا نشانہ زیادہ تر مسلمان بنے اور جس انتقامی حد تک انتقام لیا جا سکتا ہے، انگریزوں نے مسلمانوں سے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے برصغیر میں تاریخِ حریت کا باب بھی مسلمانوں نے اپنے خون سے رقم کیا جبکہ ہندوؤں نے نئے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا اور انعام کے طور پر تجارتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تفوق حاصل کر لیا جبکہ مسلمان عمومی طور پر انگریز سے متنفر تھے اور وہ اپنے آپ کو "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کا مصداق نہیں بنا پائے تھے۔ اس طرح انگریزوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی جو بنا ۱۸۵۷ء میں ڈالی گئی تھی، مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام نے اگرچہ کنارہ کشی اختیار کر لی تھی مگر مسلمان سینہ سپر رہے۔ اور انہوں نے کبھی بھی انگریزوں کی غلامی قبول نہیں کی۔ مکار فرنگی اسلامی تعلیمات

کی روشنی میں مسلمانوں کے ذہن کو بخوبی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو جو سیاسی میدان سے پہلے ہی ہٹائے جا چکے تھے، تعلیمی، تجارتی اور ترقی کے تمام میدانوں سے بال کی طرح نکال کر رکھ دیا، اور ایک اچھوت قوم کا درجہ دے دیا۔ علاوہ ازیں معاشی طور پر بھی مسلمانوں کو مفلوج بنا کر رکھ دیا۔ اس صورتِ حال کو بھانپ کر اور آئندہ چل کر ہندوؤں کے تسلط میں آجانے کے خدشہ کے پیشِ نظر سر سید احمد خاں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین منافرت ختم کرنے کی انتہائی کوشش کی جو کسی حد تک کامیاب رہی اور مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی معاشرت اختیار کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا، بلکہ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح انگریزی معاشرت میں ضم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ طبقہ ہندوؤں کی طرح انگریزوں کو دل و جان سے حکمران تسلیم کر چکا تھا۔ اب مسلمانوں کے اس محدود طبقہ اور ہندوؤں کے اجتماعی مفاد میں تھا کہ انگریز ہندوستان پر حکومت کرے اور وہ رعایا بن کر اس کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھیں اور اسی کے رحم و کرم پر رہیں۔ ان دونوں طبقوں میں انگریزی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسابقت کی دوڑ لگ گئی۔ مگر باایں ہمہ انگریز مسلمانوں کو اپنا بدترین اور خطرناک دشمن ہی تصور کرتا رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تعصب، تنگ نظری، باہمی مناقشت اور اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کر دیا۔ ان میں تنفر اور تشتت کی فضا پیدا کر کے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا، کیونکہ انگریز جانتا تھا، کہ اگر اُس نے ...... DIVIDE AND RULE (لڑاؤ اور حکومت کرو) کی پالیسی اختیار نہ کی تو ہندوستان کی سونے کی چڑیا، اس کے پنجۂ استبداد میں نہیں رہ سکے گی، اور وہ پھڑپھڑا کر نکل جائیگی چنانچہ اپنے اقتدار کے دائمی تحفظ کے لئے اس نے ہندوستان کی مختلف قوموں، طبقوں، گروہوں اور لوگوں کے درمیان نفرت کی لمبی دیوار چُن دی، جس کے متعلق سر جان میلکم

اپنی اس پالیسی کے متعلق رقمطراز ہے۔

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں، ان کی عام تقسیم ہو، اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں، فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جُدا رکھے جائیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اُٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی"۔[1] (میجر باسو کی تاریخ ص۱۴۷)

انگریزوں کی اس عیّارانہ پالیسی نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں مستقل جنگ و جدل کی راہ کھول دی۔ جس کا نتیجہ بالآخر تقسیم ملک کی صورت میں منتج ہوا۔

فرنگی سامراج نے ہند کی قوموں میں باہمی لڑائی و تفریق پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اُس نے اس تفریق کا ہدف مسلمانوں کو براہِ راست بنایا۔ مسلمانوں میں اجتماعیت کو ختم کرنے کے لئے فرقہ بازی کو جنم دیا اور انہیں سُنّی، شیعہ، بریلوی، اہلِ حدیث، مقلد اور غیر مقلد جیسے ناموں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ اس طرح مسلمان باہمی جنگ و جدل میں مصروف ہو گئے۔ انگریز نے اس سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعیت پر ضربِ کاری لگانے کے لئے "خانہ ساز نبوّت" کا دروازہ کھولا۔ جس نے آگے چل کر نہ صرف مسلمانانِ ہند کو ابتلاءٔ آزمائش میں مبتلا کر دیا، بلکہ عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو فکری اور ذہنی انتشار میں گرفتار کر دیا۔ چنانچہ "پنجابی نبی" کو مسیح موعود کے نام سے افریقہ، یورپ اور لاطینی امریکہ میں مشہور کیا جانے لگا۔ اس تحریک نے اسلامی قوتوں، اور عالمِ اسلام کے اتحاد کی راہ میں لاینحل مسائل پیدا کر کے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو ناکارہ

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ۵ر نومبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۔

بنا دیا۔ چونکہ اس خانہ ساز نبوت کی پشت پر برطانوی سامراج کام کر رہا تھا، اس لئے اپنے اقتدار کا سورج غروب ہوتے دیکھ کر اس نبوت کے ذریعہ اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

بایں ہمہ جب ہم ہند کے مسلمانوں کے جذبۂ اخوت و ہمدردی، بہادری و جاں سپاری، عزمِ آہنی اور قوتِ ارادی کے مظاہرے دیکھتے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں تو انہیں یقیناً خراجِ تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہندو قوم ایک نادیدہ، عیار، مکار، بدطینت اور محسن کش قوم ہے۔ مسلمانوں کے بحیثیت قوم، جو اس پر احسانات ہیں، ان کا بدلہ کسی صورت میں نہیں چکا سکتی۔ مسلمان حکمران اگر چاہتے اور وہ ضرورت سے زیادہ رحمدل اور روایتی رواداری نہ ہوتے، تو آج برصغیر میں ہندو قوم اس قدر کثیر تعداد میں موجود نہ ہوتی۔ مگر ہزار سالہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں وقت گزارنے کے باوجود جب سفید فام قوم کو نئے آقا کے روپ میں دیکھا تو فوراً سربسجود ہو گئی اور "پرماتما" کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ مسلمانوں کی رواداری کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ انہوں نے اپنے ہزار سالہ دورِ حکمرانی میں ملک کا نام تک نہ بدلا، بلکہ "ہندوستان" ہی رہنے دیا۔ فطری طور پر ہندو قوم ایک انتہائی پست و ذلیل قوم ہے، جو محکوم رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں حکمرانی و فرمانروائی، جہاں بینی و جہانداری کی صلاحیتیں قدرتاً ودیعت نہیں کی گئیں۔ اسے تو تقسیمِ ہند کے حادثہ نے ایک عظیم سلطنت کے روپ میں تخت پر بٹھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قدر وسیع و عریض سلطنت دیکھ کر اپنے آپ سے باہر ہو گئی ہے اور پاکستان کو مسلسل اپنی جارحانہ سرگرمیوں کا مرکز بنائے رہتی ہے۔

الغرض ہند میں انگریزوں کے مضبوطی کے ساتھ قدم جمانے کے لئے ہندوؤں نے ایک جماعت ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز افسر ہیوم (HOME) کی زیرِ نگرانی قائم کی۔ جس کا مقصد واضح

طور پر یہ تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین شکوک و شبہات کو رفع کر کے باہمی خیر سگالی کے جذبات پیدا کئے جائیں اور بتدریج صوبوں کی کونسلوں میں نمائندگی، اور کارِ بارِ حکومت میں شرکت کی راہ نکالی جائے۔ یہی کانگریس، آگے چل کر "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ چونکہ اس جماعت میں بعض مسلمان بھی شامل تھے، اس لئے اِسے "نیشنل" کا نام دیا جانے لگا۔

کانگریس کے عزائم کو متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلے جس مسلمان لیڈر نے بھانپا وہ سید احمد خاں تھے۔ انہوں نے کانگریس کے قیام و پالیسی کو دیکھتے ہی یہ جان لیا تھا کہ یہ آگے چل کر صرف ہندوؤں کی جماعت بن کر رہ جائے گی اور انگریزوں کے ہندوستان سے کسی وقت چلے جانے کے بعد مسلمانوں کے حکمران، ہندو بن جائیں گے اور انہیں مسلمانوں سے ماضی و حال کے قرضے چکانے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ کانگریس کے صرف تین سالہ قیام کے بعد ۱۸۸۸ء میں انجمن محبانِ ہند (UNITED INDIAN PATRIOTIC ASSOCIATION) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے مقاصد درجِ ذیل تھے۔

ا : انگلستان کے لوگوں کو بتانا کہ ہندوستان کی کل قومیں (رؤسا اور والیانِ ریاست) کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

ب : ہندوستان میں برطانوی حکومت کو مضبوط تر بنانا، اور

ج : کانگرس کے زہریلے اثرات سے عوام کو بچانا۔

اس جماعت میں نہ صرف مسلمان نواب، راجے، مہاراجے، رؤسا اور امیر لوگ شامل تھے، بلکہ ہندو بھی شامل تھے۔ اس لئے اس جماعت کو ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جماعت نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ہندوؤں کی مسلسل جارحانہ پالیسی نے بالآخر مسلمانانِ ہند کو مجبور کر دیا کہ وہ ماضی کے تعلقات کی خوش فہمیوں میں مبتلا نہ رہیں بلکہ اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نکالیں۔ ان کی بقا کے لئے صرف دو ہی راستے تھے، یا تو وہ اِس

ملک کو دارالحرب قرار دے کر کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جائیں اور اس کے غاصبوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ لڑیں یا انگریزوں کو اپنا مستقل ماوی و ملجا سمجھیں۔ چنانچہ بعض نوابوں اور جاگیرداروں نے دوسری راہ اختیار کر لی اور ہندوؤں کے مقابلہ میں انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مختلف صورتوں کا جائزہ لینے لگے۔ جبکہ انگریزوں کے زخم خوردہ اور اس کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت نے اس کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا، اور زیرِ زمین چلے گئے۔

یہاں پہنچ کر مسلمان بحیثیت قوم دو گروہوں میں بٹ گئے، اور یہ گر[redacted] بندی تقسیمِ ملک کے بعد آج تک قائم چلی آ رہی ہے۔ مسلمانوں کے جس گروہ نے یہ سمجھا کہ اب انگریز کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی کے حصول کے سوا مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے، ان کی رائے کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے فضا کو سازگار نہیں پاتے تھے۔ آخر وقت کی آواز بھی کوئی چیز ہے، اور اس وقت حالات کا تقاضا بھی یہی سمجھا گیا کہ اب غیر ملکی حملہ آوروں کے مقابل آنے کی بجائے تعاون کی کوئی راہ نکالی جائے اور حقوق طلبی کی سیاسی مہم میں خود کو فریق نہیں بنانا چاہیئے، اور غاصبوں کو جائز حکمران تسلیم کر لیا جائے۔ یہ وقت کی آواز ضرور تھی۔ مگر بایں ہمہ یہ اندازِ فکر مسلمانوں کی ملّی، اور ماضی کی تاریخ کے یکسر خلاف تھا۔ جس میں مسلمانوں کو آگے چل کر اسلامی معاشرت اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اندازِ فکر کی قربانی دینا پڑی اور مسلمان نام کے مسلمان بن کر رہ گئے۔ اگرچہ انہوں نے ایک الگ حصہ اسلام کے نام پر حاصل تو کر لیا مگر نامسلمانی ہنوز قائم ہے اور اپنے ماضی سے بغاوت اور یورپی فکر و نظر کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر کی کوششیں جاری ہیں۔

علامہ اقبال نے اسی اندازِ فکر کی یوں نقاب کشائی کی ہے ؎

حکمتِ افرنگ سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

بہرحال یہ اندازِ فکر نئی نسل کا تھا جس کی قیادت سرسید احمد خاں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور بیانات سے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزوں کے متعلق مسلمانوں کا اندازِ فکر بدلے اور وہ انہیں اپنا قومی و ملّی دشمن سمجھنے کی بجائے انتہائی دوست گردانیں۔ اور انگریز دشمنی، انگریز دوستی میں بدل جائے، تاکہ زمانہ کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ہندو سے مسابقت حاصل کر کے روشن مستقبل کی تعمیر کی جائے۔

سیّد احمد خاں نے جنگِ آزادی میں ہند کی تمام حریت پسند قوّتوں سے ہٹ کر انگریزوں کے لئے کام کیا۔ ان کو پناہ گاہیں مہیا کیں۔ ان کی جان و مال کو محفوظ کیا اور ایک وفادار رعایا کی طرح ان کی ہر طرح سے خدمت کی۔ جس کے بدلہ میں سید احمد خاں کی انہی خدمات کی بدولت انہیں "سر" کا خطاب بخشا گیا۔ سرسید نے بعض ایسی کتابیں لکھیں جن کے ذریعہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان صدیوں کی دشمنی اور پرانی مغایرت اور مذہبی اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ سرسید کا قلم یہاں تک آگے نکل گیا کہ دونوں قوموں کے مابین بنیادی اختلافات تک کو ختم کرنے کے لئے عجیب و غریب تاویلوں کا سہارا لیا گیا، چنانچہ انہوں نے توریت اور انجیل کی ایک تفسیر "تبیین الکلام" کے نام سے لکھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان جن باتوں پر شدید اختلاف ہے ان کی ایسی تشریح کی جائے کہ دونوں طرف کی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں اور انگریزی حکومت جو مذہباً عیسائی تھی، مسلمانوں کو اسلام کی نسبت سے اپنا دشمن تصور کرنا چھوڑ دے۔ اس طرح سرسید نے ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ بعنوان "احکامِ طعام اہلِ کتاب" لکھا۔ جس سے ثابت کیا، کہ انگریزوں کا ذبیحہ جائز ہے اور ان کا کھانا حلال ہے بشرطیکہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو۔

سرسید احمد خاں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ کئی ایسی کتابیں لکھیں جو بظاہر عیسائیوں کی طرف سے قرآن اور اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے جواب میں ہیں مگر درحقیقت

انہوں نے ان تمام باتوں کا سرے سے اسلامی ہونا محلِ نظر بنا دیا ہے اور انہیں اسلامی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جن پر انگریز عیسائی معترض تھے۔ علاوہ ازیں سرسید نے قرآن کریم کی ایسی ہی جدید تفسیر "تفسیر احمدیہ" کے نام سے لکھی جس میں اسلام و ایمان کی ایسی تشریحات و تاویلات کی گئی ہیں جن سے آج تک متقدمین شاید "صرفِ نظر" کرتے رہے ہیں بہرحال سرسید احمد خاں نے سیاسی طور پر متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ قومیت کا تصور پیش کیا۔ جو آئندہ سیاست میں مسلمانوں کے سامنے ایک نصب العین کی صورت میں متشکل ہوتا چلا گیا، اور بالآخر جداگانہ قومیت کی بنیاد پر ہی تشکیلِ پاکستان عمل میں آئی۔

کانگریس کے قیام کے بعد ابتداءً سرسید احمد خاں صرف اس بنا پر مخالف تھے کہ اس کا میلان صوبوں کی کونسلوں میں نمائندگی کے حصول کی طرف تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ملکی سیاست میں بتدریج شریک کار ہونا چاہتی تھی جب کہ سرسید مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینے کو غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے تھے، لیکن بعد میں کانگریس میں ہندوؤں کی کثیر تعداد میں شمولیت کی بنا پر یہ بات بھی ظاہر ہوتی چلی گئی کہ یہ جماعت مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے مفادات کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی DIVIDE AND RULE کی پالیسی نے ہندوستان کی قوموں میں فتنہ و فساد کا جو بیج بویا تھا اور اس کے پروان چڑھانے میں جو پروپیگنڈہ مشینری تیار کی تھی اس کے اثرات بھی بتدریج ظاہر ہونے لگے تھے۔ ان حالات و واقعات پر متعصب ہندو لیڈروں کوتاہ اندیش مہاسبھائیوں اور تنگ نظر شرنارتھیوں کے سخت رویہ نے مسلمانوں کو، ہندوؤں سے بددل ہی نہیں کیا بلکہ اس حد تک متنفر کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے ملک میں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے جہاں انہوں نے بلا شرکت غیرے ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ اور اپنے عہدِ سلطانی میں ہندو ایسی احسان فراموش قوم کو اپنی کرسی کے برابر

جگہ دے کر حاکم و محکوم اور آقا و غلام کی تمیز ختم کر کے بھائی چارگی اور انسانی رواداری و محبت کو جنم دیا تھا۔ اب اسی ملک میں اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرنے کا تصور کس قدر جاں گداز ہو سکتا ہے۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری کے بعد ہندو قوم ذرا دور اندیشی سے کام لیتی تو وہ بہ آسانی انگریزوں کو نکال باہر کر کے اس دیس میں سالہا سال پہلے ہندو مسلم متحدہ حکومت قائم کر سکتی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندو قوم کو از خود شامل کر رکھا تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوؤں کے انگریزوں کے ساتھ روز بروز تعلقات بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے انگریزوں کے ساتھ یہ معاہدۂ عمرانی SOCIAL CONTRACT کر رکھا تھا کہ ان کے قائم مقام ہندو بنیں گے کیونکہ ہندوستان، ہندوؤں کا ملک ہے، اور مسلمان "غیر ملکی حملہ آور" ہیں، جن کا ہند میں بحیثیت شہری رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے اس خفیہ معاہدہ کے پیشِ نظر مسلمان رہنماؤں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ مسلمانوں کی علیحدہ جماعت بنانے کے سوا اب کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا

ان حالات نے مسلمانانِ ہند کو مجبور کر دیا کہ وہ ہند میں اپنے حقوق کی مستقل حفاظت کے لئے ایک علیحدہ جماعت کا قیام عمل میں لائیں۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا، جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے مقاصد یہ تھے۔

ا : مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا۔

ب : مسلمانانِ ہند کے دل میں برطانوی حکومت کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا۔

ج : مسلمانانِ ہند میں دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ خیالات پیدا نہ ہونے دینا۔

نواب وقار الملک مسلم لیگ کے پہلے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ کے مسلم طلبہ کے سامنے نئی قائم شدہ جماعت مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام پر روشنی

ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

"ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا، اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا، اور اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزوں کے بغیر ہم عزت و آسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔[1]

(رسالہ نواب وقار الملک کی اسپیچ، مسلمانانِ ہند کی پالیٹکس پر ۲۳ مارچ ۱۹۰۷ء)

سطور بالا میں برصغیر کی سیاست پر اثر انداز ہونے والے دونوں نکتہائے نظر، پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے جن کو سامنے رکھ کر قاری بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے، کہ ہندوستان کی سیاست "ہندو اور مسلم" دو علیحدہ جماعتوں کی شکل میں متحارب گروہوں کی صورت میں ظاہر ہوتی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے خوف اور آئندہ ملکی سیاست پر انگریزوں سے ملی بھگت کے نتیجہ میں اثر انداز ہونے کے ڈر سے ایک علیحدہ جماعت کی تشکیل کی، اور اس میں وہ حق بجانب تھے مگر کانگریس جیسا طریقِ کار (انگریزوں سے تعاون) اپنا کر انہوں نے غلطی کی جس کا تلخ تجربہ پانچ سال کے اندر اندر ہو گیا۔ نیز مسلم لیگ کے قیام کا فوری سبب تقسیم بنگال کا

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور، ۵ نومبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۵-۶

وہ منصوبہ بنا جسے انگریز نے بزعمِ خویش انتظامی سہولت کے پیشِ نظر عملی جامہ پہنایا، اور جو "حادثاتی" طور پر مسلمانوں کے لئے مفید قرار دے دیا گیا۔ مگر ہندو پریس نے آسمان سر پر اٹھالیا اور گاؤ ماتا کے ٹکڑے کہہ کر ہندوؤں میں مذہب کی بنیاد پر وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیا کہ بالآخر ۱۹۱۱ء میں یہ منصوبہ منسوخ کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے تقسیمِ بنگال کو اپنے حق میں بہتر سمجھا، کیونکہ انہیں ہندوؤں کی سماجی، معاشرتی اور اقتصادی بالادستی سے نجات مل گئی۔ مگر ہندوؤں نے جس ملک گیر پیمانے پر تقسیمِ بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کی، مسلمانانِ ہند کا یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ مسلمانوں کو اگر حادثاتی طور پر کوئی فائدہ پہنچ جائے، تو وہ بھی ہندوؤں کو کسی صورت گوارا نہیں۔ اس لئے ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے انہیں ایک علیحدہ جماعت کا قیام عمل میں لانا ہوگا چنانچہ دوسرے ہی سال مسلم لیگ قائم ہو گئی۔

سیاسیات کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے تقسیمِ بنگال پر میں نے جس قدر کتابیں، مضامین اور رسائل پڑھے ہیں، سب نے متفقہ طور پر یہی نکتہ نظر پیش کیا ہے کہ لارڈ کرزن نے تقسیمِ بنگال کا منصوبہ مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے پیش کیا تھا، اور اسے مغرب زدہ اذہان، انگریز اور مسلمانوں کے مابین خوشگوار تعلقات سے معنون کرتے ہیں۔ راقم کو مزید افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ سیاسیات کے لیکچرار انگریزوں کی تحریر کردہ کتب سے مطالعہ و استفادہ کرنے تک اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں اور یہ رجحان ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے حصول کے بعد بھی آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ ان کا اس بارہ میں اپنا کوئی نکتہ نظر نہیں ہے۔ راقم شروع سے ہی اس نکتہ نظر کا مخالف رہا ہے، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ فرنگی، مسلمانوں کی خیر خواہی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسی تقسیمِ بنگال کے منصوبے کو ذرا اس نکتہ نظر سے ہی دیکھ لیجیے کہ اگر ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم مسلمانوں کی فلاح و بہبودی اور انہیں ہندوؤں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی کی گئی تھی تو کیا ۱۹۱۱ء میں مسلمانانِ ہند ہندوؤں کی دستبرد سے محفوظ کر دیئے گئے تھے کہ تقسیم کا منصوبہ منسوخ کر دیا گیا ـــــ یا اگر تقسیمِ بنگال کا

منصوبہ بنگال کی کثرتِ آبادی اور انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر عمل میں لایا گیا تھا، تو کیا ۱۹۱۱ء میں بنگال کی کثیر آبادی قلیل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے انتظامی پیچیدگیاں اور مشکلات ختم ہو گئی تھیں اور تقسیم کی منسوخی کا اعلان کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم کے پس منظر میں انگریز کی عیارانہ پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کارفرما تھی، اور کرزن مشہور مکار وائسرائے تھا جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں منافرت کو عروج تک پہنچانے میں دورُخی پالیسی اختیار کی مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ تم بنگال کی تقسیم سے ہندوؤں کی دستبرد سے محفوظ ہو جاؤ گے، اور ہندوؤں کو یوں اُکسایا کہ تقسیم سے گاؤماتا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اس لئے ذرا تحریک چلا دو، جلسے اور جلوس نکالو۔ تاکہ تقسیم کا منصوبہ ناقابلِ عمل ہو جائے، ورنہ مسلمان معاشی طور پر تم سے بے نیاز ہو جائیں گے یوں دونوں قوموں کو انگریز نے لڑایا، لیکن بالآخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی کے دربارِ عام میں ایڈورڈ پنجم نے تقسیم بنگال کی تجویز کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ جس پر مسلمانانِ بنگال ہکا بکا رہ گئے، کیونکہ یہ اعلان ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ اس صدمہ کی تاب نہ لاتے ہوئے نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ جاں بحق ہو گئے۔ مسلم لیگی لیڈر انگریز سے قربت کے اصول سے متنفر ہو گئے۔ اگرچہ منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا، تاہم بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کے غیر متوقع اعلان نے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں میں بدظنی پیدا کر دی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ فرنگیوں، اور ہندوؤں کی ملی بھگت سازش کے باوجود مسلمانوں کی طرف سے اتحاد کی بارہا کوششیں کی گئیں، مگر ہندو اپنی روایتی تنگ نظری اور سازشی جبلت سے باز نہیں نکلا اور مسلمانوں کی طرف سے اتحاد کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ تقسیم ملک کے بعد بھی ایک اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہنے کے لئے حکومتِ پاکستان نے بارہا مصالحانہ رویّہ اختیار کرنے کی کوشش کی، مگر ہندو کی مکارانہ سیاست نے اس

پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، اور مسلمانوں کو تاحال مسلسل ذہنی کشمکش میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے قیام کے بعد سے بہت قبل متحدہ ہندوستان میں ایک ایسا ذہن موجود تھا جس کی خدمات کے شمار کے لئے موجودہ کتاب کے صفحات متحمل نہیں مگر جس کی خدمات کو برصغیر کے تقریباً تمام مؤرخین نے یکسر نظر انداز کر رکھا ہے بلکہ ان دونوں جماعتوں نے اُس ذہن کی تمام خدمات کو اپنے سر تھوپنے کی مسلسل جارحانہ کوششیں کی ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جوں کا توں قائم ہے۔

کانگریس یہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان میں آزادی کی شمع اس کی بدولت روشن ہوئی ہے۔ اگر کانگریس کا وجود نہ ہوتا تو ہندوستان کبھی بھی انگریز سے آزادی کا پروانہ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ جتنی آزادی کی تحریکیں چلیں، کانگریس نے ان تمام تحریکوں کی آبیاری کی اس کے نزدیک ہندوستان کی تاریخ آزادی کانگریس اور صرف کانگریس کی مرہون منت ہے

انہی خطوط پر مسلم لیگی ذہن کی سوچ بچار کام کرتی ہے۔ مسلم لیگ کا کہنا یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی کامیابی مسلم لیگ کی مساعی کی مرہونِ منت ہے اور وہ اس میں بلاشرکت غیرے ذمہ دار ہے، بلکہ بعض تاریخ سے نابلد مگر جذباتی عناصر یہاں تک کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے کہ پاکستان کا قیام مسٹر محمد علی جناح کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ اُن کے سامنے شخصیات تاریخ کا رُوپ دھار لیتی ہیں جبکہ تاریخی عوامل اور ان سے مرتب شدہ اثرات ان کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض شخصیات تاریخ سازی کا کردار ادا کرتی ہیں اور قائد اعظم انہیں شخصیات میں ایک بلند و بالا مقام پر فائز نظر آتے ہیں، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعض ایسی تحریکوں نے بھی جو بظاہر تحریک پاکستان کے مخالف تھیں، غیر شعوری طور پر ہی سہی، پاکستان کے حق میں فضا کو سازگار بنایا، اور ایک غیر جانبدار مؤرخ کا قلم انہیں تاریخ کے صفحات سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔

بہرحال کانگریس ہو یا مسلم لیگ، ہمیں ان کی خدمات کو کسی دوسرے کے سر تھوپنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کی خدمات کی اہمیت گھٹانا مقصود ہے۔ ہر جماعت اور تحریک نے متحدہ ہندوستان میں مثبت یا منفی طور پر آزادیٔ ملک کی خاطر مقدور بھر کوشش کی، اس لئے ان سطور میں کسی کی توہین یا تنقیص مقصود نہیں ہے۔ صرف اس بات کا اظہار مطلوب ہے کہ ہر جماعت یا تحریک کی خدمات کو تاریخ کے صفحات میں اس کے مقام کے مطابق جگہ ملنی چاہیئے۔

ان صفحات میں ہم جس ذہن کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں، وہ ذہن تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا ہے۔ جسے مؤرخ کا جانبدار قلم اور وقت کی ظالم و جبروت قوت، ختم نہیں کر سکی، چنانچہ مسلم بادشاہوں کے دربار میں' یہ ذہن، اُن حق گو علماء کی صورت میں موجود رہا ہے، جنہوں نے مطلق العنان بادشاہوں کے سامنے ان کے ظلم وستم کو دربار عام میں ننگا کیا اور اُنہیں اعیانِ سلطنت کی موجودگی میں ٹوکا، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس حق گوئی کی پاداش میں اُنہیں کس قدر صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں گی اِس طرح یہ طبقہ جہانگیر کے زمانہ میں مجدّد الف ثانی کی صورت میں نمایاں رہا، جن کی ہیبت و سطوت سے خود کارکنانِ حکومت لرزہ براندام تھے۔

درحقیقت اورنگ زیبؒ عالمگیر کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے لٹیرے تاجروں نے شاہانِ ہند کی لن ترانیوں اور باہمی کشمکش کے پیش نظر حکومت کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ شاہانِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے مسلمانوں کی حکومت میں "خرید و فروخت" کا سلسلہ شروع کیا تو عوام کے لئے نئی مشکلات پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ انگریزوں نے مستقبل کی حکومت کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے اپنی پسند کا ایک طبقہ پیدا کرنا شروع کیا۔ ان کی توجہ سب سے پہلے زمینداروں کی طرف منعطف ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء میں بندوبست اراضی کے نام سے ایک نیا نظام

رائج کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ کاشتکاروں پر زمینداروں کا تسلط قائم کر دیا جائے اور صرف انہیں لوگوں کو زمینوں کی ملکیت کے حقوق عطا کر دیئے جائیں جو انگریزوں کی خوشنودی کو حاصل کرنا اپنی معراج سمجھتے ہوں اور کاشتکاروں کو ان معدودے چند افراد کی رعیت قرار دے دیا جائے۔ یہ سب کاروائی ۱۷۹۳ء میں عمل میں آئی۔

انگریز کے اس بندوبست اراضی کے نظام نے کسانوں اور کاشتکاروں میں ایک ہیجان برپا کر دیا، اور انہوں نے اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے میر ناصر علی عرف ٹیٹو میر کی زیر سرکردگی علم بغاوت بلند کر دیا۔ جنہیں گرفتار کر لیا گیا اور بالآخر ۱۹ ارنومبر ۱۸۳۱ء کو شہید کر دیا گیا۔

تاریخ ہند میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ خود کاشت کرنے والوں کو زمینوں کی ملکیت سے محروم کر کے غیر کاشت کنندہ افراد کو ملکیت زمین کے حقوق عطا کر دیئے گئے۔ جس سے ایک طبقاتی کشمکش زمیندار و مزارع کے درمیان شروع ہو گئی۔ جو تقریباً پونے دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی جوں کی توں قائم ہے۔

ٹیٹو میاں کی شہادت کے بعد یہ تحریک فرائضی تحریک کے نام سے کام کرنے لگی، جس کے روح رواں حاجی شریعت اللہ صاحب تھے جو ۱۸۴۰ء میں وفات پا گئے۔ انکے جانشین دودو میاں بنے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کا اعلان کیا، اور کاشتکاروں اور کسانوں کے حقوق کی بازیابی کے لئے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ بنگال کے مختلف حصوں میں اکاڈکا جھڑپوں نے وہاں کے بعض نیک دل نوابوں اور بادشاہوں کو بھی انگریزوں کے خلاف لڑنے پر اُکسایا، جن میں بنگال کے نواب سراج الدولہ اور میسور کے حکمران سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنگ پلاسی اور میسور کی چند جنگوں کے علاوہ جو دیسی حکمرانوں نے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر لڑیں، دیگر تحریکیں اور مسلسل جنگیں جو ٹیٹو میاں کی کسان تحریک، فرائضی تحریک، سید احمد شہید

اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریکِ جہاد اور ۱۸۵۷ء کی تحریک، جنگِ آزادی کے نام سے مشہور ہیں ــــــ علماء، ان کے مریدین اور معتقدین نے لڑیں، جنہیں ہم عوامی تحریکوں کا نام دے سکتے ہیں۔

غرض یہ علماء مختلف ادوار میں اپنے فرائض مختلفہ سے کبھی بھی غافل نہیں رہے ہیں۔ اگر ایک طرف شرک و بدعت کا دور چلا، تو اِسی طبقہ علماء میں سے چند آگے بڑھے اور توحید کا علَم بلند کیا۔ اگر عیسائیت کی تبلیغ کا دروازہ کھلا نظر آیا تو میدانِ مناظرہ میں یہی علماء سامنے آئے اور انہیں علم و فلسفہ، مناظرہ و مجادلہ اور دلائل و براہین میں وہ شکست فاش دی کہ عیسائیت کو اپنی موت کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اگر دشمنِ دین و ملک کے خلاف باقاعدہ جنگ کی باری آئی تو حجروں اور مساجد میں محبوس ہونے کی بجائے میدانِ وغا میں وہ جوہر دکھائے کہ مخالفین انگشت بدنداں رہ گئے۔ اگر علمِ دین کی اشاعت اور تفسیر و حدیث کے درس کی باری آئی تو انہوں نے اس میدان میں بھی اپنی علمی بصیرت اور قابلیت کا سکّہ منوایا۔ بہرحال مجاہدوں کا یہ ٹولہ، حق گو علماء کا یہ گروہ براہِ راست اپنے مخالف سے ٹکّر لینے کا عادی رہا ہے۔ منافقت یا مصلحت کیشی اس کے قریب سے نہیں گزری۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور جدید طبقہ کی سیاست میں ایک بنیادی فرق رہا ہے۔ اوّل الذکر نے جہاں انگریزوں کے خلاف خارجی محاذ پر علَمِ جہاد بلند کیا، وہاں داخلی طور پر بھی انگریزی معاشرت، انگریزی تہذیب و ثقافت، انگریزی طرزِ زندگی اور انگریزی شعائر کے خلاف بغاوت کا علَم بلند کئے رکھا، جبکہ جدید طبقہ نے نہ خارجی طور پر انگریزوں کے خلاف علَمِ آزادی اٹھایا اور نہ ہی داخلی طور پر انگریزی طرزِ فکر کے خلاف صف آرا ہوئے۔ خارجی طور پر ہندوؤں کے مقابلہ میں انگریز کا قرب حاصل کر کے اپنے تحفظ کا ذریعہ تلاش کیا اور داخلی طور پر انگریزی طرزِ معاشرت اپنانے میں عافیت سمجھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مختلف طبقوں نے انگریزوں کی غلامی میں اپنی عافیت

سمجھی، جس میں ہندو پیش پیش تھے اور مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کی زیر قیادت نسل بھی انگریزوں سے تعاون و وفاداری کے راستے تلاش کر رہی تھی، ایسے وقت میں ان مجاہد علماء کا گروہ انگریز سے خارجی اور داخلی طور پر نبرد آزما تھا۔ انگریز نے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لئے صرف علاقہ پر ہی کنٹرول کرنا کافی نہ سمجھا، بلکہ وہ ہندوستان کی تعلیمی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائے کہ یہاں کا نقشہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مگر اس طبقہ علماء کا کمال ہے کہ وہ اس جد زہریلی ہوا سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوئے اور اپنی پرانی ڈگر پر آج بھی بخیر و عافیت چل رہے ہیں۔ ان کی راہ میں اس قدر مشکلات پیدا کی گئیں کہ الامان و الحفیظ، مگر انہوں نے اس تمام پروپیگنڈہ مشینری کا منہ توڑ جواب دیا۔

فرنگی نے اپنی ناجائز حکومت کی منظوری باقاعدہ حکومتِ برطانیہ سے حاصل کر کے اسے جائز قرار دے دیا۔ انگریز اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر نئی آب و تاب کے ساتھ ہند میں وارد ہوا۔ اس کے مقابلہ کے لئے جس طبقہ نے سنجیدگی کے ساتھ منصوبہ بندی کی، وہ یہی علماء کا طبقہ تھا۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کے مقابلے میں انہوں نے اسلامی تعلیم کے احیاء کے لئے دیوبند میں ایک دارالعلوم قائم کیا۔ انگریزی طرزِ زندگی کے مقابلہ میں انہوں نے اسلامی طرزِ زندگی پر زور دیا۔ فرنگی سیاست مکر و فریب، جعل سازی و دغابازی کا مرقع تھی، انہوں نے اسلامی سیاست میں رواداری اور بھائی چارگی کا درس دیا۔

ان سب سے بڑھ کر انگریز سے خارجی و داخلی طور پر چھٹکارا پانے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے آزادی کا علم بلند کیا، اور ۱۸۷۸ء میں دارالعلوم دیوبند کے عظیم فرزند مولانا محمود الحسن نے اپنے شاگردوں اور احباب پر مشتمل ایک جماعت "ثمرۃ التربیت" کے نام سے قائم کی، جس کے روحِ رواں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم تھے۔ اس جماعت میں شیخ الہند کے درجِ ذیل خصوصی شاگرد شامل تھے جو آگے چل کر تاریخِ ہند کے افق پر

علم و سیاست اور جہاد و انقلاب کے چاند بن کر چمکے۔

① مولانا عبید اللہ سندھی	② مولانا حسین احمد مدنی
③ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ	④ مولانا منصور انصاری
⑤ مولانا عبد الرحیم پوپلزئی	⑥ مولانا انور شاہ کشمیری
⑦ مولانا محمد صادق، کراچی	⑧ مولانا عبد الصمد رحمانی
⑨ مولانا احمد علی، لاہوری	⑩ مولانا عبد الوہاب

اور ان کے متعدد رفقاء شامل تھے[1]

اس جماعت کے قیام کی بدولت مسلمانانِ ہند میں ایک ذہنی انقلاب لانے کی مساعی شروع ہوئیں۔ اس کی قوت کا مظاہرہ ۱۹۱۰ء میں اس وقت ہوا جب دار العلوم دیوبند کا دستار بندی کا جلسہ منعقد ہوا، جس میں اطراف و اکنافِ ہند سے تیس ہزار سے زائد مسلمانوں نے شرکت کی۔ اسی موقع پر جماعت کو وسیع پیمانوں پر چلانے اور عوامی بنانے کے لئے "جمعیۃ الانصار" کے نام سے نئی جماعت قائم کر دی گئی، جس کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں ہوا۔ جس کے سیکرٹری جنرل مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اسی موقع پر "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک تربیتی ادارہ دہلی میں قائم کیا گیا۔ اس طرح ان علماء نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنی "ذہنی چوکیاں" قائم کر دیں۔ جنہیں آگے چل کر "تحریکِ انقلاب اور ریشمی رومال" کی عظیم تحریکوں میں عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دینے تھے[2]

---

[1] بحوالہ ترجمان اسلام، لاہور [2] ایضاً

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بیسویں صدی کے عشرۂ اولیٰ میں ہندوستانی سیاست پر تین گروپ حاوی تھے۔ کانگریس، طبقۂ علماء، اور مسلم لیگ۔ اس وقت ملکی سیاست پر اگرچہ کوئی گروپ مجموعی طور پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تاہم ہر گروپ کے آدمی موجود تھے۔

جہاں تک ان تینوں جماعتوں کی کارگردگی کا تعلق ہے مسلم لیگ کو قائم ہوئے تین چار سال ہو چکے تھے، جسے کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ کانگریس کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہ تھا۔ اگر کوئی لائحہ عمل تھا تو وہ اس حد تک تھا کہ ہندوستان کی سیاست میں اُس حد تک دخیل ہوا جائے جس کی ملکۂ ہند بخوشی اجازت دے، لیکن دلیش کے لئے نئے مسائل پیدا نہ کئے جائیں۔

ان دنوں صرف ایک طبقہ نظر آتا ہے جسے علماء حق کا طبقہ کہا جاتا ہے جو انگریز سے براہ راست ٹکر لے رہا تھا۔ چنانچہ جنگِ عظیم اوّل میں کانگریس اور ہندوستان کی تمام جماعتیں انگریزوں سے تعاون کر رہی تھیں، لیکن علماء کی واحد جماعت تھی جو ایّامِ جنگ میں انگریزی عملداری کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کئے ہوئے نظر آتی ہے۔ یہی ایّامِ جنگ تھے جب ریشمی رومال ایسی تحریکِ انقلاب کا انگریزوں کو علم ہو گیا تو حجاز میں شیخ الہند اور ان کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ساتھیوں کو محبوس کر دیا گیا اور مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعض رفقاء کو جلاوطن کر دیا گیا۔

ہند کی سیاست کا یہ پہلو کس قدر حیرت زا ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے، جن کا اوڑھنا بچھونا مذہب تھا، اپنی پوری جدوجہد میں، ہندو مسلم کا سوال نہیں اُٹھایا، نہ اُنہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی اس عظیم جدوجہد میں ہندوستان کی دوسری کونسی قوم ساتھ دیتی ہے۔ جدوجہدِ آزادی کے اس طریقِ کار کو، جو علماء نے اپنا رکھا تھا،

ایک خوبی کے نام سے بھی معنون کیا جاسکتا ہے اور ایک خامی سے بھی۔ خوبی اس طرح کہ علماء کی کوشش تھی کہ آزادی کی تحریک میں اگر انہوں نے ہندو مسلم سوال اٹھایا تو تحریکِ آزادی ناکام ہو کر رہ جائے گی اور انگریز جو پہلے ہی ہندو مسلم کا سوال اٹھا کر دونوں قوموں کو لڑا کر آزادی کا رُخ موڑنا چاہتا ہے اس کے مشن کو مزید تقویت ملے گی۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریک میں اس سوال سے صرفِ نظر کیا۔ خامی اس طرح بنی کہ جب سیاسیات ہند میں ہندو مسلم سوال اٹھا اور ہر جگہ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تو دونوں قوموں میں تنفّر نے اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ مل جل کر رہنا دوبھر ہو گیا۔ کانگریس کے ساتھ "نیشنل" کا اطلاق مضحکہ خیز بن کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی جو فعال جماعت تھی وہ سرے سے اس سوال کے اٹھانے کے حق میں نہیں تھی۔ لازماً یہ ایک خلا تھا جسے جدید تعلیم یافتہ، مذہب سے دُور مسلمانوں نے پُر کیا اور فرقہ وارانہ بنیاد پر کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کو تقویت پہنچائی، جس نے بالآخر سیاساتِ ہند کا رُخ موڑ کر رکھ دیا۔

ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان کی سیاسیات میں مسلمانوں کے یہ دونوں طبقے متحد ہو کر اپنی جدوجہد کرتے تو اوّلاً انگریز بہت عرصہ قبل برصغیر کو چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔ ثانیاً پاکستان کی سرحدیں بہت وسیع ہوتیں۔ بہرحال جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں کہ یہ وقت تنقیص و تعریض کا نہیں ہے اور نہ ہی غلطیوں کے اُچھالنے کا ہے۔

حیرت یہ ہے کہ جنہیں فرقہ واریت کی بنیاد پر نیو اُٹھانی چاہیئے تھی وہ اپنی افتادِ طبع اور ماضی کی تاریخ کے پیشِ نظر اس سے کنارہ کش رہے اور جن کا بظاہر مذہب سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، انہوں نے حالات کو پرکھ کر، وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے میدان جیت لیا حالانکہ اس حقیقت سے انکار مسلم لیگ نہیں کر سکتی کہ جہاں تک مسلمانانِ ہند میں مذہبی جوش پیدا کرنے، انہیں درسِ جہاد دینے اور اسلام سے محبت پیدا کرنے کا تعلق ہے، اس میدان میں صرف وہ جماعتیں پیش پیش نظر آتی ہیں جو بدقسمتی سے تقسیمِ ملک کے منصوبہ کے خلاف

تھیں۔ ورنہ مسلم لیگ نے بحیثیت جماعت کے مسلمانوں میں ایک قوم ایک ملّت، اور ہندو دشمنی کے جذبات یقیناً پیدا کئے اور حالات کے رُخ نے بھی ان کا ساتھ دیا، مگر بایں ہمہ مذہب سے شیفتگی اور اسلام سے والہانہ محبّت کا جذبہ مسلم لیگ کی بجائے دیگر تحریکوں، اور جماعتوں نے پیدا کیا تھا۔ تحریکِ پاکستان کے قریبی ایّام میں جمعیتِ علماء اسلام سے متعلق علماء، یقیناً مذہب کی بنیاد پر اسلام سے محبّت کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے مگر یہ کریڈٹ بہرحال دوسری جماعتوں کو وافر صورت میں ملتا ہے۔

مسلم لیگ تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کے بعد انگریزوں سے بہت مایوسی ہوئی، اس لئے کہ ان کے انگریزوں سے تعاون و وفاداری کے جذبہ کو بہت ٹھیس پہنچی۔ نیز اس صدمہ کی بدولت ان کے سیاسی نقطۂ نظر میں تبدیلی رونما ہوئی۔ مگر یہ تبدیلی خوش آئند ثابت نہ ہو سکی کیونکہ اب اُنہوں نے انگریزوں سے دُور ہو کر کانگریس سے مفاہمت کا سلسلۂ جنبانی شروع کر دیا حالانکہ ہند کی سیاست کا رُخ پلٹنے کے لئے مسلم لیگی قیادت کے لئے ایک فیصلہ کن موڑ آ چکا تھا کیونکہ کانگریس روزِ اوّل ہی سے ہندوؤں کے مفاد کی نگران سمجھی جاتی تھی۔ انگریزوں نے تقسیمِ بنگال کی تنسیخ سے مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔ اب مسلم لیگ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ان طاقتوں سے تعاون کرتی جو ہندو مسلم سوال سے بے نیاز انگریزوں کے خلاف انقلابی قوتوں کو مجتمع کر رہے تھے۔ مگر بے پیندے لوٹے کی طرح، کانگریس کی گود میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے وقت کی راگنی شروع کر دی اور اپنے اصولوں سے یکسر منحرف ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۳ء میں آگرہ میں مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت، سر ابراہیم رحمت اللہ ہوا۔ جس میں طے پایا کہ ہندو مسلم مفاہمت کے نام سے کانگریس کے ساتھ بات چیت شروع کی جائے۔

الغرض ۱۹۱۴ء سے جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی جنگ کے دوران ریشمی رومال کی تحریک میں شامل علماء، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد اور دیگر حضرات مالٹا میں

نظر بند کئے جا چکے تھے اور اندرونِ ملک مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کو جیلوں میں محبوس کر دیا گیا تھا علاوہ ازیں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ساتھی بیرونی دنیا میں ہند کی آزادی کے لئے سرگرمِ عمل تھے۔ یہ ایک سہانا وقت تھا کہ مسلم قوتیں تحریکِ آزادی کی قیادت سنبھال کر جنگِ عظیم اوّل کے خاتمہ تک انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر کے آزادیٔ کامل حاصل کرنے کا شرف حاصل کر سکتی تھیں۔

مگر لکھنؤ میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا فارمولا ترتیب دیا جا رہا تھا، جسے تاریخ ہند میں لکھنؤ پیکٹ کہا جاتا ہے۔ جس کی اہم دفعات حسبِ ذیل تھیں۔

ا: مرکزی اسمبلی میں $\frac{4}{5}$ منتخب شدہ ممبروں میں $\frac{1}{3}$ تعداد مسلمان ممبروں کی ہو۔

ب: صوبجاتی کونسلوں میں $\frac{4}{5}$ منتخب شدہ ممبر ہوں جنہیں $\frac{1}{5}$ نامزد شدہ ممبر ہوں۔

ج: مسلم اقلیت کے لئے جداگانہ انتخاب باقی رکھا جائے گا۔ اس جداگانہ نیابت کا تناسب درجِ ذیل صوبوں میں اس طرح ہوگا۔

ا: پنجاب	۵۰ فیصد	جبکہ	آبادی	۵۵	فیصد تھی۔
بنگال	۴۰ فیصد	〃	〃	۵۳	〃 〃
یوپی	۳۰ 〃	〃	〃	۱۴	〃 〃
بہار	۲۵ 〃	〃	〃	۱۰	〃 〃
مدراس	۱۵ 〃	〃	〃	۷	〃 〃
بمبئی [1]	۳۳.۳ 〃			۲۰	〃 〃

د: کسی قوم کے غیر سرکاری نمائندوں کا پیش کردہ مسودہ قانون پر غور نہ کیا جائے گا اگر متاثرہ ہونے والی قوم کے تین چوتھائی ($\frac{3}{4}$) اراکین اس مسودہ قانون کی مخالفت

[1] بحوالہ ترجمان اسلام، لاہور - ۵ر نومبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۶

کریں، نیز یہ طے کرنا کہ کسی مسودۂ قانون سے کوئی فرقہ متاثر ہوتا ہے یا نہیں، اس قوم کے منتخب اراکین اسمبلی کا کام ہوگا۔

اس فارمولے میں مسلم لیگ نے پنجاب و بنگال کی مسلمان اکثریت کو اقلیت میں رکھ کر ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کے لئے چند سیٹیں حاصل کرنا چاہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان ممبر اقلیت ہی میں رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقلیت میں رہ کر مسلمانوں کو سیاسی حقوق وغیرہ کے حصول میں دشواریاں موجود رہیں۔ اس فارمولے کو کانگریس نے منظور کر لیا۔

جنگ عظیم اوّل کے خاتمہ کے بعد انگریز کے خلاف انقلابی تحریکیں چلانے والوں اور کانگریس کے مابین مفاہمت کا دور شروع ہوا۔ کیونکہ کانگریس ڈبل رول ادا کر رہی تھی ایک طرف ہندو کا مفاد وابستہ تھا، دوسری طرف ہند کی آزادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ دونوں مسائل کو سامنے رکھ کر تحریک شروع کر دی جائے۔ چنانچہ تاریخ آزادئ ہند کا یہ باب بھی نہایت حیران کن ہے، کہ قبل از تقسیم ملک جب بھی انگریزوں کے خلاف کوئی زبردست تحریک شروع ہوئی، خواہ وہ تحریک سراسر مذہبی نوعیت کی کیوں نہ ہو، کانگریس نے ان آزادی پسند انقلابی قوتوں کا بھرپور ساتھ دیا اور مسلم لیگ بحیثیت جماعت الگ تھلگ رہی، بلکہ ڈرائنگ روم کی سیاست کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ البتہ ۱۹۴۰ء کے بعد یہ کیفیت ۱۹۴۷ء تک بدل گئی اور مسلم لیگ ایک عوامی قوت اُبھر کر سامنے آگئی۔

جنگ عظیم کے بعد ترکی خلافت کے متعلق مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا اور انگریز ترکی کو اتحادیوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ ملنے کی سزا دینے پر تُل گیا۔ حالانکہ وہ مسلمانانِ ہند کی بظاہر یقین دہانی کرا چکا تھا کہ ترکی خلافت کو برقرار رکھا جائے گا، اور مسلمانوں کے جذبات کا بھرپور لحاظ کیا جائے گا کیونکہ مسلمانانِ ہند نے اسی یقین دہانی پر

ہی جنگِ عظیم اوّل میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن مکّار انگریز نے دیکھا کہ اس کا مطلب حل ہو گیا ہے اور وہ فتحیاب ہو چکا ہے تو اُس نے عربوں میں قومیت کے جذبے کو بھڑکا کر عربی عجمی لڑائی شروع کرا دی مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ اس سارے ڈرامے میں انگریز مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔ چنانچہ ترکی میں خلافت کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمانانِ ہند سردھڑ کی بازی لگا دینے کے جذبہ سے سرشار میدان میں نکل آئے۔ ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کر دی گئی جس کی شاخیں ملک کے کونہ کونہ میں قائم کر دی گئیں۔

تحریکِ خلافت

مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں تحریکِ خلافت ایک ایسا موڑ آیا جس میں ہندوستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتیں یا دوسرے الفاظ میں ہند کی تمام قومیں شانہ بشانہ انگریز کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہی تھیں۔ تحریکِ خلافت بظاہر ترکی خلافت کے احیاء اور انگریزوں سے نفرت کے بھرپور اظہار کا نام تھا۔ جس کا تعلق صرف مسلمانوں کے جذبات سے ہو سکتا ہے نہ کہ ہند کی دیگر قوموں کے ساتھ۔ مگر کانگریس نے عدمِ تعاون کی تحریک شروع کرنے کے لئے یہی وقت مناسب سمجھا اور مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء بھی خلافت کمیٹی کے شانہ بشانہ جنگِ آزادی لڑ رہی تھیں۔ گویا تحریکِ خلافت میں ہند کی مقتدر سیاسی جماعتوں اور قوموں کے اتحاد نے پورے برصغیر میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر شخص بلا تمیز رنگ و نسل اور مذہب و ملّت صرف ایک جذبہ سے سرشار تھا کہ انگریز ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے کسی طرح نجات حاصل کی جائے۔

اب اس مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم پر جو شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا حسین احمد مدنی، بیرسٹر حسن امام، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم محمد اجمل خاں، مولانا سید سلیمان ندوی، مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو۔ ذرا انصاف کی

عینک لگا کر بتایئے کہ ایک ایسی تحریک جسے قومی تحریک کی حیثیت حاصل ہے کی قیادت برصغیر کے بلند مرتبہ علماء ہی کے ہاتھوں میں نظر آتی ہے یا نہیں؟ اور اس حقیقت سے کوئی کور چشم مورخ ہی صرفِ نظر کر سکتا ہے کہ جس تحریک میں علماء کی اجتماعی قوت شامل حال ہے اس کی کامیابی یقینی صورت میں ظاہر نہ ہو۔ پھر کیا تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کی مشترکہ جدوجہد اس حقیقت کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود سیاسی میدان میں بھی ہندوؤں اور دوسری قوموں کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال کچھ عرصہ دیر تک قائم رہتی تو شاید تاریخ کے اوراق اس حقیقت سے آشنا ہو جاتے کہ مسلمان قوم اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اکثریت پر حکمرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے، انہیں کسی عددی اکثریت سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ہے جب وہ حالتِ جنگ میں عددی قلت کے باوجود بڑے بڑے معرکوں میں فتحیاب ہوتے رہے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ حالتِ امن میں عددی اکثریت کو خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر شکست سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔

ہم جب تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون میں برصغیر کی قد آور شخصیتوں کو یکجا دیکھتے ہیں تو اس حقیقت کو بہر حال تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مسلم لیگ نے، مسلمانوں کو ایک اقلیت تسلیم کرا کر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو مخدوش بنا دیا۔ اگر تحریکِ خلافت کا سا اتحاد چند سال تک کے لئے قائم رہ جاتا تو مولانا محمد علی جوہر کا ۱۹۳۱ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر آزادیٔ کامل کا نعرۂ حق، اُسی تاریخ کو حقیقت کا روپ دھار لیتا اور برصغیر پورے سترہ سال قبل آزادیٔ کامل سے ہمکنار ہو جاتا، جس کا سہرا مسلم قیادت کے سر بندھتا۔ لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

فرنگی بڑی عیار اور مکار قوم کا نام ہے۔ تحریکِ خلافت کے موقع پر جب اُس نے برصغیر کی تمام قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا دیکھا تو اُسے پاؤں تلے سے زمین نکلتی نظر آئی

چنانچہ فوری طور پر مختلف قوموں میں انتشار و افتراق کی نئی راہیں تجویز کی جانے لگیں اور تحریک خلافت کے خاتمہ کے ایک سال کے اندر ہی سوامی شردھانند جیسے متعصب ہندو رہنماؤں کی خدمات حاصل کر لی گئیں اور انہوں نے شدھی اور سنگھٹن جیسی گھٹیا اور مسلم کشی کی تحریکوں کی سرپرستی کی جس سے فرقہ وارانہ فسادات کا از سرِ نو آغاز ہو گیا۔ انگریز کامیاب رہا اور ہند کی قومیں باہم دست و گریباں ہو گئیں۔ سیاسی طور پر مسلمان رہنماؤں میں یہ اختلاف کھل کر اُس وقت سامنے آیا جب پنڈت موتی لال نہرو نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کیلئے ایک رپورٹ مرتب کی جسے سیاسی زبان میں نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے، جس کی درج ذیل دفعات نہایت اہم ہیں۔

ا : فرقہ وارانہ نیابت کو ختم کر دیا جائے۔ یعنی جُداگانہ نیابت کے اصول کو ختم کر دیا جائے۔

ب : مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو ایک تہائی کی بجائے ایک چوتھائی نمائندگی دی جائے۔

ج : صوبہ سندھ اور سرحدی صوبہ کو مشروط طور پر بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

د : وفاقی طرزِ حکومت کی بجائے وحدانی طرزِ حکومت قائم کی جائے۔

ہ : مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب کی بنیاد پر زیادہ نمائندگی نہ دی جائے۔

اس رپورٹ پر ملک بھر میں بڑی لے دے ہوئی۔ مسلم لیگ دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ہندو مسلم فسادات زوروں پر شروع ہو گئے۔ مسلمانوں میں ایک دفعہ پھر ہیجان برپا ہو گیا۔ مسٹر محمد علی جناح نے نہرو رپورٹ کا تفصیلی جواب لکھا جو چودہ نکات پر مبنی تھا۔ جسے سیاسی تاریخ میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کہا جاتا ہے۔ جو درجِ ذیل ہیں۔

ا : ہندوستان کا دستور وحدانی طرز کا نہ ہو بلکہ وفاقی حیثیت کا حامل ہو۔ جس میں صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو۔

۲ : تمام صوبے مساوی طور پر خود مختار ہوں۔

۳ : ملک کی تمام اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق حق نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے۔ کسی صوبے کی اقلیت کو اکثریت یا اکثریت کو اقلیت نہ بنایا جائے۔

۴ : مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے۔

۵ : اگر کسی اقلیت کے تین چوتھائی ارکان ایسے قانون کی مخالفت کریں جس سے اس فرقے پر زد پڑتی ہو، تو وہ منظور نہ کیا جائے۔

۶ : مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا حق بدستور قائم رہنا چاہیئے۔

۷ : ہر فرد کو عبادت و مذہب میں آزادی ہونی چاہیئے۔

۸ : سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبے کا درجہ دیا جائے۔

۹ : بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کی جائیں تاکہ دوسرے صوبوں کی طرح یہاں کے عوام ترقی سے ہمکنار ہو سکیں۔

۱۰ : ایسی سرحدی تبدیلی عمل میں نہ لائی جائے جس سے مسلم اکثریت والے صوبے پنجاب، بنگال اور سرحد متاثر ہوں۔

۱۱ : مسلمانوں کی تہذیب، ان کی زبان، ان کا تمدن اور ان کے ثقافتی سرمائے کو محفوظ کیا جائے۔

۱۲ : سرکاری ملازمتوں اور حکومتِ خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

۱۳ : مرکزی مجلس مقننہ میں وفاق میں شامل ریاستوں کی رائے لئے بغیر دستور میں تبدیلی نہ کی جائے۔

۱۴ : مرکزی یا صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کی تعداد ⅓ سے کسی صورت میں کم نہ ہو۔

ہمارے نزدیک نہرو رپورٹ اور اس کے جواب میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہندوستان کے سیاسی افق پر ہندو مسلم کا مسئلہ ایک مسلّمہ حقیقت کے روپ میں سامنے آگیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ جناح کے چودہ نکات کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے سلسلہ میں قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں تھیں۔ انہی ایّام میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے بھی ایک علیحدہ مملکت کے لئے مضامین کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے خطبۂ صدارت الہ آباد میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کر دیا تھا کہ :-

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مستقل سلطنت قائم کر دی جائے۔ یہ سلطنت برطانوی حکومت کے زیرِ اثر رہے یا علیحدہ، ہر صورت میں خود مختار ہونی چاہیئے۔"

علامہ نے اپنے اس خطبہ میں مسلم بنگال کا ذکر نہیں کیا۔ شاید ان کے نزدیک علیحدہ مسلم مملکت کی جگہ عالمِ اسلام کی وحدت و آزادی کا تصور موجود ہو اور ان چار صوبوں کو یکجا کر کے عالمِ اسلام کی آزادی کے لئے قلعۂ اوّل کی حیثیت دینا چاہتے ہوں۔

بہر حال نہرو رپورٹ اور مسٹر جناح کے چودہ نکات تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد کے ہونے والے واقعات اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہوئے۔ اب سوال یہ رہ گیا تھا کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کہ ہندو مسلم کا یہ اختلاف کس شکل میں متشکل ہو، دونوں جماعتوں کے مقتدر حضرات لندن میں تین مرتبہ گول میز کانفرنسوں کا انعقاد کرنے گئے مگر یہ تینوں بیٹھکیں بے سود ثابت ہوئیں۔

ہندو مسلم اختلافات نے جب واضح صورت اختیار کر لی تو مسلمانوں کا ایک فعال گروپ جو تحریکِ خلافت سے ہند کی سیاست پر اپنے اثرات مرتب کر رہا تھا، اُس نے اپنے لئے ایک نئی راہ اختیار کرنے کی سعی کی۔ اس نئے گروپ کی تربیت حریت پسند

اور آزادی کے متوالوں کے ہاں ہوئی تھی ۔ لہٰذا ان کی علیحدہ حیثیت ہونے کے باوجود، ان کا تعلق خاطر حریت پسندوں کی طرف مائل رہا ، جس وجہ سے ان کے متعلق اپنوں میں بھی بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئیں ، گویا اس نے ایک درمیانی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ۔ اسے "مجلس احرار اسلام" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ احرار میں وہ لوگ شامل تھے جو مذہبی زیادہ تھے اور سیاسی کم ۔ یعنی مذہب کو اوّلیت کا درجہ حاصل تھا اور سیاست ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جن اکابر کے یہ نام لیوا تھے وہ تقویٰ و پرہیزگاری، علم وعمل اور تدیّن و تدبّر کے لحاظ سے ان سے کہیں آگے تھے ، جبھی تو یہ ان کے نام لیوا تھے ۔ مگر جن کے یہ نام لیوا تھے وہ مذہب پر زیادہ عمل پیرا ہونے کے باوجود صرف "سیاسی" تھے ۔ مگر اِن کے ہاں مذہب کو اولیت حاصل تھی جس کی بنا پر اوّل و آخر یہ ایک تبلیغی جماعت بن کر رہ گئی ۔ اس کی سیاسی حیثیت صرف شہروں تک محدود رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس کو ہندوستان میں سیاسی قوت حاصل نہ ہو سکی ۔ اس کی کئی وجوہات تھیں ۔

(۱) مجلسِ احرار سے وابستہ رہنما اور رضاکار جدید تعلیم یافتہ نہ تھے ۔ اعلیٰ سیاسی حلقوں میں انہیں کوئی تفوق حاصل نہیں تھا ، اسلئے ان کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ۔

(۲) ان کی اکثریت بہادر رضاکاروں پر مشتمل تھی نہ کہ لیڈروں اور رہنماؤں پر ، ظاہر ہے کہ رضاکار تعمیلِ ارشاد کیلئے تو موزوں ہو سکتا ہے ، رہنمائی کے لئے نہیں ۔

(۳) ان کی اکثریت خطیبوں اور واعظوں پر مشتمل تھی ۔ جو اپنی سحر بیانی اور خطابت کے زور سے وقتی طور پر حاضرین کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے ، مگر کوئی ٹھوس کام کر کے دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکتے تھے ۔

(۴) احرار میدان کے شہسوار ضرور تھے مگر میز کے کھلاڑی نہیں تھے ۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے اسرار و رموز میدانوں میں لڑ کر سمجھ میں نہیں آتے بلکہ ان کیلئے

گول میز ہی موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔ بیسویں صدی کا یہ خاصا ہے کہ اس میں کوئی اہم مسئلہ میدانوں میں حل نہیں ہوا ہے، بلکہ ہر مسئلہ میز کے ارد گرد بیٹھ کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

⑤ اس میں شامل حضرات خود ہی اس احساس میں مبتلا تھے کہ وہ کسی کا پیغام لے کر نکلے ہیں، اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔

سیاسی دنیا میں یہ باور کرانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بتائے کہ قوم کو کیا دیگا یا اس کے پاس دینے کے لئے کیا کچھ ہے۔

⑥ اس میں شامل اکثریت، درمیانی اور غریب طبقہ کے لوگوں پر مشتمل تھی جن کی گذراوقات کا انحصار لوگوں کے چندوں اور ان کے تعاون پر تھا۔ ان کا اپنا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے گروہ سے کون لوگ اپنی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں جو دینے کی بجائے لینے کے عادی ہوں۔

⑦ انہوں نے کھُل کر سیاسیاتِ ہند میں اس وقت قدم رکھا جب برصغیر دو متحارب گروہوں (مسلم، ہندو) میں تقسیم ہو چکا تھا اور اس تقسیم کا سہرا نہرو رپورٹ اور جناح کے چودہ نکات کو حاصل ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں سے کٹ کر ہی علیحدہ ہوتے مگر چونکہ ان حضرات کا روحانی تعلق حریت پسند علماء کے ساتھ تھا جو بوجوہ کانگریس سے تعاون کر رہے تھے، اس لئے ان کا وزن اسی پلڑے میں تولا جاتا رہا۔

⑧ ان کے پاس برصغیر کے سیاسی مسائل کے حل کے لئے کوئی دو ٹوک منصوبہ نہیں تھا ان کے پاس گو ایک غیر معمولی پروگرام تھا، مگر دنیا کی یہ ریت رہی ہے کہ دو متحارب گروہوں میں صلح وصفائی کے فرائض سرانجام دینے والا خود مارا جاتا ہے۔ یہی حال احرار کے ساتھ ہوا۔

⑨ ان کے پاس وسائل کی بے حد کمی تھی۔ اپنی آواز زیادہ سے زیادہ پنجاب تک پہنچا

سکتے تھے۔ پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں بوجہ عدم وسائل لینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے

(۱۰) یہ جماعت اپنے قیام کے ابتدائی پانچ سال کے اندر ہی اندر انگریز کی مکارانہ سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی۔ چونکہ مولوی تھے، اس لئے مسجد ہی ان کے زوال کا باعث بنی۔ حالانکہ ان کے موقف کی صحت کا شاہکار مسجد شہید گنج کا وہ پہرے دار ہے جو آج بھی سنگین کی نوک پہرہ دے رہا ہے۔ مگر مکّار اُسے کہا جاتا ہے جو سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں یدِطولیٰ رکھتا

(۱۱) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ گروپ اپنی طبعی شرافت اور خلوص کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ پُر اعتماد تھا۔ انہیں اپنے پرائے یا بُرے بھلے میں تمیز نہ تھی، جس نے انہیں خوش خلقی سے سلام کہہ دیا یہ سمجھے کہ وہ بہ دل و جان ان کا خیر خواہ ہے۔ ان کے دل و زبان میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ جو زبان سے ایک دفعہ کہہ بیٹھتے، اُسے کر گزرنے کی کوشش کرتے تھے سیاسی میدان میں مکر و فریب، جعل سازی اور مصلحت بینی اور وعدوں سے مکر جانا سیاسی کامیابی کے اربعہ عناصر ہیں۔ مگر احراری حضرات کا ان سے دُور کا واسطہ تک نہ تھا۔

(۱۲) ان کی سیاست ہمیشہ مدافعانہ (DEFENSIVE) طریق پر چلتی رہی ہے۔ انہیں اپنے مخالف پر جارحانہ OFFENSIVE حربہ استعمال کرنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی۔

چنانچہ ان وجوہات کی بدولت احرار، بعض حیرت انگیز کامیابیوں پر بعض ناعاقبت اندیش مؤرخوں نے بھی قلم اُٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یا سرے سے ہی اسے "صرفِ قلم" کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر بایں ہمہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مجلس احرار اسلام نے اپنی خامیوں اور فرد گذاشتوں کے باوجود پنجاب میں بالخصوص اور برصغیر اور عالمِ اسلام میں بالعموم جو نشانات چھوڑے ہیں ان کی جھلک آج بھی کہیں کہیں نظر آ ہی جاتی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مجلس احرار اسلام وہ واحد جماعت ہے جس نے:۔

(۱) سیاسیات میں مذہبی رنگ پیدا کیا۔ پہلے صرف مرکز اور صوبوں کی سیٹوں پر بات چیت ہوتی تھی۔ اب مذہب بھی سیاست میں گھس گیا۔ گویا مذہبی سیاست کو احرار نے

ہند میں سب سے پہلے متعارف کرایا، جو پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ
کی عملی صورت میں متشکل ہو گیا۔

(۲) سیاسیات میں مذہب کو ہمیشہ رکاوٹ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کی تردید اگرچہ مختلف حلقوں سے مسلسل ہوتی رہی۔ تاہم جس جماعت نے سیاست میں بھرپور حصّہ لے کر عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ مذہب، سیاست میں رکاوٹ کا باعث نہیں بنتا، بلکہ سیاسی محاذ پر مذہب کی آمد سے معرکہ سر ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے، وہ احرار ہے۔ علّامہ اقبال کا یہ قول مشہور ہے ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مگر یہ مصرع پڑھنے والے کتنے ہیں جنہوں نے اسے عملی جامہ پہنانے میں کوئی انقلابی اقدام کیا ہو؟ برصغیر میں مجلس احرار اسلام کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اس نے علامہ اقبال کے اس کلام کی عملی تفسیر اپنی شبانہ روز جدوجہد اور پیہم کوششوں کے ذریعہ پیش کر دی۔

(۳) سیاست میں اپنی دعاوی کی کامیابی کے لئے جن جدید ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے ان میں مکر و فریب، نمود و نمائش، جعل سازی، مصلحت کیشی، جھوٹے وعدے، منافقانہ روش، الزام تراشی سرِفہرست ہیں۔ ان حربوں کو استعمال کئے بغیر آپ اپنی دکان سیاست نہیں چمکا سکتے، مگر احرار نے اپنی سیاسی زندگی میں ان تمام ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ یہ ایک ایسی جرأتِ رندانہ تھی جسے مستقبل کا اسلامی مؤرخ یقیناً خراجِ تحسین پیش کریگا۔

(۴) احرار کے میدان میں آنے کے بعد غریب لوگوں کو پہلی مرتبہ حوصلہ ہوا کہ سیاست "گھوڑوں کی ریس" کا نام نہیں ہے کہ بڑے بڑے لوگ ہی اسے دفع الوقتی یا فارغ لمحات گزارنے کا ایک مشغلہ سمجھیں۔ بلکہ سیاست کے "دروازے" ہر غریب کے لئے کھلے ہیں اور وہ حتی المقدور قومی معاملات میں بہتر سے بہتر خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عالمی سیاست میں درمیانی طبقہ اور غریب آدمی نے تاریخ ساز کردار پیش کیا ہے۔

امیروں کی سیاست ہمیشہ خوشامدانہ پالیسیاں اختیار کرنے، غریبوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور ملت فروشی کے کارہائے نمایاں سے پُر ہے۔ مجلس احرار اسلام نے پنجاب کے جیالے رضاکاروں، سرحد کے پٹھانوں، لکھنؤ یوپی اور دہلی کے دانش وروں، بنگال کے جذباتی مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے درمیانی طبقہ کے لئے ترقی کے دروازے کھول دیئے اور انہیں احساسِ کمتری سے نجات دِلا کر دانشوروں، عالموں اور راہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

⑤ احرار نے جماعتی حیثیت سے جن تحریکوں کو پروان چڑھایا، نیز قید و بند کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے جس قدر لاتعداد رضاکار بھرتی کئے، ہندوستان کی تمام جماعتوں نے کسی مشترکہ کاز کے لئے متحد ہو کر بھی اتنے رضاکار فراہم نہیں کئے۔ تحریکِ خلافت ہند کی تمام جماعتوں نے مشترکہ طور پر شروع کی تھی اور اس میں کانگریس، عدم تعاون کے نام پر بھی شامل ہو گئی تھی، نیز ہند کے مختلف حصّوں کے لوگ شامل تھے۔ مگر تحریکِ کشمیر کے سلسلہ میں مجلس احرار نے صرف پنجاب سے پچاس ہزار رضاکاروں کی ایک بہت بڑی فورس پیش کر کے، تمام سیاسی جماعتوں اور حکمران طبقہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ چنانچہ تحریکِ کشمیر کے بعد ہی سے احرار کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔

⑥ احرار نے پہلی مرتبہ یہ تاثر دیا کہ کسی تحریک کی کامیابی کے لئے روپوں کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ بہادر انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

NOT GOLD BUT ONLY MEN CAN MAKE,
A PEOPLE GREAT AND STRONG;
MEN, WHO FOR TRUTH AND HONOUR'S SAKE
STAND FAST AND SUFFER LONG.

⑦ برصغیر میں چند جماعتیں ایسی قائم ہوئیں جنہوں نے باقاعدہ رضاکار فورس قائم کی۔

ان رضاکاروں میں ایسا ولولہ اور جوش بھر دیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل اور اپنے امیر کی اطاعت کے لئے جان و مال اور اہل و عیال تک کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ یہ جماعتیں اگرچہ علاقائی تھیں تاہم ان کی رضاکار فورس کی طاقت سے بڑے بڑے سورما خوف کھاتے تھے۔ ان میں مجلس احرار اسلام، خاکسار تحریک اور خدائی خدمت گار شامل ہیں۔

(۸) احرار اسلام وہ واحد گروہ ہے جس نے اپنے اکابر سے سیاسی مسائل پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں اپنے لئے ایک علیحدہ راہ متعین کر لی مجلس احرار اسلام کے راہنما، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر اکابرینِ جمعیتِ علمائے ہند کا از حد احترام کرتے تھے اور یہ احترام یک طرفہ نہیں تھا۔ تاہم یہ لوگ ان کی علمی وجاہت اور تقویٰ و پرہیزگاری کے، نہ صرف ثناخواں تھے بلکہ معتقد تھے، مگر سیاست میں ان حضرات کا کانگریس سے تعاون احرار کو اچھا نہیں لگتا تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے سیاسی حد تک اپنے لئے ایک الگ راہ منتخب کر لی لیکن روحانی تعلق اور احترام باہمی موجود رہا، اور اسی احترام اور روحانی تعلق کی وجہ سے بعض انگریز زدہ اور کور چشم جماعتوں اور نام نہاد لیڈروں نے احرار کو ہمیشہ مطعون کیا۔ احرار نے ہمیشہ اس طعنہ زنی کو اپنے لئے یہ کہہ کر اعزاز سمجھا کہ ان کا تعلقِ روحانی ایسے اکابر سے جا ملتا ہے جو فرنگی کے کبھی وفادار نہیں رہے بلکہ انگریز کے جانی دشمن رہے ہیں۔ نیز اُن کا تعلق ایسے اولوالعزم انسانوں سے ہے جن کا ظاہر و باطن ایک پکے مسلمان کا ہے۔ اس لئے انہوں نے کبھی ان "مطاعن" کو پرکاہ وقعت نہیں دی۔

جہاں تک سیاسی اختلاف کا تعلق ہے یا مذہبی معاملات کا، احرار دو ٹوک بات کرنے کے عادی تھے۔ ایک دفعہ حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے کسی نے پوچھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویریں عام ہیں، آپ تصویر کھنچوانے سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔ تو شاہ جی نے فوراً جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں سیاست میں ان کا مقلّد تھا، شریعت میں

نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں بابو! میرے میاںؒ نے منع فرمایا ہے۔ اُن کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں[1]۔

اور سیاسی تقلید بھی ۱۹۲۹ء کے آخر میں ختم ہوگئی جب "احرار اسلام" کی بنیاد عمل میں آئی:

(۹) "مجلس احرار اسلام نے اپنی شبانہ روز مجاہدانہ مساعی، خداداد صلاحیتوں اور مذہبی رنگ میں انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات اس شدّت سے بھڑکائے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ملتا۔ یہ واحد جماعت ہے جس نے انگریز کے قیام کی مدّت کو مزید گھٹا دیا اور انگریز اپنا بوریا بستر باندھنے پر وقت سے پہلے تیار ہوگیا۔ تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ پنجاب، انگریزی مفادات کا سب سے بڑا نگہبان اور محافظ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب انگریزی سیاست کے قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ احرار نے انگریز کا پنجاب سے زور توڑا، اور ۱۹۳۱ء میں ایک ایسی عوامی تحریک، جس میں ننانوے فی صد مسلمان شامل تھے، شروع کرکے انگریز اور مہاراجہ کشمیر کو حیرت میں ڈال دیا۔

(۱۰) تحریکِ کشمیر چلانے کا سہرا صرف مجلس احرارِ اسلام کے سر ہے۔ اس تحریک کے بڑے دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ احرار کی دُور بین نگاہ نے کشمیر کے مستقبل کے متعلق بعض سازشوں کا پتہ چلا لیا۔ جس میں قادیانیوں کی یہ سازش شامل تھی کہ وہ قادیان کو اپنے مستقبل کا مستقر بنانا چاہتے تھے۔ اور آگے چل کر قادیانی سٹیٹ بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر بنانا مقصود تھا۔ اس منصوبہ کی تکمیل میں احرار آڑے آگئے اور مزاحمت کرنے لگے۔ انہوں نے کشمیر کمیٹی جس کے صدر بشیر الدین محمود تھے اور علامہ اقبال جو اس کمیٹی کے رکن تھے، کو مجبور کر دیا کہ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیں۔ قادیانیوں کی سازش یوں بے نقاب ہوگئی، جس کا سہرا مجلس احرار اسلام کے سر ہے۔

---

[1] بحوالہ "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" از شورش کاشمیری ص ۱۹۱

(۱۱) مجلس احرار نے ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر جنگ لڑی۔ ملک کے اندر جتنی سیاسی جماعتیں تھیں، سب ایک محاذ پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئی تھیں۔ چنانچہ کانگریس اور مسلم لیگ دو قابل قدر جماعتیں تھیں۔ دونوں کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے مرکز اور صوبوں میں آبادی کے تناسب کے پیش نظر "ہوم رول" کا مطالبہ تھا۔ ان دونوں جماعتوں نے مذہبی معاملات میں نہ تو کبھی مداخلت کی اور نہ ہی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ تاہم فرقہ وارانہ بنیاد پر بغیر مذہبی جنگ چھیڑے، سیاسی لڑائی لڑ رہی تھیں، لیکن مجلسِ احرار کا نقطۂ نظر دونوں سے قدرے مختلف تھا۔ احرار بنیادی طور پر فرنگی اقتدار کے مخالف تو تھے ہی، اس لئے فرنگی سایہ میں پروان چڑھنے والے اداروں اور جماعتوں سے مخاصمت بھی اِن کا فطری حق تھا۔ چنانچہ سیاسی محاذ پر انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ شدید کرنے اور مذہبی محاذ پر انگریز کے خود کاشتہ پودا (قادیانی فرقہ) کے عزائم سے مِلّت اسلامیہ کو باخبر رکھنا، ان کے مشن میں شامل ہوگیا۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل اس کتاب کے کسی حصّہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

(۱۲) احرار سب سے پہلے سیاساتِ ہند میں قرآنی سیاست کے علمبردار بن کر نکلے، اور ۱۹۴۰ء کے بعد مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے مقابلہ میں حکومتِ الٰہیہ کا وہ عظیم الشّان پروگرام پیش کیا۔ جس کی پُشت پر حضرت شاہ ولی اللہ سے لے کر علامہ سیّد جمال الدین افغانیؒ، مفتی محمد عبدہٗ، مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن وغیرہ کی انقلابی تحریکیں اور ان کے مقاصد کار فرما تھے لیکن جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا جاچکا ہے کہ احرار میز کی سیاست کی نسبت میدان کی سیاست کے شہسوار تھے اور انگریز حکومت سے اُن کا کوئی رابطہ نہ تھا، جس کی وجہ سے ہندوستان کو چھوڑتے وقت انگریز نے انہیں یکسر نظر انداز کر دیا۔

(۱۳) احرار اسلام ہند میں وہ پہلی سیاسی جماعت ہے جس نے مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کے مابین رواداری، میل جول اور محبّت و اخوّت کا جذبہ نہ صرف پیدا کیا بلکہ انہیں جنگِ آزادی

کے لئے اتحاد و اتفاق کی ایک لڑی میں پرو کر رکھ دیا۔ لہٰذا اسے ایک معمولی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ کیونکہ انگریز کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمانوں میں معمولی اختلافات کی وجہ سے دائمی مفارقت موجود رہے۔

احرار نے مختلف فرقوں میں جذبۂ آزادی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ باہمی یگانگت، احساسِ رواداری اور باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ چنانچہ ایک ہی سٹیج پر حنفی، اہلِ حدیث، بریلوی، دیوبندی، شیعہ وغیرہ کے جید علماء نمودار ہوئے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہار شریف اور مولانا مظہر علی اظہر اکٹھے اٹھتے بیٹھتے نظر آئے۔ انگریز کے مقابلہ میں مسلمان فرقوں میں اس قسم کی یگانگت و مفاہمت پیدا کرنا۔ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ تاہم مجلس احرار کے کارناموں میں یہ کارنامہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

(۱۴) مجلس احرار اسلام نے فرقۂ قادیانیت کے متعلق وہ واضح اور دو ٹوک پالیسی اختیار کی، جو آج تک کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت نہیں اختیار کر پائی۔ قادیانیوں کا پنجاب، بلوچستان، اور بتدریج پاکستان میں "قادیانی سٹیٹ" قائم کرنے کا منصوبہ جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا۔ قادیانیوں کے عزائم سے امتِ مسلمہ کو باخبر رکھا۔ حکومت اور اعیانِ حکومت کو انکی سرگرمیوں سے مطلع کیا۔ اگرچہ احرار کی یہ سرگرمیاں تقریروں تک محدود تھیں لیکن مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان کی بدولت قادیانیوں کے خلاف اردو، عربی، انگریزی، اور پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں وافر تعداد میں لٹریچر موجود ہے جو ملک اور بیرونِ ملک پڑھا جاتا ہے۔

حال ہی میں مولانا لال حسین اختر صدر مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان نے یورپی اور دیگر ممالک کا تفصیلی دورہ کرکے قادیانیوں کے خلاف بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ جن کی تفصیل راقم الحروف کی ایک دوسری کتاب "تحریکِ ختمِ نبوّت" میں پیش کی جا رہی ہے۔

(۱۵) ختمِ نبوّت کے متعلق جو خدمات احرار نے انجام دی ہیں وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل

ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کا پردہ چاک کرنے اور ایک زبردست تحریک شروع کرنے کے لئے مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کے مابین فقید المثال اتحاد کی فضا پیدا کر کے جو عظیم کارنامہ انجام دیا تھا وہ احرار ہی کا حصّہ ہے۔ ۱۹۵۳ء سے قبل جدید تعلیم یافتہ مسلمان، مرزائیوں کو مسلمانوں میں ایک فرقہ کی حیثیت دیتا تھا۔ اس تحریک کے بعد ہر تعلیم یافتہ، مرزائیوں کے خطرناک عزائم سے نہ صرف باخبر ہوگیا بلکہ عشقِ رسول کے جذبہ سے سرشار ہوگیا اور مرزائیوں کو فرقہ سمجھنے کی بجائے ایک غیر اسلامی گروہ سمجھنے لگا۔ اس کی تفصیل بھی "تحریکِ ختمِ نبوّت" میں پیش کی جارہی ہے۔

(۱۶) احرار نے بحیثیت جماعت سرمایہ داری کے خلاف ہند میں سب سے پہلے آواز بلند کی۔ نیز غریبوں اور مزارعوں کی زبوں حالی کا زور شور سے ذکر کیا۔ اس چیز نے پنجاب میں غریبوں کسانوں اور مزارعین کو احرار کی طرف متوجہ کیا جس سے احرار جلد ہی ایک فعال عوامی جماعت بن گئی۔ کیونکہ دوسری جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس میں بڑے بڑے سرمایہ دار، جاگیردار شامل تھے۔ اس لئے احرار نے سب سے پہلے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔

(۱۷) احرار نے سب سے پہلے ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کیلئے مساویانہ حقوق کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ مساوات مرکز اور صوبوں کی اسمبلیوں سے لے کر زندگی کے ہر میدان اور ہر سطح پر ہونی چاہیئے جب کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ بھی آبادی کے تناسب کی حد تک مسلمانوں کے حقوق کی علمبردار تھی۔

غرض مجلس احرار اسلام کے کارنامے بہت عظیم ہیں۔ جنہیں اس کتاب کے کسی حصّہ میں پیش کر دیا گیا ہے۔

مجلسِ احرار کا قیام

احرار کی بنیاد رکھنے والے سابقون میں امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق،

خواجہ عبدالرحمان غازی قابلِ ذکر ہیں۔

مجلسِ احرار کی پالیسی

احرار کی سب سے پہلی کانفرنس ۱۱-۱۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو جیبیبہ ہال لاہور میں زیرِ صدارت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی منعقد ہوئی۔ مولانا سیّد داؤد غزنویؒ جو اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے، کے الفاظ میں "فی الحقیقت مسلمانانِ پنجاب کا دس برس کے بعد ایک عظیم الشان قومی اجتماع تھا" جس میں اس گرمی کے موسم میں دو سو کے قریب ڈیلیگیٹ مختلف اضلاعِ پنجاب سے تشریف لائے[1]۔ اس کانفرنس کے صدر مجلس استقبالیہ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ ہائی کورٹ نے احرار کے قیام، مقاصد اور پالیسی پر اپنے خطبۂ استقبالیہ میں روشنی ڈالی۔ بعد میں مولانا حبیب الرّحمان صدر اجلاس نے مزید وضاحت کی۔ آیئے ان خطبات کے چند اقتباسات کا مطالعہ کریں اور پاس شدہ قراردادوں کو دیکھیں تاکہ احرار کے مقاصد اور اس کی پالیسیوں کے متعلق ہمہ قسم کی معلومات حاصل ہوسکیں۔

مولانا مظہر علی اظہر صدر مجلسِ استقبالیہ، اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کے حالات کا پس منظر پیش کرتے ہوئے احرار کے قیام و پالیسی کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:-

"کانگریس اور حکومت کے درمیان عارضی صلح کے بعد اُمید پڑتی تھی، کہ آئندہ دستور اساسی کی ترتیب میں فرقہ وارانہ اور دیگر مسائل کا تسلی بخش حل ہوسکے گا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد نظر آیا کہ یہ امید موہوم تھی۔ گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جو ۱۹۳۰ء کے آخری اور ۱۹۳۱ء کے ابتدائی ایّام میں ہوا، مختلف صوبجات کے مختلف تصفیے ہوئے اور بڑے صوبوں میں سے ایک صوبہ پنجاب ہی ایسا تھا جس کے تناسبِ نمائندگی کے متعلق

---

[1] پنجاب احرار اسلام کانفرنس، خطبات و قراردادیں صفحہ ابتدائیہ

فیصلہ نہ ہو سکا۔"

"عارضی صلح نے تصفیے کے امکانات میں اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ قوم پرستی کے بیشتر مدعی صوبے کے خرمنِ امن کو جلا کر خاک میں ملانے کے درپے نظر آتے ہیں سکھ قوم پرستوں نے امرتسر میں سکھ لیگ کا اجلاس کر کے بیانگِ دہل کہہ دیا کہ اگر حکومت نے ان کی مرضی کے مطابق دستورِ اساسی کی ترتیب نہ رکھی تو وہ خون کی (یعنی مسلمانوں کے خون کی) ندیاں بہا دیں گے۔ ہندو سبھا نے لاہور میں قوم پرستی کا دعویٰ کرتے ہوئے اسلام کو دشمن قرار دیا اور ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرنے والے ہندوؤں سے کہہ دیا کہ اگر ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہو تو مسجد میں جا کر کلمہ پڑھ لو۔ اقلیتوں کی کانفرنس میں ہر مقرر نے قوم پرستی کا دعویٰ کرتے ہوئے انتہائی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا۔[1]

چنانچہ مولانا مظہر علی اظہر نے پنجاب کے مسئلہ کے حل پر زور دیتے ہوئے جداگانہ انتخاب کے خلاف ہندوؤں کے شور و غوغا کی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا:-

"ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کے خلاف آواز اٹھائی، لیکن وہ اس لئے نہ تھی کہ ملکی فوائد پیش نظر تھے۔ پنجاب کونسل میں ایسے مسلمان نظر آتے تھے جو ان کے زیر اثر نہ تھے۔ کیونکہ حکومت کے ارکان مسلمانوں کو ایک راہ پر چلا رہے تھے، اور ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اگر تمام گورنمنٹ کالج اور سکول ہندوؤں اور سکھوں سے معمور ہوں، تمام ملازمتوں میں ان کا ہی عنصر ہو، اور تمام میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ انہی کے اشارے پر کام کریں تو یہ ان کے نزدیک عین قوم پرستی ہے، لیکن اگر مسلمانوں کے لئے کسی کالج کا دروازہ کھل

---

[1] احرار اسلام کانفرنس، لاہور۔ خطبات و قراردادیں صفحہ ۱-۲

جائے یا ملازمتوں میں ان کو حصہ دیا جائے یا کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ان کی کچھ آواز سنائی دینے لگے تو ہندو قوم پرستی کی دیوار گرنے لگ جاتی ہے اور وہ گنبدِ افلاک سر پر اٹھائے بغیر چین نہیں لے سکتے۔[1]

حالات کے اس رخ پر آنے کے بعد ہندوؤں کی تنگ نظری کا شکار مسلمانوں کو دیکھ کر احرار نے اسلامیانِ ہند کے لئے ایک نئی راہ منتخب کرنے کی دعوت دی جسے مولانا مظہر علی اظہر کے الفاظ میں اس طرح کہا گیا ہے:۔

"ان حالات میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا، مجالسِ قوانین میں واضح نشستوں کا تناسب، فیڈرل اور یونٹری آئین حکومت وغیرہ محض فروعی مسائل ہیں، جن کا حل ہونا یا نہ ہونا، ملکی مسائل و مصائب پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اصلِ اصول ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا ہے، اور وہ بھی اقتصادی آزادی محض سیاسی آزادی، اقتصادی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی اور ملک کو دردناک اقتصادی اور سیاسی انقلاب کی طرف لے جائے گی۔ موجودہ قوم پرستوں کا بیشتر حصہ سیاسی آزادی بلکہ اس سے بھی کمتر پر قانع نظر آتا ہے اور اس لئے فرقہ وارانہ مسائل کا حل کوئی نظر نہیں آتا ہندوستان کے لئے سیاسی اور اقتصادی آزادی حاصل کرنا ہمارا منتہائے مقصود ہونا چاہیئے، خواہ فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل ہو یا نہ ہو، خواہ جماعتی جنگ سے نجات ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ جب تک ہماری اپنی آواز، ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والی نہیں، جب تک ہماری سیاسی اور حکمتِ عملی کی باگ ڈور لندن کے سیاسی اور اقتصادی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے نہ ہمیں

---

[1] احرار کانفرنس، خطبات و قرار دادیں صفحہ ۲۔۳

پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو گا، نہ پہننے کے لئے کپڑا مہیا ہو سکتا ہے۔ نہ گرمی اور سردی سے بچنے کیلئے گوشۂ عافیت مل سکتا ہے۔"

مولانا آخر یہ کہنے کو تو کہہ دیا کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا نشستوں کا تناسب وغیرہ ملکی مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے بغیر ہندوستان کے مستقبل کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا ہوا نظر بھی تو نہیں آ رہا تھا۔ آخر کس طرف کا رُخ کیا جاتا۔ اب تھا۔ اس کیلئے مولانا نے سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی آزادی کا نعرہ لگا دیا کیونکہ بقول ان کے محض سیاسی آزادی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی، جب تک اقتصادی آزادی کے حصول کی کوششیں نہ کی جائیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی آزادی تو مجالسِ قانون ساز میں نمائندگی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر مجالس قانون سازی میں نمائندگی بقول مولانا کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی تو اقتصادی آزادی کے لئے مولانا نے کونسی تجاویز، طریقِ کار، یا پروگرام عوام کو دیا۔ میرے نزدیک احرار کی یہی وہ بڑی خامی ہے کہ اُس نے نہرو رپورٹ اور جناح کے چودہ نکات کے مابین اپنا کوئی دو ٹوک، واضح اور متبادل لائحہ عمل قوم کے سامنے پیش نہ کیا، ورنہ تنقید برائے تنقید سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال احرار کی جدوجہد کا ایک اور رُخ بھی تھا۔ جسے کسی جماعت نے نہیں اپنایا اور احرار کو اپنی افتادِ طبع اور درمیانی طبقہ سے متعلق ہونے کی بنا پر اپنانا پڑا۔ وہ رُخ کیا تھا؟ مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہم اب بھی آزادیٔ وطن کے لئے تہِ دل سے کوشش کریں گے، لیکن ہماری کوششیں غریبوں، مفلسوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی، خوش حالی اور فارغ البالی کے لئے ہوں گی۔ ہم برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کی جگہ، ہندوستانی ملوکیت اور سرمایہ داری کو دے کر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم نئی

لہ احرار کانفرنس، خطبات و قراردادیں صفحہ ۷-۸

بادشاہتیں، نئے راج، نئی نوابیاں اور نئے ساہوکارے دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے، ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں، نہ آئندہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اس لئے جہاں ہم نے آج تک برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعفِ ایمانی سمجھا ہے، اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوشِ غضب میں آئیں، تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ پہ چلتے جائیں گے۔[1]

احرار کے اس عزم و ارادہ کے پیچھے یہ نکتہ کار فرما نظر آتا ہے کہ وہ سرمایہ دار خواہ ہندو ہو یا مسلمان، دونوں سے لڑیں گے اور دونوں فرقوں کے غریبوں اور ناداروں کو مِلا کر اپنے مقاصد کی تکمیل کریں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے احرار کو غریب مسلمان ہی میسر آئے نہ کہ غریب ہندو۔ ہندو کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو وہ اپنا مستقبل کانگریس کے ساتھ منسلک کرتا نظر آتا ہے، کیونکہ وہ احرار کو نیشنلسٹ جماعت اس لئے سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہندوؤں کی خود غرضی تنگ نظری اور تعصب کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے، کہ اگر کسی جماعت کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ ہندوستانی باشندوں کی ہمہ قسم کی آزادی کے لئے، فرقہ وارانہ بنیادوں سے ہٹ کر کام بھی کر رہی ہو، تب بھی "بنیا" کے نزدیک وہ صرف اس لئے قوم پرست نہیں کہلا سکتی کیونکہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے چنانچہ اس حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے بعد ہی مسلم راہنماؤں کو مجلسِ احرار کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بنابریں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی صدر مجلس احرارِ اسلام کانفرنس نے کانفرنس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فرمایا:۔

---

[1] احرار کانفرنس، خطبات و قرار دادیں صفحہ ۹-۱۰

"احرار کانفرنس کے بُلانے کی ضرورت کیوں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ عارضی صلح کے بعد جب کہ نیا آئین و قانون ہندوستان کے لئے کانگریس انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر تیار کر رہی ہے، اس وقت ہر قوم کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس آئین میں اپنے لئے بہتر سے بہتر مقاصد حاصل کرے پنجاب میں سکھوں کی قوم نے جن کی نمائندگی کا دعویٰ ماسٹر تارا سنگھ کو ہے، مسلمانوں کے خلاف اتنا زہر اُگلا اور ہندو پریس نے اسکی تائید کی، جس کیلئے تریاق کی ضرورت ہے"۔

گویا احرار کانفرنس بلانے کا مقصد مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرنا اور ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے دی گئی دھمکیوں کا جواب دینا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کانفرنس جو جولائی ۱۹۳۱ء کو بلائی گئی تھی، یہ بہترین موقع تھا کہ ہندو اور سکھ فرقہ پرستوں کا بہادری اور جوانمردی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ مسلم لیگ کی سیاست ڈرائنگ روم سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اس میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو انگریز کے خطاب یافتہ تھے۔ ظاہر ہے کہ انگریز کی طرف سے خطاب یافتہ یا تمغہ یافتہ لوگ اس کی خوشنودی اور مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ گول میز کانفرنسوں میں مسلم لیگ کی طرف سے جو وفد شریک ہوا، ان میں سوائے مسٹر محمد علی جناح کے باقی سب کے سب "سر" اور "خان بہادر" کے القاب سے مزین نظر آتے ہیں۔

ذرا گول میز کانفرنسوں میں مسلمانوں کے نمائندوں کی فہرست[1] ملاحظہ فرمائیے۔

۱: سر آغا خاں ۲: سر محمد شفیع ۳: سر شاہنواز خاں،
۴: سر احمد سعید چھتاری ۵: سر غلام حسین ہدایت اللہ ۶: سر سلطان احمد
۷: سر شفاعت احمد خاں ۸: سر ظفر اللہ خاں ۹: بیگم شاہنواز
۱۰: کیپٹن شیر محمد خاں آف ڈومیلی ۱۱: خان بہادر حافظ ہدایت حسین کانپور والے

---

[1] ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۶

۱۲: نواب سر عبدالقیوم ۱۳: مسٹر محمد علی جناح

بہر حال مجلس احرار اسلام نے ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلہ میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ احرار کا خیال تھا کہ سب کی نگاہیں پنجاب کی مسلم اکثریت کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ گہری سازش سے پنجاب کی اکثریت کی آبادی کو نہ صرف یہ کہ اقلیت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں بلکہ انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ ہند کے کسی مقام پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو ہندو ماتا کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

مجلس احرار کو یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ یہ وہ واحد جماعت ہے جس نے پورے برصغیر میں مسلمانوں کے لئے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا، جبکہ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنی ہوئی تھی وہ ان صوبوں (پنجاب و بنگال) میں، جہاں مسلم اکثریت تھی، تناسب کے لحاظ سے نصف بلکہ اس سے بھی کم سیٹوں پر قانع تھی، اور مرکزی اسمبلی میں ۱/۳ حصہ پر شاکر تھی۔ بایں ہمہ مسلم لیگ کو زعم تھا کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے حالانکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اقلیت میں رکھ کر ہندوستان کا ثانوی شہری بنا دیا تھا اور ہندو اکثریت کے خوف و ڈر کی فضا قائم کر دی۔ اگرچہ صورت حال اس کے برعکس تھی کیونکہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے مسلم قائدین پیش پیش تھے۔

غرض احرار نے مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں مساوی حقوق کا مطالبہ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کی تنگ نظری و تعصب نے احرار ایسی قوم پرست تحریک کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کے اصول کو تسلیم کر لے۔ چنانچہ احرار نے بھی اسی کانفرنس میں جداگانہ نیابت کا اصول مان لیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا:۔

سب سے بڑا مشکل مسئلہ پنجاب کا ہے۔ پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کی متحدہ کوشش یہ ہے کہ کسی طرح پنجاب میں مسلمانوں کو آئین اور دستور کے

اندر اکثریت حاصل نہ ہو۔ سکھوں نے تو اس کے لئے اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور وہ مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوئی تو ہم پنجاب میں خون کی ندیاں بہا دیں گے، اور ہندو ان کی اعلانیہ امداد کر رہے ہیں۔ ۲۲ر جون ۱۹۳۱ء کو "پرتاپ" نے تو یہ بھی لکھ دیا کہ سکھ اور ہندو پنجاب میں کبھی اورنگ زیب کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ ان حالات میں کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ پنجاب کے ہندو، سکھ، مسلمان متحد ہو کر کوئی کام کر سکتے ہیں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا کہ ہندو اور سکھ پنجاب میں قوم پرستی کے پردے میں فرقہ پرستی کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اس کا ثبوت میناریٹی کانفرنس (MINORITY CONFERENCE) نے دے دیا ہے یعنی اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ پنجاب میں بالغاں کو حق رائے دہندگی نہ دیا جائے اور یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ پنجاب کی مسلم اکثریت کی جگہ ہم انگریز کی حکومت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس وقت پنجاب کے ہندو اور سکھوں کی متحدہ کوشش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت قائم نہ ہونے دیں اور اگر کوئی مسلمان جس نے ملک و وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کی ہو، اور اگر وہ یہ کہہ دے کہ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت دی جائے تو اسی وقت ہندو پریس اس کو بدترین شہری اور فرقہ پرست کے نام سے بدنام کرنا شروع کر دیتا ہے میں ہندوستان کی تمام اقوام کو کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ——

جماعت احرار کسی قوم کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتی مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وہ اچھوت بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمان ہندوستان میں برابر کے حقدار ہیں، اور وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار بن کر رہیں گے۔

اگر مسلمان ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے، تو وہ سکھ اور ہندوؤں کے متعصبانہ جذبات اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو دیکھ کر اپنے حقوق کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔[1]

احرار نے اپنی اس پہلی کانفرنس میں پہلی بار کانگریس کی پے بہ پے ہندو نوازی اور نام نہاد "نیشنل" جماعت کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا اور ایک نیشنلسٹ تحریک کے علمبردار ہونے کے باوجود، مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر لیا اور ایک طویل قرارداد اس ضمن میں پاس کی۔ احرار نے نہرو رپورٹ اور جناح کے چودہ نکات کے بعد برصغیر میں جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر کے برصغیر کی تاریخِ سیاست میں ایک انقلابی قدم اٹھایا نیشنلسٹ تحریکوں کے لئے یہ ایک حیرت انگیز اعلان تھا۔ اس اعلان نے کانگریس اور قوم پرست طبقہ کے لئے الگ الگ سوچ کی کئی راہیں کھول دیں مگر کانگریس نے اس سے کوئی سبق نہ لیا۔ نتیجتاً مسلمان کانگریس سے بدظن ہو گئے، اور مسلم لیگ کے قریب آ گئے۔ قرارداد کی نقل حسبِ ذیل ہے۔

ہندوؤں کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور جداگانہ انتخاب

ہرگاہ کہ مارچ ۲۷ء میں مختلف مسلم جماعتوں کے کئی ایک مقتدر راہنماؤں کی پیش کردہ دہلی تجاویز کو، جن میں تجویز کیا گیا تھا کہ تمام فرقوں کے لئے تمام صوبوں میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں، اور حلقہ ہائے انتخاب کو مخلوط کر دیا جائے۔ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے قبول نہ کیا۔

---

[1] احرار کانفرنس۔ خطبات و قراردادیں صفحہ ۱۴-۱۵

اور ہرگاہ کہ مسئلۂ پنجاب کا وہ حل جو نہرو رپورٹ نے پیش کیا اور جس کو ۱۹۲۸ء کے ہندو، مسلم، سکھ میثاق میں، جو لکھنؤ میں ہوا، منضبط کیا گیا تھا، اور جس میں سفارش کی گئی تھی کہ سب بالغوں کو حق رائے دے کر مخلوط انتخاب کا سلسلہ جاری کیا جائے اور کسی فرقہ کے لئے پنجاب میں نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

تمام سکھ قوم نے حتیٰ کہ میثاقِ لکھنؤ پر دستخط کرنے والوں نے بھی اسے نامنظور کیا، اور سکھوں کی ہندوؤں نے علانیہ تائید کی، اور ہرگاہ کہ خود مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۸ء کے اس میثاقِ پنجاب سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور یہ اعلان کرکے کہ اس میں سکھوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، اس واحد تجویز کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جس پر رضامندی باہمی کی امید ہو سکتی تھی۔ اور ہرگاہ کہ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے حق رائے دہی بالغاں کی علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ اور

ہرگاہ کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ باعزت اور برادرانہ سلوک روا رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے اور بدستور چھوت کی شکل میں مسلمانوں کے سوشل بائیکاٹ کو جاری رکھتے ہوئے متحدہ قومیت کے راستے میں روز افزوں مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ اور

ہرگاہ کہ ہندو اور سکھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے لئے محض اپنے فرقہ وارانہ مفاد کی خاطر چیخ و پکار کر رہے ہیں، اور اپنی انتہائی فرقہ پرستی کو نام نہاد قومیت کے لحاظ میں ظاہر کر رہے ہیں۔ اور ہرگاہ کہ مہاتما گاندھی نے بھی اصرار کیا کہ مسلمانوں کا متحدہ مطالبہ ہو پیشتر اس کے کہ وہ قابلِ التفات ہو سکے۔ اور ہرگاہ کہ مسلمانوں کے اعتدال پسند اور قدامت پسند طبقے، جداگانہ انتخاب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اور

ہرگاہ کہ مخلوط انتخاب کے ہر اُس فارمولا سے جو مسلمان قوم پسندوں کے نزدیک قابلِ قبول تھا، پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے اختلاف کیا ہے اور اب معاملات کا زیادہ دیر تک کھٹائی میں پڑا رہنا بے سود ہے۔ اور ہرگاہ کمال سنجیدگی اور عزم سے یہ دھمکی دی گئی ہے

کہ اگر کوئی ایسا آئین رائج کیا گیا خواہ وہ نہرو رپورٹ کے مطابق کیوں نہ ہو جس میں صوبہ کے لئے امکان ہو کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کو مخلوط انتخاب کے ذریعہ بھی مجلس قوانین پنجاب میں منتخب کرا سکے تو سکھ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادیں گے، اور ہندو سکھوں کی پشت پناہی پر ہیں۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ مصیبت کے تدارک کے لئے شیرازۂ قوم کا انتشار دُور کیا جاوے۔ اور

ہر گاہ کہ ہندو اور سکھ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ مسلمانوں کے لئے مرکزی حکومت میں فائق حیثیت حاصل کرنے کا ذرہ برابر بھی امکان ہو۔ اس لئے کانفرنس کی رائے ہے کہ موجودہ حالات میں جداگانہ انتخاب جاری رہنا چاہیئے اور جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے، وہاں کی مجالس وضع قوانین میں نشستوں کی اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہونی چاہیئے۔ اور مخلوط انتخاب، جو متحدہ قومیت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اس کا اجراء اس وقت تک معرضِ التواء میں رہنا چاہیئے، جب تک ہندو اور سکھ، مسلمانوں کے خلاف اپنے جارحانہ اور معاندانہ رویہ سے دستکش نہ ہو جائیں، اور مسلمانوں کے ساتھ طول وعرضِ ہند میں زندگی کے ہر شعبہ میں فراخ حوصلگی، رواداری اور ہندوستانی برادری کا سلوک عملاً پیش کر کے متحدہ قومیت کے لئے خوش گوار فضا پیدا نہ کریں [1]۔

مجلس احرار نے اسلامی اقدار کے احیاء کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بھی سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ درحقیقت کانگریس سے علیحدہ جماعت کے قیام میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا جذبہ ہی کار فرما تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ جولائی ۱۹۳۱ء میں جو مختلف قراردادیں پاس کیں، ان کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر کے وہ عملاً مسلم لیگ کے قریب آچکے تھے۔ مگر احرار اور مسلم لیگ میں پروگرام کی نسبت شخصیات متصادم نظر آتی

---

[1] احرار کانفرنس۔ خطبات و قراردادیں صفحہ ۲۶-۲۸

ہیں۔ احرار درمیانی اور غریب طبقہ کی نمائندہ جماعت تھی، اور حریت پسند جماعتوں کے ساتھ کام کرکے وہ بہادری، جوانمردی اور نتائج سے بے خوف ہو کر کام کرنے کے عادی تھے۔ نیز اپنے پروگرام کی تکمیل میں وہ فرنگی کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ مگر مسلم لیگ وڈیروں، زمینداروں اور نوابوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ سوائے محمد علی جناح کے باقی سب نوآموز، ناتجربہ کار اور مفاد پرست طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وہ بنیادی اختلافات تھے جو دونوں جماعتوں کے پروگراموں میں یکسانیت کے باوجود متحد کرنے میں رکاوٹ بنے رہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

مجلس احرار نے اپنے پہلے اجلاس جولائی ۱۹۳۱ء کے بعد آل ہند بنیاد پر ایک خصوصی اجلاس مؤرخہ ۹۔۱۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو منعقد کیا۔ جس میں مجلسِ مرکزیہ کے ارکان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مختلف الخیال اصحاب بھی جمع ہوئے۔ اجلاس کی صدارت جناب شیخ حسام الدین بی۔ اے نے کی۔ اس اجلاس میں خصوصیات کے ساتھ مندرجہ ذیل قراردادیں قابلِ ذکر ہیں۔

"ملک جمہوریت ہند اور حکومتِ خود اختیاری کا یہ تقاضا تھا کہ فرقہ وارانہ امور کے متعلق فیصلہ ہندوستان کے مختلف فرقے باہمی رضامندی سے کرتے۔ ازبسکہ وزارتِ برطانیہ کا اعلان اس جمہوری اصول کے صریحاً منافی ہے۔ علاوہ ازیں خالص اسلامی نکتہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس میں مسلمانانِ ہند کے واجبی مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا اور ان کی حیثیت کو مستقل خطرہ میں ڈالا گیا ہے۔ مثلاً

پنجاب میں جہاں ان کی آبادی ستاون ۵۷ فیصدی کے قریب ہے۔ ان کی اکثریت کو انچاس ۴۹ فیصدی کی آئینی اقلیت میں بدل دیا گیا ہے۔

بنگال میں کہ وہاں بھی وہ آبادی کا جزو غالب ہیں۔ ان کی اکثریت کو اڑتالیس ۴۸ فیصدی کی دائمی اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کا تناسب نمائندگی موجودہ تناسب سے بھی گھٹا دیا گیا ہے۔

مرکز میں مسلمانوں کی نیابت کے سوال کو چھوا تک نہیں۔

لہٰذا مجلس احرار اسلام ہند کے اس اجلاس کی رائے میں یہ فیصلہ قطعاً ناقابلِ التفات ہے، اور مجلس احرار یہ اعلان کر دینا چاہتی ہے کہ اگر مسلمانوں کے واجبی مطالبات پورے نہ کئے گئے تو وہ کسی موثر قدم کے اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

مجلس احرار ہند کا یہ تاریخی جلسہ گورنمنٹ ہند سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ کاغذاتِ سرکار میں مسلمانوں کی پس ماندہ اقوام کو کمین نہ لکھا جائے[۱]"

ان قراردادوں کے مطالبہ کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ قراردادیں اور مطالبات مسلم لیگ پیش کر رہی ہو۔ مگر یہ پروگرام غریب طبقہ کی نمائندہ مسلم جماعت احرار کا ہے۔ اس پروگرام کے علاوہ احرار نے ہند کے سرمایہ داروں اور وڈیروں کے خلاف اور غریب مزدوروں اور کسانوں کے تحفّظ کے لئے بھی زبردست آواز اُٹھائی۔ چونکہ یہ مسلمانوں کی جماعت تھی اور انہی کے حقوق کے تحفّظ کے لئے کام کر رہی تھی، اس لئے مسلمان وڈیرے اور سرمایہ دار، احرار کے جانی دشمن بن گئے۔ چونکہ مسلم لیگ پر اس طبقہ کی اکثریت کی گرفت تھی، اس لئے یہ طبقہ اپنے ذاتی مفادات کے تحفّظ کے لئے، احرار اور مسلم لیگ میں مفاہمت کی کوششوں کو ہمیشہ ناکام بناتا رہا۔

احرار اور مسلم لیگ

متحدہ ہندوستان میں احرار اور مسلم لیگ دو عوامی جماعتیں تھیں، جن کی قیادت مسلم عمائدین کے ہاتھ میں تھی۔ یوں تو سیاسی جماعتیں اور بھی تھیں جن کی قیادت مسلم قائدین

---

[۱] مجلس احرارِ اسلام ہند کا اجلاس خصوصی صفحہ ۳-۴

کے ہاتھ میں تھی۔ مثلاً خاکسار تحریک، خدائی خدمت گار، جمعیۃ علمائے ہند وغیرہ مگر ان کے پروگراموں میں زبردست اختلافات تھے۔ احرار اور لیگ میں کوئی بنیادی اختلافات نہیں تھے۔ پروگرام یکساں تھے، البتہ طریق کار مختلف تھا۔ چنانچہ :۔

ا : احرار کا خیال تھا کہ انگریز فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکا کر ہند میں، اپنی عمر کو طول دے رہا ہے، کیونکہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" اس کا بنیادی نصب العین ہے، جبکہ لیگ کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں انگریز کا ہاتھ نہیں ہے البتہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور مسلمانوں کے خلاف بغض کارفرما نظر آتا ہے۔

ب : احرار کا پروگرام یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مسلم اکثریت اور اقلیت والے صوبوں میں انہیں آبادی کے تناسب کے مطابق جداگانہ بنیاد پر نمائندگی کا حق ملنا چاہیئے، اور اسی طرح مرکز میں بھی انہیں زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جانی مناسب ہے۔ بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو پہلی احرار کانفرنس منعقدہ جولائی ۱۹۳۱ء کے صدر تھے، مسلمانوں کے لئے مساویانہ بنیاد پر نمائندگی کے خواہاں تھے، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس جداگانہ نیابت کے اصول کو ماننے اور لیگ کی نسبت مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی حاصل کرنے کے باوجود وہ تقسیمِ ملک کے خلاف تھے۔ اس کے برعکس لیگ کا نقطۂ نظر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں یہ تھا کہ فرقہ وارانہ بنیاد پر علیحدہ مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ مسلمان سیاسی و اقتصادی طور پر ہندوؤں کے دباؤ سے محفوظ رہ سکیں۔

دونوں جماعتوں کا یہ اختلاف چونکہ بنیادی نوعیت کا نہیں تھا، اس لئے مختلف اوقات میں دونوں جماعتوں کے رہنماؤں میں باہمی اتحاد کے لئے بات چیت کے کئی دور شروع ہوئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا، جب یہ امید ہو چکی تھی کہ دونوں جماعتوں کے مابین نقطۂ نظر کا یہ اختلاف بس ختم ہوا ہی چاہتا ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، لیگ کا مفاد پرست

طبقہ جو وزیروں، نوابوں اور زمینداروں کی صورت میں مسلم لیگ پر حاوی ہو چکا تھا، محمد علی جناح کی احرار سے گفتگو کو ناکام بناتا رہا۔

ہم درجِ ذیل سطور میں محترم جناب ماسٹر تاج الدین انصاری لدھیانوی کے قلم سے گفتگو کے وہ تمام مراحل نقل کرتے ہیں جو فریقین کے مابین ہوئے۔ یہ رپورٹ مجلس احرار اسلام پاکستان، لاہور، ملتان کے مطبوعہ پمفلٹ "اکابر احرار اور قائد پاکستان جناب محمد علی جناح کی خوش گوار ملاقاتوں کا اجمالی تذکرہ" کے صفحات ۷ تا ۲۰ سے شکریہ کے ساتھ نقل کی جا رہی ہے۔

پہلی ملاقات

۱۹۳۶ء میں پنجاب کی مسلم لیگ پر معدودے چند سرکار پرستوں کا قبضہ تھا۔ آزاد خیال لوگ خال خال نظر آتے تھے۔ ساری کارروائی کاغذی ہوتی تھی۔ مسٹر جناح پنجاب میں ایسی جاندار لیگ بنانا چاہتے تھے جو سرکاری اثرات سے پاک ہو۔ مگر یہاں کا ٹوڈی طبقہ اوپر کے اشارے پر جب چاہتا لیگ میں داخل ہو کر بیان بازی کر لیتا اور جب اشارہ ملتا، خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ سر فضل حسین، حکومتِ برطانیہ کے قابلِ اعتماد، ذہین اور طاقتور مہرے تھے۔ ان دنوں سر فضل حسین کا طوطی بولتا تھا۔ پنجاب پر دو طاقتوں کا قبضہ تھا۔ عوام کی نمائندگی میں احرار اور سرکار کی نمائندگی میں سر فضل حسین۔ احرار رہنماؤں سے سر فضل حسین کے تعلقات میں بظاہر کوئی کشیدگی نہ تھی۔ فضل حسین بلا کے ذہین، سیاسی شاطر اور منتقم مزاج انسان تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، مسٹر جناح پنجاب مسلم لیگ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ سرکار پرستوں سے چھٹکارا چاہتے تھے مگر انہیں عوام تک رسائی حاصل نہ تھی۔ وہ اس ارادہ سے پنجاب میں تشریف لائے تاکہ آئندہ الیکشن کے لئے میدان درست کیا جائے۔ وہ سر فضل حسین سے بھی مسلم لیگ کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ اِدھر سر فضل حسین بھی مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے لئے بیتاب تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ مسٹر جناح کو پنجاب کے پالیٹکس میں داخل ہونے سے حتی الوسع روکا جائے چنانچہ ان دونوں بڑے آدمیوں نے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں سر فضل حسین نے نہایت عیاری سے کام لیتے ہوئے ملاقات کے کمرے میں پردے کے پیچھے دو برطانوی جاسوسوں کو بٹھا دیا تاکہ وہ مسٹر جناح کے خیالات اپنے کانوں سے سن لیں۔ گفتگو کا نچوڑ یہ تھا، کہ مسٹر جناح بہرحال مسلم لیگ کو الیکشن کے میدان میں اتاریں گے خواہ انہیں کانگرس سے کوئی سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ سر فضل حسین نے مسٹر جناح کو بے حوصلہ، دل برداشتہ اور مایوس کرنے کی انتہائی کوشش کی اور آخر میں انہیں کہا کہ "آپ پنجاب میں جلسہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں، جلسہ کامیاب نہ ہوسکے گا۔ یہاں کون آپ کی بات سننے گا؟ اور کس نے ساتھ دینا ہے"؟

احرار اور مسٹر جناح کی گفتگو

اس قسم کی گفتگو سن کر مسٹر جناح افسردہ خاطر ہو کر سر فضل حسین کے ہاں سے واپس آکر احرار رہنماؤں سے ملے۔ مسٹر جناح اور احرار رہنماؤں کی یہ ملاقات ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے مکان پر ہوئی۔ اس ملاقات میں احرار رہنماؤں نے مسٹر جناح سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں پنجاب کے مسلم لیگیوں اور سر فضل حسین کی صحیح پوزیشن بتائی، اور انہیں کہا کہ آپ جلسۂ عام میں ضرور تقریر کریں، ہم جلسے کا انتظام پوری ذمہ داری سے کریں گے۔ چنانچہ جلسہ ہوا مسٹر جناح نے دل کھول کر تقریر کی اور احرار رضا کاروں نے بے وردی اس جلسے کا انتظام کیا۔ مسٹر جناح کو احرار رہنماؤں نے مشورہ دیا کہ آپ مسلم لیگ کو ٹوڈیوں اور سرکار پرست رؤسا کے پنجے سے نکالئے اور اسے عوامی جماعت بنائیے۔ مسلم لیگ کا موجودہ طبقہ آپ کی بجائے برطانوی اشاروں پر چلتا ہے۔ جب اشارہ ملتا ہے مسلم لیگ زندہ باد کہنے لگتے ہیں، تب مسلم لیگ میں جان پڑ جاتی ہے، جب دوسرا اشارہ ملتا ہے خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسلم لیگ کی جان نکل جاتی ہے۔ یہ لوگ مسلم لیگ کے گلے میں چکی کا پاٹ ہیں، یہ آپ کو چلنے

نہیں دیں گے۔ مسٹر جناح نے احرار رہنماؤں سے کہا کہ "اگر احرار ساتھ دیں تو وہ فضل حسین سے ٹکر لینے کو تیار ہیں"۔ سر فضل حسین نے چونکہ ملاقات کے وقت دو انگریزوں کو پس پردہ بٹھایا تھا اور مسٹر جناح اس حرکت سے باخبر ہو چکے تھے اس لئے مسٹر جناح سخت برہم تھے اور وہ واقعی سر فضل حسین کو اس حرکت کا مزہ چکھانا چاہتے تھے مگر۔۔۔۔۔۔

احرار کو کیا تُحفہ ملا؟

سر فضل حسین سے خفا ہو کر مسٹر جناح تو لاہور سے تشریف لے گئے مگر سر فضل حسین کے دل میں احرار کے خلاف گرہ بیٹھ گئی وہ احرار اور مسٹر جناح کے باہمی تعلّقات کو برداشت نہ کر سکے اور احرار کے سخت خلاف ہو گئے۔ وہ حکومت کے نفسِ ناطقہ تھے۔ مسٹر جناح سے احرار رہنماؤں کی یہی ملاقات سر فضل حسین سے نزاع کا باعث ہوئی، ورنہ وہ چودھری افضل حق مرحوم اور مولانا مظہر علی صاحب کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتے اور دوستوں کی طرح ملنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ احرار رہنماؤں کے علاوہ وہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم و مغفور کے والد بزرگوار مولانا حافظ محمد زکریا مرحوم کے بہترین دوستوں میں تھے بلکہ انہیں پیروں کی طرح مانتے تھے۔ مگر سیاست کا میدان ایسا خطرناک ہے کہ اس کی تلخی اور انتقامی جذبہ کربلا بنا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ احرار کی مقبولیّت جب پورے شباب پر تھی تو سر فضل حسین ہی کی مہربانی سے احرار پر ـــــ مسجد شہید گنج کا ملبہ گرا دیا گیا؟ غریب احرار کو ایک جلسے کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی؟ اور

ع مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے!

مسٹر جناح دفتر احرار میں

دُوسری ملاقات

مسٹر جناح اور مجلس احرار کے رہنماؤں میں ـــــ سر فضل حسین کی ملاقات کے بعد ـــــ تعلّقات نہایت خوشگوار ہو گئے تھے چنانچہ الیکشن قریب آگیا تو مسٹر جناح لاہور تشریف لے آئے۔ اب احرار اور مسٹر جناح کے

درمیان چونکہ کوئی پردہ حائل نہ تھا، وہ بے تکلف دفترِ احرار میں چلے آتے اور الیکشن کے بارے میں صاف دلی سے مُبادلۂ خیال کیا، مگر سرفضل حسین کے چیلے چانٹے لیگ میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس اہم ملاقات کو کیسے برداشت کرتے؟ اس دوسری ملاقات کے موقع پر جو دلچسپ واقعہ ظہور پذیر ہوا، اس سے قارئین کرام صحیح اندازہ لگاسکیں گے کہ مسٹر جناح کو خود ان کے خود غرض حاشیہ نشینوں نے کن پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا تھا؟

ناقابلِ تردید حقیقت

واقعہ یہ ہے کہ مسٹر جناح کی دلی خواہش تھی کہ پنجاب کے انتخابات میں احرار ایسی فعال جماعت اور مسلم لیگ میں، باہمی تعاون ہونا چاہیئے۔ وہ اس بارے میں احرار زعمار سے مبادلۂ خیال بھی کرتے رہے۔ ادھر احرار زعمار بھی یہ چاہتے تھے کہ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کے ایسے نمائندے آنا چاہئیں جو سرکار پرست نہ ہوں بلکہ مخلص اور نڈر مسلمان ہوں، جو مسلمان قوم کی صحیح نمائندگی کر سکیں۔ مسٹر جناح پر تو احرار کو اعتماد تھا، مگر پنجاب کے اکثر مسلم لیگی رہنماؤں پر بہ وجوہ قطعاً اعتماد نہ تھا۔ حالانکہ میاں عبدالعزیز مدظلہ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم مجلس احرار کے ہر فرد کے لئے قابلِ احترام بزرگ تھے۔ احرار نے اپنی رائے کو چھپایا نہیں، بلکہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے مسٹر جناح سے بھی عرض کر دیا کہ آپ کے بعض ساتھی دو کشتیوں کے سوار ہیں، انہیں باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کی مستقل عادت ہے۔ انہیں ہمارے ساتھ ایمان داری سے تعاون کی تاکید فرمادیں۔ چنانچہ لاہور سے روانگی سے قبل مسٹر جناح نے پنجاب کے ان مسلم لیگی رہنماؤں پر یہ بات واضح کر دی کہ "انتخابات میں احرار اور مسلم لیگ کو مل کر کام کرنا ہوگا، اب یہ ایک طے شدہ امر ہے۔" مسٹر جناح کی اس تائید پر احرار مطمئن ہوگئے۔ پنجاب کے ان مسلم لیگی رہنماؤں میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ احرار کے متعلق اپنی دلی رائے کا دانشگاف الفاظ میں اظہار کر دیتے کہ احرار کے ساتھ کسی بھی صورت میں تعاون نہیں ہوسکتا اور نہ ان مسلم لیگی رہنماؤں میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ اپنے مخلص قائد سے بغاوت کرتے۔ مسٹر جناح

کے لاہور سے تشریف لے جانے کے بعد یہ حضرات پیچ و تاب کھاتے رہے اور منصوبے بناتے رہے کہ احرار سے کیونکر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ تا آنکہ مشترکہ اجلاس کا وقت آ پہنچا۔ مسٹر جناح کی ہدایت کے مطابق الیکشن بورڈ کا اجلاس برکت علی ہال میں منعقد کرنے کی تاریخ کا تعیّن ہو گیا۔ اجلاس کے انعقاد سے چند روز قبل چند لیگی رہنما رسمی گفتگو کے لئے دفتر احرار میں تشریف لائے۔ سرسری گفتگو کے بعد یہ حضرات فرمانے لگے کہ چونکہ مسلم لیگ باہمی تعاون سے الیکشن لڑنا ہے اس لئے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھ لینا چاہئے۔ پھر فرمایا۔ الیکشن کے اخراجات سے نپٹنے کے لئے بہتر صورت تو یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری بورڈ کی جانب سے معتد بہ رقم ہر امیدوار کے ٹکٹ پر لگا دی جائے اور باقی اخراجات امیدوار خود ادا کرے۔ چودھری افضل حق نے فرمایا کہ ہمارے ہاں تو الیکشن کے اخراجات برائے نام ہوتے ہیں۔ میرا گذشتہ انتخاب آپ حضرات کے سامنے ہوا ہے۔ اخراجات کی تفصیل بھی سن لیجئے۔ میرے پاس کل رقم دو صد ۲۰۰ روپیہ تھی جو میں نے اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دی۔ انتخاب ہو چکا تو کارکنوں نے واپسی پر مجھے بہتر ۷۲ روپے دیتے ہوئے کہا کہ یہ ان دو سو روپوں میں سے باقی بچے ہیں۔ اس لئے حضرات کرام! ہمیں تو الیکشن کے اخراجات کی قطعاً فکر نہیں ہے۔ آپ کی امداد بہر حال ہمیں کرنا ہے۔ ہمارے کارکن اور معزز رفقاء حلقۂ انتخاب میں وقتِ ضرورت پیدل بھی سفر کر لیتے ہیں، فاقے بھی کاٹ لیتے ہیں تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور اسی قلندرانہ ٹھاٹھ سے شہنشاہوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال دیا کرتے ہیں"۔ اس گفتگو کے بعد فریقین مطمئن ہو گئے۔ احرار اس لئے مطمئن تھے کہ ہم نے اپنی اصل حقیقت اور حیثیت نئے دوستوں پر بغیر کسی ایچ پیچ کے واضح کر دی ہے اور مسلم لیگی زعماء اس لئے مطمئن ہو گئے کہ مدِ مقابل کا پینترا معلوم ہو گیا ہے، اب ٹھینگنی دینے کے لئے آسانی سے داؤ مارا جا سکتا ہے۔

برکت علی ہال کا تاریخی اجلاس

مشترکہ پارلیمنٹری بورڈ کی جانب سے اجلاس

کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ کہ "جلسہ کی کارروائی برکت علی ہال میں ٹھیک چار بجے شام شروع ہوگی"۔ (مدعوئین کو وقت کا خاص طور پر خیال رہے)۔ ایجنڈا حسب ذیل ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیگر امور بہ اجازت صدر"۔ اس اعلان کے مطابق احرار زعما مشترکہ پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں شمولیت کے لئے اپنے دفتر دہلی دروازہ سے جو برکت علی ہال سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے، پیدل چل کر ٹھیک چار بجے ہال میں داخل ہوئے۔ خلافِ توقع مسلم لیگی زعماء ہال میں پہلے سے موجود تھے۔ احرار جا کر بیٹھے ہی تھے کہ اسٹیج سے اعلان ہوا "ضروری کارروائی ایجنڈے کے مطابق ختم ہو چکی ہے کوئی اور بات ہو تو فرمائیے"۔ احرار زعما حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اپنی گھڑیاں دیکھیں تو چار بج کر چار یا پانچ منٹ ہوئے تھے۔ خدایا! تلاوت کس وقت ہوئی، جلسے کا افتتاح کس نے کیا۔ تجاویز کب پیش ہوئیں، یہ ماجرا کیا ہے؟ صدر جلسہ سے احرار زعماء نے دریافت کیا کہ ابھی تو چار بج کر چار یا پانچ منٹ ہی ہوئے ہیں، ہم ٹھیک وقت پر حاضر ہوگئے ہیں، اب کارروائی شروع ہونا چاہیئے، آپ کیا فرما رہے ہیں؟ لیگی زعماء یہ باتیں سُن کر مسکرا رہے تھے۔ احرار زعماء کو مخاطب کرتے ہوئے صدرِ جلسہ نے فرمایا۔ "اِدھر ہال کے کلاک کی طرف دیکھئے، ساڑھے چار بج چکے ہیں، معمولی کارروائی تھی جو ختم ہو چکی ہے"۔

ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ بعض لیگی حضرات نے معیّن وقت سے قبل ہال میں داخل ہو کر نہایت آسانی سے کلاک کی سوئی کو گھمایا اور آدھ گھنٹہ آگے بڑھا دیا یعنی چار کی بجائے ساڑھے چار بجا دیئے۔ احرار زعماء حیران تھے کہ یہ کیا تماشا ہوا ہے؟ بہر حال احرار زعماء نے صدر جلسہ سے عرض کیا کہ بندہ پرور بات تو ہم نے سمجھ لی ہے اتنا تو بتا دیجئے کہ کون کون سی تجاویز منظور ہوئی ہیں؟ ارشاد ہوا۔ ہم نے چند کمیٹیاں بنائی ہیں اور امیدواروں کے لئے ٹکٹ کی فیس کا تعیّن کیا ہے۔ دریافت کیا۔ کتنی فیس رکھی ہے؟ فرمایا۔ ساڑھے سات سو روپے فی کس، وہ بھی مشروط (اس واقعہ کا

ذکر تاریخِ احرار، طبع ثانی، بابت مارچ ۱۹۶۸ء کے صفحہ ۲۱۱ پر ملاحظہ فرمائیں) اس مرحلے پر احرار زعماء نے لیگی رہنماؤں کی عیّاری اور چالاکی کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ احرار غریب کیا کرتے، دِل برداشتہ ہو کر جلسے سے اُٹھ آئے۔ آتے ہی مسٹر جناح کی خدمت میں اس صورتِ حال کی تفصیل لکھ بھیجی۔ مسٹر جناح اس خط کے ملتے ہی لاہور تشریف لے آئے۔ احرار زعماء سے دفترِ احرار میں آکر ملے۔ انہیں اپنے ساتھیوں کی اس طفلانہ حرکت اور نامناسب کارگذاری پر بڑا دکھ ہوا۔ وہ احرار کے دفتر سے یہ فرماتے ہوئے اُٹھے کہ "میں ان لوگوں سے ابھی دریافت کرتا ہوں کہ انہوں نے ابتداء ہی میں ایسی بدمزگی کیوں پیدا کی"؟ دوسرے دن مسٹر جناح پھر تشریف لائے۔ ملاقات ہوئی، تو وہ فرمانے لگے کہ "میں چاہتا تھا کہ آپ بھی میرے ساتھی بنیں، مگر جب میرے اپنے بعض ساتھی آپ کے ساتھ نہ چل سکیں تو کیا کیا جائے! مجھے بہر حال یہ لوگ جیسے بھی ہیں انہی کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔"

آخری ملاقات رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کو ایک روز مسٹر جناح نے دہلی میں اپنی کوٹھی پر چائے کی دعوت دی۔ اُن دنوں جماعتی تنظیم کے سلسلہ میں دہلی میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ دعوت چونکہ صرف مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو دی گئی تھی، اس لئے میں ان کے ہمراہ نہ جا سکا۔ مولانا تنہا تشریف لے گئے۔ میں مولانا کی واپسی کا بیتابی سے انتظار کرتا رہا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ دو ذمہ دار لیڈروں نے قوم اور مُلک کی بہتری کے لئے کن لائنوں پر مبادلۂ خیال کیا ہے۔ موصوف کی کوٹھی سے مولانا نے واپس آکر بتایا کہ مسٹر جناح نے نہایت بے تکلفی اور خلوص سے باتیں کیں۔ مقصد ایک تھا مگر طریق کار میں اختلاف تھا۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد مسٹر جناح نے مولانا کو بازو سے پکڑ کر فرمایا کہ "مولانا میرا ساتھ دیجئے، پھر دیکھئے میں کیا کرتا ہوں"؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ "آپ نے مجھے بازو سے پکڑا ہے

آپ چھوڑ تو نہیں دیں گے؟ آپ کے موجودہ ساتھی ہمیں برداشت کر لیں گے؟ کہیں پھر شفیع لیگ کا مردہ زندہ نہ ہو جائے اور آپ اپنے ساتھیوں ہی کی وجہ سے دوسری اُلجھن میں پھنس جائیں۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں"۔

مولانا نے بتایا کہ یہ ساری گفتگو دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ مولانا واپس آنے لگے تو قائدِ پاکستان نے دوبارہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مگر اس کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ دوبارہ ملاقات کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ مسلم لیگ پر مسلط ٹوڈیوں اور سرمایہ داروں، لیگ کے دوسرے درجہ کے لیڈروں اور نچلی سطح کے کارکنوں نے ایسا معاندانہ رویّہ اختیار کیا اور اختلافات کی ایسی آندھیاں اُٹھائیں کہ پناہ بخدا۔ مجلس احرار اسلام اور مسلم لیگ میں تلخی بڑھ گئی۔ اختلافِ رائے نے مخالفت کی صورت اختیار کر لی اور منافرت کی خلیج ناقابلِ عبور ہو گئی تا آنکہ ؏

"اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا!"

احرار اور لیگ کے اتحاد کے بارہ میں یہ تفصیلی رپورٹ کسی مزید تبصرہ کی محتاج نہیں ہے۔ حقیقتِ حال کی وضاحت کے بعد یہ چیز کھل کر سامنے آگئی کہ:۔

۱: سر فضل حسین سے مایوس ہو کر پنجاب میں قدم جمانے کے لئے مسٹر جناح کو از خود احرار کے پاس آنا پڑا۔ جس پر احرار نے صرف محمد علی جناح کی آمد پر انہیں خوش آمدید ہی نہیں کہی بلکہ سر فضل حسین سے ٹکر لینے پر کمر بستہ ہو گئے۔

۲: احرار کی وساطت سے محمد علی جناح پنجاب ایسے خطے میں ایک عوامی رہنما کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے، جس نے آگے چل کر تشکیلِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ احرار نے چونکہ لیگ کو اپنا سیاسی حریف نہ سمجھا اسی لئے تو محمد علی جناح کے جلسہ کا انتظام خود سنبھالا۔ ورنہ سر فضل حسین کی طرف سے تعاون کے سلسلہ میں کلیتہً انکار ہو جانے کے بعد پنجاب میں لیگ بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ احرار کی

مسلم لیگ کے لئے اس قربانی کو سیاسی دنیا میں ایک ایسی سادگی سے تعبیر کیا جائے گا جو دوسروں کے لئے اپنی موت پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔

احرار کے اس تعاون پر اسے کیا ملا؟

(۱) مسٹر جناح نے لیگ میں وڈیروں اور زمینداروں کی شرارتوں کو واضح طور پر جاننے اور برکت علی ہال کے مشترکہ اجلاس کو سبوتاژ کرنے کی سازش کا علم رکھنے کے باوجود اپنے جماعتی کارکنوں سے کوئی باز پرس نہ کی، اور احرار کو جو جواب دیا وہ آپ پڑھ آئے ہیں۔

(۲) احرار، مسٹر جناح کی خاطر پنجاب کے سیاسی شاطر، فرنگی کے خاص مہرے اور منتقم مزاج زمیندار سر فضل حسین سے ٹکر لے چکے تھے۔ انہیں آزمائشی دور میں جناح بھی چھوڑ گئے، مگر فضل حسین احرار سے سیاسی انتقام لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہا۔ احرار سیاسی داؤ پیچ کو شاید مذہباً گناہ کبیرہ سمجھتے تھے، اس لئے فضل حسین کی طرف سے بے نیاز ہو گئے۔ جس نے بالآخر جناح سے تعاون کی پاداش میں شہید گنج کا ایسا ملبہ گرایا جسے احرار نہ اٹھا سکے اور ایک ایسی فعال سیاسی تحریک جو ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی تھی، صرف سات سال کے اندر اندر گہری سازش کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ تھی وہ قیمت جو احرار نے مسٹر جناح سے تعاون کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کی۔

(۳) احرار پر جب شہید گنج کا ملبہ گرایا گیا تو ملبہ اٹھانے کے لئے احرار اکیلے رہ گئے۔ خود مولانا ظفر علی خاں مخالفوں کی صف میں چلے گئے۔ مسٹر جناح اس وقت مسلمانوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے میں شب و روز مصروف تھے۔

احرار نے اس ہزیمت کا متواتر تین سال تک بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کہاں ہزاروں اور لاکھوں کے اجتماعات اور کہاں چند افراد کی ٹولی۔ غرض انہوں نے اپنا مشن

کسی صورت نہ چھوڑا، اور اپنے متعین راستے پر ڈٹے رہے۔ تا آنکہ مسلم لیگ نے لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا ریزولیوشن پاس کیا جس سے ہند کے مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین مل گیا۔

مسلم لیگ کے قرار دادِ لاہور پیش کرنے کے بعد مسلمانانِ ہند کو اپنی منزلِ مقصود کا واضح طور پر پتہ چل گیا۔ اور یہی وہ تاریخی اعلان ہے جسے ہندوؤں کے بلے جا پروپیگنڈہ اور زہریلی فضا نے بالآخر پاکستان کی صورت میں متشکل کر دیا۔ لیگ کی تاریخ میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا دن TURNING POINT ثابت ہوا۔ لیگ کی عظمت کا دور در اصل اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

(۱) ہند میں مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں موجود تھیں ان میں اکثر جماعتیں علاقائی تھیں۔ لیگ کے علاوہ کوئی مسلم جماعت ملک گیر حیثیت کی حامل نہیں تھی۔

(۲) مسلمان سیاسی جماعتوں کے قائدین کی اکثریت مذہبی قسم کے حضرات پر مشتمل تھی۔ جو آئینی موشگافیوں سے کوسوں دُور تھے نیز ان کی سیاست جذبات پر مشتمل تھی، جبکہ لیگی سیاست کا دار و مدار آئینی طرز کی جنگ پر تھا۔

(۳) مسلم سیاسی جماعتوں میں لیگ واحد جماعت ہے جس کے تعلّقات انگریز حکمرانوں سے اچھے رہے۔ نیز لیگی قیادت نے ہمیشہ انگریزوں سے تعلّقات کو معمول پر رکھنے کی انتہائی کوشش کی اور آخر وقت تک رابطہ برقرار رکھا جبکہ دیگر مسلم جماعتوں نے انگریزوں سے تعلّقات کو بگاڑنے میں ہی آزادیٔ ہند کی منزل کو قریب سمجھا اور آخر وقت تک انگریزوں سے مصالحت کو کسی قیمت پر قبول نہ کیا۔

(۴) لیگ کے علاوہ دوسری مسلم جماعتیں اپنی بقا کے لئے کوئی واضح لائحہ عمل تجویز نہ کر سکیں جو مسلمانانِ ہند کو اپیل کر سکتا۔ چنانچہ خاکسار تحریک کے پاس مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے جذبۂ جہاد اور عسکری نظام کی دعوت تھی۔ احرار نے قرار دادِ لاہور

کے تین سال بعد اپریل ۱۹۴۳ء میں حکومتِ الٰہیہ کا تصوّر پیش کیا مگر حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کسی مخصوص جگہ کا تعیّن کیا گیا اور نہ اس کے لئے کوئی طریقِ کار وضع کیا گیا۔ انجام کار یہ تجویز مسلمانوں کی توجہ مبذول نہ کرا سکی اور اپنا دم توڑ گئی۔

(۵) لیگ کی عظمت اور پاکستان کے قیام میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کو بڑا دخل حاصل ہے۔ انکے آہنی عزم، پختہ ارادے اور فولادی قوتِ عمل کے سامنے ہنود کی سازش اور گاندھی کے مکر و فریب کا داؤ نہ چل سکا۔ تحریکِ پاکستان، قائداعظم کی شخصیت کا سہارا لے کر آگے بڑھتی رہی جو پاکستان کی صورت میں منتج ہوئی۔

(۶) جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے بعد نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاست ماند پڑ گئی اور اس طرح ہند کی سیاسی صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی۔ اب مسلم لیگ کی راہ میں روڑا اٹکانے کے لئے کوئی جماعت موجود نہ تھی۔ احرار نے اپنی قرارداد حکومتِ الٰہیہ میں واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ "گو مجلس موجودہ وقت میں حکومتِ برطانیہ سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتی اور اپنی قسمت کو اللہ کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے، پھر بھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگرس کے سمجھوتے کی راہ میں سنگِ گراں بننے کی کوشش کرنا، بلکہ وہ ان کو روکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ان حالات میں وہ سمجھوتہ کی علیحدہ کوشش کر کے مسلمانوں میں باہمی خلفشار کو ہوا دینا نامناسب سمجھتی ہے اور واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جو کوئی سمجھوتہ چاہتا ہے وہ بیشک مسلم لیگ سے اور جس جماعت سے چاہے باتیں کرے لیکن وہ مجلسِ احرار سے امید نہ رکھے کہ وہ ایسے مخمصوں میں پھنس کر مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا دروازہ کھولے گی۔"[1]

ان حالات میں اب لیگ کے مقابل مسلمانوں کی کوئی نمائندہ جماعت موجود نہیں تھی

---

[1] روداد اجتماع سہارنپور، شائع کردہ مجلس احرار اسلام پاکستان صفحہ ۷-۸

اب اُسے صرف کانگرس سے تقسیم کے فارمولے پر بات کرنا تھی اور بس۔

⑦ مسلم لیگ نے ۴۶ء کے انتخابات میں اپنی نمائندہ حیثیت کو بھی منوالیا، جب اُسے ۴۹۲ سیٹوں میں سے ۴۲۸ سیٹیں حاصل ہوگئیں۔ یہ انتخابات لیگ نے ایک علیحدہ مملکت کے اصول یعنی پاکستان کے قیام پر لڑے تھے جس میں اُسے زبردست کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس عظیم الشان کامیابی کے بعد انگریز اور کانگریس کے پاس تقسیم برصغیر کے فارمولے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔

تقسیمِ ملک سے قبل مختلف صوبوں کی تقسیم کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا، خصوصاً پنجاب کی تقسیم پر ملک بھر میں ایک سیاسی بحث چل پڑی۔ احرار اس بحث میں پیش پیش تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پنجاب کو ہرگز تقسیم نہ کیا جائے۔ وہ کانگریس کو اُسے "قومی تحریک" کے کردار پر از سرِ نو غور کرنے کی ترغیب دیتے کہ کانگریس جو تقسیم ملک کے خلاف ہے، تقسیمِ پنجاب پر کیسے راضی ہوگئی۔ کانگریس کا یہ دوغلا کردار احرار ایسی نیشنلسٹ تحریک کے لئے نہایت مایوس کن تھا۔ کانگریس کا تقسیمِ پنجاب پر اصرار، احرار کے لئے غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ اس کے رویّہ سے تنگ آکر تو احرار نیشنلسٹ ہونے کے باوجود جُداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر چکی تھی لیکن اُسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ سکھوں کی خوشنودی کے لئے تقسیمِ پنجاب پر اصرار کرے گی، مگر کانگریس کی مجلسِ عاملہ اس قسم کی قرارداد منظور کر چکی تھی۔ احرار کے نقطۂ نظر کے متعلق ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

اُنہیں دنوں جناح گاندھی مذاکرات ہوئے۔ جس میں جناح نے کہا کہ کانگریس مجھے لُولا لنگڑا پاکستان دینا چاہتی ہے۔ اس سے عام مسلمانوں نے یہی تاثر لیا کہ محمد علی جناح بھی تقسیمِ پنجاب کے مخالف ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا مجلس احرار کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس ۲۳ مارچ ۴۷ء کو مجلس کے مرکزی دفتر لاہور میں منعقد ہوا جس میں

عاملہ کے درجِ ذیل حضرات نے شرکت کی۔ امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، آغا شورش کاشمیری، نوابزادہ نصراللہ خاں، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، غازی محمد حسین سالار جیوش احرار، میاں محمد رفیق ایم ایل اے اور ان کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی شرکت کی جسمیں ملک کے حالات کا صحیح تجزیہ کیا گیا اور ایک قرارداد کے ذریعہ کانگریس کی تقسیم پنجاب کی قرارداد کی سخت مخالفت کی گئی اور مسلم لیگ اور دیگر مسلم جماعتوں کے ساتھ متفقہ طور پر کانگریس کی قرارداد کے خلاف محاذ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا مجلس احرار کے فیصلے کے بنیادی نکات یہ تھے۔

(۱) کانگریس پر ہندو فسطائیت نے سردار پٹیل کی راہنمائی میں غلبہ حاصل کر لیا ہے، اور اُس نے اپنا قومی کردار بدل کر، انتقالِ اختیارات کے مرحلہ پر ہندومت کے تسلّط کی جدوجہد شروع کی ہوئی ہے۔

(۲) پنجاب میں فسادات کا جو ہنگامہ برپا ہوا، اس کے پس منظر میں بھی متذکرہ صدر خواہش مضمر ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو جو اس صوبے کی اکثریت ہیں، اُن کے جائز حق سے محروم رکھنے کے لئے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت مرعوب کرنا چاہا، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم پنجاب کا فیصلہ کر کے ان کے جنگجویانہ اقدام کی تائید کر دی جو یقیناً مسلمان عوام کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

(۳) مجلس احرار، ہندو فسطائیت کے مہیا کردہ شواہد و نظائر کی روشنی میں مسلمانوں کے باہمی سیاسی اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے مستقبل میں ملتِ اسلامیہ کی بقا کے لئے متحد ہو جانے کی خواہش مند ہے، اور ہندوستان میں مسلمانوں کو جو مشترکہ خطرہ درپیش ہے اس کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے مشترکہ محاذ کا اعلان کرتی ہے۔

④ مجلسِ احرار نے جدوجہدِ آزادی میں ہمیشہ وطنِ عزیز کے استخلاص اور ملت کی سربلندی کو ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن اس وقت کہ تیسری طاقت ہندوستان کی تصویر سے نکل رہی ہے، مسلمانوں کے حقوقِ استقلال کا مسئلہ اہم ترین ہے۔

⑤ تقسیمِ پنجاب کا نظریہ ناقابلِ قبول ہے۔ اور مجلسِ احرار اس کی مزاحمت کیلئے عام مسلمانوں سے ہم آہنگ ہو کر ہر ممکن قربانی و ایثار کے لئے آمادہ ہے۔[1]

احرار کی اس قرارداد اور واضح اعلان کے بعد ہندو پریس نے وہ طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا جو اُس نے لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کے بعد اُٹھایا تھا۔ جسے اس کے روایتی ذہن نے بالآخر پاکستان کی صورت میں دنیا کے جغرافیہ پر ثبت کر دیا۔ بعینہٖ کانگریس نے احرار کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے خلاف بھی پرانی روش اختیار کی۔ نمونہ کے طور پر ہندو پریس کے چند تراشے ملاحظہ فرمائیے۔

۱ : روزنامہ "پرتاپ" نے مجلسِ احرار ختم "مسلم لیگ میں جذب ہو جائے گی" کے عنوان کے تحت یہ شذرہ سپردِ قلم کیا۔

لاہور۔ ۲۴ مارچ۔ آل انڈیا مجلس احرار جو گذشتہ کچھ عرصہ سے قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے درمیان لٹک رہی تھی، آخر آج اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئی ہے۔ اس کی ورکنگ کمیٹی نے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صدارت میں ایک طویل ریزولیوشن پاس کیا ہے جس میں ملک میں فسادات کی ذمہ داری — "فاشسٹ کانگریس لیڈر شپ" پر ڈال کر کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور تمام مسلم جماعتوں کے درمیان اتحاد کا ڈھونگ رچاتے ہوئے عملی طور پر اپنی جماعت کو مسلم لیگ میں جذب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

---

[1] احرار کا تازہ فیصلہ۔ روزنامہ آزاد صہ ۳، ۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء

ب : "بندے ماترم" "مجلس احرار بھی لڑھک گئی" کے زیرِ عنوان رقم طراز ہے :۔
"بالآخر پاکستان کی حمایت کا اعلان ۔ فسادات کی ذمہ داری کانگریس پر بھتوپی ۔
کانگریس سے تعاون کی پالیسی ختم ۔ تقسیمِ پنجاب کی مخالفت ۔"

ج : "ٹریبون" لکھتا ہے کہ "احرار کانگریس سے ناراض ہو گئے ۔"

د : "پربھارت" نے احرار کی پالیسی پر یوں تنقید کی :۔
۱ : تقسیمِ پنجاب کی تجویز پر احرار والے بھڑک اُٹھے ۔
۲ : کانگریس کے خلاف لیگیوں کی سی باتیں ۔
۳ : ان کی ورکنگ کمیٹی کا نیا رنگ ۔ نواکھلی کے فسادات کرانے کا الزام بھی کانگریس کے سر بھتوپ دیا ۔

ہ : "تیجے ہند" نے بعنوان "کانگریس کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا" یہ لکھا کہ :۔
۱ : مجلس احرار نے کانگریس سے علیحدگی کا بہانہ تراش لیا ۔ ہر جگہ فسادات کی ذمہ دار کانگریس ہے ۔
۲ : کانگریس پر فاشسٹ ہونے کا الزام ۔ تقسیمِ پنجاب کی مخالفت کرنے کا تہیہ ۔ مجلس احرار دیگر مسلم جماعتوں سے مل کر پروگرام مرتب کرے گی ۔

س : "اجیت" ۔ قوم پرست احرار اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئے ۔ کانگریس سے تمام تعلقات منقطع کر لئے [1]

تقسیمِ پنجاب کے مسئلے پر مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ محاذ بنانے پر ، ہندو پریس نے احرار کے خلاف جو چیخ و پکار کی ، آپ نے ملاحظہ فرمالی ۔ اس مقام پر احرار ، لیگ کے ساتھ دوش بدوش ہو کر پاکستان کی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ احرار ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے

---

[1] "ہمارا فیصلہ اور ہندو اخبار" ۔ روزنامہ "آزاد" لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء ص ۳

یعنی ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جُداگانہ نیابت کی افادیت کے قائل ہو چکے تھے اور انہوں نے ہر سطح پر مسلمانوں کو ہندوؤں سے سیاسی اور اقتصادی طور پر نجات دلانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس لئے اسی وقت سے احرار اور لیگ میں ہم آہنگی کا دور چل نکلا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں احرار اور جناح کی باہمی ملاقاتوں کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ اگرچہ مذاکرات کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے تاہم باہمی شناسائی اور تعلقات پُرسکون رہے۔ لیگ کی قرارداد لاہور کے بعد احرار نے سیاسی طور پر لیگ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اگرچہ احرار نے اپریل ۱۹۴۳ء میں حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد منظور کی تھی تاہم وہ بڑی احتیاط کے ساتھ تیار کی گئی تھی۔ جس میں لیگ کے بالمقابل آنے کی بجائے پہلو سے نکل جانے میں عافیت سمجھی گئی اور واضح طور پر کہہ دیا کہ ہم لیگ و کانگریس کے باہمی سمجھوتے میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔

اب احرار کے اس تازہ فیصلے اور اس پر ہندو اخبارات کے تبصروں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ احرار لیڈروں نے پنجاب کی تقسیم کے خلاف پنجاب کے گوشہ گوشہ میں کانگریس کی سازش کو بے نقاب کیا۔ مسلمانوں کو باہمی اتحاد کی تلقین کی۔ یہاں مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جسے روزنامہ "ڈان" دہلی نے ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء بروز اتوار اپنے نامہ نگار متعینہ دہلی کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔

DELHI AHRARS ENDORSE LAHORE RESOLUTION.

By "DAWN" staff reporter.

The illusory veil of Congress nationalism has been lifted and that body now stands exposed as a Hindu

Fascist organisation. The All-India Majlis-e-Ahrar has therefore decided to co-operate with the only Muslim national organisation, the Muslim league, to safeguard the Muslim nation of India, said Qazi Ahsan Ahmed, Ahrar leader at a largely attended meeting of the Delhi Provincial Majlis-e-Ahrar held in Jama Masjid on Friday.

The meeting was held to endorse the decision taken by the working committee and the Council of All India Majlis-e-Ahrar recently in Lahore, severing connection with the Congress.

The Ahrar leader in the course of his speech severly criticised the Congress policy in the Punjab. "But we have decided to put an end to the Congress game," he went on to say "We now form a united Muslim national front against

the Facist policy of the Congress. We are only waiting for the final decision of Qaid-e-Azam Mr. Jinnah on the question of partition of the Panjab.

ترجمہ:-

مسلمانانِ دہلی کی طرف سے احرار کی قراردادِ لاہور کی توثیق

(سٹاف رپورٹر) کانگریس کی جھوٹی قوم پرستی کا پردہ چاک ہو چکا ہے اور وہ ہندو فسطائیت کے روپ میں سامنے آچکی ہے۔ آل انڈیا مجلس احرار اسلام نے اب صرف مسلمانوں کی واحد قومی تنظیم مسلم لیگ سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ہند کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ یہ الفاظ احرار لیڈر قاضی احسان احمد نے جامع مسجد دہلی کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہے۔

یہ اجلاس آل انڈیا مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی کے حالیہ فیصلہ لاہور کی تائید میں منعقد ہوا، جس سے کانگریس کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔

احرار لیڈر نے دورانِ تقریر، کانگریس کی تقسیمِ پنجاب ——— کی پالیسی پر سختی سے تنقید کی۔ انہوں نے دورانِ تقریر زوردار الفاظ میں اعلان کیا کہ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس کے کھیل کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اب ہم کانگریس کی فسطائیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ مسلم محاذ کی تشکیل کریں گے۔ اب ہم پنجاب کی تقسیم کے مسئلہ پر صرف قائداعظم محمد علی جناح کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے تقسیمِ ہند کے منصوبے کے تحت مسلم لیگ نے دیگر صوبوں کے ساتھ کانگریس کی عاملہ کی قرارداد کے مطابق پنجاب کی تقسیم پر صاد کر دیا۔ لیگ کا یہ فیصلہ اس قدر اچانک تھا کہ سب حیران و ششدر رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ بہرحال پنجاب کی تقسیم کو ہم ایک

بہت بڑا المیہ سمجھتے ہیں اور ہزاروں تاویلوں کے باوجود قائداعظم محمد علی جناح کی ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تصور کرتے ہیں جس کا خمیازہ پچیس سال گذرنے کے بعد تین زبردست جنگوں اور ہزاروں جھڑپوں کی صورت میں بھگت رہے ہیں اور نامعلوم آئندہ نسلیں کب تک اس ناکردہ گناہ کی سزا بھگتتی رہیں گی، اِلّا یہ کہ کوئی اور قائداعظم پیدا ہو جو پاکستان کے مغربی حصّہ کی موجودہ ناقابلِ عمل اور ناقابلِ قبول سرحدات کو ختم کر کے متحدہ پنجاب کی سرحدوں کی از سرِ نو حد بندی کرے۔

پاکستان بن گیا۔ اس کی خاطر کس قدر خون بہا، کتنی جانیں تلف ہوئیں، کتنی عصمتیں تار تار ہوئیں، کتنے گھر اجڑے، کتنی بستیاں برباد ہوئیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس کی بقا و تعمیر کے مسائل درپیش تھے۔ مجلسِ احرار اسلام کے لیڈروں کی اکثریت نے پاکستان کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔ تقسیمِ برصغیر سے قبل آزادی و استخلاصِ وطن کے سلسلہ میں احرار کی پالیسی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ قدرتی طور پر مسلم لیگ سے دو مرتبہ احرار کی بات چیت ہو چکی تھی اور تعاون و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مشترکہ لائحہ عمل تجویز کیا جا چکا تھا۔ مگر تاریخ کے طالب علم کو اس حقیقت سے انکار کی مجال نہیں کہ دونوں مرتبہ لیگ نے پرواہ نہ کی اور احرار کی پیش کش پر کان نہ دھرا۔ بایں ہمہ احرار نے اپنی طرف سے تشکیلِ پاکستان سے قبل تعاون کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کانگریس سے احرار اپنا تعلق ۱۹۳۱ء سے ہی ختم کر چکے تھے۔ ان سے ملنے اور راہ و رسم بڑھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ البتہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بالآخر ہندوستان جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ احرار کے دیگر زعماء جن میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، جناب شیخ حسام الدین، جناب ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا مظہر علی اظہر، جناب آغا شورش کاشمیری، جناب مرزا غلام نبی جانباز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، نے پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان حضرات نے اپنا

آئندہ عزائم اور پروگرام کی تشکیلِ نو کے لئے مختلف اوقات میں باہمی صلاح و مشورہ جاری رکھا۔ انہی دنوں ہندوستان نے بعض مسلمان ریاستوں (خصوصاً حیدرآباد دکن، جوناگڑھ وغیرہ) پر فوج کشی کر کے زبردستی قبضہ جما لیا۔ انہی ایام میں قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ پاکستانی قوم پر دو طرفہ مصیبت نازل ہو گئی۔ تاہم لیاقت علی خاں کا وجود مسلمانانِ پاکستان کے لئے ایک بڑا سہارا تھا، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان نے پاکستان کو چین سے نہ بیٹھنے دیا بلکہ کشمیر کا محاذ کھول دیا۔ ابتدائی جنگ ہوئی جس میں فتوحات ہوئیں۔ آخر کار جنگ بند ہوئی اور کشمیر دو حصّوں میں منقسم ہو کر رہ گیا۔ سرینگر اور جموّں کا کثیر حصّہ ہندوستان کے قبضہ میں چلا گیا اور کچھ حصّہ آزاد کشمیر کی صورت میں پاکستان کے ساتھ موجود ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ وہ ایام تھے جنہیں انتہائی نازک (CRITICAL) کہا جا سکتا ہے مسلمانوں کی بدنصیبی کا دور یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس نوزائیدہ مملکت کے سامنے خارجی مصائب کے علاوہ داخلی طور پر بھی افراتفری اور انتشار کا دور شروع ہو چکا تھا۔ مرکز و صوبوں میں مسلم لیگ کے نوزائیدہ بچّے جو ابھی تک شاید سنِ بلوغت کو نہیں پہنچے تھے، مگر اقتدار پر فائز ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انکی اس اندرونی کشاکش نے ملّتِ اسلامیہ کے دردمند عناصر کو ایک بار پھر چونکا کر رکھ دیا کہ کہیں خدانخواستہ اس عظیم مملکت کو جسے بیشمار قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا ہے، اقتدار کی رسہ کشی کی نذر نہ کر دیا جائے اور یوں پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد احرار لیڈروں نے بارہا اعلان کیا کہ اب مسلم لیگ سے ان کے اختلافات ختم ہو چکے ہیں، اس لئے مسلم لیگ سے استحکامِ ملک و ملّت کے نام پر بھرپور تعاون کیا جائے گا چنانچہ نوابزادہ نصر اللہ خان جنرل سیکرٹری مجلسِ احرارِ اسلام نے اپنے ایک بیان میں کہا:۔

"ملک کی تقسیم کے بعد اب مسلم لیگ سے ہمارے اختلافات ختم ہو گئے ہیں اب

مسلم لیگ اور احرار دونوں جماعتیں استحکامِ پاکستان کو ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ اور احرار کے بنیادی مقاصد میں وقت نے یگانگت اور یکرنگی پیدا کر دی ہے۔[۱]

رئیس الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا:۔

"لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہو چکی۔ اس وقت لیگ قوتِ حاکمہ ہے۔ عام مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کر لیا ہے۔ میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں اور اس کیلئے عملی قدم اُٹھانا چاہیئے۔ مجلسِ احرار کو ہر نیک کام میں حکومتِ پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔"[۲]

جناب ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلسِ احرار پاکستان کا درجِ ذیل بیان قابل ہے۔ انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان کے پہلے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ماضی کی تلخیوں کو بھول جائیے اور ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں یہ بات صفائی سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ماضی میں ہم آپس میں اُلجھے رہے ہیں اور رائے کا اختلاف رہا ہے۔ اُس وقت دو مختلف جماعتیں تھیں ہر ایک نے اپنی رائے قائم رکھی۔ ہم نے مسلمانوں کی فلاح کے لئے اپنا نظریہ

---

[۱] ہفت روزہ تنظیمِ اہل السنّت، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء
[۲] 〃 〃 〃 〃 〃 ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

بحوالہ روزنامہ "آزاد"، لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۴۹ء، ص ۲

[illegible]

ایک اور مقام پر شاہ جی نے [illegible]

تقسیم سے پہلے ایک مسلم لیگی نے [illegible]

؎ [illegible] ہفت روزہ تنظیم اہلِ سنت ۱۳ جنوری [illegible]

ایک سیاسی مسئلہ کا اختلاف تھا، رائے کی ٹکر تھی۔ برادری کے دو بھائیوں کے درمیان ایک سوال پر بحث تھی۔ میں نے تو شاہ جہان کی مسجد میں لاکھوں مسلمانوں کے سامنے قائد اعظم کے جوتوں پر سفید داڑھی رکھی اور کہا۔ میری ٹوپی لے جا کر ان کے قدموں میں رکھ دو کہ شاید ان تک میری رسائی ہو سکے مگر آہ ؎

خلوت میں اُسے بار ہے، کیونکر ملئے
جلوت میں اُسے عار ہے، کیونکر ملئے

میرے دل میں چند خدشات تھے جن کے لئے وقت کی سیاسی فضا کوئی اطمینان بہم نہ پہنچا سکی اور قائد اعظم کی بارگاہ تک رسائی نہ ہو سکی۔ بہر حال قوم نے فیصلہ کر دیا اور جس دیانتداری سے ہم نے اختلاف کیا تھا اُسی دیانتداری سے برادری کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اب یہ ملک میرا ہے، اور میں اس کا وفادار شہری۔ جنہوں نے جانا تھا وہ جا چکے، میں یہاں ہوں اور یہیں رہوں گا یہاں تو میری جنگ کا اختتام ہے اور وہاں جاؤں تو ابھی میری جنگ کا آغاز ہے۔"[1]

یہ دردمند عناصر جنہوں نے قبل ازیں بارہا لیگ کی طرف صرف اس لئے دستِ تعاون بڑھایا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جمہوری طریق پر اُسے اپنا ماویٰ و ملجا سمجھ لیا تھا اور سیاسی طور پر اپنا مقتدا و پیشوا مان لیا تھا اور ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، اس لئے لیگ کے ہاتھ مضبوط کریں تاکہ آئندہ تعمیر ملک میں بھرپور حصہ لیا جائے اس عنصر نے اب کی بار پھر ان تمام سنگین حالات کو سامنے رکھ کر ایک دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس بُلائی۔ اس عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد احرار پارک باغ دہلی دروازہ لاہور میں، ۱۲، ۱۳، ۱۴ر جنوری، بدھ، جمعرات، جمعہ ۱۹۴۹ء کو ہوا۔ جس میں کراچی سے لے کر درۂ خیبر تک کے احرار رہنماؤں، رضاکاروں اور ملت کے بہی خواہوں نے شرکت کی۔ کانفرنس سے

[1] روزنامہ "آزاد" لاہور ۱۴ر نومبر ۴۹ء ص ۱

دو روز قبل احرار کی مجلسِ عاملہ نے اپنی بنیادی پالیسی کے تغیر اور دیگر اہم امور پر کئی قرار دادیں بحث و تمحیص کے بعد پاس کیں۔ پھر یہ قرار دادیں احرار کی مجلسِ مشاورت کے روبرو تائید کے لئے پیش ہوئیں۔ ازاں بعد کانفرنس کے اجلاسوں میں عوام کے سامنے رکھ کر عام منظوری حاصل کی گئی۔ مجلسِ مشاورت قریباً پانچ سو نمائندوں پر مشتمل تھی، نیز مختلف اضلاع کی جماعتوں کے صدر و سیکرٹری اور جیوش کے سالار صاحبان موجود تھے۔

احرار کی اس دفاعی کانفرنس میں ملک کے داخلی و خارجی معاملات پر مختلف قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جن میں اہم قرار داد جو کانفرنس کا بنیادی مقصد ظاہر کرتی ہے آخری اجلاس میں جناب شیخ حسام الدین صاحب سیکرٹری مجلس احرار اسلام پاکستان نے پیش کی اور تائید کے لئے احرار کے صدر امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک ایمان افروز تقریر فرمائی۔ قرار داد کے الفاظ یہ تھے:۔

"اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ تقسیمِ ہند کے نتیجہ کے طور پر ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی ترقی و فارغ البالی پاکستان کی قوت اور استحکام میں ہی مضمر ہے، نیز بین الاقوامی سیاسیات میں استعمار پرست قوتوں اور دہریت نواز ڈکٹیٹرشپ کے درمیان عالمگیر اقتدار اور تسلط حاصل کرنے کے لئے امریکہ اور برطانیہ ایک طرف اور روس دوسری طرف دنیا کے گوشے گوشے سے کمزور اور پسماندہ اقوام اور دُوَل اپنے اپنے دھڑے میں شامل کرنے کے لئے، ہر قسم کی حیلہ جوئی، لالچ اور دباؤ سے انسانیت کو پھر ایک دفعہ ناقابلِ تصور تباہی و ہلاکت کا شکار بنا رہے ہیں۔ بالخصوص جمعیتِ اقوام کے پردہ میں یہودی وطن کی تخلیق، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں اقتصادی تحفظات کے نام پر ترکی، ایران، عراق، شرقِ اردن، سعودی عرب، فلسطین، یمن، شام، مصر سوڈان اور انڈونیشیا وغیرہ اسلامی ممالک کی آزادی، امن اور ترقی کو

برابر قربان کیا جارہا ہے۔ سفید فام اقوام نسلی برتری اور سیاسی اجارہ داری کے تحفظ و بقا کے لئے جس منظم طریق سے انگریزی زبان بولنے والی قوموں اور مغربی و یورپی اقوام وغیرہ نعروں کے فریب سے انسانیت سوز عزائم کو پورا کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ یقیناً ملّتِ اسلامیہ کی سلامتی اور عالمگیر امن کی خواہش رکھنے والے افراد اور گروہ اس صورتِ حال کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"بنا بریں دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ایسے نازک ترین وقت میں اسلامیانِ پاکستان بہت حد تک اس زہر کا تریاق پیدا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ملّت کی راہنمائی اور ترقی کے لئے، ان کی داخلی سیاست کو ہر قسم کی سیاسی گروہ بندیوں سے آزاد کر کے ایک ہی مشترکہ پلیٹ فارم کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ اس سے جہاں ایک طرف ملّتِ اسلامیہ کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے وہاں پاکستانیوں میں صحیح اور سنجیدہ شعور کے پیدا کرنے کی راہیں بھی کھل جائیں گی اور کم سے کم مدّت میں قوم میں ضبط و نظم اور خود اعتمادی کی خصوصیات پیدا ہو سکیں گی۔"

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلسِ احرار کے مقاصد میں مذہبی سربلندی کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی از بس شامل تھی جو پاکستان کے قیام کے بعد سیاسی طور پر اب پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا دفاع پاکستان احرار کانفرنس کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا ملّی فرض سمجھتی ہے کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد رسومات کو درست رکھنے خصوصاً مسئلہ ختم نبوت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے تبلیغی

سرگرمیوں تک محدود رکھے گی۔ جو اراکین و ہمدردانِ احرار زمانۂ حال کے موافق میں ہی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں، وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے روایتی اخلاص اور عملی انہماک سے ملک و ملّت کی خدمت میں حصّہ دار بن سکتے ہیں[1]"

اس قرار داد کو پیش کرتے وقت مرحوم شیخ حسام الدّین کی آواز بھرّا گئی اور اُنہوں نے نہایت رقّت آمیز الفاظ میں فرمایا:۔

"ہم نے انگریز کے خلاف سول نافرمانی کی اور اپنے بچوں کو شروع ہی سے اس ڈھب پر تربیت دی کہ عدمِ تشدّد کچھ نہیں، ہم تشدّد کے قائل تھے۔ ہم PROGRESSIVE تھے، لیکن آج وہ بہادر بچّے جنہیں انگریز کا روپیہ، انگریز کا دباؤ مرعوب نہ کر سکا، جن کا ووٹ انگریز نہ چھین سکا جنکی بہادری کی انگریز نے تعریف کی، جو کبھی نعروں سے مرعوب نہ ہو سکے، ان بہادر بچّوں کو میں آج مسلم لیگ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ ان سے کام لے اور ملک میں ان کی ہڈیوں اور خون کی ضرورت پڑے تو کام لے۔ میرے یہ بہادر بچّے اپنے ملک کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں[2]"۔

شیخ حسام الدّین کے یہ الفاظ تاریخِ احرار میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں معلوم نہیں ان کے ذہن میں اُس وقت کس قدر حسین تصوّر تھا۔ شاید وہ حسین تصوّر جو اُس باپ کے ذہن میں موجود ہوتا ہے جب وہ اپنی جوان بیٹی کو رخصت کر رہا ہوتا ہے۔

اس طرح جانِ احرار حضرت سیّد بخاریؒ نے اس تاریخی قرار داد پر تقریر کرنے سے پہلے پنجاب کے طول و عرض سے آتے ہوئے جیوشِ احرار میں بطور انعام تلواریں تقسیم کیں اور

---

[1] روزنامہ آزاد، لاہور۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۹ء صفحہ ۲

[2] " " " " " صفحہ ۶

بعد میں اپنے ہزاروں باوردی رضاکاروں کو کھڑا کر کے جو حکم دیا، وہ تاریخِ احرار میں یادگار رہے گا۔ آپ نے فرمایا :-

"احرار رضاکارو! آج کے بعد تم احرار رضاکار نہیں رہے ـــــ جاؤ قومی رضاکاروں کی نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جاؤ۔ اب گلی کوچوں میں چپ و راست کا وقت نہیں رہا۔ فوجی ٹریننگ حاصل کر کے ملک و ملّت پر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مجلسِ احرار کا سرمایہ تم ہو۔ میری ساری کمائی تم ہو۔ میں تمہیں قوم کے سپرد کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ ہماری عمر بھر کی کمائی صحیح کام آئی۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

نوجوانو! کل صبح سے قومی رضاکاروں کی تنظیم میں شامل ہو جاؤ۔ فوجی وردی میں ملبوس ہو کر رائفل پکڑو اور دین و ملّت کی پاسبانی کے لئے جان قربان کرنے کی تربیت حاصل کرو"۔[1]

احرار تو دل و جان سے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں مشغول ہو گئے اور انہوں نے بہادری کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کر کے کُھلے دل کے ساتھ مسلم لیگ میں ادغام کا اعلان کر دیا۔ احرار کو جن بزرگوں سے روحانی تعلّق کے پیشِ نظر آج تک مطعون کیا جاتا رہا ہے انہوں نے بھی مختلف اوقات میں نہ صرف پاکستان کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کیا، بلکہ پاکستان کے استحکام کی خاطر اپنے متعلقین کو خصوصی ہدایات بھیجیں کہ وہ تعمیرِ پاکستان کی خاطر دلجمعی کے ساتھ کام کریں۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک استفسار کے جواب میں فرمایا :-

"تحریکِ پاکستان کی مخالفت ایسی ہی تھی جیسے کسی مسجد کی تعمیر سے پہلے مسجد

---

[1] روزنامہ "آزاد" لاہور ۲۸ ر نومبر ۱۹۴۹ء صہ ۲

تعمیر کرنے کی مخالفت کی جائے، لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر مخالفت کرنے والے بھی اس کی حفاظت کو فریضہ سمجھتے ہیں۔ اب پاکستان قائم ہو گیا ہے اس لئے اس کی بقاء اور استحکام کا فریضہ ہم سب پر عائد ہوتا ہے۔"

(یہ شیخ الاسلام نمبر)

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق میاں بشیر احمد سابق سفیر ترکی سے ایک روایت بحوالہ روزنامہ کوہستان" چند ماہ قبل شائع ہوئی ہے جس میں میاں بشیر نے کہا تھا کہ جب وہ ترکی میں پاکستان کے سفیر تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد وہاں دورہ پر تشریف لائے تو انہوں نے جناب ہمایوں بشیر صاحب سے علیحدگی میں یہ کہا کہ پاکستان کو ہر قیمت پر مستحکم و مضبوط بنایا جائے[1]۔

مجھے اس وقت سخت حیرت ہوتی ہے جب آج کے مسلم لیگ کے بعض دوست نما دشمن جنہیں برصغیر کی تاریخ سے ذرہ برابر مس نہیں ہے یا جنہوں نے متحدہ ہندوستان کی تاریخ کا اس زاویۂ نگاہ سے مطالعہ فرمانے کی زحمت تک گوارا نہیں کی، جب وہ احرار یا دوسری کسی نیشنلسٹ تحریک پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں: "یہ لوگ پاکستان کے دشمن تھے، نظریۂ پاکستان کے قائل نہیں تھے، کانگریس کے ایجنٹ تھے، ہندوؤں سے روپیہ لیتے تھے بھلا انہیں پاکستان سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ یہ لوگ محمد علی جناح کو قائداعظم بھی نہیں مانتے تھے نہ لکھتے تھے وغیرہ وغیرہ"۔ موجودہ کتاب ان تمام الزامات کے مکمل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں جوابات دینے کے لئے نہیں لکھی جا رہی ہے، نہ ہی یہ اس کا موضوع ہے۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ کتاب ہذا کا مطالعہ ایک طالب علم کی حیثیت سے غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے کیا گیا تو انشاء اللہ احرار کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ تاہم ہمیں ایک اور قرارداد کا ذکر ان سطور میں کرنا پڑ رہا ہے تاکہ مسلم لیگ کے غیر متعصب اذہان

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور مؤرخہ ۱۹ نومبر ۱۹۷۱ء

درج ذیل قرار داد کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھیں کہ احرار نے قائدِ اعظم کو کن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

احرار نے دفاعِ پاکستان کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پہلی قرار داد بابائے پاکستان کی رحلت پر منظور کی، جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ اجلاس حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بے وقت رحلت کو ملک و ملّت کا ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں ان کی راہنمائی اور سیاسی بصیرت، قومی ضبط و نظم کے لئے حد درجہ اہم اور ضروری تھی۔ یہ اجلاس حضرت قائدِ اعظم کی ہمشیرہ عزیزہ مس فاطمہ جناح سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"[1]

اس اقتباس کے ساتھ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی کابینہ کے وزیر خارجہ مسٹر ظفر اللہ خاں کا وہ طرزِ عمل سامنے رکھئے جو انہوں نے وفاتِ بانیٔ پاکستان پر قوم کے سامنے پیش کیا کہ "میں محمد علی جناح کا جنازہ اس لئے نہیں پڑھتا کہ میرا اُن کا عقیدہ کا اختلاف تھا۔ مجھے ایک کافر حکومت کا مسلمان ملازم سمجھئے یا ایک مسلمان حکومت کا کافر ملازم"[2] معلوم نہیں، کہ مسلم لیگیوں کو ظفر اللہ خاں کے ساتھ کس قدر قلبی لگاؤ تھا کہ وہ قادیانیوں کے طرزِ عمل کے شاکی نظر نہیں آتے، بلکہ ہمیشہ آزادی و حریت کی علمبردار جماعتوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ مسلم لیگ سے تعاون کی قرار داد پاس ہو جانے پر ملک بھر میں بے پایاں مسرت و انبساط کا اظہار کیا گیا۔ چنانچہ مسلم لیگی حلقوں کے علاوہ قومی پریس نے بھی شذرات سپردِ قلم کئے اور احرار قیادت کو موقع و محل کے مطابق پالیسی تبدیل کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

چنانچہ مغربی پنجاب کے اُس وقت کے وزیر اعلیٰ خان افتخار حسین ممدوٹ بنفسِ نفیس جیوشِ احرار کی سلامی لینے کے لئے تشریف لائے۔ پچاس ہزار احرار کے تربیت یافتہ

---

[1] روزنامہ "آزاد"، لاہور۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۹ء صہ ۲

[2] "الفلاح" پشاور، ۲۸ر اگست ۱۹۴۹ء۔ بحوالہ روزنامہ آزاد ۲۸ر نومبر ۱۹۴۹ء صہ ۲

رضا کاروں نے جس والہانہ انداز میں خان ممدوٹ کو سلامی دی اور جس جوش و خروش کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہی، یہ انہی کا حصّہ تھا۔ رضا کاروں کے مارچ پاسٹ کا منظر چاق و چوبند دستے اور بینڈ باجوں کے ساتھ ترانوں کی دُھن پر ممدوٹ صاحب کو سلامی پیش کی گئی تو حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے طمانیت و خوشی کا اظہار کیا۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے بھی لیگ کے ساتھ احرار کے تعاون پر مبارکباد کے تار بھیجے۔ مرکزی وزیرِ مواصلات جناب سردار عبدالرّب نشتر نے ان الفاظ کا اظہار کیا۔

کراچی - ۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ

مکرّمی! السلام علیکم، آپ کا گرامی نامہ مع جریدۂ "آزاد" مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء ملا۔ شکریہ! یہ امر موجبِ مسرّت ہے کہ آپ حضرات نے مسلم لیگ میں شمولیّت کا فیصلہ کیا ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اسلام و پاکستان کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

احقر العباد : عبدالرّب نشتر

احرار کے اس فیصلے پر مسلم لیگی قائدین نے جس خوشی کا اظہار کیا، اُسے ہم نقل کر چکے ہیں۔ اب درجِ ذیل سطور میں قومی پریس نے احرار کو اِس تاریخی فیصلے پر جو مبارکباد پیش کی اور احرار رہنماؤں کے خلوص پر جس قسم کی خوشی کا اظہار کیا اُسے قارئین ملاحظہ فرما کر یقیناً مسرّت کا اظہار کریں گے۔

روزنامہ اخبار "زمیندار"، روزنامہ اخبار "نوائے وقت"، روزنامہ اخبار "سفینہ" روزنامہ اخبار "غازی"، روزنامہ اخبار "احسان"، روزنامہ اخبار "غالب"، روزنامہ اخبار "انقلاب" نے شذرات قلمبند کئے، جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) "زمیندار" مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۴۹ء۔ بعنوان "مجلسِ احرار اور مسلم لیگ"

گذشتہ برس "زمیندار" میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں مجلس احرار کی سیاسی

طرزِ کار پر گفتگو کی گئی تھی۔ اس مقالے کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ حالات میں مجلسِ احرار کی سیاسی طور پر کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اس کا نصب العین آزادیٔ وطن تھا اور یہ مقصد قیامِ پاکستان سے پورا ہو چکا ہے۔ اب وہ وطن کے دفاع و تحفّظ کی حامی ہے تو یہ کام حکومت کر رہی ہے۔ لہٰذا اسے سیاسی طور پر اپنا وجود ختم کر دینا چاہیئے، تاکہ مسلمانوں میں افتراق کی آگ بھڑکنے نہ پائے۔ آج کل مجلسِ احرار کے لئے صرف تبلیغ و اصلاح کا کام باقی رہ گیا ہے۔ احرار دوست سیاسی معاملات میں تو مسلم لیگ کی اطاعت کریں، اور اپنی مجلسی سرگرمیاں تردیدِ مرزائیت کی راہ پر ڈال دیں، اس کام کے لئے وہی موزوں ہیں بعض احرار دوستوں نے انفرادی طور پر اس مشورے کا خیر مقدم کیا لیکن معاصر "آزاد" کو ہماری خدا لگتی باتوں سے اتنا رنج پہنچا کہ حقیقی مبحث کو چھوڑ کر گالیاں دینا شروع کر دیں، لیکن احرار دوستوں کا مجلسی دماغ صحیح ہے، یہ اور بات ہے کہ ذرا دیر فہم ہے، یا وہ "دیر آید درست آید" پر عمل کرتے ہیں چنانچہ "زمیندار" کا وہی مشورہ جس پر "آزاد" مضطرب ہوا تھا، ایک برس کے بعد مقبولیت کے کانوں سے سُنا گیا۔ اس اجمال کی تفصیل دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کی اس قرارداد میں ملاحظہ فرمایئے۔

"اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ تقسیمِ ہند کے بعد ملّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی ترقی اور فارغ البالی پاکستان کی قوّت اور استحکام ہی میں مضمر ہے نیز بین الاقوامی سیاسیات میں استعمار پرست قوتوں اور دہریت نواز ——— ڈکٹیٹر شپ کے درمیان عالمگیر اقتدار اور تسلّط حاصل کرنے کے لئے امریکہ اور برطانیہ ایک طرف اور روسی دوسری طرف اپنے اپنے دھڑے کو مضبوط کر رہے ہیں اور ترکی، ایران، عراق، شرق اردن، سعودی عرب، فلسطین، یمن، شام، مصر، سوڈان اور انڈونیشیا وغیرہ اسلامی ممالک کی آزادی کو قربان کیا جا رہا ہے۔ دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس اسی

نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس نازک ترین وقت میں داخلی سیاست کو ہر قسم کی سیاسی گروہ بندیوں سے آزاد کر دیا جائے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم کو مضبوط تر کیا جائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلسِ احرار کے مقاصد میں مذہبی سربلندی کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی از بس شامل تھی جو قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی طور پر پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا ورکنگ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ آئندہ سے مجلسِ احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد و رسوم کو درست رکھنے اور خصوصاً مسئلہ ختمِ نبوت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رکھے گی۔ جو اراکین و ہمدردانِ احرار زمانہ حال کے موافق سیاسی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے روایتی اخلاص اور عملِ انہماک سے ملک و ملت کی خدمت میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔"

ہر مسلمان اس قابلِ تحسین فیصلے کا خیر مقدم کرے گا۔ اس وقت احرار کو مسلم لیگ کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن مسلم لیگ کو احرار کی ضرورت ہے۔ ہمارا جماعتی نظام اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ اسے صحیح طور پر قابلِ عمل بنانے کے لئے نئی قوت کی ضرورت ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مغربی پنجاب کی مسلم لیگ جنگ کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی ہے۔ نہ اس نے قوم کی کوئی خدمت کی، نہ ملک ہی کا تقاضا پورا کیا۔ اس کے قالب میں صرف ہوسِ وزارت کی روح ناچتی رہی۔ پاکستان کے ابتدائی ایام میں اس مجلس کے صدر خان ممدوٹ تھے جو مسلم لیگ کو وزیرانہ اغراض کے تار پر نچاتے رہے۔ اس کے بعد صدارت کی گٹھڑی میاں افتخار الدین نے اٹھائی۔ میاں صاحب تجربہ کار لیڈر تو تھے لیکن ان کے سیاسی خیالات اتنے وسیع تھے کہ دماغ میں بھی نہ سما سکے۔ اس لئے وہ اپنا مقصد و عقیدہ خود بھی نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے کوئی کام کیا تو صرف یہ تھا کہ بے معنی سی وزارت حاصل کر لی اور وزارت کے میدان میں بھی زیادہ

دیر نہ ٹھہر سکے۔ اس کے بعد میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ صدر منتخب ہوئے۔ ان سے ہمیں بہترین توقعات تھیں لیکن وہ بھی میاں افتخارالدین کا ترقی یافتہ ایڈیشن ثابت ہو رہے ہیں۔ وہ جب سے کرسیٔ صدارت پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ وزارتی جھگڑوں کے سوا کسی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ وہی قرارداد ملامت کے جھگڑے ہیں، وہی ممبروں کو اپنے ڈھب پر لانے کی چالیں ہیں، وہی جوڑ توڑ ہیں، قوم اور مسلم لیگ کی پرواہ ہی نہیں خان ممدوٹ وزارت کو بچانے کے لئے فرائضِ حکمرانی فراموش کر رہے ہیں اور میاں دولتانہ وزارت توڑ دینے کے کام کو تمام قومی مصروفیتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ قوم کو اس اقتدار طلبی کی بھٹی کا ایندھن بنایا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ایسے عنصر کو مسلم لیگ میں لانے کی ضرورت ہے جو وزارتی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہ کر قوم کی خدمت کر سکے۔ موجودہ حالات میں یہ کام احرار کر سکتے ہیں۔ ان کے گذشتہ طرزِ عمل سے خواہ کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ عوام کی ذہنیت، عوام کی ضرورتیں اور عوام کے تقاضے سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ وہ عوام میں پیدا ہوئے، عمومی زندگی کے تمام مرحلوں سے گزرے اور عوام ہی کی راہنمائی کرتے رہے۔ تجربہ کے اعتبار سے ان کا درجہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایوانوں میں رہنے والے جھونپڑیوں میں رہنے والوں کی حالت کیا جانیں گے۔ اُن کی مصیبتوں کا اندازہ تو وہی لگا سکتا ہے جو خود غربت کی وادی میں رہا ہو۔ اس وقت مسلم لیگ کی قیادت و سیادت جن حضرات کو حاصل رہی ہے وہ محض دولت کی قوت سے لیڈر بن گئے۔ ایسے بہت کم حضرات ہیں جن کی عمومی زندگی سے مخلصانہ جدوجہد اور جوشِ عمل کی کوئی داستان وابستہ ہو۔ لہٰذا احرار کے شمول سے مسلم لیگ صحیح معنوں میں عمومی جماعت ہی نہیں بنے گی، بلکہ اس میں مخلصانہ اور نتیجہ خیز کام کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی۔

احرار اس فیصلے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے وقت و حالات ہی کا

تقاضا پورا نہیں کیا بلکہ اس الزام کی بھی تردید کر دی کہ مجلس احرار سوادِ اعظم سے دُور رہ کر دھونی مار رہی ہے۔ اب وہ بھی کام کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ وہ سیاسی بکھیڑوں میں اس درجہ اُلجھ کر رہ گئی تھی کہ مرزائیت کے لئے کوئی کام نہ کر سکی۔ اس تغافل کے باعث مرزائیت کے دبے ہوئے فتنے کو اُبھرنے کا موقع مل گیا۔ مرزائی ہر طرف چھا رہے ہیں۔ اب ہمیں اُمید ہے کہ مجلس کو مرزائیت کے خلاف یکسوئی سے جدّ و جہد کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مجلس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہو جائے گا۔ اس میں وہ تمام صحیح الخیال مسلمان بھی شامل ہو جائیں گے جو تردیدِ مرزائیت کی راہ میں تو اس کے ساتھ چلنا چاہتے تھے لیکن سیاسی اختلافات اُن کا رستہ روک لیتے تھے۔ اب چونکہ سیاسی جھگڑے نہیں رہے اس لئے کوئی مسلمان مجلس کی رُکنیت قبول کرتے ہوئے نہیں جھجکے گا۔

آخر میں ہم احرار دوستوں کو مبارک باد کہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ مجلس احرار کی عاملہ اور انتظامیہ بھی کانفرنس کے فیصلے کی تصدیق سے پس و پیش نہیں کرے گی۔

(۲) "خوش آمدید"

"نوائے وقت" کا شذرہ بعنوانِ بالا

ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ مجلسِ احرار اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیاں بند کر دے اور اس کے جو کارکن سیاسیات میں حصّہ لینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے ذریعہ قوم کی خدمت کریں۔ ہم اس فیصلے کا صدقِ دل کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ مسلمان اس خوشی میں ہمارے شریک ہیں۔

مجلسِ احرار مسلمانوں کی ایک پُرانی اور فعال جماعت ہے۔ اس جماعت سے ایک نہایت اہم سیاسی غلطی ہوئی جس نے مسلمانوں کو اس سے دُور کر دیا۔ لیکن اس جماعت کے کارکنوں کی ہمت اور کام کرنے کی صلاحیت سے کبھی کسی کو انکار نہیں ہوا۔ اب جبکہ مجلسِ احرار نے اپنی سیاسی حیثیت کو ختم کر دینے کا اعلان کیا ہے، مسلم لیگ کے پُرانے کارکنوں کو بڑی کُشادہ دلی

کے ساتھ احراری بھائیوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ جب مجلسِ احرار ہی نے اپنے ماضی کو دفن کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے تو مسلم لیگ کو بھی ماضی کی تلخ یاد بھلا دینی چاہیئے۔

مجلسِ احرار کے کارکن، فعال اور محنتی لوگ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلم لیگ میں انکی شرکت لیگ کو ایک نیا اور تازہ خون بخشے گی۔ لیگ کے غریب اور عوامی کارکنوں کو خاص طور پر احرار کے اس فیصلے پر خوشی ہونی چاہیئے۔ مسلم لیگ میں احرار کی شرکت غریب طبقہ کے ہاتھ مضبوط کریگی اور اس خطرے کا کہ کہیں لیگ جاگیرداروں لینڈ لارڈوں، انگریز کے پرانے کاسہ لیسوں اور سابق یونینسٹوں کے قبضہ میں نہ چلی جائے اور حصولِ اقتدار کے لئے ایک مشین بن کر نہ رہ جائے، کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے گا۔ (نوائے وقت ۱۷ر جنوری ۱۹۴۹ء)

(۳) "احرار کا مبارک فیصلہ"

روزنامہ "سفینہ" ۱۷ر جنوری ۱۹۴۹ء

مجلسِ احرار ہر پاکستانی کی طرف سے مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے مملکت اور قوم کی بھلائی کے لئے ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔ جس کی رُو سے ہر احراری، مسلم لیگ اور نیشنل گارڈ میں شامل ہو سکتا ہے۔ کشمیر اور دوسرے مسائل کے پیشِ نظر احرار نے بروقت اپنی سیاسی سرگرمیوں کو ملک اور قوم کے حوالے کر کے ایک شاندار مثال قائم کی ہے ورنہ آج کل اس امر کا امکان بھی تھا کہ کوئی نئی جماعت پرانی خرابیوں کو دُور کرنے کا پروگرام سامنے رکھ کر قائم بھی رہے اور پھلے پھولے بھی، لیکن محض اس خیال سے کہ اس سے بھی ایک حد تک اختلافات بڑھیں گے، احرار نے اپنا دامنِ عمل و فکر سمیٹ کر صرف تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کر لیا ہے۔ ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ جس طرح احرار نے سیاست کو دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے، اِسی طرح دوسری جماعتیں تبلیغی امور میں احرار کی دل کھول کر امداد کریں گی۔ حقیقتاً ابھی تبلیغ کے لئے بہت بڑا میدان ہے اور اگر احرار کے ساتھ دوسرے اہلِ نظر اور اہلِ استطاعت مسلمانوں نے اس فریضہ کا احساس کیا تو احرار کا دائرہ تبلیغ بیرونِ پاکستان تک پھیل کر بہت اچھے

نتائج پیدا کر سکے گا۔ ہم مجلسِ احرار کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اس مجلس کے ماتحت تجارتی امور کی نگرانی کا بندوبست بھی کرے۔ مسلمان ابھی اس میدان میں بھی اچھی طرح نہیں جمے، اور ہم جانتے ہیں کہ مجلسِ احرار میں اِس سُوجھ بُوجھ کے انسان شامل ہیں جو اس شعبہ میں بھی کافی کام کر سکتے ہیں۔

(۴) "مجلسِ احرار کی پیش کش"

روزنامہ "غازی" ۔ ۱۷ جنوری ۱۹۴۹ء

دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا آخری اجلاس ملّتِ پاکستان کے حضور میں اتحاد و تعاون کی ایک قابلِ قدر پیش کش چھوڑ کر ختم ہو گیا۔ جس مقصدِ عزیز کی خاطر مجلسِ احرار نے اپنا دائرہ عمل تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کر دیا اور جن اخلاص بھرے جذبات کے ساتھ احرار نے اسلام کی سربلندی اور پاکستان کی بقا و استحکام کے لئے یہ پیشکش کی وہ اسلام اور ملّتِ پاکستان کی ضروریات کا اہم ترین تقاضا تھا۔ ہمیں مجلسِ احرار کی گذشتہ زندگی سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں لیکن جب ہم احرار کانفرنس کی پاس کردہ آخری قرارداد اور زعمائے احرار کے توضیحی خیالات پر غور کرتے ہیں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ پیش کش ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جو حصولِ پاکستان کے بعد حصولِ اقتدار کی ذاتی جنگ چھیڑ کر نہ صرف پاکستان کی عظمت و شرف کی خوبصورت پیشانی کو داغدار بنا رہے ہیں، بلکہ نفس پرستی کے عالم میں بار بار کراچی کے آستانہ عالیہ کی طرف دوڑ دوڑ کر مسلم لیگ کی حاصل کردہ کامیابیوں کے لئے سامانِ تضحیک مہیا کر رہے ہیں۔ کیا پاک پنجاب کے ممدوٹ دولتانہ اور نون کے لئے یہ قرارداد ایک سبق نہیں ہے کہ عین اس وقت جبکہ محاذِ پاکستان کے یہ سپاہی جنگ جیت کر آپس ہی میں جوتم پیزار ہو رہے ہیں، اسلام کی آواز اور ملّت کی پُکار پر اِن کے کان بہرے ہو چکے ہیں، اُن کی ایک مخالف سیاسی جماعت نے جو ہمیشہ ایک فعال جماعت بن کر زندہ رہی، نہ صرف اپنی جُداگانہ حیثیت کو مسلم لیگ اور پاکستان

میں مدغم کرنا پسند کیا بلکہ اپنا سب کچھ ملک و ملّت کے تحفّظ اور وقار پر لٹانے کا صاف او
واشگاف اعلان بھی کر دیا۔

بین الاقوامی حالات کا دھارا جس رُخ پر بہہ رہا ہے اور مستقبل کی آغوش میں ج
طوفان چھُپے ہوئے ہیں، ان کی موجودگی میں ملّتِ پاکستان کے اندر انفرادی اور ذاتی کشمکشِ
اقتدار کا تصوّر بھی ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ ملّتِ پاکستان آج ایک ایسے مقام پر کھڑی
ہے جہاں نہ مسلم لیگ کے اربابِ اقتدار کے خود غرضانہ جھگڑے برداشت کئے جا سکیں گے
اور نہ جماعتوں کی سیاسی باہمی رقابتوں کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ یہ وقت پوری ملّت
پاکستان کے لئے "بنیان مرصوص" بن چکا ہے، رسمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں افرادِ ملّت
کے دلوں سے اختلافات اور بغض و عناد کے زنگ دھو ڈالنے کا ہے۔ رہنماؤں کے سینوں
میں جتنی فراخی اور دلوں میں جتنی وسعت کی آج ضرورت ہے کبھی نہ تھی۔ ہم بزرگانِ احرار
کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف وقت کی آواز کو بگوشِ ہوش سنا، بلکہ پوری جرأت
سے اس پر لبیک بھی کہا۔ مجلسِ احرار مملکت میں کس قدر اثر و رسوخ کی مالک ہے، اس
بحث کا یہ موقع نہیں لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہ کی جا سکے گی کہ احرار نے قربانی کے میدان
میں بارہا اپنے نام کی لاج رکھی ہے اور اس کی سرگرمیوں کو ہماری قومی زندگی کے پلیٹ فارم
پر جو اہمیت حاصل رہی ہے، اُسے نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ مسلم لیگ اور پاکستان کیلئے انہوں
نے اتحاد و تعاون اور خدمات کی جو غیر مشروط پیش کش کی ہے اور اپنے سیاسی موت کے
وارنٹ پر جس جرأتِ مردانہ سے دستخط کر دیئے ہیں، اسے نظر انداز کرنا نہ صرف اسلامی اخلاق
اور تقاضائے اخوّت کی توہین ہوگی بلکہ پاکستان کے مفاد سے ایک دشمنی بھی۔ قوم کے ایک فرد
کو بھی آج مخالفوں کی قطار میں نہیں دیکھا جا سکتا اور اس کا قوم کی سرگرمیوں سے جُدا رکھا
جانا خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے، اور پھر مجلسِ احرار تو ایک جماعت ہے جس سے لاکھوں
انسان متعلق ہیں۔ اس کی پیش کش کو حاکمانہ غرور کے پائے استحقار سے ٹھکرا دینا احرار سے

زیادہ پاکستان کے اپنے مفاد کو ٹھوکر لگاتا ہے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار کے امیر شریعت کی حیثیت سے قرارداد مذکور کی تائید کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ میرا یہ اقدام انتہائی اخلاص پر مبنی ہے اور دل کی آواز ہے۔ ہم اس اعلان پر عدمِ اعتماد کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ اور بالخصوص جب ہم حالات کی بگڑی ہوئی نیّت کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ملّتِ پاکستان کی صفوں میں آج بے مثال اتحاد کی ضرورت ہے، اور یہ آخری مہلت ہے کہ ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کو ماننے والے سچے دلوں سے ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں۔ پُرانے قصور جانے دیں، اگلی تقصیریں معاف کر دیں۔ آپس کی جُدائی نے نہ پہلے کسی قوم کو فائدہ پہنچایا، نہ آئندہ پہنچا سکے گی۔ مجلسِ احرار کے تعاون کی پیش کش کو قبول کرنا جماعتی اتحاد کا پہلا قدم بن سکتا ہے، اور اس کے بعد مستقبل میں خوشگوار صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم حکومتِ پاکستان سے مفادِ ملّت کے نام پر اپیل کریں گے کہ اس قرارداد کے بعد وہ مجلسِ احرار کے متعلق اپنے رویّہ پر نظرِ ثانی فرمائے اور مجلسِ احرار کے بعض کارکنوں پر جو پابندی لگا رکھی ہے اُسے ختم کر کے اپنے فرض کو پورا کرے۔

اگر احرار کے کسی کارکُن نے کوئی ایسی حرکت کی اور ایسی سرگرمی دکھائی جو مفادِ ملّت کے منافی ہو تو قانون اپنا فرض ادا کر سکتا ہے۔

⑤ "مجلسِ احرار کی نئی راہ"

روزنامہ "احسان" مورخہ ۱۷ جنوری ۴۹ء

مجلسِ احرار نے اپنی سہ روزہ دفاعِ پاکستان کانفرنس میں سیاسی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر کے صرف معاشری، مذہبی اصلاح کے کاموں تک محدود رہنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ کسی خارجی دباؤ یا کسی سرکاری اثر سے غیر متاثر ہونے کی بنا پر ایک ایسا جمہوریت نواز قدم ہے جس پر پاکستانی عوام اور زعمائے احرار دونوں کو مبارکباد دی جا سکتی ہے۔ مجلسِ احرار کا شمار اُن سخت جان جماعتوں میں ہوتا ہے جس نے پچھلے زمانہ کی اُس کشاکش میں اپنی راہ نہ بدلی،

جب لیگ سے الگ ہو کر سیاسی کام کرنا، اپنے اور پرائے دونوں کی نگاہ میں ایک لعنت بنا ہوا تھا۔ اس لئے اگر آج اس جماعت نے اپنی تمام سیاسی تحریکوں کو ختم کر کے صرف معاشرتی و مذہبی بن جانے پر اکتفا کیا ہے اور سیاست کے خارزار میں لیگ کے جھنڈے تلے آنے کا دوٹوک فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کسی جبر یا دباؤ کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ حالات کے اُن تقاضوں کا صحیح اور بروقت جواب ہے جو کشمیر کی جنگِ استصواب کو کامیاب بنانے کے لئے ہم میں سے ہر شخص کا شانہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار ہونے کی اپیل کر رہے ہیں۔ پاکستان میں کسی سیاسی جماعت پر کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے اگر احرار چاہتے تو اپنی جُداگانہ جماعتی حیثیت کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ لیکن آج جس اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ مل جُل کر تعمیر پاکستان کے مقصدِ عزیز کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس کا اقتضا یہی تھا کہ مختلف ٹولیوں میں بکھر جانے کی بجائے اتحاد و تعاون کی ایک قابلِ قدر مثال قائم کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ لیگ کے حلقوں میں بھی مجلسِ احرار کے اس فیصلہ کو خوش آمدید کہا جائے گا تاکہ اس طرح ہماری سیاسی زندگی میں جس نئے عنصر کا اضافہ ہو وہ ایک خوشگوار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہو سکے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم مجلسِ احرار کے ارکان سے بھی یہ توقع کریں گے کہ وہ صدقِ دل کے ساتھ محض خدمت کے جذبہ سے متاثر ہو کر لیگ کے جھنڈے تلے آئیں گے اور خلوص کے علاوہ اور کوئی تصوّر ان کے سامنے نہ ہوگا، اور نہ اپنے فیصلہ کو وہ کسی سٹنٹ کے طور پر استعمال کریں گے۔

(۶) "مجلسِ احرار کی خوش آئند پیش کش"

روزنامہ "غازی" مؤرخہ ۱۸ جنوری ۱۹۴۹ء

یہ خبر نہایت خوش کن ہے کہ مجلسِ احرار اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی تمام سیاسی سرگرمیاں ختم کر کے مسلم لیگ میں شریک ہو جائے گی۔ مجلسِ احرار ایک سیاسی جماعت ہے۔ ایک اہم سیاسی غلطی نے اسے صفِ اوّل سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ ہم ان کی کشادہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے ہیں، اور ان کے کارکنوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہم میں شامل ہو کر قوم اور ملک کی تعمیر

میں اسی طریق پر کوشاں رہیں گے جیسے وہ اس سے پیشتر تھے۔ انہوں نے صحیح موقعہ پر ایسے مخلصانہ اقدام اُٹھا کر قوم کو کئی ایک خلفشاروں سے دُور کر دیا ہے۔ اس وقت موقعہ ایسا نہیں ہے کہ ہم گروپ بندیوں میں مشغول رہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے مہربان وزراء کے لئے بھی یہ زندہ مثال ہوگی، اور وہ اپنے ذاتی مقاصد کو قربان کر کے قوم اور ملک کے لئے یکجہتی کا ثبوت دیں گے۔

(۷) "مجلسِ احرار کا تازہ فیصلہ"

روزنامہ "غالب" لاہور۔ مؤرخہ ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء

مجلسِ احرار اسلام پاکستان نے اگلے روز دفاعِ پاکستان کے نام سے جو کانفرنس منعقد کی تھی، وہ یہ انقلاب انگیز فیصلہ کر کے ختم ہوئی کہ مجلسِ احرار پاکستان میں سیاسی کام کرنے سے دستبردار ہوتی ہے۔ اس غرض سے وہ اپنے متوسلین کو مسلم لیگ میں غیر مشروط طور پر شامل ہو جانے کی ہدایت کرتی ہے۔ مجلسِ احرار اسلام کا وجود صرف دینی، اخلاقی اور اصلاحی تبلیغ و ترقی کے لئے باقی رہے گا۔

حقیقت میں یہ فیصلہ آج سے ایک سال پہلے ہو جانا چاہیئے تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد مجلسِ احرار اور مسلم لیگ کے پروگراموں میں کوئی تفاوت نہیں رہا تھا۔ اب سوال پاکستان کے حسن و قبح کا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ پاکستان کی حفاظت، خدمت اور دفاع کے فرائض کس طرح انجام دیئے جائیں اور یہ مقاصد لیگ اور احرار میں مشترک تھے۔ ایک ہی مقصد کے لئے دو جماعتوں کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مجلسِ احرار نے پاکستان میں وہی پوزیشن اختیار کر لی ہے جو ہند میں مسلم لیگ، احرار اور جمعیۃ علماء نے اختیار کر رکھی ہے۔

مجلسِ احرار اپنے نظام کے اعتبار سے اُن مسلمانوں پر مشتمل ہے جو عوام سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لیگ میں مدغم ہونے سے یہ فائدہ ہوگا کہ لیگ میں بھی عوامی رجحانات بڑھیں گے اور وہ جاگیرداروں، دولتمندوں اور امراء کے قبضے سے نکل کر عام مسلمانوں کے اختیار میں

لے جائی جاسکے گی۔ ہمیں امید ہے کہ مسلم لیگ کے طبقے احرار کا خیر مقدم کریں گے اور انکی خداداد صلاحیتوں سے قوم کو مستفید کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۸) "احراری مسلم لیگی ہوگئے"

روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ مؤرخہ ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء

"مجلسِ احرار کے راہنما اور کارکن ہمیشہ بہت کار آزمودہ، بہت ایثار پیشہ، بہت جفاکش اور غیور قومی خادم ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں بارہا ان سے شدید اختلاف ہوا، لیکن ہم ان کی خوبیوں کے ہمیشہ معترف رہے۔ کاش مسلم لیگ میں ان کی شرکت ہماری اس واحد سیاسی جماعت کو تباہی سے بچالے اور اس کو صحیح معنوں میں لوگوں کی جماعت بنادے۔ آج کل تو ہمیں یہ ساری کی ساری جماعت وزارت اور صدارت کے چکّر میں پھنسی ہوئی نظر آتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ احرار مسلم لیگ میں شامل ہو کر کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اور آیا مسلم لیگ کے خداوندانِ اقتدار، انہیں کچھ کام کرنے کا موقع بھی دیتے ہیں یا نہیں؟"

احرار نے سیاسیات میں لیگ کی منتشر قیادت کو تسلیم کرلیا۔ اگرچہ احرار جانتے تھے کہ لیگی قیادت میں خلوص کس حد تک موجود ہے۔ ان کے باہمی اقتدار کی رسّہ کشی نے نہ صرف یہ کہ ملک کے داخلی انتشار کو واضح کر دیا بلکہ ان کی وطن دوستی حب الوطنی اور قومی خدمت کا بھرم بھی کھول دیا۔

لیکن بایں ہمہ احرار نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کے باہمی اختلاف کو نظر انداز کر کے ملک کے دفاع اور استحکام کی خاطر لیگ کی قیادت میں کام کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مرکز اور صوبوں کے درمیان اختلافات سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ اسی طرح پنجاب میں ممدوٹ، دولتانہ، فیروز خاں نون کے مابین اقتدار کی رسّہ کشی میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیا اور غیر جانبدار رہے۔ ہم گذشتہ صفحات میں لکھ آئے ہیں کہ آزادیٔ وطن کے ساتھ ساتھ احرار کا مقصد دینِ اسلام کی خدمت بھی کرنا تھی اور اصلاحِ معاشرہ کے فرائض بھی سرانجام دینے تھے۔ احرار کی نگاہ

دُور بین نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مسلم لیگی قیادت میں باہمی اختلافات کی وجہ سے مُلک پر نوکر شاہی کا تسلّط غالب ہوتا جا رہا ہے۔ نیز اس نوکر شاہی میں ایک اہم عنصر ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب اور عقیدہ کا پرچار سیاسی طریق پر کر رہا ہے۔ یہ گروہ جسے عرفِ عام میں "قادیانی گروہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کے قائد مسٹر ظفر اللہ خان وزارتِ خارجہ پر متمکن تھے۔ وہ نہ صرف اندرون ملک لیگ کی باہمی کشاکش سے فائدہ اُٹھا کر موزوں عہدوں پر اپنے ہم مسلک اور ہم عقیدہ اشخاص کو تیزی کے ساتھ فائز کرتے چلے جا رہے تھے بلکہ ملک سے باہر سفارتی عہدوں پر بھی اپنے ہم مسلک لوگوں کو مقرر کر رہے تھے۔ اس پر ملک میں احرار نے سب سے پہلے آواز اُٹھائی، عوام اور خواص کو مطلع کیا، قادیانیوں کی سازشوں سے پردہ اُٹھایا اور اُن کے عزائم سے خبردار کیا لیکن نقّار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے؟ لیگ کی نابالغ قیادت نے احرار کے اس انکشاف کو وطن دشمنی پر محمول کرتے ہوئے احرار کی طرف سے سیاسی قیادت سپرد کر دینے کے باوجود مشکوک نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جب تک پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان زندہ رہے۔ احرار اور لیگ کا تعلق بہت حد تک ٹھیک رہا۔ بلکہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات سے پہلے احرار راہنماؤں نے خان لیاقت علی خان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا ٹکٹ کسی قادیانی کو نہ دیں تو وہ مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہ بات منظور کر لی، تو احرار نے انتخابات میں مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد لیگ میں کوئی قابلِ ذکر رہنما نہ رہا جو احرار کے ساتھ تعلّقات کو معمول پر رکھتا۔ احرار نے دفاعِ پاکستان کانفرنس میں جہاں یہ بات واضح کر دی کہ وہ آئندہ سیاساتِ ملکی میں حصّہ نہیں لیں گے، وہاں اُسی قرار داد میں مذہبی معاملات خصوصاً ختمِ نبوّت کے متعلق دو ٹوک بات کہہ دی تھی کہ اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ توجّہ دی جائے گی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ختمِ نبوّت کے اجتماعی عقیدہ کے متعلق مسلم لیگ

بحیثیت ایک مسلم جماعت کے، احرار کا ساتھ دیتی، مگر مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے احرار کی مذہبی سرگرمیوں کو پاکستان دشمنی پر محمول کرکے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ احرار نے اگر سیاسی طور پر لیگی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا تو مذہبی طور پر لیگ احرار کی قیادت کو تسلیم کر لیتی، لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً ملک کی قسمت بدل جاتی۔ ہمارا ملک وحدت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا تھا، دو ٹکڑے ہو کر نہ رہ جاتا۔

دفاعِ پاکستان کانفرنس میں احرار نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۹ء کو اپنے دوسرے اجلاس میں قادیانیوں کے متعلق ایک قرارداد منظور کی جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ عظیم الشان اجلاس اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ پاکستان میں بسنے والی ہر قوم کو اس کے جائز حقوق اور جائز مناصب دیئے جائیں۔ مرزا صاحب کی جماعت چونکہ اپنی اپنی حیثیت سے بہت زیادہ حقوق و مناصب پر قابض ہو چکی ہے جس سے نہ صرف مسلمانوں کے دنیوی حقوق پامال ہو رہے ہیں بلکہ مرزائی ان مناصب کو تبلیغِ مرزائیت کا ذریعہ بنا کر مسلمانوں کے ایمان پر برابر ڈاکے ڈالنے میں مصروف ہیں۔ اس لئے یہ اجلاس حکومتِ پاکستان اور دستور ساز اسمبلی کو ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اُس مطالبہ کی طرف توجہ دلاتا ہے جو اُنہوں نے حکومتِ برطانیہ سے کیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے قطعی طور پر فرمایا تھا کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے اسی طرح علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے اور آبادی کے تناسب کے لحاظ سے اُن کے حقوق اسی طرح متعین کر دیئے جائیں جس طرح سکھوں کو ہندوؤں سے علیحدہ اقلیت قرار دیا گیا۔"[1]

احرار صرف مندرجہ بالا قرارداد کی وجہ سے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں تھے بلکہ

[1] روزنامہ "آزاد" لاہور مؤرخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۹ء صفحہ ۲

تحریکِ کشمیر کے وقت سے انگریز کے اس خود کاشتہ پودے کا پیچھا کر رہے تھے۔ دراصل احرار کا تحریکِ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لینے کے دیگر عوامل کے علاوہ ایک یہ مقصد بھی کار فرما تھا کہ قادیانی کشمیر کو "قادیانی سٹیٹ" بنانا چاہتے تھے اور قادیان جو ان کے نبی کے مسکن و مستقر ہونے کی وجہ سے مقدس خطۂ ارضی بن چکا تھا وہ چاہتے تھے کہ اس کی حفاظت کی جائے اور اس کے ارد گرد کا سارا علاقہ "ایک قادیانی سٹیٹ" بنا دیا جائے۔ اسی سازش کی تکمیل کی خاطر مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا، ورنہ ایک مذہبی فرقہ کے سربراہ کا ایک خالصۃً سیاسی تحریک کی قیادت چہ معنی دارد؟ احرار اس تحریک میں کود پڑے اور مرزا بشیر کی سازش کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ ڈاکٹر اقبال جو اپنے مرتبہ و شہرت کی وجہ سے کمیٹی کے رکن بن چکے تھے، قادیانیوں کے عزائم سے باخبر نہیں تھے، احرار نے اُن سے مسلسل ملاقاتیں کر کے اس سیاسی گروہ کے عزائم سے باخبر کیا، جس پر وہ کشمیر کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے نیز علامہ نے کانگرسی لیڈروں کو بھی اس گروہ کے عزائم سے آگاہ کیا۔

احرار نے ۱۹۳۴ء میں قادیان میں جس شان و شوکت سے کانفرنس کی، اس کے اثرات برصغیر کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی جا پہنچے۔ یہ اس صورت میں پہنچے کہ اس کانفرنس کی وجہ سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر مقدمہ قائم کیا گیا، جس سے عدالت میں قادیانیوں کے عقائد زیرِ بحث آئے۔ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقہ اور بیرونی دنیا پہلی مرتبہ مرزائیوں کے عقائد سے روشناس ہوئی۔

تقسیمِ ملک سے قبل احرار کی توجہ دو محاذوں پر تھی۔ پہلا محاذ آزادیٔ وطن کا تھا۔ جس کی خاطر وہ جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے چلے آ رہے تھے۔ دوسرا مذہبی محاذ تھا۔ اس مذہبی محاذ پر انگریز نے اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی خاطر "قادیانی فرقے" کو جنم دیا تھا۔ اس فرقہ کی سرکوبی اور اصلاحِ معاشرہ کا کام احرار کے ذمہ تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سیاست کا تاج، لیگ کے سر پر رکھ دیا، خود مذہبی محاذ پر آ گئے اور اپنی ساری توجہ پاکستان کو اندرونی

دشمنوں سے محفوظ رکھنے پر مرکوز کر دی، چنانچہ حفاظتِ پاکستان کی خاطر مرزائیوں سے ٹکر لینا ایک فطری امر تھا۔ پھر اس تحریک کے پسِ منظر میں کوئی فوری مقصد کارفرما نظر نہیں آتا۔ بلکہ مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں، اور کھلم کھلا پاکستان کو قادیانی سٹیٹ بنانے کے عزائم، بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کے ارادے جب عام ہوئے تو وطن کے تحفظ اور ملک کو سازشوں سے بچانے کی خاطر میدان میں آگئے۔ انہوں نے اس وقت کی لیگی قیادت کو اس گروہ کے عزائم باطلہ کے متعلق دستاویزی ثبوت بھی فراہم کیا۔ کہ ربوہ کی خلافت "ریاست اندر ریاست" کا دو عملی نظام پیش کر رہی ہے، اس کا تدارک کیا جائے، لیکن لیگی قیادت نے احرار کے خلوص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور وطن دوستی کو وطن دشمنی پر محمول کیا۔ دستاویزی ثبوت مہیا ہونے پر قادیانی گروہ کے خلاف عملی اقدام کرنے کی بجائے احرار کو مطعون کیا جانے لگا۔ انہیں پاکستان میں افراتفری اور انتشار پیدا کرنے کا موجب قرار دیا جانے لگا، انہیں اقتدار کا بھوکا کہا گیا، حالانکہ اگر احرار اقتدار کے حصول کی خاطر ہی تحریکِ ختمِ نبوت کا سہارا لے رہے تھے تو ان کے لئے موزوں وقت ۱۹۵۱ء کے انتخابات تھے نہ کہ ۵۴-۱۹۵۳ء کا زمانہ۔

یہ تو تھا مسلم لیگی نقطۂ نظر جو اپنی جھولی میں قادیانیوں کو تحفظ دے کے ایک مخلص اور جانباز جماعت کے خلاف غلط پروپیگنڈے میں مصروف تھے حالانکہ اس جماعت نے خلوص و دیانت کے ساتھ سیاسی قیادت لیگ کو دے کر اپنے آپ کو اس میں ضم کر لیا تھا مگر اسے لیگی قیادت کی بدنصیبی ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مٹھی بھر دشمنانِ ختمِ نبوت کو اپنے ہاں پناہ دے کر مسلمانوں کے تمام مسلمہ فرقوں کی دشمنی مول لے رہے تھے۔ جہاں تک احرار کا تعلق ہے لاہور ریزولیوشن کے بعد اس نے انفرادی اور جماعتی طور پر اپنے کارکنوں اور رضاکاروں کو مسلم لیگ سے تعاون اور خدمت کے لئے ہمیشہ تلقین کی اور اپنی قرارداد پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ اگر کسی کارکن نے لاہور ریزولیوشن کی خلاف ورزی کی تو اُسے جماعت

چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا یا اُسے احرار کی رُکنیت سے خارج کر دیا۔ اس ضمن میں بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے جناب ماسٹر تاج الدین انصاری نے بار ہا "آزاد" کے ذریعہ احرار کارکنوں کے دائرہ عمل کی وضاحت کی۔ چنانچہ ۲۳ / نومبر ۴۹ء کے "آزاد" میں "احرار کارکنوں کا دائرہ عمل" کے عنوان سے ایک اعلان شائع کیا ہے جسے آپ ملاحظہ فرما کر احرار کی دیانت اور ایفائے عہد کی داد دے سکتے ہیں۔

"لاہور ریزولیوشن کی روشنی میں مجلس احرار کے کارکنوں کا دائرہ عمل محدود ہو گیا ہے۔ اب انہیں بحیثیت احرار صرف تبلیغ کے میدان میں کام کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سیاست میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ اگر احرار کارکنوں کو سیاست میں حصّہ لینا ہے تو انہیں مسلم لیگ کے رُکن بننا چاہیئے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب، قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی، صاحبزادہ سیّد فیض الحسن صاحب، حکیم عبدالسّلام (سرحدی) اور دیگر زعماء احرار، مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن بن چکے ہیں۔ لاہور ریزولیوشن کے ذریعہ مجلسِ احرار نے مسلم لیگ اور احرار کی متوقع کشمکش کا خاتمہ کر دیا اور سیاست کا میدان مسلم لیگ کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ احرار کا کوئی کارکن کسی ایسی جماعت کا رُکن نہیں بن سکتا، جو مسلم لیگ سے متصادم ہو۔ یہ وضاحت اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ مجلس احرار میانوالی کے صدر صوفی عبدالرحیم صاحب کو اپنے ایک کارکن کے خلاف یہ شکایت ہے کہ وہ کمیونزم کا باقاعدہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں اور مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا غلط حوالہ دے کر کارکنوں کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں کمیونسٹ بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایسے کارکن جو اسلامی نظام سے کٹ کر کمیونزم کی آغوش میں جانا چاہیں: انہیں چاہیئے کہ وہ مجلس احرار سے مستعفی ہو جائیں، ورنہ ان کے خلاف تادیبی

کارروائی کی جائیگی اور انہیں جماعت سے خارج کر دیا جائے گا۔

تاج انصاری

قارئین یہ نہ سمجھیں کہ احرار لیڈروں کی سرگرمیاں ماسٹر تاج الدین انصاری کے دائرۂ عمل کی وضاحت تک محدود رہیں بلکہ وہ عملی طور پر مسلم لیگ کی ممبر شپ بڑھانے، اس کا پیغامِ عام کرانے اور اس کی آواز کو گھر گھر تک پہنچانے کے لئے سربکف میدان میں نکل آئے احرار کی طرف سے مسلم لیگ سے تعاون کا باقاعدہ اعلان اگرچہ دفاعی کانفرنس لاہور کے بعد عملی صورت میں ظاہر ہوا، لیکن بایں ہمہ تشکیلِ پاکستان کے بعد احرار لیڈر انفرادی طور پر بھی لیگ سے تعاون کر رہے تھے چنانچہ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے ایک خط دریں بارہ آرگنائزر مسلم لیگ کو لکھا جس کی نقل پیشِ خدمت ہے۔

بخدمت جناب آرگنائزر صاحب ضلع مسلم لیگ ملتان

السلام علیکم ۔ گذارش ہے کہ شجاع آباد کی تمام تحصیل میں پرائمری مسلم لیگوں کا کام رُکا ہوا ہے۔ کاپیاں رُکنیت کی نہیں ہیں اور نہ ہی ضلع مسلم لیگ کا کوئی ذمہ دار اس تحصیل میں تشریف لایا ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ رُکنیت کی کاپیاں بدست حامل عریضہ ہذا ارسال فرما کے ممنون فرمائیں۔ والسلام

احقر العباد

احسان احمد

(order:) Issue 20 Copies with payment.

Sd/- M. Hussain

dt 12-5-48

مسلم لیگ کی رُکنیت عام کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ قاضی احسان احمد صاحب کو لیگ کے ہر اجلاس میں دعوت دی جاتی تھی کہ وہ اجلاس میں آ کر اپنی قیمتی آراء سے جماعت

کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ اس سلسلہ میں ایک دعوت نامہ کی نقل پیش خدمت ہے، جو رانا گل محمد صاحب نے قاضی صاحب کو لکھا۔

سٹی مسلم لیگ، میاں چنوں، ضلع ملتان

نمبر........ تاریخ 16.7.50

مکرمی جناب قاضی صاحب

السلام علیکم۔ کل سید خلیل الرحمٰن شاہ صاحب کراچی سے یہاں تشریف لائے انہوں نے فرمایا ہے کہ میں قاضی صاحب کو ملنا چاہتا ہوں، نہایت ہی ضروری پروگرام مرتب کرنا ہے۔ اگر آپ کل تک تشریف لا سکیں تو یہاں ہی خلیل صاحب مل لیں گے، ورنہ آپ کو ہر حالت میں ۲۶۔۹۔۵۰ سے پہلے پہلے لاہور میں ملنا ہوگا کیونکہ ۲۱/۹ کو آنریبل خان لیاقت علی خان تشریف لا رہے ہیں اور ۲۸/۹ کو سرحد چلے جائیں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری درخواست کو قبول فرما کر تکلیف فرما دیں گے جبکہ نہایت ہی اہم پروگرام ہے۔

آپ کا مخلص

گل محمد بقلم خود

اسی طرح کا ایک اور دعوت نامہ صدر ضلع مسلم لیگ ملتان مخدوم سید علمدار حسین گیلانی کی طرف سے بھی قاضی صاحب کو ملا جس کی نقل حسب ذیل ہے۔

از دفتر مسلم لیگ ضلع ملتان

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب سلمہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ مزاج شریف! میں ضلع مسلم لیگ کا ایک ضروری اجلاس مورخہ $4\frac{1}{52}$ بروز جمعہ بوقت $2\frac{1}{2}$ بجے دن بمقام عارضی دفتر ضلع مسلم لیگ ملتان بالائی منزل دفتر مارکیٹ کمیٹی ریلوے روڈ ملتان شہر، بلا رہا ہوں۔ اس اجلاس

میں آپ کی شمولیت از حد ضروری ہے۔ براہِ مہربانی وقت مقررہ پر تشریف
لا کر مشکور فرمادیں۔ المرقوم 24 12/51

مخدوم زادہ الحاج سیّد محمد علمدار حسین گیلانی۔ بی اے
ایم ایل اے
پریذیڈنٹ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ، ملتان

یہاں تک کہ بعض اوقات مرکزی اور صوبائی وزرا کی کمیٹیوں کے اجلاس میں بھی قاضی احسان احمد صاحب کو بطورِ خاص مدعو کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اعلیٰ سطح کے اجلاسوں میں شرکت قابلِ اعتماد آدمی ہی کیا کرتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اہم اجلاس ۲۵-۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو بہاولپور میں منعقد ہوا، جس میں قاضی صاحب کو مدعو کیا گیا۔ نقل دعوت نامہ درجِ ذیل ہے۔

بہاولپور مسلم لیگ، بغداد الجدید

نمبر 126 تاریخ 20-1-52

محسن و مکرّم بندہ جناب مولانا قاضی احسان صاحب

السلام علیکم۔ بہاولپور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا ایک غیر معمولی اجلاس و کونسل کا ایک غیر معمولی اجلاس مؤرخہ ۲۵-۲۶ جنوری ۵۲ء کو منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں عزت مآب خان عبدالقیوم خان صاحب وزیر اعظم صوبہ سرحد، عزت مآب صوفی عبدالحمید صاحب وزیر زراعت صوبہ پنجاب، عزت مآب سردار محمد خان صاحب لغاری وزیر تعمیرات صوبہ پنجاب، و عزت مآب سید جعفر شاہ صاحب وزیر تعلیم صوبہ سرحد، عزت مآب غیاث الدین صاحب پٹھان، و جناب خلیل الرحمٰن صاحب جنرل سیکرٹری ڈسٹرکٹ مسلم لیگ ملتان شرکت فرما رہے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آپ چوبیس ۲۴ ماہ حال

تک بہر صورت بہاولپور تشریف لاکر مشکور فرمادیں۔

آپ کا خیر اندیش

Mu. Chishti

برائے جنرل سیکرٹری

مزید براں مسلم لیگ کے مرکزی حضرات وقتاً فوقتاً احرار راہنماؤں سے باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں مرکزی امور کے پارلیمانی سیکرٹری جناب خلیل الرحمٰن صاحب کا مکتوب، قاضی صاحب کے نام درج کیا جاتا ہے۔

Pakistan Muslim League

Telephone : 3130

Telegrams : "MUSLMLEAG"

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ط

پاکستان مسلم لیگ

خلیل منزل۔ مزنگ لاہور

۳۰ر اکتوبر

مخدومی محترمی جناب قاضی صاحب زاد الطافکم

السلام علیکم! اس سے پہلے ایک کارڈ ارسال خدمت کیا تھا۔ میری اُن سے تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوئی، اور جو کچھ آپ نے فرمایا تھا، اُنہوں نے دلجمعی اور مسرت کے ساتھ سُنا۔ اور بہت کچھ کہا جو میں آپ کی اور جناب شاہ صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تار بھی میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں اور اس ملفوفے میں بھی عرض کرتا ہوں کہ آپ براہ کرم مجھ سے ۳ر نومبر سہ پہر کے وقت گیلان ہاؤس ملتان

میں ضرور ملیں، تاکہ میں آپ کی معیت میں شاہ صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر جملہ کیفیات عرض کر سکوں۔ اُمید ہے کہ آپ یہ تکلیف اس نیاز مند کی خاطر ضرور گوارا فرمائیں گے۔

والسلام علیکم۔ نیاز مند

خلیل الرحمٰن

ایک طرف لیگ کی غلط پالیسیوں کی انتہا ہے مگر دوسری طرف وفاداری بشرط استواری کا عملی ثبوت! غور فرمائیے کس قدر بُعد ہے دونوں کے طرزِ عمل میں۔ لیگ شاید یہ سمجھتی تھی کہ چونکہ اُسے اقتدار حاصل ہے لہٰذا اُس کی ہر بات قانون کا درجہ رکھتی ہے اور اُسے بلا چون و چرا تسلیم کرنا ہر پاکستانی کا فرضِ منصبی ہے۔ حالانکہ جمہوری ممالک میں اختلاف رائے ہر فرد کا بنیادی حق ہوتا ہے، مگر بایں ہمہ احرار نے یہ اصرار کبھی نہیں کیا کہ وہ لیگ سے سیاسی قیادت واپس لینا چاہتی ہے کیونکہ لیگ اسکی اہلیت ثابت نہیں کر سکی اور باہمی اختلافات میں اس قدر اُلجھ چکی ہے کہ کسی صوبہ میں داخلی طور پر امن کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی بلکہ ہر صوبہ میں پارٹی بازی کا دور دورہ ہے۔ پارٹی ڈسپلن کا فقدان ہے۔ تاہم لیگ کو سیاسی قیادت سپرد کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ لیگ کی "مذہبی قیادت" کو بھی بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔ ہاں اگر لیگ اپنے پروگرام کے مطابق نیز قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں ملک کے اندر ایک اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کا نام دے کر اس کی اطاعت ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ تصور کیا جاتا۔ مگر لیگ نے تو مرکز میں سر ظفر اللہ خان قادیانی کو وزیرِ خارجہ کے اعلیٰ منصب پر فائز کر کے مرزائیوں کے لئے نہ صرف یہ کہ اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کے دروازے کھول دیئے تھے۔ قادیانیوں نے احرار کے لاہور ریزولیوشن کو پڑھ کر اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ انہیں اندیشہ تھا

کہ احرار نے اگر لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تو وہ کسی صورت بھی قادیانیوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ اس لئے ان کی کوشش تھی کہ لیگ اور احرار کو ایک دوسرے سے دُور رکھا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے تین طریقوں سے کام کیا۔

اوّلاً یہ کہ احرار نے اگرچہ لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا ہے اور احراری راہنما لیگ کے ممبر بنتے جا رہے ہیں تاہم لیگ میں انہیں ان کی شایانِ شان کوئی عہدہ نہ دیا جائے تاکہ وہ لیگ پر چھا نہ جائیں۔

دوسرا لیگ کو احرار سے بدظن کر دیا جائے اور ان کے ماضی کے اختلافات کو اُچھالا جائے۔ چنانچہ اُن کی پراپیگنڈہ مشینری تیزی کے ساتھ حرکت میں آگئی۔

تیسرا یہ کہ پاکستان کے کلیدی عہدوں پر قبضہ جمانے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دی جائیں تاکہ پاکستان جو ایک نئی اسلامی مملکت ہے، اس پر قبضہ کر کے "قادیانی سٹیٹ" بنا کر اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کر سکیں۔

اِن خطرناک ارادوں کو نہ صرف یہ کہ احرار نے وقت پر بھانپ لیا بلکہ بعض قومی اخبارات نے اِن آنے والے بھیانک خطرات کی طرف حکومت کی توجہ دلائی مگر لیگی قیادت ؎ اِک خامشی تیرے سب کے جواب میں

کا منظر پیش کر رہی تھی۔ لیگی حکومت صوبوں میں اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھی اور یہ خطرناک فتنہ نہایت معصومیت کے ساتھ سول و فوجی ملازمتوں میں گھسا چلا جا رہا تھا قومی پریس بار بار چیخ رہا تھا کہ آنے والے خطرناک اور مہیب سایوں سے بچنے کے لئے قادیانی گروہ کے سیاسی عزائم کا فوراً محاسبہ کیا جائے مگر کسی نے کوئی توجہ نہ دی، بلکہ جو شخص بھی قادیانی فتنہ کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتا۔ اُسے لیگی حکومت اپنے اوپر تنقید سمجھ کر اس کے خلاف رسوائے زمانہ سیفٹی ایکٹ کا بلا تحاشا استعمال کرتی۔ ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین کو بتائیں کہ اُن دنوں قادیانیوں کے عزائم کے بارے میں قومی پریس کا نقطۂ نظر اور

اندازِ فکر کیا تھا۔ درج ذیل سطور میں معاصر محترم روزنامہ "زمیندار" لاہور مؤرخہ ۹ فروری ۱۹۴۹ء کا افتتاحیہ بعنوان "مرزائیوں کے ہتھکنڈے" بحوالہ روزنامہ "آزاد" لاہور مؤرخہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء پیشِ خدمت ہے۔

"مرزائی پاکستان کے لئے مستقل فتنہ ہے۔ انہوں نے اس سرزمین کی وطنیت کبھی غیر مشروط طور پر قبول نہیں کی۔ یہاں رہتے ہیں تو پاکستان کا دم بھرتے ہیں قادیان جاتے ہیں تو "بندے ماترم" کا ترانہ جھوم جھوم کر گاتے ہیں، اور ترنگے جھنڈے کو پرنام کرتے ہیں۔ بایں ہمہ اپنے آپ کو پاکستان کا وفادار ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ وفا اور عقیدت کی تقسیم ناممکن ہے۔ کوئی جماعت ایک ہی وقت میں دو حکومتوں کی وفادار نہیں بن سکتی۔ اگر ایسا کرے گی تو وہ کسی کی وفادار نہیں سمجھی جائے گی۔ پاکستان میں اور بھی اقلیتیں ہیں۔ عیسائی ہیں اچھوت ہیں، پارسی ہیں اور ہندو ہیں، لیکن کسی اقلیت نے آج تک ہندوستان یا حکومتِ ہند سے وفاداری و عقیدت کا اظہار نہیں کیا۔ صرف مرزائی اقلیت ہے جو پاکستان میں رہتے ہوئے درویشوں کو قادیان بھیجتی ہے اور ان کی وساطت سے ہندوستان کی خدمت میں عقیدت و ارادت کا ہدیہ پیش کرتی رہتی ہے۔ پھر یہ درویش پاکستان میں واپس آجاتے ہیں اور ان کی جگہ کوئی دوسری ٹولی بھیجی جاتی ہے۔ اس طرح تمام مرزائی باری باری ہندوستان سے پیمانِ وفا باندھ آتے ہیں۔ غور فرمائیے جن لوگوں نے ہندوستان سے وفاداری کا رشتہ استوار کر رکھا ہے وہ پاکستان کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں؟ آگ کا پجاری تو پانی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ ظلمت کو سجدے کرنے والا روشنی سے کب خوش ہوتا ہے۔ کفر کو قوتِ حاکمہ ماننے والے اور برہمن کو اولی الامر سمجھنے والے تو اسلام اور مسلمانوں کے ہمدرد نہیں ہو سکتے کیونکہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ہمارا دعویٰ ہے کہ خدانخواستہ کبھی پاکستان سے ہندوستان کی ٹھن گئی، اور حکومتِ ہند نے مرزائیوں کو قادیان میں آباد کرنے کا وعدہ کر دیا تو یہی مرزائی پاکستان کے لئے مارِ آستین ثابت ہوں گے۔ اگرچہ آج بھی خفیہ طور پر پاکستان کی بہ نسبت ہندوستان کے زیادہ خیر خواہ ہیں۔ لیکن وعدے کے بعد تو تکلفات کا پردہ بھی اُٹھ جائے گا۔ اگر حکومتِ پاکستان کو ہماری بات کا اعتماد نہیں تو حکومت کوئی ایسا معاہدہ کر دیکھے جس کی رو سے مرزائیوں کو قادیان میں آباد ہونے کی آزادی حاصل ہو تو یہی خلیفہ صاحب جو آج پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے نظر آتے ہیں۔ اپنے مریدوں کے ساتھ "جے ہند" کے نعرے لگاتے ہوئے ہندوستان جاتے ہیں یا نہیں؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ سرکاری ملازمین کے علاوہ ایک بھی مرزائی پاکستان میں نہیں رہے گا، سب کے سب ہندوستان چلے جائیں گے۔ جو معلومات پاکستان سے مہیّا کر چکے ہیں، ان سے حکومتِ ہند کو مستفید کریں گے۔ معلومات ہی پر کیا موقوف ہے ہندوستان کے حلقہ بگوش ہو کر پاکستان کے خلاف معاندانہ سازشوں سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ جب پاکستان میں رہتے ہوئے اور ملک سے امتیازی رعائتیں حاصل کرنے کے باوجود ہندوستان کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں تو قادیان جانے کے بعد کیا کیا نہ کریں گے۔ مرزائیوں کو قادیان ہر شہر سے عزیز ہے۔ وہاں ان کا دین پیدا ہوا، ان کے نبی نے جنم لیا اور وہیں اس کی نعش مدفون ہے۔ اسی لئے تو مرزائی دوست قادیان کو "بروزی کعبہ" اور اس کی یاترا کو "ظلی حج" کہا کرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ مرزائی پاکستان کے لئے اپنا کعبہ چھوڑ دیں۔

ان کے نزدیک بہشتی مقبرے کی ایک ایک قبر ہزاروں پاکستانیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مرزائیوں کا بس چلے تو پاکستان بیچ کر قادیان خرید لیں، اور پھر بھی حکومتِ ہند سے کہیں۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ہم اس مبحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ مرزائیوں نے قادیان میں آباد ہونے کے لئے ہندوستان سے کیا کیا وعدے کئے، مسٹر سورن سنگھ سے کیا کہا گیا، ڈاکٹر گوپی چند کو کس قسم کا یقین دلایا گیا، مسٹر چندو لال ترویدی کی خدمت میں کیا کیا گذارشیں کی گئیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے کس نوعیت کے پیمانِ وفا باندھے گئے اور مسٹر بلدیو سنگھ کو کیا لالچ دیا گیا۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن سے بحث کے طویل ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہم صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ مرقومہ بالا حقائق کے پیش نظر مرزائی فتنہ کا لمسٹ نہیں ہیں؟ کمیونسٹ اس لئے قابلِ گرفت سمجھے جاتے ہیں کہ ان کا رُخ کراچی کے بجائے ماسکو کی طرف ہے، نیشنلسٹ مسلمانوں کو اس لئے قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے کہ اُن کی عقیدتوں کا رشتہ دہلی سے استوار ہے، لیکن مرزائیوں کو کوئی نہیں پوچھتا، جو اعلانیہ طور پر ہندوستان پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کسی نے قادیان سے واپس آنے والے درویشوں سے نہیں پوچھا کہ تم قادیان میں "بندے ماترم" کا ترانہ چھیڑ کر ترنگے جھنڈے کو سلام کرتے آئے ہو، پھر پاکستان میں کیوں واپس آتے ہو؟ جاؤ اسی ملک سے وطنیت کا رشتہ باندھو جس سے پیمانِ وفا باندھ رہے ہو۔ ہماری حکومت دو کشتیوں پر سوار ہونے کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ اس کی غفلت اور ناجائز اقلیت نوازی کا یہی عالم رہا تو وہ وقت دُور نہیں جب مرزائیوں کی سازشیں پاکستان کے لئے وجہِ مصیبت بن جائیں گی۔

ایک طرف تو ہندوستان کی پوجا کی جارہی ہے دوسری طرف پاکستان کی ملازمتوں کے سر پر قادیانیوں کو سوار کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں مرزائیوں کی آبادی زیادہ سے زیادہ ایک سو چالیسواں حصّہ ہوگی، لیکن بڑی بڑی ملازمتوں پر چھ فیصدی سے زیادہ قابض ہیں۔ جس محکمہ میں کوئی مرزائی افسر متعیّن ہوتا ہے وہاں چند ماہ میں مرزائی ہی مرزائی دکھائی دیتے ہیں۔ اوّل تو ایسے لوگوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو جانے چاہئیں، جن کی وفاداری مشکوک ہے۔ دوم اقلیّت کو اکثریت پر حکومت کرنے کا حق نہیں پھر مرزائیوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر اُنہیں اسلامی اکثریت پر حکمران کیوں بنایا جاتا ہے؟ حکومتِ پاکستان اور حکومتِ مغربی پنجاب کو اس کا جواب دینا چاہیئے علاوہ ازیں مرزائیوں کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنا ہے تاکہ فرزندانِ توحید کو تو باہم آویزی سے فرصت نہ ملے اور مرزائی اپنے قادیانی دین کا زہر آسانی سے پھیلاتے جائیں۔ اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر پر نظر ڈالئے۔ مرزائیوں کو کشمیر سے اس لئے دلچسپی ہے کہ ان کی عجیب و غریب تحقیقات کے بموجب وہاں مسیح ناصریؑ کی قبر ہے۔ قادیانی چاہتے ہیں کہ مرزائی مسیح کی قبر جاتی رہی تو مسیحِ ناصری کی قبر ہی ہاتھ آجائے، تاکہ مباہلے کے اصول پر کچھ تو پیش کیا جاسکے۔ علاوہ ازیں مرزائی کشمیر کو سب سے بڑا تبلیغی میدان بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں ان خواہشوں کا پس منظر پیش کرنا مقصود نہیں، ورنہ بحث ۱۹۳۱ء کی کشمیر کمیٹی ہی سے شروع کی جاتی ہے۔ صرف موجودہ حالات کو دیکھئے۔ مہاجرینِ کشمیر میں کشمکش کی جو آگ بھڑکی ہے وہ خلیفہ قادیان ہی نے بھڑکا رکھی ہے۔ خلیفہ صاحب چودھری غلام عباس کے خلاف نہ صرف نفرت پھیلاتے ہیں بلکہ اُن کے خلاف متحدہ محاذ بھی بنارہے ہیں۔ اس غرض کیلئے

معاندانہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہے۔ اس غرض کے لئے بعض مہاجروں اور مہاجروں کے لیڈر کہلانے والے چند اشخاص کی مدد کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ پہلے بھی اپنی کھوئی ہوئی لیڈری حاصل کرنے کے لئے چودھری صاحب کے مخالف تھے۔ اب مرزائیوں کی امداد نے ان کے حوصلے اور بھی بلند کر دیئے ہیں۔ چودھری صاحب کا قصور کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ مرزائیت کے حامی نہیں ہیں۔ انہوں نے ۳۵ء میں مرزائیوں کو کشمیر و جموں نیشنل کانفرنس سے نکال دیا تھا اور جب مسلم کانفرنس قائم کی تو مرزائیوں پر اس کی رکنیت کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور کرنے بھی چاہئیں تھے کیونکہ مسلم کانفرنس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس طرزِ عمل کے پیش نظر مرزائیوں کو خطرہ ہے کہ چودھری غلام عباس کا اقتدار قائم رہا تو کشمیر و جموں میں مرزائیت کو ترقی نہ حاصل ہو سکے گی۔ اس لئے وہ چودھری صاحب کو گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ افتراق بین المسلمین کی پرانی غرض پوری کی جا رہی ہے۔ مرزائی چاہتے ہیں کہ مسلمان مہاجرین تو آپس کی لڑائی میں مصروف ہوں اور مرزائی تبلیغ کے لئے میدان خالی ہونے لگے۔ مہاجرین کشمیر و جموں کو اس ہمرنگِ زمین دام سے خبردار رہنا چاہیئے۔ اگر وہ مرزائیوں کی انگیخت پر اپنی صحیح و صالح قیادت کو نقصان پہنچانے کے اختلاف و افتراق میں مبتلا ہو گئے تو کہیں کے نہ رہیں گے۔"

قومی پریس کے علاوہ مجلسِ احرار نے بارہا لیگی قیادت کو اس عظیم فتنہ کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ تقریروں اور تحریروں کی صورت میں دردمندانہ اپیلیں کی گئیں مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" لاہور نے اپنی اشاعت ۲۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو ایک اداریہ

نوٹ بعنوان "مسلم لیگ کی ذمہ داریاں" لکھا جو پیش خدمت ہے۔

"مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ ایسی جماعت ہے جسے قوتِ حاکمہ تسلیم کیا گیا ہے مسلم لیگ کے رہنماؤں نے مسلم لیگ کے حلقہ اثر کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے لئے ہر اس شخص کو جو مسلمانوں کے سے نام رکھتا تھا، مسلم لیگ کا ممبر بننے کی اجازت دے کر بنیادی غلطی کا ارتکاب کیا۔ مسلم لیگی رہنماؤں کی اس غیر دانشمندانہ اور غیر مذہبی وسعتِ قلبی نے اسلام کے بدترین دشمنوں کو اسلامی حصار میں داخل ہو کر رخنہ اندازی کا موقعہ دیا۔ میاں افتخار الدین کے کمیونسٹ ساتھی اور مرزا محمود کے مرزائی ایجنٹ بیباکانہ مسلم لیگ میں داخل ہو گئے، اور مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو خطاب کر کے انہیں اسلام سے گمراہ اور ایمان سے محروم کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔ کم از کم یہ تو ہوا کہ کمیونسٹوں اور مرزائیوں نے اپنی گروہ بندی اور تنظیم کے ذریعہ اس قدر طاقت ضرور حاصل کر لی کہ وہ دہریت اور مرزائیت کی تبلیغ کے لئے کھلے بندوں میدان میں نکل آئے۔ سب سے زیادہ طاقت مرزائیوں نے حاصل کی۔ اس لئے کہ انگریز نے انہیں کلیدی محکموں تک پہنچنے میں بہت زیادہ سہارا دیا۔ مرزا محمود صاحب جو کبھی لاہور آ کر جلسہ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، آج پنجاب کے کونے کونے پر نظر جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ کبھی سندھ کا رُخ کرتے ہیں، کبھی بلوچستان پر قبضہ کرنے کی ٹھان لیتے ہیں اور کبھی ربوہ ہی کو دارالامان بنانے کی فکر میں ہیں۔ پاکستان کی تشکیل کے فوراً بعد ان مرزائیوں نے عجب گل کھلائے ہیں۔ ان کے اکثر کارنامے پردہ راز میں ہیں۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے یہ راز از خود ظاہر ہو رہے ہیں۔ زمیندار مجریہ ۱۸ر نومبر کی ایک خبر ملاحظہ فرمایئے۔

"لاہور۔ ۱۶ر نومبر۔ حیدر آباد دکن کے ایک رضا کار جناب فرزند توحید نے، جو ہجرت کر کے چلے آئے ہیں، یہ انکشاف کیا کہ نظام شاہی فوجوں کا کمانڈر انچیف العیدروس مرزائی تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس غدار نے ہتھیار رکھ دینے کا مشورہ کسی اور جگہ سے حاصل کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے دو لاکھ مسلمانوں کو۔۔۔

جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔"

اس خبر کو بار بار پڑھئے اور غور فرمایئے کہ ان مرزائیوں نے مسلمانوں کی تباہی میں کہاں کہاں اپنے ایجنٹوں سے کام لیا ہے۔ یہی حال کمیونسٹوں کا ہے۔ مسلم لیگ کی وسعتِ قلبی ملاحظہ فرمایئے کہ میاں افتخار الدین کو پہلے تو مسلم لیگ صوبہ پنجاب کا صدر بنا لیا۔ اب میاں صاحب کے خلاف زہر اُگلا جا رہا ہے۔ چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کو وزارتِ خارجہ کا قلمدان سپرد کرنے کے بعد یہ اُمید رکھنا کہ اسلامی ممالک مرزائیت کے زہریلے جراثیم سے محفوظ رہیں گے، نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تمام مصیبت اور پریشانی اسی بنیادی غلطی کا نتیجہ ہے کہ مسلم لیگ کے دروازے اُن گروہوں اور جماعتوں کے لئے کھول دیئے جو اسلام کی باغی اور ختم المرسلین کے منکر ہیں۔ مسلم لیگ کو اسلام کی خاطر جو احتیاط لازم تھی، اُسے تو مسلم لیگ نے نظر انداز کیا مگر اپنے وقار کے لئے جس تجویز کو مناسب سمجھا، اس کا اعلان نہایت بیتابی سے کیا گیا۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ مسلم لیگ نے چند جماعتوں پر پابندی لگائی ہے، جن میں اسلامی جماعتیں بھی شامل کر لی گئی ہیں، مگر جن جماعتوں پر سب سے پہلے پابندی لگنی چاہیئے تھی، اُنہیں کھلا چھوڑ دیا۔ کمیونسٹوں پر بحیثیت کمیونسٹ کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے اور مرزائیوں کا تو ذکر ہی کیا، وہ تو چوروں کی طرح اس طرح گھر میں گھسے ہیں کہ انہیں خادم خاص سمجھ کر سر پر بٹھا رکھا ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ مسلم لیگ کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت باقی رہے سیاسیات کی باگ ڈور صرف مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہنی چاہیئے۔ تمام ان لوگوں کو جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے منکر ہوں، مسلم لیگ سے خارج کر کے قرطاسِ رُکنیت پر یہ پابندی درج ہونی چاہیئے کہ مرزائی اور کمیونسٹ مسلم لیگ کے رُکن نہیں ہو سکتے۔ مرزائی اگر مسلم لیگ کے رُکن بن سکتے ہیں تو کسی بھی غیر مسلم کو مسلم لیگ کا رُکن بننے سے نہیں روکا جا سکتا۔

قرار دادِ مقاصد کے بعد یہ پابندی اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔ کمیونسٹوں کو اسلامی نظام قبول نہیں۔ ان کا کمیونزم پہ ایمان ہے، اور مرزائیوں کو تاجِ ختمِ نبوّت سے دشمنی ہے

پھر ان ہر دو گروہوں کو مسلم لیگ کا رکن بننے کی اجازت ہی کیوں دی جاتی ہے اسلام کے باغی مسلم لیگ سے باہر رہ کر مسلم لیگ یا پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے البتہ جب انہیں اندر رہ کر ریشہ دوانیوں کی اجازت دی جائے گی، تو نتائج زیادہ خطرناک اور زیادہ مُہلک ثابت ہوں گے۔"

احرار لیڈروں نے صرف تقریروں اور تحریروں کو ہی کافی نہ سمجھا، بلکہ مرزائیوں کے عقائدِ فاسدہ اور عزائمِ باطلہ کے متعلق اس وقت کے لیگی قائدین اور وقت کے حکمرانوں سے ملاقاتوں اور رابطوں کا سلسلہ قائم رکھا۔ چنانچہ اس کام کے لئے خاص طور پر خطیبِ پاکستان مولینا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی مامور تھے۔ انہوں نے صدرِ مملکت سے لے کر عام افسر تک کو مرزائیوں کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین خان لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، نواب افتخار حسین ممدوٹ، چودھری محمد علی، مشتاق احمد گورمانی، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور دوسرے لیگی گورنروں اور وزیروں سے بالمشافہ کئی کئی گھنٹے گفتگو کی، ان کی خطرناک تحریروں کے حوالے دکھائے، اُن سے خُدا اور رسولؐ اور ملک و ملّت کے نام پر کوئی مؤثر قدم اُٹھانے کی پے در پے درخواستیں کیں، مگر سب بے سود گئیں۔ البتہ پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خان کے ساتھ قاضی صاحب کی جو دو مرتبہ گفتگو ہوئی وہ نہایت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی مگر انہیں قدرت کی طرف سے مہلت ہی نہ مل سکی اور وہ ایک گہری سازش کا شکار ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ خان لیاقت علی خان اور دیگر حضرات سے تفصیلی گفتگو کتاب ہٰذا میں کسی دوسری جگہ پیش کی جا رہی ہے۔

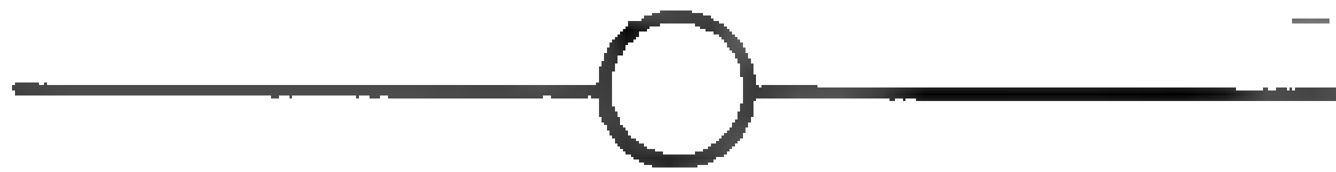
خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد احرار زعما کو یقین ہو چلا تھا کہ اب لیگی حکمران مرزائیوں کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے ملک و ملّت کے وسیع تر مفاد، اور جدید نسل کو ان کے خطرناک ارادوں سے

باخبر رکھنے کے لئے ایک تحریک کا پروگرام بنایا، لیکن تحریک چونکہ مکمل مایوسی، گفت و شنید کی ناکامی اور تقریروں اور تحریروں کے غیر مؤثر ہو جانے کے بعد شروع کی جا رہی تھی اس لئے احرار نے ضروری سمجھا کہ ختمِ نبوّت کے اجتماعی عقیدہ اور غیر متنازعہ مسئلہ کی خاطر مسلمانوں کے تمام مسلّمہ فرقوں کے نمائندہ علماء سے رابطہ قائم کیا جائے اور انہیں اعتماد میں لے کر متفقہ طور پر کوئی لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک مجلسِ عمل کی تشکیل کی، جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کے جیّد علماء و اکابر شامل ہوئے۔ اس مجلس کی سربراہی کے لئے متفقہ طور پر مولانا ابوالحسنات قادری کو منتخب کر لیا گیا۔ اسکی تفصیل مصنف کی ایک اور کتاب "تحریکِ ختمِ نبوّت" میں پیش کر دی گئی ہے، ملاحظہ فرمائی جائے۔

تحریکِ ختمِ نبوّت کے بعد مجلسِ احرار کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کے راہنماؤں کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ لیگ اور قادیانیوں پر بظاہر کوئی پابندی نہیں تھی، مگر دونوں عوام کی خوشنودی سے محروم ہو گئے اور ان کے خلاف عوامی غیظ و غضب اس قدر اُٹھا کہ وہ اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے اور زندہ درگور ہو کر رہ گئے۔ مگر بایں ہمہ چونکہ دونوں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، اس لئے جوڑ توڑ کی سازشوں میں مصروف ہو گئے مرزائیوں نے اب نوکر شاہی کا روپ دھار لیا تھا جبکہ مسلم لیگ میں اب غیر لیگی لوگ آنے شروع ہو گئے اور بالآخر یہ جماعت اس نوکر شاہی کی غلام بن کر رہ گئی تا آنکہ ۱۹۵۸ء میں خان محمد ایّوب خاں کے گھر کی لونڈی بنا دی گئی۔ ایّوب خاں نے اپنے عہدِ سُلطانی میں کنونشن لیگ کو سہارا دیئے رکھا، جبکہ کونسل لیگ میاں ممتاز دولتانہ کے بوڑھے کندھوں پر سوار رہی۔ بالآخر لیگ کو حکومت کا سہارا بھی دغا دے گیا، اور اس کی وراثت فضل القادر چودھری، خان عبدالقیوم خاں اور میاں ممتاز دولتانہ میں مساوی طور پر تقسیم کر دی گئی لیکن یہ وراثت چونکہ قانوناً صحیح نہیں تھی، اس لئے سب حصّے دار باہم

دست و گریبان ہو گئے۔ اس باہمی کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعت جسے عوام پہلے ہی ٹھکرا چکے تھے، حکومت کے سہارے نے بھی ٹھکرا کر رکھ دیا اور ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بغیر جنازے کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پشاور، لاڑن اور چاٹگام کی پہاڑیوں میں دفن کر دی گئی۔ چند نام لیوا باقی ہیں لیکن وہ بھی بادِ صرصر کے تھپیڑے کھانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کا وجود یا عدم وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی حال مجلسِ احرار اسلام کا ہے۔ اس کے راہنماؤں کی اکثریت طبعی عمریں پوری کر کے اپنے اللہ سے جا ملی ہے۔ بعض نے مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، جب کہ کئی راہنما جمعیۃ علماء اسلام میں شامل ہو چکے ہیں ؂

باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں



قادیانیت

ایک سیاسی جائزہ

قادیانیت ایک مستقل موضوع ہے۔ بظاہر یہ موضوع کتاب ہذا کی وسعت سے ماورا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں اس موضوع کا تعلق دنیا کے ہر اُس مسلمان سے ہے جو حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور آپ کی شریعت کو آخری اور قطعی حجّت سمجھتا ہو۔ خاص طور پر جس جماعت یا فرد کی ساری زندگی عقیدۂ ختم نبوّت کے تحفّظ میں گذری ہو، اس کا تعلّق اور گہرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ احرار اور مجلسِ تحفظ ختم نبوّت کے اکابرین کی ساری زندگیاں، قادیانیت کے محاسبہ اور ختمِ نبوّت کے دفاع اور تحفّظ میں گذری ہیں۔ ان اکابرین میں مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی شخصیت نمایاں رہی ہے۔ تحفّظِ ختمِ نبوّت کے سلسلہ میں انہوں نے کیا خدمات انجام دیں، اس کے متعلق تحقیقاتی رپورٹ کے ریمارکس ملاحظہ فرمائیں۔

"پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم کی توجہ قادیانی تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کرائی وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھا۔ قادیانیت کی مخالفت اس شخص کی زندگی کا واحد مقصد معلوم ہوتا ہے اور وہ جہاں کہیں جاتا ہے اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر بھرا ہوتا ہے۔ زیادہ اہم سیاسی واقعات کا ذکر تو درکنار، پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت پیش آجائے، کوئی افسوسناک واقعہ

رونما ہو جائے، قائد ملت قتل کر دیئے جائیں یا ہوائی جہاز گر پڑیں قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں ہی کی سازش کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

"مارچ ۱۹۵۲ء میں شجاع آبادی، کراچی کے ایک اور عالم مولانا احتشام الحق تھانوی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کرکے خواجہ ناظم الدین کے پاس لے گیا تاکہ وہ اُن کو اس غیظ و غضب سے مطلع کریں جو احمدیوں کے خلاف ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں ۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملے۔ شجاع آبادی کا چوبی صندوق اس کے ساتھ ہی تھا۔ اُس نے اس صندوق میں سے کچھ قادیانی لٹریچر نکالا۔ جس کو پڑھ کر خواجہ ناظم الدین سخت پریشان ہوئے۔"

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت، فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص۱۲۷)

قاضی صاحب زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ عدالت کے یہ ریمارکس میرے کفن کے ساتھ شامل کر دینا تاکہ شفاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحق بن سکوں۔

مَیں اپنے محدود مطالعہ کے باوجود پختہ یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ اس مادرِ گیتی میں فرنگی قوم سے زیادہ ہوشیار، مکار اور عیار قوم نے جنم نہیں لیا۔ ایک وقت تھا کہ عالمی سیاست میں فرنگی اقتدار کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور ہر بر اعظم اس کی نوآبادیات بن چکا تھا۔ دورِ اقتدار میں فرنگی کے قدم جہاں بھی پہنچے، اپنے اثرات ضرور چھوڑتے۔ یہ اثرات اس قدر گہرے، واضح اور غیر مبہم ہوتے چلے گئے کہ آج تک آزاد دُنیا ان سے نجات نہیں حاصل کر سکی ہے۔ اگرچہ فرنگی اقتدار کا وہ سورج جو بیسویں صدی کے آغاز سے اس کے وسط تک نصف النہار تک جا پہنچا تھا، بتدریج غروب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آج آئرلینڈ بھی برطانیہ کے ساتھ دو گام چلنے کو تیار نہیں ہے۔ تاہم فرنگی سیاست کی یہ کرشمہ سازی رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی نوآبادی ملک کی حدود سے باہر

نکلا ہے، اپنی شبانہ روز محنت کی وجہ سے جو معاشرہ ترتیب دے گیا ہے، وہ جوں کا توں قائم ہے۔ بالفاظ دیگر جسمانی لحاظ سے جا چکا ہے مگر رُوح پر تسلّط آج بھی قائم ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے اپنے قیام کے دوران غلامی کی جو سپرٹ پیدا کی تھی وہ علیٰ حالہٖ موجود ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود، ذہنی طور پر محکوم اقوام ابھی تک خود مختاری کی نوعیت نہیں سمجھ سکیں۔ شاید وہ اس احساس کہتری کا شکار ہوں کہ وہ صدیوں سے محکوم رہ کر کس طرح حاکم بن گئیں۔

مزید برآں فرنگی نظامِ تعلیم ہی اس نہج پر تشکیل دیا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے آئندہ نسلیں اپنی مادی ضروریات میں اس قدر اُلجھ کر رہ گئیں کہ وہ اُن سے باہر کسی دوسری چیز کا تصوّر تک نہ کر سکیں۔ چنانچہ انگریز کے چلے جانے کے باوجود تقریباً سب نوآبادیات میں وہی طرزِ تعلیم اور نظامِ تعلیم رائج ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی نظام کی بنیاد غیر ملکی طرز پر رکھی گئی ہو، اس کے برگ وبار سے وہی نتائج مرتب ہو کر سامنے آتے رہیں گے۔ محض ولائیتی آقاؤں کی جگہ دیسی آقاؤں کا آ جانا نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ فرنگی سے پوری طرح نجات حاصل کی جائے، اور یہ اسی وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے جب اس قسم کی نشانیاں یکسر ختم کر دی جائیں اور اُن کی جگہ ایک آزاد قوم کے خیالات و تصوّرات کی روشنی میں نیا نظامِ تعلیم اور نیا طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریز نے اپنے قدم پوری طرح جمانے کے لئے، جہاں گھر گھر لڑائیاں، غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا وہاں اس نے ملّتِ اسلامیہ کی اجتماعیت میں چھید ڈالنے اور جسدِ ملّی میں ناسُور پیدا کرنے کے لئے "قادیانیت" کو بھی جنم دیا۔ فرنگی جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اُسے برصغیر پاک و ہند کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لئے جاتے وقت اُسے اپنے آئندہ سامراجی تحفّظات

کے لئے کوئی نہ کوئی مستقل نشانی چھوڑ جانی چاہیئے۔ ان سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے اُسے برصغیر میں بعض خاندانوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بڑی تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ جویندہ یا بندہ کے مصداق اُسے کئی ایسے خاندان مِل گئے، جنہوں نے فرنگی تحفظات کی خاطر ہر انتہا تک پہنچنے کیلئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ان خاندانوں میں قادیان کے مرزا غلام مرتضیٰ کا خاندان بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ کیونکہ یہ خاندان ایک ایسے پروگرام کے لئے بھی تیار ہو گیا جس نے مسلمانوں کے اجتماعی ذہن میں انتشار پیدا کر کے عالم اسلام کے لئے خطرناک حالات پیدا کر دیئے۔

قادیانیت کے موضوع پر برصغیر پاک و ہند میں جب بھی کوئی آواز اُٹھی، اُسے فرقہ بازی کا نام دے کر سبوتاژ کیا گیا یا اُسے ملائیت اور گروہی سیاست کا مسئلہ گردانا گیا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ملک بھر میں جب مسلمانوں کے مسلّمہ اسلامی فرقوں نے متحدہ طور پر اس فرقہ کے عزائم کے خلاف آواز اُٹھائی تو اسے "احراری و احمدی" مسئلہ قرار دیکر اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ یہ مسئلہ کبھی جماعتی سیاست کا نہیں رہا بلکہ یہی وہ خطرناک فتنہ ہے جس کے خلاف مسلمانانِ پاک و ہند ہی نے بیک زبان آواز نہیں اُٹھائی بلکہ عالمِ اسلام کے تمام جید علماء و مشائخ نے اس کا نوٹس لیا۔ لیکن کیا کیا جائے مسلم لیگی سیاست کا کہ اُس نے مسلمانوں کے اس متفقہ عقیدہ ختمِ نبوّت اور اس کے منکرین کے مابین بنیادی اختلافات کو باہمی فرقہ بازی پر محمول کیا اور مسلمانوں کے اجتماعی مطالبات کی طرف ہمدردانہ غور کرنے کی بجائے احرار اور مسلم لیگ کے پُرانے اختلافات کو ہوا دے کر تحریکِ ختمِ نبوّت کو، نظریۂ پاکستان اور ملک کی سلامتی کے خلاف سازش قرار دیا۔

قادیانیت کا مسئلہ ایک معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، کہ یہ اپنے عزائم و مقاصد نیز خصوصی روابط کے لحاظ سے بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس کے خلاف سب سے پہلے برصغیر پاک و ہند کے جید علماء نے مذہبی محاذ سے

آواز اُٹھائی۔ اس وجہ سے اِسے ہمیشہ "چند فرقوں کا نزاعی مسئلہ" سمجھا گیا۔ بعد میں جب قادیانیت کے سیاسی عزائم کی جھلکیاں نظر آنے لگیں تو مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے پوری شرح و بسط کے ساتھ اس مسئلہ پر قلم اُٹھایا اور ثابت کیا کہ قادیانیوں کے ارادے نہایت خطرناک ہیں اور جسدِ ملّی کے لئے نہایت تباہ کن۔ اسی طرح سیاسی لیڈروں میں پہلی آواز پاکستان کے سابق وزیر اعظم سیّد حسین شہید سہروردی نے اُٹھائی اور انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدّین کو ایک طویل خط لکھا۔ بعد میں خود شہید سہروردی نے مسلمانوں کی وکالت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ مگر ان سب حقائق کے باوجود اس مسئلہ کو مُلّا کا مذہبی مسئلہ ہی سمجھا گیا۔ یا زیادہ سے زیادہ مسلمانوں میں شیعہ سُنّی ، بریلوی دیوبندی، مقلّد اور غیر مقلّد کے باہمی فروعی اختلافات کی حد تک اختلافی مسئلہ بنا دیا۔ یہ ایک گہری سازش تھی جس کی پُشت پر قادیانیوں کی پوری مشینری کام کر رہی تھی حالانکہ مسلمان فرقوں کے باہمی اختلاف کے باوجود، دین کی اساس ایک ہے جب کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان کوئی قدرِ مشترک سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

اگر آپ منیر رپورٹ کا بنظرِ غائر مطالعہ فرمائیں تو یہ چیز اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ سی آئی ڈی کو مخصوص طریق پر رپورٹ مرتب کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ مخصوص طریقہ یہ تھا کہ رپورٹیں اس طرح ترتیب دی جائیں، جس سے احرار اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات کو اجاگر کرتے ہوئے، احرار کے طرزِ عمل کو ہدفِ مطاعن بنایا جائے تاکہ اصل نزاع جو مسلمانوں اور قادیانیوں کے مابین ہے، اوجھل ہو کر رہ جائے۔ جناب آغا شورش کاشمیری نے صحیح لکھا ہے کہ "احرار کے باب میں سی آئی ڈی کا قلم زیادہ تر جرّاح کی بجائے قصّاب کا چھرا نظر آتا ہے۔"

سیاسی محاذ پر سی آئی ڈی نے احرار اور لیگ کے اختلافات کو ہوا دی۔ نیز احرار اور کانگریس کا باہمی ناطہ جوڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک جگہ رپورٹ

میں ہے :-

"احرار برصغیر کی تقسیم کے خلاف تھے۔ ان پر کانگریس اعتبار کرتی تھی اور وہ ہمیشہ کانگریس کے کارکنوں سے خلا ملا رکھتے تھے۔"[1]

کتنا سفید جھوٹ ہے اور کس قدر بہتانِ عظیم۔ سی آئی ڈی کو کیسے پتہ چلا کہ احرار پر کانگریس اعتبار کرتی تھی۔ نیز اس قسم کی سیاسی رپورٹیں مرتب کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ مگر چونکہ ایک مخصوص گروہ، اس قسم کی رپورٹیں مرتب کروا رہا تھا۔ اس لئے سی آئی ڈی کو مشین کی طرح ایسی رپورٹیں مرتب کرنا پڑیں۔ مذہبی محاذ پر سی آئی ڈی کو ہدایت تھی کہ وہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات کا ذکر نہ کریں۔ بلکہ احرار اور قادیانیوں کے مابین اختلاف بیان کریں، تاکہ پڑھنے والوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ یہ دو مذہبی فرقوں کے باہمی اختلاف کا مسئلہ ہے نہ کہ مسلمانوں کے اجتماعی عقیدہ و ایمان کا مسئلہ یا یہ کفر و اسلام کا مسئلہ ہے۔ حالانکہ احرار نے قادیانیوں کی اس چال کو سمجھتے ہی پیش بندی کے طور پر تمام مسلمہ فرقوں کو متحد کر کے ایک ایکشن کمیٹی "مجلسِ عمل" کے نام سے قائم کر لی تھی۔ تاہم قادیانیوں اور ان کے ہمنواؤں نے "مسلمانوں اور قادیانیوں میں جھگڑے" کی جگہ "احرار اور احمدی جھگڑا" بنا دیا۔ سی آئی ڈی رپورٹ ملاحظہ فرمایئے۔

"احرار، احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔"[2]

ایک اور مقام پر سی آئی ڈی کی کرشمہ سازی ملاحظہ فرمائیں۔

"آج کل جماعت احرار کا کام صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا جائے۔"[3]

بہرحال ہم منیر رپورٹ پر تفصیلی تبصرہ اپنی ایک اور کتاب "تحریکِ ختمِ نبوت"

---

[1] تحقیقاتی رپورٹ صفحہ ۱۹، محررہ ۱۹ / جون ۱۹۵۰ء۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۸ یکم دسمبر ۱۹۵۱ء۔ [3] ایضاً صفحہ ۵۶۔

کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

قادیانیت پر اس وقت بیشمار کتابیں لائبریریوں میں موجود ہیں اور اس تحریک کے تقریباً ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرے بھی۔ مگر بایں ہمہ موجودہ دور میں جس چیز کی شدّت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے وہ ہے اس تحریک کے سیاسی خدوخال کا اُجاگر کرنا۔ میں طالب علمی کے زمانے ہی سے اس تحریک کو ایک سیاسی تحریک سمجھتا رہا ہوں اور آج بھی اسے ایک زبردست سیاسی تحریک سمجھتا ہوں۔ جس کی بنیاد فرنگی مقاصد پر رکھی گئی ہے۔

فرنگی کے مقاصد کیا ہیں ؟ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل اس کا مقصدِ اوّلین ہے۔ فلسطین میں اسرائیل کی ریاست قائم کرکے مسلمانانِ عرب کے لئے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا ہے، اور وہ آج بھی اس خطرہ سے دوچار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عرب ملکوں میں باہمی اختلافات موجود ہیں لیکن میں کم از کم عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب میں سے، نااتفاقی کو کوئی سبب نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ عرب ہی نہیں عالمِ اسلام بھی اگر متحد ہو جائے تو بھی اسرائیل کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ جب تک اس کی پُشت پر برطانیہ، امریکہ اور اس کے حواریین موجود ہیں۔ بہرحال فرنگی نے اسرائیل کی ریاست قائم کرکے جہاں عالمِ عرب کے لئے ایک مستقل خطرہ پیدا کرکے رکھ دیا ہے، وہاں انہیں خطوط پر برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر فرنگی کو پھر یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ کہیں برصغیر کے مسلمان، سامراجی عزائم کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ اس لئے یہاں بھی "مرزائیل" کی ایک ریاست قائم کردی جائے تاکہ برصغیر کے بیس کروڑ مسلمان ایک متحدہ قوّت کی صورت میں اُبھر کر بڑی طاقتوں کے لئے خطرہ نہ بن سکیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ پاکستان کی تشکیل کے سلسلہ میں فرنگی کا ہاتھ تھا، تاکہ

برصغیر کے بیس کروڑ مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اُبھر کر اپنے تبلیغی مشن کے تحت سارے ہندوستان کو پاکستان نہ بنا دیں، یا ہندوستان کی سیاست پر مسلمان بحیثیت قوم کے اگر چھا گئے تو جہاں ہندومت کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو جائے گا وہاں فرنگی کی موت یقینی ہو جائے گی اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی سونے کی چڑیا سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر جائیگی بلکہ میرے نزدیک پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا اور مسلمانانِ ہند کا ایک علیحدہ مملکت کے حصول کے لئے کمربستہ ہو جانا، ہندوؤں کی عصبیت، تنگ نظری اور مسلمانوں کو اقتصادی طور پر ہمیشہ کے لئے دستِ نگر بنا دینے کے رجحان کے پیشِ نظر، ردِ عمل کے طور پر ایک ارتقائی عمل تھا جس کا جلد یا بدیر ظہور پذیر ہونا بدیہی امر بن چکا تھا۔

میں اس امر سے بھی متفق نہیں ہوں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کانگریس کا نظریۂ قومیت کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، صحیح ثابت ہوا ہے، یا متحدہ ہندوستان مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا صحیح حل تھا۔ بلکہ سقوطِ مشرقی پاکستان کو مسلم لیگ کی بدنہاد سیاست اور فوجی ٹولے کی بے لگام قیادت کی کرشمہ سازیاں تو کہا جا سکتا ہے، ایک علیحدہ مملکت کے وجود کے پس منظر کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آزادی کا حصول آسان ہے مگر اس آزادی کو برقرار رکھنا مشکل امر ہے۔ جو قومیں آزادی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں اور آزادی جیسی نعمت کی قدر نہیں کیا کرتیں اُن کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دوں کہ جا بجا مسلم لیگ پر نکتہ چینی اس امر کی غماز نہیں ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ یہی وہ نکتۂ اختلاف ہے جسے اگر بغور سمجھا جائے تو پاکستان کی غلط اور صحیح سیاست کا فرق واضح ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں مسلم لیگ کو ایک مقدس شے یا آفاقی چیز تصور کر لیا گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ غلطیوں سے مبرا ہے

یا اگر اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اُسے آسمان کی طرف سے سمجھا جائے۔ وہ نہ صرف قابلِ معافی ہے بلکہ اس پر نکتہ چینی گناہِ کبیرہ اور ملک دشمنی پر محمول کی جائے گی۔ اس نظریہ کے قلابے صدیوں پیشتر DIVINE RIGHTS OF KINGS کے نظریہ سے ملتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ہی نظریہ بادشاہت کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے گھڑا گیا اور بادشاہ کو ظلّ اللہ کہہ کر اُسے آفاقی چیز تصور کر کے عوام پر اس کی اطاعت، خدا کی اطاعت کے مترادف سمجھ لی گئی۔ اور اس کی حیثیت خطاؤں سے بلند تر بنا دی گئی۔ ہمارے ملک میں یہی حال مسلم لیگ کا، اس کی قیادت نے کیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ پاکستان، مسلم لیگ کا دوسرا نام ہے۔ یا مسلم لیگ پاکستان کا دوسرا نام ہے۔ مسلم لیگی قیادت پر نکتہ چینی کو پاکستان پر نکتہ چینی سمجھا گیا۔ نتیجتاً نکتہ چینی کرنے والوں کو غدار، وطن دشمن، ملک دشمن بلکہ اسلام دشمن تک کہا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو عوام نے ایک مقبول جماعت بنایا تھا۔ اس کے اندر وہ عناصر پیدا ہو گئے جو جماعتی سیاست اور حکومتی سیاست میں تمیز نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ جماعت کی صدارت کو حکومت کی وزارت کے ماتحت کر دیا، انجام آپ کے سامنے ہے۔ اگرچہ اس غلطی کا آغاز نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کیا تھا، بہرحال انجام بہت برا ہوا، جبکہ اس کے مقابلہ میں ہمارے پڑوس بھارت میں وزارت وصدارت میں فرق روا رکھا گیا، اور جماعت کو وسیع تر بنیادوں پر از سرِ نو منظم کر کے کانگریس سے اختلاف کرنے کو بھی ملک دشمنی سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ جس سے ایک مضبوط حزبِ اختلاف نے جنم لیا۔ ملک میں جمہوریت کا دور دورہ رہا۔ آج اسی کی بدولت چوبیس سال سے بھارت میں کانگریس برسرِ اقتدار ہے۔ غرض ہمارے ملک میں چونکہ مسلم لیگ کو جماعتی حیثیت دینے کی بجائے ایک مقدس شے کا مقام دے دیا گیا۔ اور لیگی قیادت کو انسانی قیادت کی جگہ آفاقی قیادت سمجھ لیا گیا جس کی اطاعت ہر پاکستانی پر بلا چون وچرا فرض قرار دے دی گئی۔ جماعت کو

وسیع تر بنیادوں پر منظم نہیں کیا گیا بلکہ جماعتی راہنما شروع دن سے اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف ہو گئے۔ اس لئے آج سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں انجام ہمارے سامنے ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ احرار، تقسیمِ مُلک کے منصوبہ کے خلاف تھی نہ کہ نظریۂ پاکستان کی۔ نظریۂ پاکستان اگر لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ تھا تو کون مسلمان اس کی مخالفت کر سکتا ہے۔ جو لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ کا مخالف ہو اُسے مسلمان کہلانے کا حق کون دے سکتا ہے۔

اس لئے تقسیمِ ملک اور چیز ہے اور نظریۂ پاکستان اور چیز۔ پھر احرار کا اختلاف جو تقسیم ملک تک محدود تھا وہ بھی بالآخر ختم ہو گیا کیونکہ دفاعی کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۹ء ہی سے احرار نے لیگ کی سیاسی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا جس سے رہا سہا اختلاف کا بھی یکسر خاتمہ ہو گیا۔ احرار لیڈروں نے مسلم لیگ کے لئے شب و روز کام کیا، خاص طور پر ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بھرپور حصّہ لیا۔

لیکن لیگی قیادت کو تسلیم کر لینے کا یہ مطلب کیوں لے لیا جائے کہ لیگی قیادت کی ہر غلطی کو احرار من وعن تسلیم کر لیں گے۔ خاص طور پہ ایسی غلطی جس کا تعلق براہِ راست ایمان و عقیدہ سے ہو۔ مثلاً لیگی قیادت ظفراللہ خان اور قادیانیوں کو نہ صرف "مسلمان" ہونے کی سند عطا کر دے بلکہ کلیدی عہدوں پر فائز کر دے جبکہ قادیانی نبی نبوت کو مان لینے کے بعد جمہور مسلمانوں کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ احرار بھی مسلمانوں کی ایک جماعت تھی وہ قادیانیوں کی سیاسی و مذہبی قیادت کیوں تسلیم کرتی۔

احرار تقسیمِ ملک کے منصوبہ کے خلاف تھے جو بعد میں ختم بھی ہو گیا۔ تاہم احرار کا یہ سیاسی نظریہ اُن کا عقیدہ نہیں تھا کہ تقسیمِ ملک غلط ہے یا ناقابلِ عمل ہے۔ نظریہ اور عقیدہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نظریہ کا تعلق عارضی اور وقتی حالات سے ہوتا ہے حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ نظریہ بدلتا رہتا ہے۔ نظریئے کو بدل جانا، ایمان کے بدل جانے کے مترادف نہیں ہوتا۔ نیز نظریئے کے بدلنے پر ثواب و عذاب کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اس کے برعکس عقیدہ کا تعلق ایمان و الیقان سے ہوتا ہے۔ عقیدہ سے انحراف دین سے انحراف کے مترادف ہے۔ عقیدہ کا تعلق چونکہ ایمانیات سے ہوتا ہے اس لئے اس پر جزا و سزا کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ مسولینی کہتا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں لیکن عقیدہ نہیں بدلا جا سکتا۔

احرار نے تقسیمِ ملک کے منصوبہ کے خلاف سیاسی نظریہ رکھنے کی کتنی سخت سزا پائی کہ آج تک اُسے اس "حرکت" کی سزا مل رہی ہے۔ اگرچہ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سابقہ موقف سے "تائب" بھی ہو گئے لیکن بر ایں ہمہ آج بھی اُسے ملک دشمن، کانگرس کا ہمنوا، ہندوؤں کا ایجنٹ اور اسی طرز کے دیگر "بیش قیمت القابات" سے نوازا جا رہا ہے لیکن حیرت اور شدید حیرت اس بات پر ہے کہ جس فرقہ کا عقیدہ یہ تھا اور آج تک ہے (اور ظاہر ہے کہ عقیدہ بدلا نہیں جا سکتا) کہ ہندوستان کی تقسیم غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے، وہ فرقہ نہ صرف قابلِ عفو ہے بلکہ اندرون اور بیرون ملک کلیدی عہدوں پر فائز ہونے کا جائز حق دار۔

ببیں تفاوت از راہ کجا است تا بہ کجا

چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود ابن مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوّت، فرماتے ہیں۔

"میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے لیکن قوموں کی منافرت کی وجہ سے عارضی طور پر الگ بھی کرنا پڑے تو یہ اور بات ہے۔ ہم ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں"[1]

کیا آج تک کسی محبِ وطن نے اس بیان کا کوئی نوٹس لیا؟ قادیانیوں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے۔ اور پھر جب وہ ہندوستان

---

[1] بیان مرزا محمود مندرجہ اخبار "الفضل" ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء

کی تقسیم پر بہ امر مجبوری رضامند ہوئے ہیں نہ کہ خوشی سے، تو پھر اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اس کا جواب مرزا محمود نے اپنے بیان ہی میں دے دیا ہے کہ وُہ اس لئے پاکستان آئے ہیں تاکہ "پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قادیانیوں کی یہ کوشش کس قسم کی ہوگی، اس کی نوعیت کیا ہوگی، وہ کس طرح اکھنڈ بھارت پھر سے قائم کریں گے؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا محمود کا یہ بیان ۶ مئی ۱۹۴۷ء کو دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اُن کا نقطۂ نظر بدل گیا ہو۔ ہم گذشتہ صفحات میں لکھ آئے ہیں کہ تقسیم ہند کے خلاف قادیانیوں کا "عقیدہ" تھا نہ کہ نظریہ، اور عقیدہ نہیں بدلا کرتا۔ لہٰذا تقسیم ہند کے خلاف اُن کا عقیدہ جوں کا توں آج تک قائم چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ان کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمائیں۔

"ہم نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ تقسیم اصولاً غلط ہے"۔[1]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو میرے نکتۂ نظر کی مزید وضاحت کرتا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد قادیانی کی اُمت ایک مذہبی ٹولہ ہے تو اس کا سیاسیاتِ ملکی سے کیا تعلق؟ ملک تقسیم ہو یا نہ ہو، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہو جائیں، ایک مذہبی تنظیم کس بَل بوتے پر پاکستان کو ختم کر کے اکھنڈ ہندوستان بنا دینا چاہتی ہے؟

قادیانیت کی تحریک کبھی مذہبی نہیں رہی بلکہ یہ ایک سیاسی تحریک تھی۔ جسے ہندوستان کے حالات کے تحت مذہب کا لبادہ اوڑھنا پڑا۔ اور مسلمانوں کی توجہ منعطف کرنے کے لئے اوّل اوّل غیر مسلموں، عیسائیوں اور آریاؤں کے ساتھ مناظرہ بازی بھی کرنا پڑی۔ تاہم چونکہ یہ تحریک خالصتاً ایک سیاسی تحریک تھی جس کا منتہائے مقصود یہودیوں

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء

کی طرح اسرائیل سٹیٹ کی طرز پر ایک "مرزائیل" سٹیٹ قائم کرنا تھا، اس لئے اس کے سیاسی خدوخال بھی بتدریج آشکارا ہوتے چلے گئے، جس کا مختلف اوقات میں مُسلم اکابرین کی طرف سے نوٹس لیا جانے لگا۔ چنانچہ مرزا محمود اپنے ایک بیان جو اخبار "الفضل" ۲۷ فروری و ۲ مارچ ۱۹۲۲ء میں چھپ چکا ہے، میں "کابل میں احمدیوں کی آزادی" کے زیرِ عنوان کہا تھا کہ :-

"میں کل ایک خوشخبری سُنا چکا ہوں، وہی افغانستان جہاں سید عبداللطیف صاحب شہید ہوئے تھے وہاں اب امیر نے کہا ہے کہ کسی احمدی کو مذہب کی خاطر قید نہیں کرنا چاہیئے۔ بلخ میں تین احمدی قید تھے۔ گورنر سے پوچھا گیا اُس نے کہا کہ یہ احمدی ہیں۔ حکم کیا کہ فوراً چھوڑ دو، کسی احمدی کو مذہبی معاملہ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھو ہم نہیں جانتے کہ وہاں کے لئے ہمیں کیا طریقِ عمل اختیار کرنا پڑتا۔ شاید کابل کے لئے کسی وقت جہاد ہی کرنا پڑ جاتا مگر اب دیکھو کتنا تغیر آ گیا۔ وہاں کے بادشاہ نے کہہ دیا کہ قیدی احمدیوں کو چھوڑ دو۔ پس نہیں معلوم ہمیں کب خدا کی طرف سے دُنیا کا چارج سپرد کیا جاتا ہے، ہمیں اپنی طرف سے تیار ہو رہنا چاہیئے کہ دنیا کو سنبھال سکیں۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے کہ بھلا ایک مذہبی فرقہ کے لئے دُنیا کا چارج حاصل کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔؟

مرزا محمود صاحب اس کے چند سال بعد کھُل کر باتیں کرنے لگے چنانچہ اپنی ایک مجلسِ مشاورت میں کانگریس اور مسلم لیگ میں شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کانگریس اور مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق کئی ایک اصحاب نے پُرزور تقریریں کیں۔ آخر اس بارے میں حضور نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اس وقت یہ سوال جماعت میں ایک رَو پیدا کرنے کے لئے اُٹھایا گیا ہے۔ دوست اس پر

غور کریں، اور اگلی مجلسِ مشاورت میں پھر اسے پیش کیا جائے گا۔ اس
عرصہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کو تحریری طور پر پوچھا جائے کہ کیا وہ احمدیوں
کو اپنے ساتھ سیاسی معاملات میں شریک کرنے کے لئے تیار ہیں، ان کی
طرف سے جواب آنے اور غور کرنے کے بعد مناسب فیصلہ کیا جائے گا[1]

خط کشید الفاظ پر غور فرمایئے۔ جب کانگریس اور مسلم لیگ جو خالصتہً سیاسی جماعتیں تھیں، ان سے قادیانی فرقہ کے لوگ جو بزعم خویش "مذہبی ٹولہ" ہیں، دونوں جماعتوں سے تحریری طور پر اس بات کی یقین دہانی کیوں چاہتے ہیں کہ دونوں میں سے کون "احمدیوں کو اپنے ساتھ سیاسی معاملات میں شریک کرنے کے لئے تیار ہے"۔ یہ سیاسی سودے بازی کس قسم کی تھی جو احمدیوں کے پیش نظر تھی۔ اُن کے نزدیک کانگریس اور مسلم لیگ میں ایک ہندو اور مسلمان جماعت کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس "مذہبی ٹولہ" کے نزدیک اگر اہمیت ہے تو اس بات سے ہے کہ دونوں میں سے کون سی جماعت احمدیوں کو اپنے ساتھ سیاسی معاملات میں شریک کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس پس منظر میں آپ قادیانیوں کے اُس طرزِ عمل پر ذرا غور فرمایئے جس کا مظاہرہ انہوں نے ریڈ کلف ایوارڈ کے موقع پر پیش کیا۔ جب حد بندی کمیشن پاک بھارت میں حد بندی کی تفصیلات طے کر رہا تھا، اور کانگریس و مسلم لیگ کے نمائندے، دونوں اپنے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے، اس موقع پر جماعت احمدیہ نے باؤنڈری کمیشن کے سامنے اپنا ایک الگ محضر نامہ پیش کیا۔ اپنے لئے کانگریس اور لیگ سے علیحدہ موقف اختیار کیا اور قادیان کو "ویٹیکن سٹی" قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اس محضر نامہ میں انہوں نے اپنی تعداد، علیحدہ مذہب، فوجی و سول ملازمین کی تعداد وغیرہ پیش کر کے علیحدہ رہنے کا مطالبہ کیا۔ جسے اگرچہ تسلیم نہیں کیا گیا البتہ اُن کے میمورنڈم سے کمیشن نے یہ فائدہ حاصل کر لیا کہ مسلمانوں میں سے احمدیوں کو

---

[1] روزنامہ "الفضل" جلد ۲۵، ۹ نومبر ۱۹۳۷ء نمبر ۲۶۱ ص ۲ کالم ۳

خارج کر کے گورداسپور کو مسلم اقلیت کا ضلع قرار دے کر اُسے بھارت کے حوالے کر دیا۔ اس طرح بھارت کے لئے کشمیر پہ چڑھ دوڑنے کا راستہ مل گیا۔

اس سے ایک بات مترشح ہوتی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں میں سے کسی جماعت سے قادیانیوں کی سودے بازی نہ ہو سکی تھی۔ تبھی تو وہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے ایک علیحدہ میمورنڈم پیش کرنے اور قادیان کو "ویٹیگن سٹی" قرار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، جو پاکستان کے مستقبل کے لئے نہایت تباہ کن اقدام ثابت ہوا، اور مسائل کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ پیدا ہو گیا، جس سے آج تک ہم دوچار چلے آ رہے ہیں اور رہتی دُنیا تک رہیں گے۔ یہ سزا ہمیں اس فرقہ کی بدولت ملی جو آج بھی ملتِ اسلامیہ کے جسم پر ایک ناسُور بن کر سوار ہے۔

مرزا محمود اپنے ایک بیان میں ساری دنیا کی حکومتوں کو احمدی بنانے کے ارادہ کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"پس جب تک خدا تعالےٰ موجودہ حکومتوں اور پارلیمنٹوں کو احمدی نہیں بنا دیتا، اُس وقت تک اسلامی نظام کے وہ حصّے جن پر عمل کیا جا سکتا ہے ضروری ہے کہ اُن پر عمل کیا جائے اور جب حکومتیں احمدی ہو جائیں گی تو اُس وقت اسلامی نظام کا مکمل ڈھانچہ تیار ہو گا۔"[1]

جوں جوں مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا حصول ممکن بنتا چلا گیا، توں توں مرزا محمود صاحب کا لب و لہجہ سخت ہوتا چلا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا محمود کا خیال تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ "آزاد حصّہ" مل جائے گا، جہاں ہم اپنی "سٹیٹ" قائم کر لیں گے۔ اُنہیں یہ امید بھی ہو چلی تھی کہ کانگریس یا مسلم لیگ میں سے کسی کے ساتھ کسی حد تک سیاسی سودے بازی ہو جائے گی۔ لیکن کانگریس چالاک

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۴ر دسمبر ۱۹۳۷ء۔ صنا کالم ۴

ہندوؤں کی جماعت تھی۔ بنیا کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا کرتا، بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے لُوٹ لے، اس لئے وہ بظاہر احمدیوں کی حمایت کر رہے تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے تو قادیانیوں کی حمایت میں سلسلۂ مضامین بھی لکھنا شروع کر دیا تھا، جس کا بروقت نوٹس علامہ اقبال نے لیا اور نہرو کے سلسلہ ہائے مضامین کا پس منظر واضح کر دیا کہ کونسی چیز نہرو کو قادیانیوں کا ہمنوا بنانے پر مجبور کر رہی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شنکر داس ایم بی بی ایس اپنے ایک مضمون میں، جو اخبار "بندے ماترم" میں ۲۲ اپریل ۳۲ء کو شائع ہوا، یوں رقمطراز ہیں۔

"اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں ہندوستانی قوم پرستوں اور محبّانِ وطن کو ایک ہی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے اور وہ آشا کی ایک جھلک احمدیوں کی تحریک ہے۔ جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے، وہ قادیان کو اپنا مکہ تصوّر کرنے لگیں گے اور آخر میں محب ہندو اور قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے"[1]

علامہ اقبال نے ان مضامین کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ قادیان کے متعلق میں نے جو بیان دیا تھا جسمیں جدید اصول کے مطابق صرف ایک مذہبی عقیدہ کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس سے پنڈت جی (جواہر لال نہرو) اور قادیانی دونوں پریشان ہیں غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی وحدت کے امکانات کو بالخصوص ہندوستان میں پسند نہیں کرتے"[2]

---

[1] بحوالہ "اکھنڈ بھارت اور مرزائی" صـ۳، شائع کردہ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، ملتان۔ [2] علامہ اقبال کا مضمون "اسلام اور احمدیت" مندرجہ رسالہ اسلام لاہور ۲۲ جنوری ۳۶ء بحوالہ "اکھنڈ بھارت اور مرزائی" صـ۲

مرزا محمود نے مسلم لیگ اور کانگریس کے ساتھ میز پر گفتگو کے علاوہ اُن پر اپنی قوت و طاقت کا رُعب جمانا بھی شروع کر دیا۔ تاکہ وہ اِن کے سامنے جُھک جائیں اور سیاسی سودے بازی کیلئے مجبور ہو جائیں۔ مرزا محمود کہتے ہیں۔

"ہمیں خدا تعالےٰ نے اس غرض کے لئے دنیا میں کھڑا کیا ہے کہ ہم بادشاہتوں کو اُلٹ دیں، حکومتوں کو بدل دیں اور سلطنتوں میں انقلاب پیدا کر دیں اور پھر ان بادشاہتوں، حکومتوں اور سلطنتوں کی جگہ نئی حکومتیں اور نئی سلطنتیں قائم کریں اور دنیوی حکومتوں کو اپنے ماتحت لاکر انہیں مجبور کریں کہ وہ اس تعلیم کو جاری کریں جو اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔[1]

خیال یہ تھا کہ مرزا بشیر الدین محمود پاکستان بننے کے بعد اپنے عقیدہ میں وقتی طور پر ہی سہی، کوئی تبدیلی یا تاویل نکال لیں گے یا مرزا غلام احمد صاحب کا کوئی رؤیا نکال کر پاکستان کو دل سے تسلیم کر کے اس کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم کریں گے مگر ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مرزا صاحب ایسا نہ کر سکے۔ کیونکہ اگر اکھنڈ بھارت قادیانیوں کا سیاسی نظریہ ہوتا تو شاید اپنے موقف سے ہٹ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتے۔ مگر چونکہ اکھنڈ بھارت میں "اللہ تعالےٰ کی مشیّت" کام کر رہی تھی، اس لئے اس کا تعلق عقیدہ سے تھا اور عقیدہ کبھی تبدیل نہیں کیا جاتا کیونکہ اس سے کفر لازم آجاتا ہے، اس لئے مرزا صاحب کا تعلق سرزمینِ قادیان سے اُسی طرح برقرار رہا جیسا پہلے تھا۔ قادیان جانے کی تڑپ اُسی طرح دل میں موجزن رہی جیسے پہلے تھی، قادیان کا تقدس بحالہٖ قائم رہا۔

مرزا محمود کے وکیل ڈاکٹر سر ظفر اللہ خاں نے باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش ہو کر قادیانیوں کی وکالت کی کوشش کی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ تقسیم مُلک کے وقت

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۴ منقول روزنامہ "الفضل" ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۲ کالم ۴

قادیانیوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ کر لیں گی[1]۔ مگر انہیں اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ البتہ مسلم لیگ کو جماعتی حیثیت سے اور مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے گورداسپور کے ضیاع کی وجہ سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

مسلمانوں کا جو روحانی اور قلبی تعلق مکّہ اور مدینہ کے ساتھ ہے وہ ساری دنیا پر واضح ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کا قبلہ اور قبلہ نما، مکّہ و مدینہ میں ہیں، اور ایک مسلمان جب اپنے قبلہ اور قبلہ نما کے درباروں میں جاکر حاضری کی سعادت حاصل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو کائنات کا خوش نصیب انسان سمجھتا ہے مگر بایں ہمہ شرعاً صرف انہیں مسلمانوں کے لئے زندگی میں ایک بار کعبۃ اللہ کی حاضری قرار دی گئی جو صاحب استطاعت ہوں۔ ورنہ غریب و نادار مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر ایک عام آدمی کی سمجھ سے قادیانیوں کا یہ فلسفہ بالا ہے کہ وہ قادیان کو العیاذ باللہ مکّۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ سے بھی زیادہ مقدّس سمجھتے ہیں کہ وہ قادیان میں آباد ہونے کو ہی مقصود قرار دے کر اس کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں اور اپنے مرنے والوں کو سرزمینِ پاکستان میں امانتاً دفن کرتے ہیں اور آج بھی اس انتظار میں ہیں کہ کب ان لاشوں کو اصل جائے مدفن یعنی قادیان کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

پاکستان بننے کے ایک سال بعد مرزا محمود نے اِسی تعلقِ خاطر کا اظہار اپنی ایک پریس کانفرنس میں اِن الفاظ میں کیا۔

> "کراچی ۱۷ر مارچ۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کی حالیہ پریس کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار رقمطراز ہے کہ حضرت امام جماعت احمدیہ نے پناہ گزینوں کو آبائی گھروں میں

---

[1] ہم اس کی تفصیل، پس منظر اور مختلف جماعتوں کے موقف کی تشریح، اپنی کتاب "تحریکِ ختمِ نبوّت" میں پیش کر رہے ہیں۔

بسانے کے مطالبہ کے بعد فرمایا۔ اگر حالات نے اجازت دی اور مشرقی پنجاب میں جانوں کی حفاظت اور سلامتی کا یقین دلا دیا گیا تو ہم قادیان میں جو جماعت احمدیہ کا مقدس مرکز ہے واپس جائیں گے۔[1]

اس پریس کانفرنس کے صرف ایک روز بعد ہی مرزا محمود صاحب نے ذرا کھل کر قادیان واپس جانے اور وہاں انڈین گورنمنٹ کے وفادار شہری کی حیثیت سے جو مساعی جاری رکھی ہوئی تھیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"حضور نے قادیان کی مثال دیتے ہوئے فرمایا۔ سارے مشرقی پنجاب میں قادیان اور صرف قادیان ہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ ہمیں توفیق دے، ہم اس جگہ رہیں گے۔ ہم وہاں بیٹھے ہیں اور ہر آٹھویں دسویں دن انڈین یونین کو یہ لکھ دیتے ہیں کہ ہم انڈین یونین کے وفادار باشندوں کی حیثیت سے قادیان میں واپس آنا چاہتے ہیں۔ لیکن انڈین یونین ہمیں کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ جواب دے بھی کیا۔ جب کہ دراصل اس کی نیت ہی یہ ہے کہ مسلمان وہاں نہ جائیں۔"[2]

ہم نے اب تک جتنے حوالے قادیان واپس جانے سے متعلق پیش کئے ہیں، ایک خالی الذہن مسلمان ہم سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اپنے وطن واپس جانے کی آرزو کسے نہیں ہوتی۔ اس خواہش کا اظہار کون نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں گذارش ہے کہ اپنے وطن جانے کی آرزو رکھنا اور بات ہے، لیکن ایک خاص شہر میں بسنے کو فرض قرار دینا، عقیدہ کا معاملہ ہے۔ مرزائیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ساری دنیا کو قادیان کے مقابلہ میں اس لئے ہیچ سمجھتے ہیں کہ وہ اُن کے لئے مولد النبی اور مرکز کی حیثیت رکھتا

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء صا - [2] ایضاً ۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء ص۴ کالم ۴

ہے۔ اس لئے وہ صرف قادیان کے شہری کہلانا باعث سعادت سمجھتے ہیں نہ کہ کسی دوسرے ملک کے وفادار شہری۔

چنانچہ مرزا محمود نے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مندرجہ ذیل بیان دیا۔

"حضرت امیر المؤمنین ایدہ اللہ تعالےٰ نے قادیان کا ذکر کیا کہ ہم بھی قادیان سے نکالے جا کر ہجرت پر مجبور ہوئے ہیں۔ مگر ہمارا یہ کام نہیں، کہ اپنی ہجرت گاہ میں ہی دھرنا مار کر بیٹھ جائیں، بلکہ اپنے اصل اور دائمی مرکز کو واپس حاصل کرنا ہمارا اصل فرض ہے۔" ؎ [1]

ہم گذشتہ صفحات میں لکھ آئے ہیں کہ قادیانی ساری حکومتوں کو احمدی سٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جہاں بھی موقع ملے وہ اپنے ان عزائم کی تکمیل کی کوشش کریں گے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل اور بعد میں، دو بڑی سیاسی جماعتوں' لیگ اور کانگریس سے سیاسی سودے بازی جب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور تقسیم کے وقت باونڈری کمیشن نے بھی گھاس نہ ڈالی تو قادیانیوں نے پاکستان کو "قادیانی سٹیٹ" بنانے کی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے لئے انہوں نے وقتاً فوقتاً، اپنے پیروؤں کو فوج، انتظامیہ اور دیگر محکموں میں ملازمت کرنے کی ترغیب دینی شروع کی۔ پاکستان میں ضلع جھنگ میں ایک مقام "ربوہ" کو اپنے مشن کی تکمیل کے لئے منتخب کیا۔ اُسے دفاعی لحاظ سے مضبوط بنانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کئے اور یہ زمین انہوں نے حکومتِ پاکستان سے کوڑیوں کے مول خریدی۔ اس شرط پر کہ ربوہ کی "سرزمین" میں کوئی غیر احمدی (مسلمان) مکان بنا سکے گا اور نہ ہی رہائش اختیار کر سکے گا تاکہ اُن کے مخفی کاروبار سے کسی قسم کی آگہی حاصل نہ کی جا سکے۔ حالانکہ اس قسم کی کوئی شرط ایک آزاد مملکت میں عائد نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت وہاں کے

؎ [1] روزنامہ "الفضل" ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ء صہ کالم ۱

باشندے ہیں جہاں صرف احمدی ہی آباد ہیں، کوئی غیر احمدی آباد نہیں ہے، نہ ہی اُسے آباد ہونے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مرزا محمود نے بہر حال ربوہ کی تعمیر کو ایک اہم کارنامہ قرار دیتے ہوئے ہلکے سے انداز میں "اسلامی سلطنت" کے قیام کا ذکر بھی کر گئے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"ربوہ کی تعمیر کو ہی دیکھ لو، قریباً سوا تین لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور ابھی ہم پُرانے ہٹس (HUTTS) میں رہتے ہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اُسے ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن میں نے روپیہ بیدردی سے خرچ کیا کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ اس کے بغیر لوگ کسی جگہ آباد نہیں ہو سکتے، اس کے بغیر کوئی قصبہ نہیں بن سکتا بلکہ مَیں جانتا ہوں کہ کسی "اسلامی سلطنت" کے بغیر اسلام بھی مادی طور پر غالب نہیں آسکتا۔ اس لئے پھل کو دیکھنے کے لئے مَیں جڑ کی پروا نہیں کرتا۔"[1]

قادیانیوں کی خطرناک سیاست کا ایک سنگین پہلو یہ بھی ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے تعلقات بھارتی حکومت سے جوں کے توں قائم رکھے۔ کبھی وہ قادیان کے "مقدس شہر" میں واپس جانے کے لئے بصورت بے قراری اظہار کرتے۔ کبھی کسی ہندوستانی لیڈر کی وفات پر تعزیت کا پیغام بھیج کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک "غیر سیاسی گروہ" کا کسی سیاسی شخصیت اور وہ بھی ہندو کی وفات پر تعزیت نامہ بھیجنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"مسٹر گاندھی کی موت کا پیغام جو امیر جماعت احمدیہ نے بھیجا اس میں پنڈت نہرو کو لکھا اور حلفاً لکھا۔ خدا جانتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ہمارے مقدس مرکز سے ہمیں زبردستی نکالا گیا ہے، ہم آپ کے اور آپ کی حکومت

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۲۲ / دسمبر ۱۹۴۹ء۔

کے خیر خواہ ہیں۔[1]

شاید یہ بیان کسی پیدائشی مسلم لیگی کی نظر سے نہیں گزرا۔ اگر گزرا ہے، تو خدارا فرمائیے کہ کیا فرماتے ہیں اکابرین مسلم لیگ بیچ اس مسئلہ کے کہ پاکستان کے اندر رہ کر "غیر ملکی حکومت کو خیر خواہی و وفاداری کا یقین دلانے والے"، پاکستان کے خیر خواہ اور وفادار شہری ہو سکتے ہیں؟ بیّنوا و توجروا۔

ایسے بیانات یقیناً لیگی حکومتوں کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ لیکن اِن "مقدّس مفتیوں" کے فتوے صرف وفادار شہریوں کو ہی غدّار اور "ملک دشمن" کہنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

پاکستان بننے کے ایک سال کے اندر ہی مختلف صوبوں پر قبضہ جمانے کے منصوبوں کا اظہار کھلم کھلا کیا جانے لگا۔ اس سے جہاں قادیانیوں کے خطرناک عزائم کا اظہار ہوتا ہے وہاں مسلم لیگی حکومت کی "رواداری" کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس نے قادیانیوں کے لئے مختص کی ہوئی تھی۔ چنانچہ قادیانیوں کا ترجمان روزنامہ "الفضل" اپنی اشاعت، ۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء میں لکھتا ہے۔

"بلوچستان میں تو صرف پانچ چھ لاکھ انسان بستے ہیں۔ اس میں بڑی مشکل سے صرف دو تین ہزار احمدی ہیں۔ اگر ہم سارے صوبہ کو احمدی بنالیں تو کم از کم ایک صوبہ تو ایسا ہو جائے جس کو ہم اپنا صوبہ کہہ سکیں"۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ بلوچستان کے صوبہ پر قبضہ جمانے کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے حصّوں میں حکومت کے مختلف شعبوں میں گھسنے کے احکامات وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہتے تاکہ حکومت کے اہم محکموں پر احمدی چھا جائیں، اور وقت

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۲ر فروری ۱۹۴۸ء

آنے پر بہ آسانی انقلاب لاسکیں ۔ چنانچہ مرزا محمود نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا، جس میں واضح طور پر حکم دیا گیا کہ اہم محکموں میں احمدی تعینات کرنے کے پروگرام وضع کئے جائیں۔

"جب تک سارے محکموں میں ہمارے آدمی موجود نہ ہوں، اُن سے جماعت پوری طرح فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ مثلاً موٹے موٹے محکموں میں فوج ہے، پولیس ہے، ایڈمنسٹریشن، اکاؤنٹس ہے، کسٹمز ہے، انجینرنگ ہے۔ یہ آٹھ دس موٹے موٹے محکمے جن کے ذریعہ جماعت اپنے حقوق محفوظ کرسکتی ہے۔ پیسے بھی اس طرح کمائے جائیں کہ ہر صیغے میں ہمارے آدمی موجود ہوں اور ہر طرف ہماری آواز پہنچ سکے۔

(روزنامہ "الفضل" خطبہ مرزا محمود ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

ذرا تحقیق فرمایئے کیا ان محکموں میں قادیانی بکثرت موجود نہیں ہیں۔ جب ان باتوں کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی جائے، تو جمہوریت کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور تیوری چڑھ جاتی ہے۔

تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران قادیانیت کے ترجمان روزنامہ "الفضل" نے مختلف اوقات میں جو "گوہر فشانیاں" کیں۔ اُن پر تفصیل کے ساتھ تو اپنی دوسری کتاب "تحریکِ ختمِ نبوت" میں ذکر کریں گے لیکن چند نادر نمونے یہاں بھی پیشِ خدمت ہیں۔ تاکہ ایک غیر جانبدار مبصر کم از کم غور و فکر سے کام لے کر کسی نتیجہ تک پہنچ سکے۔

مرزا محمود نے اپنی "اُمت" کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے اور تحریک کے برگ و بار سے نپٹنے کے لئے درج ذیل پیغام نشر کیا۔

"اب سر دھڑ کی بازی لگانے کا سوال ہے۔ یا کفر جیتے گا اور ہم مرجائیں گے یا کفر مرے گا اور ہم جیئیں گے۔ درمیان میں اب بات نہیں رہ سکتی۔"[1]

[1] خطبہ برائے تحریک جدید مرزا محمود، روزنامہ "الفضل" ۳۰ر نومبر ۱۹۵۱ء

کیا مرزا محمود سے پوچھا گیا کہ حضور "کفر" سے کیا مراد ہے۔ کیا پاکستان میں رہنے والے کروڑوں مسلمان "کفر" میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ قادیانی نبوت کے ماننے والے اقلیت میں ہیں۔ مرزا صاحب کی سردھڑ کی بازی لگانے کا نعرہ کن لوگوں کے خلاف ہے؟ معلوم نہیں کہ "سول وار" سے اور کیا مراد ہوتا ہے۔

سردھڑ کی بازی لگانے کے نعرہ کے بعد مرزا صاحب نے ایک مہینہ بعد باہر کی جماعتوں کو خاص ہدایات بھیجیں کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے اس لئے فوری طور پر ہدایات پر عمل درآمد کیا جائے۔ چنانچہ حکم نامہ یہ ہے۔

"باہر کی جماعتوں کو چاہیئے کہ وہ فوری طور پر اپنے خدام کی تعداد سے دفتر مرکزیہ کو اطلاع دیں کیونکہ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ مگر آدمی وہی ہوں جو کہ کم سے کم پانچ سالہ احمدی ہوں یا نسلی احمدی ہوں اور جن کے پریذیڈنٹ، سیکرٹری اور زعیم تینوں اس بات کی تصدیق کریں کہ وہ ہر قسم کی قربانی اور محنت سے کام کریں گے اور کسی قسم کی غفلت، سستی، یا غداری کا ارتکاب نہیں کریں گے"[1]

تحریکِ ختمِ نبوت کے بعد احرار اور دوسری مسلم جماعتوں کی قربانیوں کی وجہ سے کئی فائدے حاصل ہوئے۔

اوّلاً تشکیلِ پاکستان کے بعد تھوڑے ہی عرصہ کے اندر قادیانیوں کا حکومت سازی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ جن مقاصد کی تکمیل کی خاطر سر ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ بنے تھے، اس کا ایک مرحلہ جن کا تعلق خارجہ حکمتِ عملی سے تھا وہ پورا ہو چکا تھا لیکن داخلی طور پر قادیانیوں کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا کیونکہ مسلمانانِ پنجاب اپنے اختلافات کو یکسر بھلا کر ختمِ نبوت کی حفاظت کی خاطر کمربستہ ہو چکے تھے جس کا امکان

---

[1] روزنامہ "الفضل" ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء

قادیانیوں کے نزدیک توقّع کے خلاف تھا - مگر بایں ہمہ داخلی طور پہ قادیانیوں کی ناکامی نے اُن کے سارے منصوبے خاک میں مِلا دیئے۔

خارجی طور پر سر ظفر اللہ خاں نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، ان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ظفر اللہ خاں نے بحیثیت وزیر خارجہ ان ممالک سے پاکستان کے تعلقات کو مضبوط تر کیا جو سامراجی عزائم کے آئینہ دار تھے اور جن سے قادیانی اُمّت کو ہمہ قسم کی مراعات حاصل ہو سکتی تھیں - ہمارے اس دعوی کی تصدیق سردار بہادر خاں برادرِ خورد سابق صدر محمدؐ ایوب خاں کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے قومی اسمبلی میں عہدِ ایوبی میں کی تھی -

"آپ نے یہ کہہ کہ امریکہ اور برطانیہ ہمارے معاملات میں دخیل ہیں اور خواجہ ناظم الدّین کے بعد جتنے انقلابات آئے ہیں، ان میں ان دونوں کا ہاتھ تھا، مُلک میں سنسنی پیدا کر دی ہے۔ لوگ سوچنے لگے ہیں کہ واقعی ہمارا نظام اتنا کمزور تھا یا ہے کہ اس میں غیر حکومتیں دخل دے سکتی ہیں اور دخل بھی ایسا کہ جب چاہیں حکومت بدل دیں"[1]

چنانچہ ظفر اللہ خاں کی کوشش تھی کہ امریکہ و برطانیہ سے تعلّقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا جائے بلکہ پاکستان کو اِن کے بازوؤں میں اس طرح جکڑ کر رکھ دیا جائے، کہ وہ اِدھر اُدھر نہ جا سکے - کیونکہ یہی وہ قابلِ اعتماد حکومتیں تھیں جو آڑے وقت میں قادیانیوں کی ہر قسم کی مدد کو پہنچ سکتی تھیں -

(۲) ظفر اللہ خاں قادیانی کے عہدِ وزارت میں پاکستان سیٹو اور سنٹو کا رکن بنا - یہ وہ معاہدے ہیں جو سامراجی عزائم کے آئینہ دار ہیں - جن میں آج تک ہمارا ملک جکڑا

---

[1] ہفت روزہ "ترجمان اسلام" صفحہ ۵، ۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء

ہوا ہے۔ ہم نے ان معاہدوں کی وجہ سے اشتراکی ممالک اور آزاد دُنیا کی دشمنی مول لی۔ سیٹو کی وجہ سے ہم اشتراکی ممالک سے کلیتاً کٹ کر رہ گئے۔ بالفاظِ دگر امریکہ و برطانیہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا دیئے گئے۔ سنٹو کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی نگاہ میں ہمارا کردار مشکوک ہو کر رہ گیا۔

(۳) ظفر اللہ خاں نے اپنے عہدِ وزارت میں اسلامی ممالک کے ساتھ خاص طور پر ہمارے تعلّقات بگاڑے رکھے۔ ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ کہیں پاکستان کے تعلّقات اگر ان اسلامی اور عربی ملکوں سے اچھے ہو گئے تو وہ آڑے وقت میں، اسلام کے رشتہ کی وجہ سے پاکستان کی مدد کو آسکتے ہیں۔ یا اگر پاکستان کے تعلّقات ان عربی اور اسلامی ملکوں سے اچھے ہو گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پان اسلام ازم کی سپرٹ دوبارہ پیدا ہو جائے اور اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو جائیں۔ اس سے قادیانیوں کے عزائم کے ناکام ہونے کا شدید خدشہ لاحق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عرب ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اس قدر بگڑ گئے کہ جب مصر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر حملہ کیا تو ہم حملہ آوروں کا ساتھ دے رہے تھے اور غاصبوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے، جبکہ ہمارا ازلی دشمن بھارت، عرب ملکوں کی حمایت کر رہا تھا۔ اس طرح مسلمان ملکوں میں ہمارے خلاف ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نفرت کا بیج بو دیا گیا۔ جس کی سزا مدّتوں ہم بھگتتے رہے ہیں۔

(۴) ظفر اللہ خاں نے پاکستان کے تعلّقات اُن ملکوں سے نہایت خوشگوار رکھے جو اگرچہ اسلامی ممالک تھے مگر جن کی خارجہ پالیسی برطانوی و امریکی مفاد کے تابع رہی۔ اس طرح افغانستان سے بھی تعلّقات کو خراب رکھا گیا کیونکہ غیّور پٹھانوں نے کبھی قادیانیت کو خوش آمدید نہیں کہا۔

(۵) ظفر اللہ خاں کے عہد ہی میں ہمارے کے اندر غیر ملکی اڈّے قائم کر دیئے گئے جس کا

مقصد یہ تھا کہ اگر ان کے عزائم میں داخلی حالات سدِّراہ بنے تو انہیں ٹھیک کر دیا جائیگا چنانچہ پشاور کے اڈے کی طرف خاص طور پہ روس نے نشاندہی کرائی۔ جسے عہدِ ایوبی میں ختم کر دیا گیا۔

(۶) ظفراللہ خاں نے بیرونی ممالک میں ان لوگوں کو سفارتوں عہدوں پہ مامور کیا جو عقیدتاً احمدی تھے، تاکہ اگر احمدی ریاست معرضِ وجود میں آجائے تو اس نئی ریاست کو تسلیم کرانے میں زیادہ دقّتیں پیش نہ آئیں اور فوری طور پر نئی ریاست کو عالمی برادری تسلیم کرلے۔ اس چیز کی طرف مرحوم حمید نظامی ایڈیٹر روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے اپنے ایک ایڈیٹوریل میں حکومت کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ نیز جب وہ غیر ملکی دورے سے واپس آئے تو انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ ہمارے غیر ملکی سفارت خانے ایک خاص جماعت کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔

یہ ایک جھلک ہے ان کامیابیوں کی جو خارجی لحاظ سے ظفراللہ خاں نے قادیانی خلیفہ کے آئندہ عزائم کی تکمیل کے لئے انجام دیں تھیں۔ لیکن کروڑوں رحمتیں ہوں، اُن رضاکاروں پر جنہوں نے ختمِ نبوت کے نام پر جام شہادت نوش کر کے قادیانیوں کے عزائم کا رُخ موڑ کر رکھ دیا اور وقتی طور پہ وہ دب گئے۔ اسی طرح خدا کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے ان زعماء و اکابر کو جنہوں نے ان سنگین حالات میں قوم کی صحیح راہنمائی کرکے قادیانیوں کی سازشوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ میرے اس تجزیہ کی روشنی میں مرزا محمود کے بیانات ملاحظہ فرمائیں، آپ کو ایک ایک بیان واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا، اور آپ بات کی تہ تک بہ آسانی پہنچ جائیں گے۔

ثانیاً مسلمانانِ پنجاب بالخصوص اور پاکستان اور بیرونی دُنیا کے مسلمان بالعموم "قادیانیت" کے عزائم سے باخبر ہو گئے۔ قادیانیوں نے جو پبلک مقامات پر جلسے کرنے شروع کر رکھے تھے۔ تحریک کے بعد اپنے خاص مقامات پر محدود ہو کر رہ گئے۔ آج وہ

کسی جگہ پبلک پارک، میدان یا بازار میں اپنے عقائد کا پرچار نہیں کرسکتے یہ سب تحریکِ ختمِ نبوّت کا کرشمہ ہے۔

تیسرا فائدہ یہ پہنچا کہ قادیانیوں کی "اسلام کی تبلیغ" رُک گئی۔ انہوں نے شہروں کا رُخ کرنے کی بجائے دیہاتوں کا رُخ کرنا شروع کر دیا اور زن، زر اور زمین کا لالچ تبلیغ کا جزو بن کر رہ گیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پڑھے لکھے طبقہ میں "قادیانیت" کے متعلق پہلی مرتبہ "احساسِ مطالعہ" کا شوق پیدا ہوا۔ اب تک اسے ملائیت کا مسئلہ ہی سمجھا جاتا تھا، تحریک کے بعد اسے مُلک کا اہم مسئلہ سمجھا گیا اور اس پر تحقیق و مطالعہ کی مساعی جاری ہوگئیں۔

لیکن ——— ان سب باتوں کا توڑ قادیانیوں نے یہ سوچا کہ پبلک میں آنے کی بجائے کلیدی عہدوں پر قبضہ برقرار رکھا جائے۔ اس کے لئے انہیں جتنے جتن کرنا پڑے انہوں نے کئے، کیونکہ اب ان کی بقا حکومت کے مرکزی عُہدے تھے۔ چونکہ ظفراللہ خاں کا وزارت سے ہٹایا جانا اور داخلی محاذ پر شکست کھا جانا، ان کے لئے حادثۂ عظیم سے کم نہ تھا، اس لئے اب اُن کے وقار و دبدبہ کی بقا اسی میں تھی کہ وہ جوڑ توڑ کر کے اپنے عُہدوں پر برقرار رہیں اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے متعلق اب کسی کو یہ شبہ نہیں رہا کہ اس جنگ میں امریکہ نے کُھل کر بھارت کی حمایت کی تھی۔ امریکہ نے بھارت کو اپنے بھرپور تعاون کی نہ صرف پیش کش کی بلکہ زبردست اسلحہ سے بھارت کو لیس کر دیا۔ جب امریکہ پر زور دیا گیا کہ معاہدوں کی بنا پر بھارت کی جگہ پاکستان کی حمایت تمہارے لئے ضروری ہے اور تم ایک جارح ملک کی حمایت کر رہے ہو اور حلیف کی جگہ حریف کی گود میں چلے گئے ہو، تو بعد میں انکشاف ہوا کہ امریکہ نے بھارت کی اس لئے حمایت کی تھی کہ اس کے ساتھ امریکہ کا خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا ——— ستمبر ۱۹۶۵ء سے ایک ماہ پیشتر ۲؍اگست ۱۹۶۵ء کو

لندن میں جماعت احمدیہ کا پہلا یورپی کنونشن ہوا۔ جس کی روئداد روزنامہ "جنگ" راولپنڈی کی ۴ اگست ۱۹۶۵ء کے فرسٹ ایڈیشن میں ملاحظہ فرمائیں۔

"لندن ۳ اگست (نمائندہ جنگ) جماعت احمدیہ کا پہلا یورپی کنونشن جماعت کے لندن مرکز میں منعقد ہو رہا ہے جس میں تمام یورپی ممالک کے احمدیہ مشن شرکت کر رہے ہیں۔ کنونشن کا افتتاح گذشتہ روز ہیگ کی بین الاقوامی عدالت کے جج سر ظفر اللہ خاں نے کیا۔ یہ کنونشن ۷ اگست تک جاری رہے گا۔ جماعت نے مختلف ۷۵ ممالک میں اپنے مشن قائم کر لئے ہیں۔ برطانیہ میں جماعت کے ۸۱ مرکز قائم ہو چکے ہیں۔ کنونشن میں شریک مندوبین نے اس بات پر زور دیا کہ اگر احمدی جماعت برسر اقتدار آجائے تو امیروں پر ٹیکس لگائے جائیں، اور دولت کو از سر نو تقسیم کیا جائے۔ ساہوکارے اور سود پر پابندی لگا دی جائے اور شراب نوشی ممنوع قرار دی جائے۔"

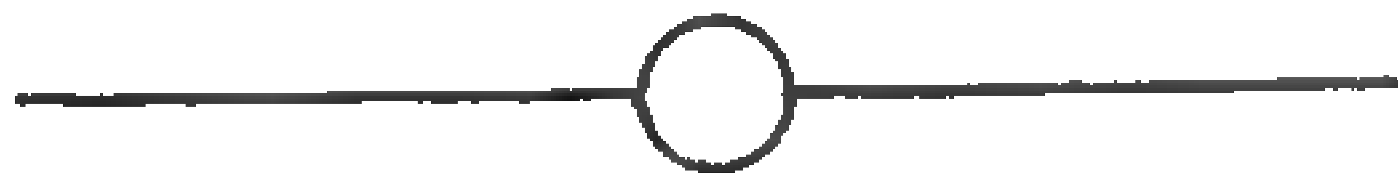
سوال پیدا ہوتا ہے کہ احمدی جماعت، پاکستان میں پاک بھارت جنگ سے عین ایک ماہ پیشتر کس ملک میں برسر اقتدار آجانے پر سوچ بچار کر رہی تھی؟ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا یہ لازمی جزو رہا ہے کہ جب کبھی ملک کے اندر کسی تحریک نے جنم لیا یا گڑبڑ ہوئی۔ اس گڑبڑ، یا افراتفری کے بعد سابقہ حکومت بدل گئی، اور نئی حکومت برسر اقتدار آگئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ایک طرف امریکہ بھارت کو پاکستان پر حملہ کے لئے اکسا رہا تھا اور دوسری طرف احمدیوں کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا کہ اب پاکستان میں تمہیں حکومت دلا دوں گا۔ اس لئے وہ آئندہ عزائم کے بارہ میں غور و فکر کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ ورنہ اس سیاق و سباق کے بغیر یہ جملہ "کنونشن میں شریک مندوبین نے اس بات پر زور دیا کہ اگر احمدی جماعت برسر اقتدار آجائے" سمجھ میں آنے سے قاصر ہے کہ آخر وہ کہاں، اور کس ملک میں برسر اقتدار آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں قادیانیوں کا آخری داؤ بھی آزمایئے جس کے بعد پاکستان دو حصوں

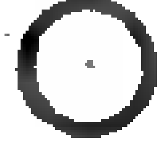
میں بٹ کر رہ گیا۔ یحییٰ خاں کے ملٹری ایکشن سے صرف ایک دن پہلے کی خبر ——— بلاتبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ (بحوالہ روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۵ / مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ آخر کالم ۲)

۲۴ / مارچ۔ کراچی۔ (اے پ پ، پ پ ا)۔ ڈھاکہ سے کراچی واپسی پر مختلف راہنماؤں کے بیانات۔ ان حضرات میں سے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ اگر اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل نہ کیا گیا تو ملک کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ انتقالِ اقتدار کا مرحلہ عبوری حکومت کے ذریعے قانونی ڈھانچہ میں ترمیم کے ذریعے طے ہونا چاہیئے۔ مولانا نورانی نے عوام پر زور دیا کہ وہ ملک کے اتحاد و سالمیت کی خاطر مزید قربانیاں دینے کے لئے تیار رہیں اور ملک تقسیم کرنے کی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیں۔ انہوں نے بتایا کہ مشرقی پاکستان کے اخبارات صدر کے اقتصادی مشیر مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد کی ڈھاکہ میں موجودگی پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر احمد اقتصادی ماہر ہیں، سیاسی امور کے ماہر نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مذاکرات میں صدر کے مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں لے

کیا اب بھی ——— شبہ کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے یہ تسلیم کرنے میں کہ "قادیانیت" ایک "سیاسی تحریک" نہیں ہے؟



ختمِ نبوّت اور قاضی صاحب



مجلس احرار اور مجلس تحفّظ ختم نبوّت میں شامل علماء اور مبلغین نے تحفّظ ختم نبوّت کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں ہیں، اگر ان کا شمار کیا جائے تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان خدمات کا صلہ کسی سے نہیں لیا۔ صلہ تو بڑی بات ہے ایسے بزرگوں کو آج تک ملک کے اندر مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے یا تہذیبِ نو کے دلدادگان اُنہیں "تنگ نظر، فرقہ پرست اور رجعت پسند" قرار دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں، تاریخ میں ان کی خدمات کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ اگر اس قبیل سے متعلق بعض بزرگوں کا ذکر سیاسی حیثیت سے اخبارات میں چھپ جاتا ہے تو میں جانتا ہوں کہ ان نازک طبائع پر کیا گزرتی ہے جو اُن کا نام تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی ہیں۔

غرض عقیدۂ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں جو بزرگ تشکیلِ پاکستان سے قبل کام کرتے رہے ہیں یا آج تک کر رہے ہیں، روشن خیالوں کے نزدیک موجودہ معاشرہ میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے۔ مقام ہو یا نہ ہو، بہر حال یہ لوگ ؏

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا

پر عمل کرتے ہوئے اپنی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی راہ میں غیروں کے علاوہ اپنوں نے جو کانٹے بچھائے، جو مشکلات پیدا کیں، مصائب و آلام کے جو دروازے کھولے۔ قید و بند کی آزمائشوں میں جس قدر مبتلا کیا، مُلک دشمنی کے جو تمغے عطا کئے، یہ ایک ایسی دلگداز، دلخراش اور دلگیر داستان ہے جو اگرچہ ماضی کی تاریخ کا حصّہ بن چکی ہے لیکن

جس کے لئے ضروری ہے کہ وقت کا مؤرخ انہیں صفحۂ قرطاس پر لا کر اصلی —— "ملت فروشوں، ملک دشمنوں اور پاکستان کے اپنے تئیں خیر خواہوں" کے چہروں سے نقاب اُلٹ دے۔

میں ذاتی طور پر مسئلہ ختمِ نبوت کو ایک تحریک کی شکل دینے والوں کو ملک میں ایک نہایت مظلوم طبقہ خیال کرتا ہوں، جو اپنوں کے عدمِ تعاون اور محدود وسائل کے باوجود دو محاذوں پر بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ پہلے محاذ پر وہ دنیا کی سب سے زیادہ منظم جماعت (قادیانی) سے بر سرِ پیکار ہیں اور اس کی سرگرمیوں اور فتنہ سامانیوں سے اندرونِ ملک عوام و خواص کو آگاہ کر رہے ہیں۔

دوسرے محاذ پر یہ طبقہ عالمی سطح پر بھی اس فتنۂ ضالّہ کے پس منظر کو واضح کر کے ایک مغضوب اور سازشی قوم یہود کے ساتھ اس کے خصوصی روابط کو اسلامی ملکوں میں طشت از بام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ دو سازشی قومیں ہیں جن کی وجہ سے، بین الاقوامی اور بین الاسلامی امن کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ دونوں کا خالق فرنگی سامراج ہے۔ گویا عالمی امن کو تہ و بالا کرنے میں فرنگی سامراج کا وجود سب سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف برصغیر کی حریت پسند جماعتیں آج تک فرنگی اور اس کی ذرّیت سے بر سرِ پیکار چلی آ رہی ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی حریت پسند گروہ فرنگی سامراج سے بر سرِ پیکار ہے۔

علاوہ ازیں اس گئے گذرے دور میں جبکہ مذہب ایک اضافی یا انفرادی مسئلہ بن چکا ہے، مذہب سے مسلسل لگاؤ رکھنے کی مشق کرانا انہیں بزرگوں کا ہی کارنامہ ہے۔ اس مادی دور میں اگر رُوحانیت کی کوئی جھلک نظر آتی ہے، تو کریڈٹ اسی طبقہ کو جاتا ہے۔

میرے نزدیک عشقِ رسول، ختمِ نبوت کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آج کے اس

بجلی کے چراغوں کے دور میں یہ لوگ عشقِ رسولؐ کی شمع فروزاں کئے ہوئے ہیں عشقِ رسولؐ ایک مسلمان کا سرمایۂ حیات ہے، اور اس سرمایۂ حیات کی دیکھ بھال اور نگرانی کے فرائض بوریا نشینوں کا یہی گروہ سرانجام دے رہا ہے۔

مسئلہ ختمِ نبوت کی حفاظت و صیانت کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے گئے سب سے مؤثر طریقہ جو اکابرینِ احرار نے منتخب کیا، وہ سلسلۂ تقاریر تھا اور یہی سلسلہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی تحریک کو مؤثر بنانے کے لئے تحریر کا سہارا لینا ضروری ہے لیکن دورِ حاضرہ میں سلسلۂ تقاریر فوری اور مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے، تاہم تقاریر کے علاوہ کسی حد تک تحریر کا بھی سہارا لیا گیا۔ ان تقاریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار کے پاس شعلہ بیان خطباء کی ایک کھیپ تیار ہو گئی جو غیر منقسم ہندوستان کے ایک حصہ سے لے کر دوسرے حصہ تک پہنچے۔ انہوں نے عوام کے چندے سے اپنی تحریک کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ مسلمانانِ ہند اس تحریک کے برگ و بار سے نہ صرف روشناس ہوئے بلکہ قادیانیوں کی سازشوں سے باخبر ہو کر میدانِ عمل میں نکل آئے۔

اوّل اوّل قادیانی اپنے مخفی عزائم سے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کرتے رہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ تعلیمِ جدید سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے مگر دینی تعلیم اور اس کے لوازمات سے یکسر کورا ہوتا ہے۔ لیکن بزعمِ خویش JACK OF ALL TRADES بننے کی کوشش کرتا ہے جبکہ اس کی حیثیت MASTER OF NONE کی سی ہوتی ہے۔

انگریز نے برصغیر پاک و ہند میں تعلیمی نظام ہی اس نہج پر چلایا تھا کہ ہندوستانی رنگ و نسل میں ہندوستانی کہلائیں مگر ذہناً وہ مغربی تہذیب کے دلدادہ بن جائیں۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کی یہ کرشمہ سازیاں جلد ہی ظاہر ہونے لگیں۔ مسلمان خاندان میں جنم لینے والے اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ انہیں صرف وہ اصول یا تاویل ہی بھلی لگنے لگی، جو ان کے "مغربی مزاج" سے ہم آہنگ اور موافقت رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پر فرنگی قبضہ

کے بعد، فرنگی کی ایما پر جتنی تحریکیں چلیں، ان کا نشانہ یہی تعلیم یافتہ طبقہ بنا۔ اور ان تعلیم یافتہ لوگوں نے اَن پڑھ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی مسلسل مساعی جاری رکھیں چنانچہ سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریکیں اس سلسلہ میں کسی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ اگرچہ سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات علی گڑھ تحریک میں مدغم ہو کر رہ گئے اور واضح صورت میں متشکل نہ ہو سکے، جبکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک باقاعدہ منصوبے کے تحت کُھل کر سامنے لائی گئی۔ تاہم دونوں تحریکیں مقاصد کے لحاظ سے یکساں تھیں، نتائج کے اعتبار سے مختلف ہو گئیں۔ اس کی کئی وجوہات تھیں جن کا تعلق موجودہ موضوع کی وسعت سے باہر ہے۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ دونوں تحریکیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں پروان چڑھیں کیونکہ وہ دینی تعلیم اور دینی تقاضوں سے پہلے ہی نابلد تھے، اس لئے انہوں نے ان تحریکوں کو خوش آمدید کہا۔

قادیانی، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی تحریک کو پروان چڑھتے دیکھ کر پھولے نہ سمائے۔ انہوں نے اپنے سیاسی عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے اِن باشعور افراد کو آلہ کار بنانا شروع کر دیا۔ انگریزی نظام کے تحت مُلک کی باگ ڈور چونکہ اسی طبقہ کے ہاتھ میں تھی اس لئے قادیانوں کو اپنے عزائم کی تکمیل میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ کیونکہ فرنگی سرپرستی کے علاوہ تعاونِ سرکار بھی حاصل تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد سیاسی قوّت اسی طبقہ کو حاصل ہو گئی، اس لئے قادیانیوں کو سابقہ سرپرستی اور تعاون حاصل رہا۔ مگر اس تحریک کی مخالفت کرنے والوں کے لئے نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب احرار قادیانیوں کے خلاف آواز اٹھاتے تو وہ بزورِ قوّت دبا دی جاتی کیونکہ اسے صرف ایک سیاسی جماعت کی مخالفت سمجھ کر کارروائی کی جاتی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد احرار نے اپنی سیاسی قوّت مسلم لیگ کے حوالے کر کے اپنے لئے عقیدۂ ختمِ نبوّت کا تحفّظ اور ملکی سالمیّت کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ یہ ایک دانشمندانہ اقدام تھا۔

احرار کے سامنے ملک کا دفاع، تحفّظِ ختمِ نبوت کی طرح ایک مذہبی فریضہ تھا۔ جس سے روگردانی اسلام سے غدّاری کے مترادف تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مُلک کا تحفّظ صرف مسلم لیگ کی ذمّہ داری ہی نہیں تھی بلکہ ہر اُس پاکستانی کا فریضہ تھا، جو اس مُلک کی حدود میں رہائش پذیر ہو۔ نئے ملک کے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر احرار نے لیگ سے رہی سہی مخالفت اور غلط فہمی کو یکسر ختم کرنے کے لئے لیگ کی سیاسی قیادت کو بلاشرط تسلیم کر لیا اور اپنے لئے ملک و ملّت کا تحفّظ کافی سمجھا۔

لیگ کی قیادت اگر عقل و شعور کی دولت سے مالامال ہوتی تو احرار کی اس پیش کش کو نہ صرف دل و جان سے تسلیم کرتی بلکہ اخوّت کا ہاتھ بڑھانے اور مملکت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے احرار کی اسلامی قیادت کو تسلیم کر کے اِن حریّت پسند علماء کی خدمات سے استفادہ کرتی۔ مگر چونکہ وہ نشۂ اقتدار میں خرمستیوں میں مصروف تھی، اس لئے احرار کی خدمات سے فائدہ نہ اُٹھا سکی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد ملک کی حفاظت و صیانت مسلمانانِ پاکستان کا مذہبی فریضہ تھا، جبکہ قادیانی اِسے ایک قادیانی سٹیٹ بنانے کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ مسلم لیگ ان حالات میں اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھی۔ قائدِاعظم کی رحلت ہی کیا کم حادثہ تھا جس سے اسلامیانِ پاکستان مغموم تھے۔ مفاد پرستوں نے لیاقت علی خاں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اب لیگی قیادت سوائے چند ایک کے، چھوکروں کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے لیگ کو فٹ بال بنا رکھا تھا۔ کبھی مرکز گول کر دیتا تھا تو کبھی صوبوں کو گول کرنے میں کامیابی ہو جاتی تھی۔ اس دوران قادیانی نہ صرف زیرِ زمین کام کر رہے تھے، بلکہ سول انتظامیہ، تجارت، صنعت و حرفت اور دیگر محکموں میں پوری طرح چھا چکے تھے۔ ان کی اپنی علیحدہ فوج بھی تھی جسے "فرقان بٹالین" کہا جاتا تھا۔

اس اندرونِ ملک گہری اور خطرناک سیاسی سازش کا سراغ، احرار کو مِل گیا۔

جس نے اپنے محدود وسائل کے باوجود نہ صرف لیگی قیادت کو خبردار کیا بلکہ پاکستان کے عوام کو اس عظیم فتنہ کی زیرِ زمین چالوں اور سازشوں سے باخبر رکھنے کے لئے ملک گیر دفاعی کانفرنسوں کا انعقاد شروع کر دیا۔ چنانچہ ملک کے ایک حصے سے لے کر دوسرے حصے تک انہوں نے پاکستانی عوام کو آنے والے مہیب خطرات سے آگاہ کیا۔

مرکزی حکومت نے عام انتخابات کے لئے پروگرام کا اعلان کیا۔ پروگرام کے مطابق ان انتخابات کا انعقاد ۱۹۵۱ء میں ہونا قرار پایا۔ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مختلف جماعتیں پر تول رہی تھیں۔ مسلم لیگ میں سے ایک حصہ کٹ کر جناح مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو چکا تھا، جس کی قیادت حسین شہید سہروردی کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب افتخار حسین ممدوٹ جناح لیگ کے سربراہ تھے۔ بالفاظ دیگر دولتانہ اور ممدوٹ برسرپیکار تھے۔ سرمایہ داروں کے ہر دو گروپ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جدید ہتھیاروں سے لیس میدانِ انتخاب میں اُتر پڑے۔

احرار نے جون ۱۹۵۰ء میں فیصلہ کیا کہ وہ ملکی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ البتہ انتخابات میں اگر کوئی قادیانی کھڑا ہو گا تو احرار اس کی بھرپور مخالفت کریں گے اور اس کے مقابلے میں کسی مسلمان امیدوار کی حمایت کریں گے۔ حالانکہ احرار نے لیگ سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے تھا کہ وہ انتخابات میں لیگ کی حمایت کرنے پر تیار ہیں، بشرطیکہ وہ کسی قادیانی کو لیگ کا ٹکٹ نہیں دیں گے مگر لیگی ہائی کمان نے احرار کی اس شرط کی کبھی پرواہ نہ کی۔ تاہم احرار نے انتخابات میں بالواسطہ طور پر حصہ لینے کا پروگرام تیار کر لیا اور تہیہ کر لیا کہ انتخابات میں کسی قادیانی یا مرزائی امیدوار کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ چنانچہ ملک بھر میں تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مرزائیوں کی سازشوں کے متعلق ملتِ اسلامیہ کو باخبر رکھنے کے لئے احرار لیڈر، رضاکار اور پُرجوش میدانِ عمل میں آ گئے۔ جہاں جہاں مرزائی امیدوار تھے احرار ان کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔

ان دنوں احرار لیڈروں کی تقریریں دفاعِ ملک و ملّت کے عنوان پر مُلک بھر میں جاری تھیں۔ انتخابات اور آئندہ نظامِ ملکی کی اہمیت پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا تھا چنانچہ مریدکے (ضلع شیخوپورہ) میں ۱۶ر فروری ۱۹۵۱ء کو احرار کے زیر اہتمام ایک عظیم کانفرنس ہوئی۔ جس میں صدرِ مجلس ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا صاحبزادہ فیض الحسن شاہ نے تقریریں کیں۔ قاضی صاحب نے آئندہ ملکی انتخابات کے متعلّق احرار کی پالیسی کے متعلّق وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک مجلسِ احرار اسلام پاکستان کی پالیسی کا تعلق ہے اگرچہ یہ بات اخبارات کے ذریعہ عوام الناس پر پوری طرح عیاں ہو چکی ہے اور اس کا اعادہ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم اتنا عرض کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ اس وقت مجلس احرارِ اسلام نے اپنی تمام تر مساعی، ملّی اتحاد اور ختمِ نبوّت کے لئے وقف کی ہوئی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہی مقدّس مقاصد کے لئے مجلس احرارِ اسلام نے مُلکی انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا۔ جب اس نوزائیدہ مملکت میں حزبِ مخالف برداشت نہیں کی جا سکتی، تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم الیکشنی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر لیں اور امّتِ مرزائیہ کے کفر و ارتداد کا قلع قمع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی پاکستان دشمنی کو پوری طرح بے نقاب کر دیں، ملک و ملّت کو اس فتنۂ مرتدہ سے آگاہ کریں اور بتائیں کہ یہ نام نہاد ٹولی پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں کیا کچھ کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔"

یہ ابھی کا واقعہ ہے کہ مرزا محمود نے کوئٹہ میں اپنے آئندہ عزائم کو واشگاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں صوبہ بلوچستان کو علیحدہ مرزائی صوبہ بنانا چاہیئے۔

یہ پروگرام ایک طرف ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ مرزائی پھر پاکستان اور ہندوستان کو ایک کرنے کا ردّیا شائع کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی

ہے۔ لیکن اگر قوموں کی غیر معمولی منافرت کی وجہ سے عارضی طور پر الگ بھی کرنا پڑے تو یہ اور بات ہے۔ بسا اوقات عضو ماؤف کو ڈاکٹر کاٹ دینے کا بھی مشورہ دیتے ہیں، لیکن یہ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری اور معذوری کے عالم میں اور صرف اسی وقت جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو، اور اگر پھر معلوم ہو جائے کہ اس ماؤف عضو کی جگہ نیا لگ سکتا ہے تو کون جاہل انسان اس کے لئے کوشش نہ کریگا۔ اس طرح ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوتے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر کوشش کریں گے کہ یہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائے۔"

(الفضل مورخہ ۱۶ مئی جلد ۳۵ نمبر ۱۱۶)

قاضی صاحب نے مسلم لیگی ٹکٹ کی تقسیم کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا

"ہم نہیں سمجھ سکے کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے کن مصلحتوں کی بنا پر مجلس احرار اسلام کے مطالبے کو ٹھکرا کر مرزائیوں کو ٹکٹ دینا ضروری سمجھا۔"[1]

بہر حال احرار نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو جائے مرزائیوں کو انتخابات نہیں جیتنے دیئے جائیں گے۔ اس پالیسی کے اختیار کرنے میں کسی کی ناراضگی کو کوئی وقعت نہیں دی جاتے گی کیونکہ ایمان کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں ایام میں احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" لاہور نے اپنی اشاعت ۲۴ فروری ۱۹۵۱ء میں "احرار مسلم لیگ اور مرزائی" کے عنوان سے درج ذیل ایڈیٹوریل سپرد قلم کیا۔

"احرار، مسلم لیگ اور مرزائی

اے اہلِ نظر اے دل والو! اکس بندش کو میں نرم کروں
اِک ہاتھ میں سارا عالم ہے، اِک ہاتھ میں اُن کا دامن ہے

مجلسِ احرار نے سیاسیات میں مسلم لیگ سے تعاون کا اعلان کرتے ہوئے "لاہور"

[1] روزنامہ "آزاد" لاہور مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء صفحہ ۱

ریزولیوشن" کے ذریعہ اپنی پالیسی کی وضاحت کر دی تھی۔ مجلس کی یہ پوزیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ سیاسیات سے الگ ہوتے ہی احرار کی تبلیغی سرگرمیاں ردِّ مرزائیت پہ مرکوز ہوگئیں۔ کفر و اسلام کی یہ آویزش جسے احرار اور مرزائیوں کی نبرد آزمائی پہ محمول کیا گیا تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ تا آنکہ انتخابات کا دور شروع ہوا۔ احرار اپنی محولہ بالا پالیسی کے پیش نظر مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں سے تعاون نہ کر سکتے تھے، بلکہ اس کے برعکس احرار مجبور تھے کہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں۔ یہاں تک معاملہ بالکل صاف تھا اور کسی اُلجھن کی گنجائش نہ تھی۔ مگر انتخابات کی ہماہمی اور مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر احرار نے مُلتان کی سالانہ تبلیغ کانفرنس میں ایک تجویز منظور کی اور بروقت مسلم لیگ اور عوام پر ظاہر کر دیا کہ لاہور ریزولیوشن اور طے شدہ پالیسی کے باوجود احرار مجبور نہیں کہ مسلم لیگ کے مرزائی اُمیدواروں کی امداد کریں۔ بلکہ بالاتفاق طے ہوا کہ اگر مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیا تو احرار اُن مرزائیوں کی لیگ ٹکٹ کے باوجود سخت مخالفت کریں گے اور مسلم لیگ کی خفگی اور برہمی کی قطعاً پرواہ نہ کریں گے۔ یہ اعلان احرار نے قبل از وقت اس لئے کیا، کہ مبادا مرزائی مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو احرار کی بجائے اس انتخابی لغزش اور باہمی کشمکش کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ پر ہو۔ احرار اب بھی طے شدہ پالیسی کے مطابق مسلم لیگ کے مخالفوں کی صف میں نہیں، بلکہ مرزائی نشستوں کے علاوہ ہر نشست پر مسلم لیگ کے ساتھی اور معاون ہیں۔

مسلم لیگ کی لغزش

احرار نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کو بروقت خبردار کیا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مرزائیوں کو مسلمانوں کے نام پر نمائندگی کا حق نہ دیں۔ مرزائیوں کو ٹکٹ دینے کے بعد مسلم لیگی رہنماؤں نے مختلف زاویوں سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا بعض نے قانونی صورت کو ملحوظ رکھا اور یہ کہا کہ جب تک رائے دہندگان کی فہرست

میں مرزائیوں کے ووٹ درج ہیں اور مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار نہیں دیا جاتا مسلم لیگ کس طرح مرزائیوں پر مسلم لیگ کے دروازے بند کر سکتی ہے۔

بعض نے کہا کہ لیگ کی مجبوریوں کے پیش نظر آپ لیگ کو معذور سمجھیں۔ اور عوام کو صحیح عقیدہ کے مطابق ووٹ استعمال کرنے کی اپیل کریں۔ تاکہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔

لیگ کے بعض ذمہ داروں نے مرزائی امیدواروں کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہرحال مجلس احرار کی پوزیشن بالکل صاف ہے۔ ہمیں اپنی واضح پالیسی کی موجودگی میں کام کرنا ہے۔ مسلم لیگ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان مرزائی سیٹوں پر مجلس احرار کے منہ آئے۔ اگر مسلم لیگ نے دھوکہ کھایا ہے یا مسلم لیگ مرزائیوں کو ٹکٹ دینے پر مجبور تھی تو اُسے اب مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارا راستہ نہ روکے اور مرزائی نشستوں پر انتخابی جنگ میں مسلمانوں اور مرزائیوں کو نپٹ لینے دے تاکہ مسلم لیگ کے دامن کی آلودگی دُھل جائے اور مجلس احرار خندہ پیشانی سے مسلم لیگ کی ہر ممکن امداد کر سکے۔ مجلس احرار اپنے موقف پر علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ مگر افسوس کہ مسلم لیگ دوراہے پر کھڑی ہے۔

مرزائی

غالباً ماہ اگست میں جب حکومت نے ضمنی انتخابات کا پہلا اعلان کیا تو مرزا محمود نے اپنے باوا کی اُمّت کے نام انتخابات کے متعلق ہدایت نامہ شائع کیا۔ جس میں بتایا کہ اُنہیں کس طریقے پر اور کن امیدواروں کو ووٹ دینا ہے۔ اس اعلان پر صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کے ایک رکن نے احتجاج کیا اور صوبہ مسلم لیگ کو مرزا محمود کے اس ڈکٹیٹرانہ مشورہ پر مرزائی اراکین کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا مشورہ دیا مگر صوبہ مسلم لیگ کے غلط کار رہنماؤں نے خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر اس جائز مطالبہ کو

درخور اعتنا۔ نہ سمجھا۔ مرزا محمود نے اسی روز مسلم لیگ سے غداری اور بغاوت کی ٹھان لی تھی۔ صوبہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے یا تو مرزائیوں کی چالبازیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا شاید سمجھ لینے کے باوجود نظر انداز کیا۔ نتیجہ کے طور پر آج مرزا محمود نے نہایت چالاکی سے مسلم لیگ کو مضحکہ خیز پوزیشن میں لا کھڑا کیا۔ اب صورت یہ ہے کہ تین مرزائی مسلم لیگ کا ٹکٹ لئے کھڑے ہیں اور چار نے مسلم لیگ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے مرزا محمود کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اُمّتِ مرزائیہ یا تو خود احمق ترین مخلوق ہے یا ان مرتدین نے مسلمانوں کو احمق سمجھ رکھا ہے۔ ہم آج پھر مسلم لیگ سے مطالبہ کرتے ہیں، کہ وہ مرزا محمود سے دریافت تو کرے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ جب تک مرزا محمود اپنی پوزیشن واضح نہ کریں، مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ مرزائیوں کو درخور اعتنا نہ سمجھیں۔"

روزنامہ "آزاد" لاہور۔ ۲۴ر فروری ۱۹۵۱ء

۱۹۵۱ء کے انتخابات میں بروایت مولانا محمد علی جالندھری مرحوم، دس مرزائی امیدوار انتخاب لڑ رہے تھے۔ جن میں بعض کو لیگی ٹکٹ دیئے گئے جبکہ بعض کو لیگ کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔ ان کی کوشش تھی کہ چند سیٹیں لے کر آئینی طور پر اپنے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے گا۔ احرار کو چک جھمرہ میں مرزائی امیدوار مولوی عصمت اللہ کے انتخابی حلقہ میں سب سے زیادہ مزاحمت پیش آئی۔ جہاں مولانا جالندھری مرحوم کام کر رہے تھے۔ مولوی عصمت اللہ نے علاقہ بھر کے زمینداروں، اہلکاروں اور غنڈوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا، اس لئے وہاں احرار کو نہ عام جلسوں کی اجازت تھی، نہ ہی کسی امیدوار کے حق میں کنویسنگ کی اجازت تھی۔ چنانچہ چک جھمرہ کے تھانیدار نے مولانا محمد علی کو تقاریر سے روک دیا تھا۔ وجہ جواز یہ پیش کی کہ چونکہ فساد کا خطرہ ہے لہٰذا تقریریں نہیں ہو سکتیں۔ عصمت اللہ نے مسلح ہو کر دو تین بار حملہ کرنے کی کوشش کی۔ احرار نے لاہور سے رضاکار بلائے۔ مرزائی امیدوار اپنے غنڈوں سمیت چک جھمرہ اسٹیشن پر پہنچ گیا تاکہ

احرار رضاکاروں کو گاڑی سے نیچے نہ اُترنے دیا جائے۔ چنانچہ اسٹیشن پر بھی تصادم ہوگیا۔ جس میں عصمت اللہ کا لڑکا اور بھتیجا زخمی ہوگیا۔ اس کے باقی سب ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس کھلم کھلا تصادم کے بعد مرزائی فورس پوری طرح حرکت میں آگئی اور ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ افسر تک نے کوشش کی کہ چک جھمرہ کا انتخاب بہر صورت جیتنا چاہیئے انہوں نے اپنے طور پر خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے دورے کا اعلان کر دیا۔ اس مرحلہ پر احرار نے کوشش کی کہ لیاقت علی خاں سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان سے انتخابی معاملات پر بات چیت کی جائے۔ چنانچہ احرار نے انتہائی کوشش کی کہ لیگ کے ساتھ تعاون کی راہ نکل آئے مگر ایمان و ضمیر کے سودے کے بغیر احرار نے لیگ کے ساتھ تعاون کرنے کیلئے کم سے کم شرائط یہ پیش کیں۔

۱۔ عصمت اللہ کے ساتھ تصادم میں ماخوذ مبینہ حملہ آوروں کا چالان نہ کیا جائے۔

۲۔ لیاقت علی خاں انتخابی مہم میں چک جھمرہ نہ آئیں۔

ان شرائط کے تسلیم کئے جانے کے بعد احرار، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے حق میں فضا کو سازگار بنانے کے لئے قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو بوریوالہ بھیجیں گے میاں صاحب کی پوزیشن بوریوالہ حلقہ میں مخدوش تھی۔ لیگ نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ اب سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ قاضی صاحب کو میاں دولتانہ کی کنویسنگ کے لئے کیونکر تیار کیا جائے۔ اگر وہ تیار ہو جائیں تو بوریوالہ اور مضافات کے مسلمانوں کو دولتانہ کے حق میں کیونکر آمادہ کیا جاتے۔ مولانا جالندھری اس وقت احرار پنجاب کے صدر تھے۔ انہوں نے قاضی صاحب کو بدیں مضمون حکم بھیجا کہ

"میں تمہیں بحیثیت صدر مجلس احرار اسلام پنجاب حکم دیتا ہوں کہ میاں دولتانہ کے حلقہ میں جا کر کام کرو۔ اس لئے کہ تمہاری عزت،

نبیؐ کی عزت سے زیادہ نہیں ہے۔"

قاضی صاحب تعمیلِ ارشاد کے لئے تیار ہو گئے مگر بوریوالہ کے جماعتی اور دوسرے لوگوں کو تیار کرنا مشکل نظر آرہا تھا۔ چنانچہ دولتانہ کے حق میں فضا ساز گار کرنے کے پروگرام کی اطلاع جب اہالیانِ بوریوالہ کو ملی تو انہوں نے سینکڑوں خطوط دفتر احرار بھیجے کہ دولتانہ کی پوزیشن کمزور ہے، اس مرحلہ پر قاضی صاحب کو نہ بھیجیں۔ چنانچہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ بوریوالہ کے مہتمم اور علاقہ کی مشہور شخصیت مولانا شیخ احمد نے دو خطوط لکھے۔ ایک خط ملک عبدالغفور انوریؒ ناظم مدرسہ خیرالمدارس ملتان کو لکھا۔ دوسرا خط انہی کی معرفت مولانا محمد علی جالندھری کو لکھا۔ جس میں ان سے درخواست کی گئی کہ قاضی صاحب کو بوریوالہ، دولتانہ کے انتخابات کے لئے ہرگز نہ بھیجا جائے۔ خطوط کی نقل درج ذیل ہے۔

ملک عبدالغفور انوری کے نام

مکرمی ملک انور صاحب۔ السلام علیکم

میں آج حاضر ہوا تھا۔ سُنا تھا کہ قاضی صاحب بوریوالہ آنے والے ہیں۔ مہربانی کرکے اگر آپ کے بس میں ہو تو قاضی صاحب کو بوریوالہ آنے سے روکئے۔ بورے والہ میں ۹۹ فیصد فضا ممتاز دولتانہ کے خلاف ہے۔ اس واسطے جہاں بھی ہوں، ان کو اطلاع دے دی جائے۔ مہربانی ہوگی۔ اور ہمارے سالانہ جلسہ کے متعلق آپ نے کیا تجویز کیا ہے۔ مطلع فرمائیں۔

والسلام شیخ احمد عفی عنہ

مولانا محمد علی جالندھری کے نام ——— بذریعہ انوری صاحب

محترم المقام حضرت مولانا محمد علی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف۔ کل بوریوالہ ہم نے لیگ والوں سے

سُنا ہے کہ یہاں ممتاز دولتانہ کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اس واسطے مَیں خود آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، کہ قاضی صاحب بوریوالہ میں ہرگز ہرگز تشریف نہ لاویں۔ مقامی حالات کا تقاضا ہے، بالکل تشریف نہ لاویں۔ بوریوالہ میں اس وقت ۹۹ فیصد لوگ مسلم لیگ کے خلاف ہیں۔ سوائے لوٹ مار کرنے والے دو تین آدمیوں کے ممتاز کا کوئی حامی نہیں۔ بس مکرر عرض ہے کہ قاضی صاحب ہرگز نہ آویں۔

شیخ احمد عفی عنہ

بوریوالہ ۲/۵/۱ ۲۶

جہاں کہیں قاضی صاحب ہوں، ان کو اطلاع دے دی جائے۔ نیز عرض ہے کہ ہمارے سالانہ جلسہ جو مارچ کے آخر میں کرنے کا ارادہ ہے، آپ نے کیا تجویز کی۔ مہربانی فرما کر مطلع فرماویں۔ والسّلام

شیخ احمد عفی عنہ

ان خطوط اور پیغامات کے باوجود قاضی صاحب معاہدہ کی رُو سے بوریوالہ گئے۔ اور کئی جلسوں میں تقریر کرکے فضا کو سازگار بنایا۔ چنانچہ میاں صاحب انتخاب جیت گئے۔ اُدھر خان لیاقت علی خاں چک جھمرہ تشریف نہ لے گئے اور احرار رضاروں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ مرزائیوں کو منہ کی کھانا پڑی اور وہ انتخاب ہار گئے:

خان لیاقت علی خان سے ملاقات

اس ملاقات کے عینی شاہد برادرم جناب حفیظ رضا پسروری ہیں۔ انتخابی مہم میں احراری راہنما مختلف حلقوں کے دورے کر رہے تھے۔ خاص طور پہ وہ حلقے جہاں مرزائی امیدوار، لیگ کے ٹکٹ پر یا آزاد حیثیت سے انتخاب لڑ رہے تھے۔ احرار کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ سیالکوٹ کے قصبہ سمبڑیال میں ایک مرزائی امیدوار

انتخاب لڑ رہا تھا۔ جس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کا امیدوار بھی موجود تھا۔ ان دنوں حضرت قاضی احسان احمد اور خان لیاقت علی خان سیالکوٹ کا دورہ کر رہے تھے قاضی صاحب سیالکوٹ انتخابی مہم کے سلسلہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کا قیام محترم جناب ماسٹر تاج دین کے مکان پر تھا۔ رات کو عشاء کی نماز کے بعد خواجہ صفدر صاحب جنرل سیکرٹری مسلم لیگ سیالکوٹ، قاضی صاحب کے پاس آئے اور درخواست کی، کہ کل ۴ بجے شام سمبڑیال میں مسلم لیگ کا جلسہ ہے، جہاں خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم بھی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ وہاں تقریر کریں۔ اس جلسہ کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ مسلم لیگی امیدوار کے مقابلہ میں ایک مرزائی امیدوار آزاد حیثیت سے انتخاب لڑ رہا ہے۔ چونکہ مقابلہ سخت ہے اس لئے احرار کی طرف سے آپ کی تقریر ضروری ہے قاضی صاحب نے کہا کہ آپ نے خان صاحب سے پوچھ لیا ہے کہ مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ خواجہ صفدر نے کہا قاضی صاحب! یہ میری ذمہ داری ہے چنانچہ قاضی صاحب، اپنے ساتھیوں، جناب حافظ محمد صادق صاحب اور سالار بشیر کی معیت میں ایک تانگہ پر سوار ہو کر سمبڑیال گئے۔ سمبڑیال، سیالکوٹ سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ راستے میں قاضی صاحب نے "اگوکی" نامی قصبہ میں بھی تقریر کی۔ ۴ بجے شام سمبڑیال پہنچے، جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ جب قاضی صاحب، حافظ محمد صادق صاحب اور سالار بشیر کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچے تو جلسہ گاہ میں، مجلس احرار اسلام زندہ باد، قاضی احسان احمد زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے بلند کئے گئے۔ لیگی اراکین نے بڑی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا۔ خواجہ محمد صفدر، محمد اقبال چیمہ و دیگر شہری و ضلعی اراکین مسلم لیگ نے آگے بڑھ کر قاضی صاحب کو اسٹیج پہ بٹھا دیا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ لیاقت علی خاں صاحب تشریف لائے۔ سارے مجمع میں نعروں کی گونج پیدا ہو گئی۔ خواجہ صفدر نے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام

دیئے۔ سب سے پہلے قاضی صاحب کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران مجلس احرار اسلام کا چپے تلے انداز میں تعارف کرایا۔ احرار نے استحکام و دفاعِ پاکستان کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں، ان کا ذکر کیا۔ آخر میں آپ نے محتاط انداز میں مسلم لیگی امیدوار کی حمایت میں عوام سے پُرزور اپیل کی۔ آپ کی تقریر دس منٹ تک جاری رہی۔ بعد میں لیاقت علی خاں کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ جلسہ کے اختتام پر سٹیج پر ہی لیاقت علی خاں نے خواجہ صفدر سے پوچھا کہ یہ مولوی صاحب کون ہیں؟ خواجہ صفدر نے لیاقت علی خاں سے قاضی صاحب کا تعارف کرایا۔ جس پر خان صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ دو گھنٹے بعد سیالکوٹ شہر میں جو لیگ کا جلسہ ہو رہا ہے جس سے وہ خطاب کر رہے ہیں، اس سے قاضی صاحب بھی خطاب فرمائیں۔ چنانچہ قاضی صاحب نے لیاقت علی خاں کی یہ دعوت منظور کر لی۔

سیالکوٹ شہر میں مسلم لیگ کا ایک تاریخی اجتماع تھا۔ جونہی اہلِ شہر کو معلوم ہوا کہ احرار کی طرف سے قاضی احسان احمد بھی تقریر کرنے والے ہیں تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ سیالکوٹ حلقہ کا انتخاب اس لئے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا کہ اس علقہ سے خواجہ محمد صفدر کے مقابلہ میں نواب افتخار حسین ممدوٹ بنفسِ نفیس الیکشن لڑ رہے تھے۔ قاضی صاحب اور لیاقت علی خاں کی زبردست تقاریر ہوئیں نعرہائے تکبیر، ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، مسلم لیگ، لیاقت علی خاں، قاضی احسان احمد زندہ باد کے نعروں سے سرزمینِ سیالکوٹ گونج اٹھی۔ جلسہ کے اختتام پر قاضی صاحب نے بڑھ کر لیاقت علی خاں سے مصافحہ کیا اور عرض کی کہ میں آپ سے بعض اہم امور پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ جس پر لیاقت علی نے کہا کہ آپ ابھی میرے سیلون میں تشریف لائیں۔ قاضی صاحب نے کہا۔ آدھ گھنٹہ میں حاضر ہوتا ہوں۔ قاضی صاحب فوراً حفیظ رضا کے گھر پہنچے۔ مرزائیوں کی کتابوں کا ایک صندوق جس میں مرزا غلام احمد قادیانی

کی تصانیف شامل تھیں، اُٹھانے کو کہا۔ حفیظ صاحب صندوق اُٹھائے قاضی صاحب کے ساتھ چل دیئے۔ اسٹیشن پہنچے۔ پلیٹ فارم پہ وزیر اعظم کو رخصت کرنے کے لئے صوبہ بھر کے ممتاز لیگی لیڈر موجود تھے۔ اور انتظار میں تھے کہ لیاقت علی خاں کب ملاقات کے لئے انہیں اپنے سیلون میں بُلاتے ہیں۔ جب قاضی صاحب اسٹیشن پہ ہجوم کو چیرتے ہوئے لیاقت علی خاں کے سیلون کی طرف بڑھے تو نواب صدیق علی خان نے کہا کہ وزیر اعظم آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آپ نے دیر کر دی۔ قاضی صاحب اندر جانے لگے تو صدیق علی خاں نے کہا کہ ملاقات کے لئے دس منٹ مقرر ہیں۔ حفاظتی گارڈ نے آپ کی تلاشی لی، پھر اندر جانے دیا۔ لیاقت علی خاں نے اپنی کرسی کے ساتھ قاضی صاحب کو بٹھا لیا۔ حفیظ صاحب فرش پر بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب نے ابتدائی بات چیت میں احرار اسلام کا تعارف کرایا۔ نیز بتایا کہ احرار، استحکام پاکستان کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ مزید بتایا کہ جب سے آپ نے بھارت کو "تاریخی مُکّہ" دکھایا ہے، اس وقت سے احرار ملک کے طول و عرض میں جہاد کانفرنسوں میں مصروف ہیں۔ برصغیر کی آزادی کے لئے علمائے نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، ان کا ذکر کیا۔ مرزائیت کا پس منظر بیان کیا۔ سب سے پہلے مرزائیوں کی مشہور کتاب "تذکرہ" دکھائی، اور صفحہ ۱۴ پڑھا۔ جس پر لکھا تھا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رات کا چاند تھے اور مَیں (مرزا غلام احمد) چودھویں رات کا چاند ہوں۔" لیاقت نے اس جملہ پر خود اپنی پنسل سے نشان لگایا اور کتاب میز پر رکھ دی۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے مرزا غلام احمد کی وہ تمام تصانیف دکھائیں جن میں حضور نبی کریم علیہ السلام، حضرت فاطمہؓ، حضرات حسنینؓ اور دیگر اہل اللہ کے خلاف توہین آمیز کلمات موجود تھے۔ لیاقت علی خاں ان تمام عبارات کو خود انڈر لائن کرتے گئے اور وہ کتابیں اپنی میز پر رکھ دیں۔

حفیظ رضا پسروری حلفاً بیان کرتے ہیں کہ جب قاضی صاحب نے لیاقت علی خاں کو

اکمل قادیانی کا یہ شعر ؎

محمدؐ پھر اُتر آئے ہیں ہم میں ۔۔۔ اور پہلے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں

محمدؐ دیکھنے ہوں جس نے اکمل ۔۔۔ غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

پڑھ کر سُنایا تو خود تو زار و قطار رو ہی رہے تھے، لیاقت علی خاں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور پُرنم آنکھوں سے فرمایا کہ قاضی صاحب! آپ اسی سیلون میں میرے ساتھ کراچی چلیں میں چند مزید باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب نے اپنے جماعتی پروگراموں کو منسوخ نہ کرنے کی بنا پر ساتھ چلنے سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ وعدہ کیا کہ چند روز تک کراچی حاضر ہو کر مزید ملاقات کروں گا۔ لیاقت و قاضی کی یہ ملاقات بجائے دس منٹ کے پورے پنتالیس منٹ جاری رہی۔ رخصت ہوتے وقت لیاقت علی خاں نے قاضی صاحب کو یہ الفاظ کہے کہ

"مولانا! آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب دعا کریں اللہ تعالےٰ مجھے اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین"

ایک ملاقات میں چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم نے قاضی صاحب سے کہا کہ جب سے لیاقت علی خاں نے آپ سے ملاقات کی ہے، اب کیبنٹ میٹنگ میں ظفراللہ خاں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ بلکہ سُنا ہے کہ ایک میٹنگ میں ظفراللہ خاں کو ان الفاظ میں لیاقت علی خاں نے مخاطب کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ ایک خاص جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں"

حفیظ رضا کا کہنا ہے کہ قاضی صاحب نے لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ایک ملاقات میں بتایا کہ لیاقت علی خاں کا پروگرام یہ تھا کہ مرزائیوں کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت دے کر خلافِ قانون قرار دے دیا جائے۔ لیکن زندگی نے مہلت نہ دی اور اس ملاقات کے تھوڑے عرصہ بعد لیاقت علی خاں کو ایک گہری سازش کے تحت

شہید کر دیا گیا۔

قاضی احسان احمد نے دیگر اکابرین مسلم لیگ سے بھی مسئلہ ختم نبوت پر مختلف اوقات میں ملاقاتیں کیں۔ اعلیٰ اور ذمہ دار افسروں کی ملاقاتیں ان ملاقاتوں کے علاوہ تھیں جنہیں بوجہ صفحۂ قرطاس پر لانے سے قاصر ہیں۔ البتہ وزراء اور سیاسی لیڈروں میں خواجہ ناظم الدین، چوہدری محمد علی، سردار عبدالرب نشتر، سردار بہادر خان، شیخ دین محمد گورنر سندھ، ملک امیر محمد خاں، چیف جسٹس محمد منیر، اور سربراہانِ مملکت میں سکندر مرزا اور ہاشم گزدر ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں سابق وزراء میں عبدالوحید خاں، اللہ بخش سومرو، سید حسن محمود، شیخ مسعود صادق، وزیر محمد اوستو، سردار عبدالحمید دستی وغیرہ سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ مگر آج تک کسی سے دُنیوی فائدہ نہیں اُٹھایا۔

ان ملاقاتوں اور سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کی وجہ خود بتلاتے، کہ اس سے بہت سے دینی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ ایک اعلیٰ افسر کے ہاں مہمان تھے۔ اُنہوں نے اپنے ماتحت اور ذمہ دار افسروں کو ایک خصوصی دعوت پر اکٹھا کیا ہوا تھا تاکہ قاضی صاحب کے مطالعہ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ چنانچہ قاضی صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ ساری رات بحث و تمحیص میں گزر گئی اور قادیانیت کا ایک ایک پہلو واشگاف الفاظ میں بیان کیا۔ صبح ہو گئی۔ بحمدہٖ تعالیٰ جتنے افسران اس دعوت میں شریک تھے، سب کے شکوک و شبہات دُور ہو گئے۔

خان لیاقت علی خاں سے ملاقات کی تفصیل، ہم سطور بالا میں پیش کر آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دیگر ملاقاتوں کی تفصیل بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ "ختمِ نبوت کا مسئلہ" کس کس کے دروازہ پر گیا اور کیا کیا جواب پایا۔

چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم سے ملاقات

چودھری محمد علی ہمارے سابقہ سیاستدانوں اور سرکاری افسروں کی نسبت ایک شریف، محنتی، دیانتدار اور اچھے انسان کی حیثیت سے متعارف ہیں۔

غالباً چودھری صاحب کا دامن کسی سازش یا مالی منفعت سے بالاتر رہا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ سے علیحدگی کے بعد ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنا پیٹ پال سکتے، بلکہ انہیں اتنے اعلیٰ مناصب سے علیحدگی کے بعد "پبلک" میں ملازمت کرنا پڑی۔ ان اوصافِ حمیدہ کے علاوہ ان میں سب سے بڑی خامی جرأت کا فقدان ہے۔ وہ بیچارے نہایت ڈرپوک انسان ہیں۔ جرأت مندانہ اقدام کا خیال ان کے تصور سے ماوراء ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اسکندر مرزا کو گورنر جنرل اور پھر صدارت کے عہدے پر فائز کیا۔ پھر اسی سکندر مرزا کی سازش کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ چودھری صاحب کا وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچنا بجائے خود نوکر شاہی کے تسلط کا کرشمہ ہے۔ وہ جمہوری طریق پر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز نہیں ہوئے تھے تاہم سکندر مرزا اور بعد میں ایوب خاں کا ظہور، اس سب کچھ کی بہت بڑی ذمہ داری چودھری صاحب پر بھی عائد ہوتی ہے، اور تاریخ کا طالب علم انہیں کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بعد میں اس داغ کو دھونے کے لئے چودھری صاحب نے محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب میں عوام کی رہنمائی کی اور ایوب خاں کے خلاف محاذ میں شریک ہوئے مگر معاملہ بہت دُور جا چکا تھا۔

چودھری محمد علی صاحب کے ایک لڑکے کی شادی ایم۔ ایچ صوفی، سی ایس پی، کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ قاضی صاحب کا تعلق صوفی صاحب سے نہایت دوستانہ رہا ہے۔ صوفی صاحب نہایت متین، ذہین اور قابل افسر ہیں۔ ان کا دامن کبھی داغدار نہیں رہا ہے۔ جن دنوں صدر ایوب خاں تازہ تازہ مارشل لاء لائے تھے ان دنوں یہ بات:

مشہور تھی کہ ملک بھر میں کوئٹہ کا کمشنر ہی رات کو چین کی نیند سوتا ہے۔ صوفی محمد حسین ان دنوں کوئٹہ کے کمشنر تھے۔ اس بات کا میں خود گواہ ہوں کہ جن دنوں صوفی صاحب چیف سیٹلمنٹ کمشنر مغربی پاکستان تھے۔ میں، قاضی صاحب کے ساتھ صوفی صاحب کو ملنے ان کے بنگلہ پر گیا ہوا تھا۔ تو قاضی صاحب کے ساتھ صوفی صاحب کے ڈرائیور کی بات چل نکلی۔ ڈرائیور نے کہا کہ آج ہی کئی لاکھ روپے مل رہے تھے، اگر صوفی صاحب ایک کلیم پر دستخط کر دیتے۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ صوفی صاحب سے جب کبھی ملاقات ہوتی تو انہوں نے قاضی صاحب کا نام نہایت احترام سے لیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ خیر چودھری صاحب کے لڑکے کی شادی کی تقریب میں قاضی صاحب بھی مدعو تھے، بلکہ نکاح بھی قاضی صاحب نے ہی پڑھایا۔

چودھری محمد علی، تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور یہ عہدہ ایسا تھا کہ جس کا تعلق پالیسی میٹر (POLICY MATTER) سے براہِ راست تھا۔ قاضی صاحب نے چودھری صاحب سے ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ چودھری صاحب نے وقت دیدیا۔ قاضی صاحب اپنے ساتھ کتابوں کا ایک صندوق لے کر چودھری صاحب کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ خادم ساتھ تھا۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کو مسئلہ ختمِ نبوّت کی اہمیت بتلائی۔ اس کے بعد قادیانیوں کی سازشوں سے نقاب کشائی کی۔ پاکستان، اسلام اور مسلمانوں سے ان کی دشمنی کا پسِ منظر واضح کیا۔ اکھنڈ بھارت کے سلسلہ میں مرزا محمود کے رؤیا دکھائے۔ مرزا غلام احمد کی وہ تمام تحریریں دکھائیں، جن میں انبیاؑ، صحابہ کرامؓ، اہلِ بیتؓ اور اہل اللہؒ کی توہین کے پہلو نکلتے تھے۔ چودھری صاحب بہت متاثر ہوئے یہ ملاقات رات کے دو بجے جا کر کہیں ختم ہوئی۔ سخت سردی کا عالم تھا۔ دوستوں نے خیال کیا کہ چودھری صاحب، اب قاضی صاحب کو واپس نہیں جانے دیں گے، اور

اصرار کریں گے کہ وہ چودھری صاحب کی سرکاری کوٹھی پر ہی آرام فرمالیں۔ مگر چودھری صاحب کو شاید سر ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کی خشمگیں نگاہیں نظر آرہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے قاضی صاحب کو اپنے ہاں رات کے کچھ حصّہ کے لئے بستر اور چارپائی مہیّا نہ کی۔ نتیجتاً قاضی صاحب کو اپنے ساتھی کے ساتھ رات کے دو بجے چودھری صاحب کی کوٹھی سے نکلنا پڑا۔ جب قاضی صاحب رخصت ہونے لگے تو چودھری صاحب نے از راہِ شفقت اپنی سٹاف کار پیش کرنا چاہی جسے قاضی صاحب نے بڑی شرافت سے ٹھکرا دیا۔ اور بس سٹاپ پر پہنچ گئے۔ دو گھنٹے تک بس سٹاپ پر بس کے انتظار میں سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ چونکہ کوئی کمبل یا اُوور کوٹ ساتھ نہیں لائے تھے۔ اس لئے سخت سردی کے عالم میں بس سٹاپ پر رُکے رہے۔ صبح ۴ بجے پہلی بس ملی، تو قاضی صاحب دفتر ختمِ نبوّت پہنچے۔ یہ تھی چودھری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم سے ایک تاریخی اور یادگار ملاقات کی تفصیل۔

چیف جسٹس محمد منیر سے مُلاقات

جناب محمد منیر سابق چیف جسٹس کی شخصیت ہمارے ملک میں ایک متنازعہ چلی آرہی ہے۔ اپنی کتاب "قانونِ شہادت" (EVIDENCE ACT) کی تفسیر لکھنے کے بعد وہ قابلیّت کے بلند آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن مسٹر غلام محمد گورنر جنرل کے آئین ساز اسمبلی کو توڑنے اور ملک کو پہلے مارشل لاء کی نذر کرنے کے اقدام کو قانونی تحفّظ دینے کے بعد جناب محمد منیر عدل و انصاف کے ترازو کو برابر نہ رکھ سکے اور ملک بھر میں اس فیصلہ کے بعد اپنی شہرت کو گہنا کر رکھ دیا۔ بعد میں وہ اس اقدام کی مختلف قسم کی تاویلات کرتے رہے۔ جس میں سب سے بڑی تاویل کچھ اس قسم کی تھی، کہ اگر وہ گورنر جنرل کے اقدام کو خلافِ قانون قرار دے دیتے تو ملک افراتفری اور انتشار کا شکار ہو جاتا اور انارکی پیدا ہو جاتی۔ اگر اس تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک

آزاد ملک کی عدلیہ کے سربراہ، وقتی مصلحت کے پیش نظر قانون کی حکمرانی تک کو خیرباد کہہ دینے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) عدلیہ کی جان ہے۔ جسٹس منیر کی جگہ اگر کوئی سیاسی لیڈر پہلی دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینے کا وہی جواز پیش کرتا جو جسٹس صاحب نے پیش کیا ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسمبلی کو توڑنے کے سیاسی اسباب یہی ہو سکتے تھے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جسٹس منیر نے عدلیہ کی کرسی پر بیٹھ کر قانونی فیصلہ صادر کرنے کی جگہ "سیاسی فیصلہ" کیوں صادر فرمایا۔ بہرحال میں جسٹس صاحب کے اس "سیاسی فیصلہ" کو تاریخ پاکستان میں ایک ایسا TURNING POINT سمجھتا ہوں جس کا سہارا لے کر بعد میں آنے والے آمروں نے اس قسم کے جواز پیدا کرنے کی طرح ڈال دی۔ جس نے بالآخر ملک کو قعرِ مذلت میں ڈال دیا۔ اگر جسٹس صاحب فیصلہ صادر کرتے وقت اپنے مقام و منصب کو سامنے رکھتے اور گورنر جنرل غلام محمد کے نحیف و نزار، معذور جسم کو تحفظ دینے کی بجائے ملک کے کمزور جسم کے صحیح معالج بن جاتے تو پھر ۷ اکتوبر ۵۸ء کو سکندر مرزا اور ایوب خان کو ۱۹۵۶ء کے آئین کی مٹی پلید کرنے، آئین کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑانے، ملک کو مستقل مارشل لاء کی نذر کرنے، عوام کا گلا دبانے، جمہوریت کا جنازہ نکالنے، اسلام کا تمسخر اُڑانے اور اخلاقی اقدار کو تہ و بالا کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔ میں جسٹس منیر کو غلام محمد، سکندر مرزا، ایوب خاں اور یحییٰ خاں کی طرح پورا ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ ملک کے ایک حصہ کے سقوط میں یہ "پنجتن" پورے کے پورے ذمہ دار ہیں اور کوئی غیر جانب دار مورخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا، بلکہ میری اس جسارت کو گستاخی پر محمول نہ سمجھا جائے تو عرض کروں گا کہ جسٹس منیر نے چونکہ ملک کو بگاڑنے کے مسئلہ کو آئینی اور قانونی تحفظ دیا، اس لئے وہ ان چاروں کی نسبت زیادہ سزا کا مستحق ہے۔

بہرحال منیر صاحب نے قاضی صاحب کے ایک دوست کی معرفت اُن سے ملاقات

کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور تحریک کے پسِ منظر اور ختمِ نبوت پر قاضی صاحب سے تبادلۂ خیالات کیا۔ منیر صاحب سے قاضی صاحب کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور تبادلۂ خیالات ہوتے۔ جب منیر رپورٹ منظرِ عام پر آئی، تو مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ منیر رپورٹ اسلام کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ گویا منیر صاحب نے کرسیٔ عدالت پر بیٹھ کر، دو اقساط میں اسلام اور ملک کے خلاف کی گئی دونوں سازشوں کو آئینی تحفّظ دیا۔

سردار عبدالرّب نشتر سے ملاقات

قاضی صاحب کی یہ ملاقات ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا لال حسین اختر صدر مجلس تحفّظ ختمِ نبوّت پاکستان بھی ساتھ تھے۔ ملاقات کا مقصد دفترِ ختمِ نبوّت بندر روڈ کراچی کے لئے اراضی کی REQUISITION تھی۔ اس وقت کراچی کے کمشنر ابوطالب نقوی نے ختمِ نبوّت کے دفتر کے لئے اراضی کی درخواست مسترد کر دی تھی نقوی صاحب کو سردار صاحب نے فون کیا کہ یہ فرض تو حکومت کا تھا کہ وہ ختمِ نبوّت کے لئے جگہ مہیا کرتی، مگر ہم دینے کی بجائے، دی گئی اراضی چھین رہے ہیں۔ چنانچہ نظرِثانی کی دوبارہ درخواست دی گئی جسے بعد میں منظور کر لیا گیا۔

دفترِ ختمِ نبوّت کے لئے اراضی حاصل کرنے کے بعد سردار نشتر نے قاضی صاحب سے حضرت شاہ جی کی خیریت دریافت کی۔ بعد میں سیاسیاتِ ملکی پر بات چیت شروع ہوئی تو سردار نشتر نے کہا کہ لیگ ملک کے اندر اپنا وقار کھو دے گی۔ اس لئے کہ سب عہدیداران وزارتوں پر براجمان ہیں اور وہ ایک گولی سے دو شکار کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ملک کے اندر متبادل قیادت پیدا کرنے اور پارلیمانی طرزِ حکومت میں استحکام پیدا کرنے کے لئے وزراء کو اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دینا چاہیئے۔ تاکہ وزراء اپنے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کر سکیں۔ نشتر کہنے لگے کہ سب لیگیوں نے عہدے سنبھال لئے ہیں

قوم کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ سردار نشتر سے مرزائیت کے بارہ میں بھی گفتگو ہوئی، جس میں انہوں نے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ گروہ اسلام اور پاکستان کا وفادار نہیں ہے لیکن بعض ایسی مصلحتیں درپیش ہیں کہ ان کی طرف دھیان نہیں دیا جا رہا۔ سردار صاحب کا خیال تھا کہ لیگ میں ایسے لوگ گھس آئے ہیں جو انگریز کی بوٹ پالش کرنے والے ہیں، ایسے لوگوں کی موجودگی اور قادیانیوں کے گروہ کی سرگرمیوں کا نوٹس نہ لینا ایسی وجوہات ہیں جو بالآخر لیگ کے وقار کو ختم کر دینے کا باعث بنیں گی۔

سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ میں واحد شخصیت تھی جنہیں جماعتی اور غیر جماعتی لوگ احترام و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سردار صاحب مردِ قلندر تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ وہ گورنر بھی رہے اور مرکزی وزارت کے عہدے پر بھی فائز رہے، مگر انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ قائداعظم محمد علی جناح کے معتمد ساتھیوں میں سے تھے۔ سرحد کا یہ واحد پٹھان تھا جس نے خلوصِ دل کے ساتھ لیگ کا ساتھ دیا اور تا دمِ واپسیں لیگ سے منسلک رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ آمین

سردار بہادر خاں سے ملاقات

یہ ملاقات بھی ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوئی۔ سردار بہادر خاں جب تک مطلعِ سیاست پر جلوہ گر رہے، پوری آب و تاب کے ساتھ رہے۔ مگر بدقسمتی سے ان کے برادرِ اکبر محمد ایوب خاں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک پر قبضہ کر کے ان کے لئے مشکلات پیدا کر دیں۔ بڑے بھائی کی مخالفت بڑی مشکل تھی مگر انہوں نے اوائل میں اس کو اچھی طرح نبھایا۔ ایوب خاں ملک کے صدر تھے اور سردار بہادر خاں حزبِ اختلاف کے قائد۔

سردار بہادر خاں اپنی سیاسی زندگی میں نیک نام رہے ہیں۔ بدنام سیاستدانوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا لیکن بڑے بھائی کی وجہ سے وہ جلد ہی سیاسیات سے ریٹائر ہو گئے۔ اس ریٹائرمنٹ کی کیا وجوہات تھیں، میرے نزدیک سیاسی کی بجائے

خاندانی اور گھریلو نوعیت کی وجوہات تھیں۔ سردار بہادر خاں نے پارلیمنٹری زندگی میں حزبِ مخالف کے قائد کی حیثیت سے دو مرتبہ ملک بھر میں SUSPENSE کی کیفیت پیدا کی۔ ملک کے داخلی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار اِن اشعار میں کیا۔

ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے
انجامِ گلستاں کیا ہوگا

ان اشعار کا قومی اسمبلی کے ایوان سے باہر نکلنا تھا کہ لوگوں کی زبان پر ایک زبردست موضوع آگیا۔ مقرروں نے تقریروں میں اور نقادوں نے تنقید کے ترازو میں اس کو تولا۔ ایوبی پالیسیوں پر اس سے بڑھ کر لطیف طنز کیا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ شاعروں نے اس بحر پر نظمیں لکھیں۔ اخبارات نے دبے الفاظ میں اڈیٹوریل لکھے

ایک دوسرے موقع پر اسمبلی کے اجلاس میں خارجہ پالیسی پہ تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہمارے ملک میں بیرونی مداخلت ہر سطح پر جاری ہے۔ ملک کے اندر کوئی انقلاب بیرونی مداخلت کے بغیر نہیں آیا۔ ملک کے اندر جتنی تبدیلیاں اور انقلاب لائے گئے، وہ سب بیرونی مداخلت کا کرشمہ ہیں۔ سردار بہادر خاں کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔

"امریکہ اور برطانیہ ہمارے معاملات میں دخیل ہیں اور ناظم الدین کے بعد جتنے انقلاب آئے ہیں، اُن میں ان دونوں کا ہاتھ ہے"

یہ ۶۲ء کی بات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ پریکٹس جاری ہے یا ختم ہو چکی ہے۔

سردار بہادر خاں سے ملاقات میں قاضی صاحب کے ساتھ مولانا لال حسین اختر بھی تھے۔ کراچی ختمِ نبوت کے لئے ٹیلیفون لگوانا تھا۔ چونکہ ختم نبوت کے نام پہ فون بار بار یاد دہانیوں کے باوجود نہیں لگ رہا تھا، سردار بہادر خاں کی عنایت

سے اسی وقت درخواست لکھی گئی جسے فوراً منظور کر لیا گیا اور دوسرے دن فون مل گیا۔ علاوہ ازیں سیاسیات ملکی اور مرزائیت کے موضوع بھی زیر بحث آئے۔ ان کا مزاج وہی تھا جو نشتر مرحوم کا تھا۔ مسلم لیگ میں ان لوگوں کا وجود شرافت و نجابت کی ایک درخشندہ مثال تھی۔

ہاشم گزدر ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی پاکستان سے ملاقات

ہاشم گزدر ایک نیک دل مسلمان اور قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر تھے۔ قاضی صاحب کی ملاقات اُن سے، اُن کے دورۂ یورپ سے واپسی پر ہوئی۔ اس ملاقات میں بھی مولانا تاج محمود، صدر مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان ساتھ تھے۔ چونکہ ہاشم صاحب، آئین ساز اسمبلی میں ایک اہم عہدہ پر فائز تھے لہٰذا اُن سے ملاقات اس بات پر ہوئی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت دلوانے کے لئے آئینی طور پر کیا اقدامات ضروری ہیں، اور کیا آئین ساز اسمبلی اس قسم کی قرار داد پیش کئے جانے کی متحمل ہو سکتی ہے؟ ہاشم صاحب نے ان تمام رکاوٹوں کا ذکر کیا جو اِس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پیش آ سکتی ہیں۔ قاضی صاحب نے جب یہ کہا کہ مرزائی اندرون اور بیرون ملک مرزائیت کی تبلیغ زور شور سے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتی، تو ہاشم صاحب نے کہا کہ وہ ابھی یورپی ممالک کا دورہ کر کے آ رہے ہیں۔ اس دورہ میں جو خاص بات دیکھی گئی وہ یہ تھی کہ پاکستان کا ہر سفارت خانہ مرزائیوں کی تبلیغ کا اڈہ بن چکا ہے۔ ہر سفارت خانہ میں کثیر تعداد میں مرزائیوں کا لٹریچر موجود ہے۔ اوقاتِ مطالعہ مقرر ہیں، جہاں مرزا غلام احمد کی تبلیغ و مشن سے آنے والوں کو روشناس کرایا جاتا ہے اور اُنہیں اسلام کا نام دے کر مرزائیت کی آغوش میں لے لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ دار حضرات سے بات کی جائیگی، لیکن امید نہیں کی جا سکتی کہ کوئی اقدام کیا جائے گا، کیونکہ اس عقیدہ سے متعلق افراد ہر شعبہ میں کلیدی عہدوں

پر فائز ہیں اور وہ اس قسم کی سرگرمیوں کا شاطرانہ طور پر نوٹس لیتے ہیں۔

خواجہ ناظم الدّین وزیر اعظم سے ملاقات

خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ کے ایک ممتاز خاندان کے نمایاں فرد تھے۔ پُرانے مسلم لیگی تھے۔ طبعاً شریف اور منکسر المزاج آدمی تھے۔ وہ ان معدودے چند افراد میں شمار ہوتے ہیں جو وزارتِ عظمٰی کے عہدے تک پہنچ کر بھی خدا کے حضور جھکنے میں عار نہیں سمجھتے۔ وُہ اس قدر شریف تھے جسے عرفِ عام میں "بادشاہ" کہا جاتا ہے، یعنی بھولے بھالے آدمی۔ مَیں سیاسیات کے ایک طالبِ علم ہونے کی حیثیت سے اُنہیں "سیاستدان" نہیں سمجھتا، البتہ تبلیغی جماعت کا ایک فرد ضرور سمجھتا ہوں، جسے وقت کی ستم ظریفی نے وزارتِ عظمٰی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کر دیا۔

خواجہ صاحب کی طبعی شرافت کے دوست دشمن سب قائل تھے۔ بلکہ اُن سے اس قدر غلطیاں ہوئیں کہ وہ ساری عمر سنبھالا نہ لے سکے۔ سیاست میں وہ کان کے کچّے تھے۔ چنانچہ موافق مخالف نے جس طرح چاہا، ان کے کان بھر دیئے اور اپنا ہمنوا بنا لیا۔ خان لیاقت علی خاں نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اُنہیں اپنا گورنر جنرل مقرر کیا۔ کیونکہ وہ بے ضرر آدمی تھے، اس لئے اُن سے کسی قسم کے نقصان کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر خواجہ صاحب کے دل میں با اختیار وزیر اعظم بننے کی آرزو چٹکیاں لیتی رہی۔ قدرت نے لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد اس آرزو کی تکمیل کے لئے منزل دکھا دی، خود وزیر اعظم بن گئے لیکن جس شخص کو انہوں نے اپنا گورنر جنرل مقرر کیا، وہ گورنر جنرل ناظم الدین نہ بن سکا۔ بلکہ نہ صرف خواجہ صاحب کو ٹھکانے لگا بیٹھا، ملک کو بھی جاتے جاتے ٹھکانے لگا گیا۔ میری مراد غلام محمد سے ہے، جنہیں لیاقت علی خاں نے اپنی شہادت سے چند روز قبل ان کی طویل بیماری اور شدید علالت کی وجہ سے وزارتِ خزانہ سے سبکدوش کر دیا تھا۔ نواب صدیق علی خاں نے اپنی کتاب "بے تیغ سپاہی" کے صفحہ ۴۹۴ میں خواجہ صاحب کی تقرری

بحیثیت گورنر جنرل، کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

"سچ پوچھئے تو خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو اس انتخاب کا بالکل اہل ثابت کر کے دکھلادیا۔ لیکن وہ اتنے میاں آدمی تھے کہ چند خود غرض اور بدخُو انسان نواب زادہ صاحب کی مُلک سے غیر حاضری کے موقع پر اُن کے کانوں میں زہر گھولا کرتے تھے کہ گورنر جنرلی میں کیا رکھا ہے، آپ کو تو وزیر اعظم بننا چاہیئے تھا، تاکہ آپ با اختیار حاکم ہوتے۔ آپ نے دیکھا کہ اُس نیک انسان کے دل میں یہ شوق پیدا کیا گیا جو برابر پلتا رہا اور بالآخر یہ شوق بہت مہنگا پڑا یعنی غلام محمد صاحب کے زمانہ میں ان کی تباہی و بربادی اور سیاسی موت کا باعث ہوا۔ کاش وہ اپنی جگہ پر قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے تو وہ کبھی بھی یہ روزِ بد نہ دیکھتے، اور مجھے یقین ہے کہ ان کی جگہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں چھین سکتی تھی اور وہ بجائے دکھ اور بدسلوکی سہنے کے سُکھ اور چین کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ اللہ اُن کو اپنی جوارِ رحمت اور شفاعتِ رسول عطا کرے۔ آمین۔"

اس سے پہلے خواجہ صاحب کے بحیثیت وزیر اعظم مقرر ہونے اور غلام محمد کے گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز ہونے کے متعلق صدیق علی خاں اپنا نکتہ نظر یوں پیش کرتے ہیں:۔

"اسی اثناء میں نئے گورنر جنرل اور نئے وزیر اعظم کے ناموں کا اعلان اور اور تقریبِ حلفِ وفاداری کی خبریں اور تصاویر شائع ہوئیں۔ الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب، گورنر جنرل کی گدی کو برضا و رغبت خود چھوڑ کر وزیر اعظم بن بیٹھے اور غلام محمد صاحب جنہیں وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے ان کی شدید علالت کی وجہ سے وزیر خزانہ کے عہدے سے شہادت سے چند دن قبل سبکدوش کر کے رخصت پر راولپنڈی جانے کی اجازت

دے دی تھی اور جنہیں خاکسار نے وزیر اعظم کی طرف سے کراچی چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر خیبر میل میں سوار اور رخصت کر کے خدا حافظ کہا تھا، گورنر جنرل کی خالی گدی پر براجمان ہو گئے۔ ان کی اس بیمار اور نامعقول تقرری نے تو لوگوں کو حیرت سے انگشت بدنداں کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کی تخت سے دستبرداری اور کمتر عہدہ کی قبولیت کو ان کی حُبّ الوطنی، منکسر المزاجی اور ایثار نفسی پر محمول کیا گیا۔[1]

بہر حال خواجہ صاحب کو وزارتِ عظمیٰ کا چارج سنبھالتے ہی دو قسم کی آئینی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تحریکِ ختمِ نبوّت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے بعد وزارتِ عظمیٰ سے دست برداری اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جانے کی بات تھی۔ کتاب ہٰذا کا تعلق چونکہ پہلے مسئلہ سے ہے، اس نسبت سے ہمارا موضوع تحریکِ ختمِ نبوّت تک محدود رہے گا۔

تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ پر خواجہ صاحب ہی فائز تھے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور نہایت شریف آدمی ہیں، اس لئے مسلمانانِ پاکستان کے جائز و متفقہ مطالبات، جو مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیشِ نظر کئے جا رہے ہیں، پر ہمدردانہ غور کر کے حل کرنے کی کوشش کریں گے مگر پاکستان کی تاریخ میں دو شریف وزیر اعظم —— ناظم الدین اور چودھری محمد علی —— جس قدر ملک کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے وہ حیرت انگیز ہے۔ ایک وزیر اعظم نے پہلے آمر غلام محمد کے کپکپاتے ہاتھوں پر بیعت کر کے سارا ملک اس کی تحویل میں دے دیا۔ دوسرے شریف وزیر اعظم، دوسرے آمر سکندر مرزا جیسے بدنہاد و بدسرشت انسان کو ملک پر مسلّط کرنے کا باعث بنے۔

---

[1] بے تیغ سپاہی ص۲۹۶

تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران قاضی صاحب، مولانا لال حسین اختر اور مولانا احتشام الحق تھانوی نے متعدد بار خواجہ صاحب سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے سامنے مرزائیوں کی تمام سرگرمیوں کا پس منظر و پیش منظر واضح کیا۔ پاکستان کے وجود کو تسلیم نہ کرنے، بلکہ اکھنڈ بھارت قائم کرنے کے رؤیا دکھائے گئے۔ نیز اُنہیں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ بشمول آپ، لیاقت علی خان قائد اعظم محمد علی جناح، تمام مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے اور مسلمانوں کے بزرگوں کو بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ مرزائیوں کی تمام چیدہ چیدہ کتابوں کے خوفناک حوالے دکھائے گئے۔ خواجہ صاحب کو جب ان تمام باتوں سے واقفیت ہوگئی تو وہ حیران رہ گئے اور ابتداءً انہوں نے ہمدردانہ غور کا وعدہ فرمایا بلکہ ایک سرکلر جاری بھی کر دیا جس کی رُو سے آئندہ مرزائی فرقہ کو اپنے مذہب کی تبلیغ وغیرہ کی اجازت نہیں تھی، لیکن وہ ظفر اللہ خان قادیانی کو اپنے مذہب کی تبلیغ اور جلسوں سے خطاب کرنے سے منع نہ کرسکے۔ بعد میں خواجہ صاحب نے تحریک کو بزورِ قوت ختم کرنے اور مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا مظاہرہ کرکے عقیدۂ ختم نبوت کے ساتھ اپنی روایتی محبّت و عقیدت کا ثبوت فراہم کر دیا۔

بہرحال ان ملاقاتوں کا تذکرہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں موجود ہے۔ اُن پر ہم تفصیلی تبصرہ "تحریکِ ختمِ نبوّت" کے موضوع پر لکھی جانے والی کتاب کیلئے محفوظ رکھتے ہیں۔

امین الدّین گورنر سندھ سے ملاقات

قاضی صاحب کی امین الدین گورنر سندھ سے ملاقات ۵۲ء میں ہوئی۔ مولانا تاج محمود لائل پوری کا کہنا ہے کہ گورنر سندھ سے ملاقات کے لئے جب قاضی صاحب کتابوں کا چوبی صندوق لے کر گورنر کے پاس پہنچے تو میاں صاحب بڑی رعونت سے پیش آئے۔ گردن اکڑی ہوئی، کرسی پر دراز تھے۔ ملاقات کے لئے صرف پندرہ منٹ کا وقت مقرر تھا۔ جب گورنر نے صندوق دیکھا تو بڑی نخشونت سے پوچھا کہ صندوق میں کیا ہے؟ قاضی صاحب نے کہا کہ اس میں مرزائیوں کے متعلق لٹریچر موجود ہے، جو آپ کی آگہی کے لئے

لایا ہوں کہ وہ ملک کے اندر کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ پاکستان کو اکھنڈ بھارت میں تبدیل کرنے کے بلئے کن منصوبوں پر عمل پیرا ہیں؟ گورنر نے جب یہ سُنا تو بڑے بڑے جواب دیا کہ مولوی صاحب! ایسی بہت سی باتیں سُن رکھی ہیں، چھوڑیئے ان باتوں کو، کوئی اور بات کیجیے۔ قاضی صاحب نے کہا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے، یہ مسلمانوں کے کفر و ایمان کا مسئلہ ہے مرزائی اپنے عقائد کی اعلانیہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ اگرچہ خواجہ ناظم الدین کی طرف سے انہیں اس قسم کی تبلیغ سے روک دیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے ہیں۔ گورنر نے جب قاضی صاحب کی اس قسم کی گفتگو سُنی تو اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کسی عام مولوی سے مخاطب نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی اور بااثر شخصیت سے محوِ گفتگو ہے۔ چنانچہ اُس نے ذرا آگے ہو کر قاضی صاحب سے پوچھا۔ کیا آپ خواجہ صاحب سے ملے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ ایک دفعہ؟ کئی دفعہ اُن سے مل چکا ہوں، اس کے علاوہ فلاں فلاں لیڈروں اور وزیروں سے ملا ہوں۔ تو گورنر صاحب کی اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہوگئی اور انہوں نے قاضی صاحب سے اڑھائی گھنٹہ تک تفصیلی گفتگو کی۔ آپ نے گورنر کو مرزائیت کا پس منظر اور ان کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ کیا۔

ملک امیر محمد خاں گورنر مغربی پاکستان سے ملاقات

ملک امیر محمد خاں بحیثیت انسان ایک مردم شناس، بہادر اور خود دار شخص تھے۔ بحیثیت منتظم سخت گیر انسان تھے۔ ایوب خانی دور میں انہیں مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنے عہد میں مُلک کا نظم و نسق پورے نظم و ضبط سے چلایا۔ کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کام کو اپنی مرضی سے چلائے۔ امیر محمد خاں کا دبدبہ، اعلیٰ افسر سے لے کر عام شہری کی زندگی تک نظر آتا تھا۔ وہ پکّے مسلمان تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کے زمانہ میں گورنر ہاؤس شراب و کباب کی بزم آرائیوں سے الگ تھلگ رہا۔ وہ اکیلے رہتے تھے۔ اُن کے اپنے بیٹوں تک کو کُھلم کُھلا گورنر ہاؤس میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

موسیقی و طرب کی محفلیں دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھیں۔ اُن کے سامنے ہر وقت مصلیٰ بچھا رہتا تھا۔ اُن کے زمانہ میں مغربی پاکستان میں عصمت فروشی کا کاروبار بند ہو گیا اور جسم فروشی قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی۔

ان کی مردم شناسی اور تحریکِ آزادی میں کام کرنے والوں کے متعلق عزت افزائی داستان قاضی صاحب کے آخری لمحات میں لکھ آئے ہیں۔ ملک صاحب نظریاتی طور پر احرار کے مخالف تھے، مگر بایں ہمہ ان لوگوں کو عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مرزائیوں کے وہ سخت مخالف تھے۔ ان کی ملک دشمنی اور اسلام دشمنی سے پوری طرح آشنا تھے۔ قاضی صاحب نے ایک ملاقات میں مرزا غلام احمد کی کتاب "ایک غلطی کا ازالہ" دکھائی اور اس کے مندرجات پڑھ کر سنائے۔ تو امیر محمد خاں آبدیدہ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً اس کتاب کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ قاضی صاحب نے انہیں مبارکباد کا تار بھیجا۔ مرزائیوں نے اس پابندی کے خلاف زور شور سے آواز بلند کی، اور ایوّب خاں تک رسائی کی۔ جس نے بالآخر کتاب پر سے پابندی ہٹا دی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ مرزائیوں کے لٹریچر میں آج بھی ایسا مواد کُھلم کُھلا فروخت اور شائع ہو رہا ہے جس میں انبیاء علیہم السّلام، صحابہ کرام، اہلِ بیت عظام اور اولیاء کرام کے خلاف بازاری زبان استعمال کی گئی ہے مگر بایں ہمہ ان کتابوں پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہے۔ لیکن اگر ختمِ نبوّت کے مقدّس موضوع پر کوئی کتاب لکھی جائے، یا مرزائیوں کا دلائل و براہین کی روشنی میں محاسبہ کیا جائے، تو حکومت کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔

غرض امیر محمد خاں کو کتاب مذکور سے پابندی اُٹھائے جانے کا نہایت افسوس رہا۔

سکندر مرزا سے ملاقات

پاکستان کی تاریخ میں بعض ایسے گھناؤنے کردار گذرے ہیں جن کے ذکر سے گھن

آتی ہے۔ قلم چلتے ہوئے رُکنے لگ جاتا ہے۔ جن کے منحوس وجود نے پاکستان کا وقار خاک میں مِلا دیا۔ اِن بد قماش آمروں نے مُلک کو سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی طور پر دیوالیہ بنا دیا، اِن میں سکندر مرزا سرفہرست ہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ملک کے اندر مختلف المیعاد سازشوں کو جنم دیا۔ جس نے مُلک کے اندر سمگلنگ کے کاروبار کو وسیع بنیادوں پر منظم کیا۔ غرض اس قماش کے لوگ چونکہ انگریزوں کے زرخرید غلام تھے اور ذہنی طور پر انگریزی تہذیب و معاشرت کا مکمل نمونہ تھے لیکن ملک کی بدنصیبی نے انہیں اُونچے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ لہٰذا ان کے پاس بعض اوقات اسلامی نوعیت اور ملک کی سالمیت ایسے اہم بنیادی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ بقول مولانا تاج محمود لائل پوری، قاضی صاحب کے ذمّہ جماعت کی سفارتی سرگرمیوں کا شعبہ تھا۔ اسی نسبت سے آغا شورش کاشمیری نے اپنی ایک نظم میں قاضی صاحب کو "سفیرِ اسلام" کے نام سے یاد کیا ہے جو شریکِ اشاعت ہے۔

غرض قاضی صاحب سکندر مرزا کے پاس بھی گئے۔ آپ نے حسبِ معمول مسئلہ ختمِ نبوّت کی اہمیّت، عقائد کے ضمن میں اس کی اہمیت، مسلمانوں اور مرزائیوں کے مابین اختلافات اور کفر و ایمان کا فرق واضح کیا۔ گفتگو سُننے کے بعد سکندر مرزا نے کہا۔ دیکھو مولوی صاحب! ملک کے اندر فرقہ بازی کی قطعًا اجازت نہیں دی جائے گی۔ اگر آپ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو سب مولویوں کو چاندی کی کشتی میں بٹھا کر مُلک بدر کر دیا جائے گا ——— لیکن دنیا جانتی ہے کہ سکندر مرزا اپنے کردارِ بد اور گھناؤنی سازشوں کی بدولت مال بردار جہاز میں مُلک بدر کر دیا گیا، یہاں تک کہ اُسے مُلک کے اندر قبر کے لئے دو گز زمین بھی نہ مِل سکی۔

قاضی صاحب اور مولوی جلال الدین شمسؔ کے مابین خط و کتابت

قاضی احسان احمد نے ملاقاتوں اور تقریروں کے علاوہ بعض اوقات تحریروں کا بھی سہارا لیا۔ جہاں تک تقریری اور تحریری خدمات کا تعلق ہے، اس میں آپ کی نسبت دیگر حضرات کا وافر حصّہ ہے۔ مگر جہاں تک سفارتی سرگرمیوں اور ملاقاتوں کا تعلق ہے، اس میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

بعض اوقات مرزائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو چیلنج بازی اور مناظرہ کیلئے دعوت کی نوبت آئی تو اس میدان میں بھی قاضی صاحب پیچھے نہیں ہٹے۔ اگرچہ احرار اور اب مجلس تحفظ ختم نبوّت میں تقریباً سارے مبلغین، تردیدِ مرزائیت کے سلسلہ میں ایک سند (AUTHORITY) سمجھے جا سکتے ہیں، تاہم مناظرہ کا میدان نرالا ہے۔ ہر مبلغ کامیاب مناظر نہیں ہو سکتا، اور ہر مناظر کامیاب مبلغ نہیں بن سکتا۔

حضرت مولانا محمد حیات صاحب اور حضرت مولانا لال حسین اخترؔ صدر مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت، میدانِ مناظرہ میں آسمانِ ختمِ نبوّت کے دو چمکتے، دمکتے ستارے ہیں جن کے سامنے قادیانیوں کا بڑے سے بڑا تیس مار خاں قسم کا مبلغ بھی دم نہیں مار سکتا۔ اگرچہ دونوں حضرات کے مناظرے کا انداز جداگانہ ہے۔ میرا اگرچہ میدانِ مناظرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، تاہم مولانا محمد حیات جنہیں "بابائے ختمِ نبوّت" کہا جاتا ہے، کا انداز دھیما، مدافعانہ اور نکات سے پُر ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخالف کو موقع دیتے ہیں کہ وہ دورانِ مناظرہ غیر متعلقہ بات بھی کہہ لے، پھر جب گرفت کرتے ہیں تو مخالف کو کچھ اس طرح قابو میں کرتے ہیں کہ وہ پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ مولانا لال حسین اخترؔ کا انداز جارحانہ، زوردار اور

مخالف کو دبانے والا ہوتا ہے۔ وہ مخالف کو غیر متعلقہ باتیں کہنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے بلکہ علمی مباحث میں پھنسا کر مخالف کا علمی پوسٹ مارٹم بھی کر جاتے ہیں جس سے مخالف میدانِ مناظرہ میں حد درجہ خفّت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی کی خدمات بھی قابلِ تعریف ہیں۔ معلومات کے سلسلہ میں مولانا عبدالرحیم اشعر بسطتاً فی العلم والجسم ہیں۔ مرزائیوں کے خلاف مقدمات کی تیاری میں مولانا محمد شریف صاحب ایک انتھک سپاہی ہیں۔ ہم ان حضرات کی خدمات کی تفصیل اپنی کتاب "تحریکِ ختمِ نبوت" میں پیش کر رہے ہیں۔

بہرحال قاضی صاحب ایک شیریں مقال و شعلہ بیان خطیب تو تھے ہی، میدانِ مناظرہ سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ قاضی صاحب ایک تقریر کے سلسلہ میں مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کی دعوت پر اُن کے مدرسہ عربیہ اظہار الاسلام چکوال تشریف لے گئے۔ وہاں تقریر کی۔ تقریر کے کچھ عرصہ بعد، مرزائیوں کے مولوی جلال الدین شمس، ناظر اصلاح و ارشاد انجمن احمدیہ ربوہ نے ایک ٹریکٹ بعنوان "اہالیانِ چکوال سے خدا اور اس کے نام پر دردمندانہ اپیل" ——— "قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے لئے مبلغ دو صد روپیہ انعام" شائع کیا۔ جس کی اطلاع مولانا قاضی مظہر حسین صاحب خلیفہ حضرت مدنیؒ نے ایک خط کی صورت میں قاضی صاحب کو بھیجی۔ قاضی مظہر حسین صاحب کے خط کی نقل یہ ہے۔

مکرّمی حضرت قاضی صاحب زید مجدہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ طالب خیر بخیر ہے۔ مرزائیوں نے جلال الدین شمس کی قلم سے گذشتہ جمعہ سے ایک دن پہلے ایک ٹریکٹ تقسیم کیا ہے جس کا عنوان ہے:۔

"اہالیانِ چکوال سے خدا اور اس کے نام پر دردمندانہ اپیل"

"قاضی احسان احمد شجاع آبادی کیلئے مبلغ دو صد روپیہ انعام"

اس میں مدرسہ اظہار الاسلام چکوال کے سالانہ جلسہ میں آپ کی تقریر کا حوالہ دے کر زہر اُگلا گیا۔ آپ نے "نور الحق" سے جو ہزار بار لعنت کا لفظ دکھلایا تھا یہ ٹریکٹ اسی کے جواب میں ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۳ پر لکھا کہ اگر مولوی احسان احمد شجاع آبادی صدر مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان سچّے ہیں تو وہ چکوال تشریف لائیں، ان کی آمد و رفت کے اخراجات ہم ادا کریں گے، اور اگر وہ کتاب "نور الحق" صفحہ ۱۲ سے یہ ثابت کر دیں کہ اس میں مرتد از اسلام پادری مولوی مخاطب نہیں، بلکہ مسلمان مولوی مراد ہیں اور پادری کرم دین نہیں، بلکہ مولوی کرم دین ساکن "بھیں" مراد ہیں اور ان پر ایک ہزار لعنت کی گئی ہے تو ہم ان کی خدمت میں دو صد روپیہ انعام بھی پیش کر دیں گے۔ مگر کیا صدر مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان ایسا کرنے کی جرأت کریں گے اور اس امتحان کے لئے چکوال آئیں گے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اور لعنت اللہ علی الکاذبین۔

یہ ٹریکٹ مجھے ۸ محرم کی شام کو ملا، اور ۹ محرم کے جمعہ پر میں نے مختصراً کہا، کہ مرزائی شر و فساد پھیلانا چاہتے ہیں وغیرہ۔

بندہ کے پاس "نور الحق" نہیں۔ یہ بھی بائیبل کے حوالجات سے ثابت کیا کہ انبیاء نے کتابیں لکھی ہیں۔ بہرحال مرتدین کے اس چیلنج کو منظور کرنا ضروری ہے تاکہ عوام کے ایمان کو یہ لوگ برباد نہ کریں۔

مولانا جالندھری اور مولانا لال حسین صاحب اختر کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔

کوئی تاریخ مقرر کر کے تینوں حضرات چکوال تشریف لائیں، اور ایک جوابی ٹریکٹ تو فوراً شائع کر دیں۔ اگر اور ٹریکٹ مل سکا تو میں ارسال کر دوں گا۔ والسّلام

الراقم منظور حسین غفرلہٗ

حال وارد بھکر۔ ۱۲ محرم ۸۴ھ

نوٹ: تاریخ کا تقرر بندہ کے مشورہ سے ہو۔

قاضی مظہر حسین صاحب نے پہلے خط میں ٹریکٹ کے شائع ہونے کی اطلاع دی دوسرے خط میں وہ ٹریکٹ بھی بھیج دیا، جو مرزائیوں نے شائع کیا۔

دوسرے خط کی نقل یہ ہے۔

محترمی حضرت قاضی صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ایک عریضہ پہلے بھکر سے ارسال کر چکا ہوں اب مرزائیوں کا ٹریکٹ ارسال ہے۔ جو انہوں نے چکوال میں تقسیم کیا ہے۔ مولانا لال حسین صاحب اختر اور مولانا محمد علی جالندھری کو بھی بھیج رہا ہوں۔ اس کا جواب مولانا اختر کی طرف سے جلد ہی شائع ہونا چاہیئے، اور ان کا چیلنج قبول کر کے تاریخ مقرر فرمائیں۔ تاکہ ان کذابوں کی قلعی کھلے۔ واللہ

والسلام

الراقم مظہر حسین غفرلہٗ

مدنی جامع مسجد چکوال۔ ۱۴ محرم ۸۴ھ

قاضی احسان احمد صاحب نے قاضی مظہر حسین صاحب کو اُن کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ شمس سے ان کی خط و کتابت جاری ہے۔ تو قاضی مظہر حسین صاحب نے تیسرا خط ۱۷ صفر ۸۴ھ کو بدیں الفاظ تحریر کیا۔

مکرمی حضرت قاضی صاحب زید مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ قبل ازیں "نور الحق" اور "ستارہ قیصرہ" پہنچے۔ جزاکم اللہ

ایک جلسہ میں حضرت مولانا جالندھری سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ کی خط و کتابت سے اطلاع دی۔ نیز یہ کہ دوسری جگہ اس نے لکھا کہ اس سے مراد علمائے اسلام بھی ہیں۔

"نور الحق" بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس میں کس صفحہ پر دوسری عبارت

درج ہے یا اور کس کتاب میں ہے ؟

جب سے قادیانیوں نے یہ ٹریکٹ تقسیم کیا ہے، ہر جمعہ میں ان کی تردید کرتا ہوں عوام کے لئے یہ ٹریکٹ نہایت شرانگیز تھا۔ جوابی ٹریکٹ کی سخت ضرورت ہے۔ شمس سے آپ کی جو مکاتبت ہو رہی ہے شائع ہونی چاہیئے۔ اس معاملہ میں ان کا پورا تعاقب کیا جائے تاکہ اس علاقہ میں یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ موضع پچتال میں ہم نے جلسہ کیا۔ جہاں کے مرزائی نے یہ فتنہ اٹھایا ہے۔ مولانا غلام مصطفیٰ صاحب مبلّغ ختم نبوّت کی پُر مغز تقریر ہوئی۔ ہم نے وہاں مجلس تحفظِ ختم نبوّت بھی بنا دی ہے۔ برادری ابھی اس مرزائی کا ساتھ دے رہی ہے اور وہ بڑی جد و جہد کر رہا ہے۔ آپ نے جو مجھے فرمایا ہے کہ مَیں شمس کو خط لکھوں۔ تو بندہ کی رائے میں اس وقت یہ ضروری نہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کیا فرمایا تھا۔ اگر آپ نے مولوی کرم دین کے نام سے جناب والدی المکرم مراد نہیں لی تھی تو آپ اس پر الزام عائد کر سکتے ہیں اور یہی کافی ہوگا۔ نیز اس کو یہ لکھیں کہ پچتال کے جس غیر احمدی کی طرف تُو نے استفسار منسوب کیا ہے، وہ اس کا نام بتلائے۔ نیز یہ کہ ایک غیر مومن پر اس نے کیوں یقین کر لیا کہ قاضی صاحب نے ایسا فرمایا ہے اور بلا تحقیق ایک غیر مومن کی تحریر پر یقین کر کے ٹریکٹ شائع کر دیا۔ وغیرہ

بندہ کو خط و کتابت سے مطلع فرماتے رہیں اور فریقین کے سابقہ خطوط کی نقل ارسال فرما دیں۔ تاکہ میرے پاس بھی ریکارڈ رہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری نصرت فرمائیں اور یہ مرتدین مغلوب و مقہور ہوں۔ اگر چکوال میں آپ کی تشریف آوری ہو تو انشاء اللہ بہت مفید رہے گا اور دشمن پریشان و مغلوب ہوگا۔ واللہ قدیر۔

والسلام — الراقم منظور حسین غفرلہٗ

مدنی جامع مسجد چکوال۔ ۱۷ صفر ۸۴ھ

احتیاطاً یہ عریضہ بدست مولانا غلام مصطفیٰ صاحب ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ ڈاک سنسر ہوتی ہے، اس میں تفصیلات خلافِ مصلحت ہیں۔

اب، ہم درجِ ذیل سطور میں مولانا قاضی احسان احمد صاحب صدر مجلس تحفظِ ختمِ نبوت اور جناب جلال الدین شمسؔ ناظر اصلاح وارشاد ربوہ کی اصل خط وکتابت شائع کر رہے ہیں، جو فریقین کے مابین مبادیاتِ مناظرہ طے کرنے کے بارہ میں ہوئی۔ خط و کتابت میں پہل قاضی صاحب نے کی۔ آپ نے اپنے پہلے خط محرّرہ ۲۱ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ میں شمسؔ کو ان الفاظ میں خطاب کیا۔

۲۱ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ

جناب جلال الدین صاحب شمسؔ

السّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

میرے ایک دوست نے جناب کا بعنوان دردمندانہ اپیل ٹریکٹ بھیجا ہے۔ اصولاً یہ آپ کو مجھے بھیجنا چاہیئے تھا۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔

چونکہ آپ نے مجھے چیلنج کیا ہے اور دوصد انعام بھی از خود پیش کیا ہے۔ لہٰذا بواپسی اطلاع دیں کہ اس معاملہ کی مبادیات کہاں طے ہوں گی۔ آپ معہ رفقاء شجاع آباد آئیں تو مجھے اطلاع دیں، یا پھر میں معہ رفقاء ربوہ آجاؤں۔ دونوں صورتوں میں سے جو منظور ہو، اس کے لئے مطلع کریں۔ فقط

قاضی احسان احمد عفی عنہ

اس کے جواب میں شمس صاحب کی طرف سے رجسٹرڈ لفافہ ۲۸ محرم ۸۴ھ کو قاضی صاحب کو ملا۔ جس کا مضمون یہ ہے۔

نمبر 642/س

۲۸ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ

10-6-64

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی

السّلام علی من اتبع الہدیٰ

آپ کی چٹھی محررہ ۲۱ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ موصول ہوئی۔ آپ کی چٹھی سے یہ امر واضح ہے کہ آپ ہمارے چیلنج مندرجہ "دردمندانہ اپیل صلا" کو منظور کرتے ہیں، اور جو بات آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے، وہ آپ کتاب "نورالحق صلا" سے دکھانے کے لئے تیار ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے کسی مبادیات کے طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ چکوال تشریف لائیں اور اپنے دعویٰ کو ثابت کریں۔ ہم حسب وعدہ دو صد روپے جناب ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع جہلم یا جناب ایس پی صاحب یا کسی اور مسلمہ فریقین معزز شخص کے پاس آپ کے دعویٰ کو کتاب میں سے دکھانے سے پہلے جمع کرا دیں گے، اور ہمارا نمائندہ بھی وہاں پہنچ جائے گا۔ اس خاص مجلس کے لئے بیس بیس اشخاص فریقین کی طرف سے شامل ہوں گے۔ اگر آپ نے ہمارے مطالبہ مندرجہ "دردمندانہ اپیل صلا" کو پورا کر دیا تو وہ ثالث صاحب جن کے پاس روپیہ جمع ہوگا، وہ آپ کو دو صد روپیہ ادا کر دینے کے مجاز ہوں گے۔ فقط

خاکسار جلال الدّین شمسؔ

ناظر اصلاح و ارشاد

قاضی صاحب نے شمسؔ کی چٹھی محررہ ۲۸ محرم کا یہ جواب بھیجا۔

جناب شمس صاحب، السّلام علی من اتبع الہدیٰ

جناب کی رجسٹرڈ چٹھی محررہ ۲۸ محرم الحرام نمبری 642 موصول ہوئی جو آپکی

جماعتی روایات کے مطابق ہے۔ آپ کے بانیٔ سلسلہ اور اُن کے متبعین ہمیشہ مسلمانوں کو چیلنج دے کے میدان میں آنے سے پہلو تہی کرتے رہے ہیں۔ آپ نے چیلنج ربوہ میں مرتب کیا، وہیں سے شائع کیا۔ اب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے مرحلے بھی وہیں طے ہونے چاہئیں۔

آپ نے تحریر کیا ہے کہ کسی مبادیات کے طے کرنے کی ضرورت نہیں، اور خود ہی کچھ شرائط تجویز کر دی ہیں۔ مثلاً

رقم فلاں صاحب کے پاس ہو گی۔

آپ کا نمائندہ آئے گا (یعنی آپ خود نہیں آئیں گے)

اس مجلس میں بیس بیس اشخاص فریقین کے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سب باتیں آپس میں مشورہ سے طے کرنے کی ہیں۔ آپ از خود اس کے مجاز نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی تصانیف میں (جس میں "نور الحق" بھی شامل ہے) علمائے اسلام پر لعنت کی ہے۔ میں بفضلہ تعالیٰ، مرزا صاحب کا لعان ہونا "نور الحق" اور ان کی دیگر تصانیف سے ثابت کر دوں گا۔ اس لئے دوبارہ لکھتا ہوں کہ مبادیات طے کرنے کیلئے آپ شجاع آباد آئیں یا میں ربوہ پہنچوں۔ آپ صاف جواب لکھیں۔

فقط

اس دوسرے خط کا جو جواب شمس صاحب نے قاضی صاحب کو بھیجا، وہ یہ ہے۔

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی

السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

آپ کی رجسٹرڈ چٹھی محررہ بلا تاریخ موصول ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہمارے چیلنج کا جواب دینے کی بجائے، اپنی طرف سے ایک نیا دعویٰ پیش کر کے مناظرہ کی طرح ڈالنا چاہتے ہیں، اور ملاقات کے ذریعہ مبادیات طے کرنے سے بھی آپ کی اصل غرض یہی معلوم ہوتی ہے اور آپ کے خط سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ ہمارے

مطالبہ کو پورا کرنے سے ایک نیا موضوعِ بحث پیش کر کے انحراف کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا چیلنج جو ہمارے ٹریکٹ کے صفحہ ۱۳ پر درج ہے، وہ صرف کتاب نور الحق کے صفحہ ۱۲ سے تعلق رکھتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اگر مولوی احسان احمد شجاع آبادی صدر مجلس تحفظ ختم نبوّت سچے ہیں تو وہ چکوال تشریف لائیں۔ ان کی آمد و رفت کے اخراجات ہم ادا کریں گے اور اگر وہ کتاب نور الحق صفحہ ۱۲ سے یہ ثابت کر دیں کہ اس میں مرتدانہ اسلام پادری مولوی مخاطب نہیں بلکہ مسلمان مولوی مراد ہیں، اور پادری کرم دین نہیں بلکہ مولوی کرم دین ساکن بھیں مراد ہیں اور ان پر ایک ہزار لعنت کی گئی ہے تو ہم ان کی خدمت میں دو صد روپیہ انعام بھی پیش کر دیں گے۔"

ہمارے نزدیک کتاب نور الحق صفحہ ۱۲ سے مذکورہ بالا مطالبہ پورا کرنے کے لئے کوئی ایسی شرائط یا مبادیات کی ضرورت نہیں جن کے طے کرنے کے لئے فریقین میں سے کسی کو سفر کی تکلیف اُٹھانے کی ضرورت ہو۔ ہمارے چیلنج کے بعد آپ صرف یہ دریافت کر سکتے تھے کہ انعامی رقم کس طرح دی جائے گی۔ اس کے دینے کا طریق ہم نے اپنی چھٹی میں لکھدیا تھا۔ کہ امین کے پاس یہ رقم جمع کرا دی جائے گی، جو چیلنج کے مطابق حوالہ دکھانے پر آپ کو دے دیگا۔ باقی یہ امر کہ فریقین کے کتنے آدمی اس مجلس میں شامل ہوں، زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ کے نزدیک جتنی تعداد مناسب ہو وہ تحریر فرما دیں۔ اگر جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر جہلم یا جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کے علاوہ کسی اور شخص کو انعامی رقم کے لئے امین بنانا چاہیں تو آپ نام پیش کریں۔ ان امور کا تصفیہ بذریعہ خط و کتابت آسانی سے ہو سکتا ہے۔

خاکسار جلال الدّین شمسؔ

ناظر اصلاح و ارشاد

قاضی صاحب نے شمس صاحب کی چھٹی محررہ ۶۴/۶/۱۸ کا تفصیلی جواب بدیں الفاظ بھیجا۔

۱۱ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ

جناب شمس صاحب،

السّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

جناب کی رجسٹرڈ چھٹی محررہ 18/6/64 موصول ہوئی۔ میں پیشتر ازیں لکھ چکا ہوں کہ مجھے آپ کا چیلنج مکمل منظور ہے۔ آپ نے صفحہ اوّل پر خدا تعالیٰ اور رسولؐ کے نام پر دردمندانہ اپیل اور میرے نام مبلغ دو صد روپیہ انعام تحریر کیا ہے۔ میں اس اپیل کے مکمل مندرجات پر گفتگو کروں گا۔

۱ : خدا تعالیٰ کے متعلق جو عقیدہ ملّتِ اسلامیہ کا ہے اور جو آپ کی جماعت کا ہے اس پر اوّلاً گفتگو کرنی ہے۔ کیونکہ آپ کی جماعت کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد اپنے آرگن "الفضل" میں یہ تحریر کر چکے ہیں :-

"حضرت مسیح موعود نے تو فرمایا کہ اُن کا اسلام اور ہے اور ہمارا اور۔ اُن کا خدا اور ہے اور ہمارا اور۔ ہمارا حج اور ہے اُن کا حج اور۔ اور اسی طرح اُن سے ہر بات میں اختلاف ہے"۔ (مندرجہ اخبار الفضل جلد ۵ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۲۸)

۲ : اسی طرح عقیدۂ رسالت آپ کی جماعت کا ملّتِ اسلامیہ سے بالکل جُداگانہ ہے۔

۳ : آپ تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی تصنیف شدہ کتابیں دکھایئے اور ان کے مضامین کہاں کہاں سے حاصل کئے گئے اور وہ کس طرح شائع اور فروخت کی گئیں، یہ سب کچھ ثابت کرنا آپ کے ذمّہ ہوگا۔ اور میں مرزا غلام احمد کا مبلغ علم، دیانت و شرافت کی حقیقت واضح کروں گا۔

۴ : "نور الحق" کی غرضِ تصنیف کیا تھی اور اس میں صرف عیسائی پادری مخاطب ہیں

یا علمائے اسلام بھی ؟ یہ میرے ذمّہ ہوگا۔

۵ : آپ کی اپیل کا صفحہ ۴ بھی ایک مستقل موضوع ہے کہ سچوں کے سردار سید الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف علمائے سوء کی نشان دہی فرمائی ہے یا جھوٹے مدعیانِ نبوّت کے متعلق بھی واضح ارشاد فرمایا ہے ؟

۶ : آپ نے اپنی اپیل میں اپنے بانیٔ سلسلہ کے متعلق رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عشق کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ یہ مستقل موضوع ہے کہ مرزا غلام احمد کی غیرت و حمیّت کا کیا حال تھا اور وہ کن کن "حکمت عملیوں" کے ماتحت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین گوارا کرتے رہے۔

۷ : اُن کا دعویٰ مسیحیت کن اغراض پر مشتمل تھا اور ان کے مقاصد اصلی کیا تھے ؟

لہٰذا میں پھر کہتا ہوں کہ اس پوری اپیل پر از اوّل تا آخر گفتگو کرنے کے لئے تاریخ و وقت مقرر کریں۔ اور مبادیات جلد از جلد طے ہونی چاہئیں۔ آپ سفر کی تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں تو میں معہ رفقاء سفر کرکے حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اپنی اپیل کے پہلے صفحات چھوڑ کر ص۱۳ کی پناہ نہ ڈھونڈھیں، پوری اپیل پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو جائیں ورنہ مجھے یہ حق ہوگا کہ میں از خود تاریخ مقرر کرکے اور اس کا اعلان کرکے ربوہ پہنچوں، اور آپ کو آپ کے چیلنج کا جواب دوں اور آپ پر آپ کے چیلنج کی حقیقت واضح کروں۔

فقط۔

نوٹ : آپ اپنی دردمندانہ اپیل کے بیس نسخے بذریعہ رجسٹری بھیج کے ممنون فرمائیں۔

اس تفصیلی چھٹی کا سات لائنوں میں شمس کی طرف سے جو جواب موصول ہوا، اس کی نقل یہ ہے۔

نمبر 927 ، ۱۷ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی

السّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔ آپ کی رجسٹرڈ چھٹی محررہ ۱۱ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ موصول

ہوئی۔ اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہمارے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ آپ مختلف عقائد اور امور پر ہم سے مباحثہ کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ ساٹھ سالوں میں بہت سے مباحثات ہو چکے ہیں۔ اب ہم کسی مزید مباحثہ کرنے کی ضرورت خیال نہیں کرتے۔

اگر آپ کو ہمارے پمفلٹ کا جواب دینا مقصود ہے تو آپ اس کے مقابلہ میں پمفلٹ شائع کر سکتے ہیں، اور اگر آپ ہمارے چیلنج کے مطابق ہمارا مطالبہ پورا کر دیں گے تو ہم ان شاء اللہ تعالیٰ انعام کے متعلق اپنا وعدہ بھی پورا کر دیں گے اور اس کے لئے آپ کو ربوہ آنے کی ضرورت نہیں بلکہ چکوال جانے کی ضرورت ہے۔

پمفلٹ کی چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں، اس لئے دو کاپیاں آپ کو ارسال کی جا رہی ہیں۔

خاکسار

جلال الدین شمس

28.6.64 ناظر اصلاح و ارشاد

قاضی صاحب کا آخری خط بنام شمس صاحب

۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ

۶ر اکتوبر

محترم جناب جلال الدین صاحب شمس

السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

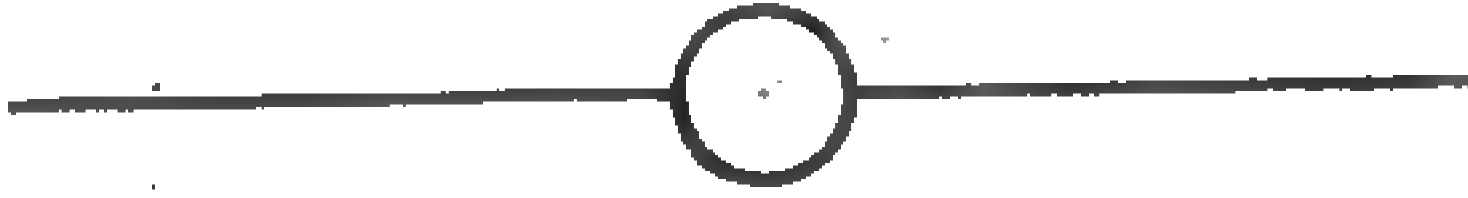
میری اور آپ کی خط و کتابت جاری تھی کہ ناگزیر حالات پیش آ گئے۔ پھر چند ماہ سے میں بیمار ہو گیا۔ آپ کی جماعت کے افراد حسب معمول غلط بیانی کر رہے ہیں، اور اسے میرے فرار پر محمول کر رہے ہیں۔ لہٰذا میں اپنی طرف سے حضرت مولانا

ڈال حسین صاحب اختر کو اپنا نمائندہ نامزد کرتا ہوں۔ اُمید ہے، آپ سا
خط و کتابت کی روشنی میں شرائط طے کر کے احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا صحی
نتیجہ دیکھیں گے۔ فقط

دُعا گو

قاضی احسان احمد عفی عنہ

شجاع آبادی



گلدستۂ احباب

غالباً آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو اردو کی کتاب میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ یہ مضمون سجاد حیدر یلدرمؔ نے لکھا تھا۔ اس میں فاضل مصنّف نے دوستوں کی بہتات پر اُن سے اجتناب کرنے کے لئے یہ مضمون لکھا تھا کہ اُن کے دوست اتنے ہیں کہ جن سے کسی وقت بھی چھٹکارا ممکن نہیں ہو سکتا۔ "گلدستۂ احباب" کا ابتدائیہ لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ مضمون یاد آ گیا کہ حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے دوستوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ان کی بجائے ہم کہتے تھے کہ "قاضی صاحب کو دوستوں سے بچاؤ"۔ وہ اگرچہ تنگ نہیں ہوتے تھے لیکن پھر بھی انسان ہے کسی وقت شکوہ بہ لب ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت مولینا غلام غوث صاحب ہزاروی ناظم جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں شجاع آباد، قاضی صاحب کے ہاں قیام پذیر تھے، قاضی صاحب، مولانا اور مَیں مسجد کے صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب آئے اور آتے ہی اپنے کسی کام کے سلسلہ میں یاد دہانی اور شکوہ و شکایت شروع کر دی۔ قاضی صاحب کچھ تکلیف میں تھے، اس کام سے معذرت کی۔ اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کچھ اس طرح باتیں کر رہا تھا، جیسے قاضی صاحب پر احسان کر رہا ہو۔ قاضی صاحب، مولانا کی موجودگی میں طرح دیتے رہے۔ بالآخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، تو اُسے جھاڑ پلائی۔ وہ صاحب گستاخی پر اُتر آئے اور چلے گئے۔ مولانا نے مجھے فرمایا

کہ دیکھو لوگ کتنے خود غرض ہیں قاضی صاحب کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہے اپنے کام سے غرض ہے اور یہ قصور قاضی صاحب کا ہے کہ انہوں نے ہر ایک آدمی کو سر پر بٹھا لیا ہے۔ میرے پاس ایسے سینکڑوں واقعات ہیں جن میں قاضی صاحب نے بعض ایسے ملنے والوں کو سر پر بٹھا رکھا تھا کہ وہ بعض اوقات احترام کو بالائے طاق رکھ کر گستاخی پر اُتر آتے تھے۔

بہرحال ان صفحات میں یہ باتیں لکھنے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ قاضی صاحب کے دوستوں میں جماعت سے باہر بھی ـــــــــ کمی نہیں تھی۔ نیز جماعت اور جماعت سے باہر ایسے احباب کی کثرت تھی جو کسی نہ کسی لحاظ سے قاضی صاحب کے ممنونِ احسان تھے لیکن واحسرتا! اُن کی زندگی کے آخری ایّام اور بعد از وفات میں نے تقریباً سب اخباروں میں جن میں ہفت روزہ چٹان، خدام الدّین، ترجمان اسلام، سنگِ میل اور ماہنامہ تبصرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اپیلیں کیں کہ قاضی صاحب کے احباب اور ملنے والے ان کے متعلق جو معلومات رکھتے ہوں، مرتب کو بہم پہنچا کر متوفی پر احسان کریں لیکن سوائے خامشی کے اُمید کی کرن کہیں نظر نہ آئی۔

انفرادی طور پر بعض احباب نے بیانات، مضامین اور شعروں کی صورت میں اپنے خیالات سپردِ قلم کیے جنہیں کتاب میں کسی جگہ شامل کر دیا گیا ہے لیکن میرا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اُن کے ہم عصر اور عقیدتمندوں نے قاضی صاحب کو کیسا پایا، تاکہ اس سے قارئین کو آگاہ کیا جا سکے۔ البتہ شیخ حسام الدین مرحوم سے جب میں نے قاضی صاحب کے متعلق فرمائش کی تو فرمایا انشاء اللہ شجاع آباد آ کر ایصالِ ثواب کے علاوہ قاضی صاحب کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچادوں گا۔ مگر قدرت کی طرف سے اُنہیں مہلت نہ مل سکی جب کہیں سے کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً اخبارات و رسائل اور مختلف جرائد کی چھان بین کرنا پڑی۔ جو کچھ بن آیا وہ پیشِ خدمت ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں ناسپاسی ہو گی اگر قاضی صاحب کے رفیقِ خاص اور زندگی بھر کے ساتھی جناب مرزا غلام نبی جانباز ایڈیٹر ماہنامہ "تبصرہ" کا شکریہ ادا نہ کروں کیونکہ جب میں نے ان کی خدمت

میں درخواست لکھ بھیجی کہ مجھے کچھ وقت عنایت فرمائیں تاکہ آپ کے پاس پہنچ کر حضرت قاضی صاحب کے حالات دریافت کرسکوں تو انہوں نے میرے خط کے جواب میں درجِ ذیل جواب بھیجا:۔

عزیز القدر! سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ برادرم قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں آپ مجھ سے جو دریافت کرنا چاہتے ہیں ——— اس کا بہت سا حصّہ حیاتِ امیر شریعتؒ میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ تاہم آپ کی معلومات کے لئے میں خود بروز اتوار ۱۷۔۸۔۸ کو کسی وقت ملتان حاضر ہو رہا ہوں کیونکہ اس ضمن میں آپ کا لاہور آنا میرے لئے باعثِ ندامت ہے۔

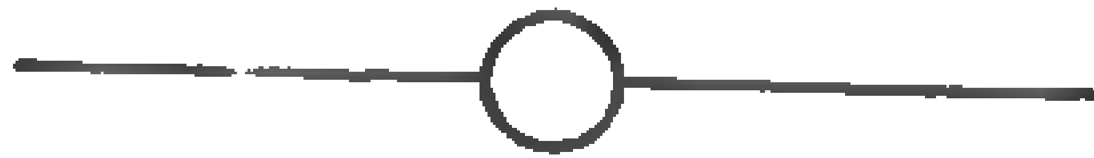
گھر میں بچوں کو دعا و سلام۔ والسّلام

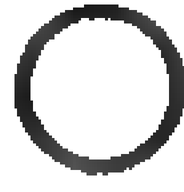
آپ کا جانباز

۱۷۔۸۔۶

ان کے علاوہ جناب خواجہ عبدالقدوس، جناب حفیظ رضا اور دوسرے احباب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بڑی اہم معلومات مہیا فرمائیں۔ اگر وہ تعاون نہ کرتے تو کتاب کسی صورت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتی۔

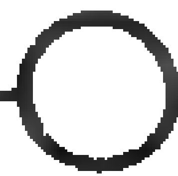
نور الحق





اگلے صفحات میں حکیم حبیب اللہ صاحب سیال روہیلانوالی (مظفرگڑھ) کے رشحاتِ قلم پیش کئے جا رہے ہیں۔ حکیم صاحب موصوف ۱۹۳۹ء سے مجلسِ احرار اسلام سے منسلک چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۴۶ء سے سیاسیات سے کنارہ کش ہیں اور طب جسمانی سے منسلک ہیں۔ دو مرتبہ قید و بند کی آزمائشوں سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ جیل کا زمانہ فیروز پور (بھارت) میں گذرا ہے۔ ضلع مظفر گڑھ کی مجلس احرار کے رضا کاروں کے سالارِ اعلیٰ رہے ہیں۔ مجھے اُن سے ایک وقیع اور تاریخی مضمون کی توقع تھی، مگر انہوں نے افسانوی انداز کو پسند فرمایا۔ اکثر و بیشتر ادھورے اور ثقیل جملے استعمال فرمائے ہیں جو آج کی ادبی دنیا میں نہ صرف متروک بلکہ غیر مستعمل بھی ہیں۔ بہرحال ان کے جذبات من و عن نقل کر دیئے گئے ہیں، جبکہ غیر متعلقہ چیزیں معذرت کے ساتھ خارج کر دی گئی ہیں۔

نُورالحق



حکیم حبیب اللہ سیال
روہیلانوالی (مظفرگڑھ)

۷۸۶

راہ رو راہِ محبّت کا خدا حافظ ہو
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

گذشتہ برس مولانا قاری نورالحق صاحب داماد رشید حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب مرحوم یہاں ایک جلسے میں بشرفِ شرکت تشریف لائے۔ میں نے قاری صاحب موصوف کو پہلی نظر اُن ایام میں دیکھا تھا جب قاضی صاحب مرحوم عوامی ہسپتال ملتان میں داخل، کش مکش حیات سے نبرد آزما تھے۔ حیاتِ مستعار کے ان آخری لمحوں میں یارِ بے وفا کی صورت آخری سلام کے لئے حاضر ہوا کیونکہ عقبیٰ میں بھی ملاقات کی توقع نہ تھی۔ تفاوتِ فردوس و سقر بیّن نظر آرہا تھا۔ محترم مولانا قاضی عبداللطیف صاحب و مولانا قاری نورالحق صاحب، دونوں ہم زُلف بصد اندوہ و حرماں خدمت کرنے میں یکساں مصروف تھے۔

آج دوسری دفعہ قاری صاحب موصوف کو دیکھ رہا ہوں اور متعارف بھی ہو رہا ہوں۔ خلوت اور پُرسکوں ماحول میں گفتگو کچھ اس انداز سے ہوئی جیسے کہ ہم برسوں کے شناسا ہیں۔ واقعی ہم آہنگی فکر اخوت کا بہت بڑا رشتہ ہیں۔

اے گل بہ تو خرسندم کہ تو بوئے کسے داری

باتوں باتوں میں ارشاد فرمایا کہ میں قاضی صاحب مرحوم کی حیات زیرِ تحریر لانا چاہتا ہوں۔ مرحوم کے احباب اور ہمنشیں حضرات سے واقعات، ملفوظات، واردات جو کچھ بھی جتنا بھی ازبر یا محفوظ ہوں عطا فرمائیں۔ اس خواہش کا اظہار مجھ ناچیز سے بھی ہوا۔ تعمیلِ ارشاد کا عہد تو کر لیا لیکن پورے ایک برس کے بعد آج

کروٹ بدلنا چاہتا ہوں مستیِ خمر نہیں، غرور و نخوت نہیں۔ ایک تو پورے اکیس برس کی طویل مدت کے بعد کسی نے مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور میں اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھا، دوسرے علمی بے بضاعتی، کُند ذہنی، احساس کمتری، پریشانیٔ افکار، بُعدِ قلم میرے لئے ضرب شدید تھا۔

مرا در تھفر عناں گیر باید از چپ و راست
کہ کجروی نہ کنم ورنہ قصد راہِ خطا است

آج رات کچھ متفکر اور پریشان سا ہوں۔ سردیوں کی یخ بستہ اور طویل شب شبِ ہجر سے بھی بدتر محسوس ہو رہی ہے۔ بے خوابی، بے کلی روح کیلئے نیشِ عقرب بن رہی ہے۔ اس تنہائی اور جانکاہ سکوت کے عالم میں میرے تصوّرات کا زاویہ پھرتے پھراتے قاضی صاحب کے اوراق بکھرنے لگ پڑا ہے۔ آنکھیں دھندلائیں، بینائی میں ارتعاش ہوا، اور سامنے دیوار پر کچھ دھندلے دھندلے نقش نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ سکرین کا پردہ تصویروں کی نمائش کرتا محسوس ہو رہا ہے۔ اس دُھند میں دُور ایک حصار حجر کے گرد آہنی کلاہ پوش فرنگی، تیر و سناں بدست، مسلح خشمگیں، بدمست، کریہہ شکل پہرہ دے رہے ہیں۔ اس قلعہ نما حصار کے اندر جواہرات اور اشرفیوں کے انبار، عصمت اور عفّت کی گٹھڑیاں، مذہب اور تقدّس کے پارہ شدہ اوراق، جذبۂ حریّت اور آزادی کے بکس، غلامی اور ذلّت کی زنجیروں میں لپٹے ہوئے مقفّل نظر آ رہے ہیں اور یونین جیک کا منحوس عَلم برسرِ ایوان لہلہاتا ہوا نظروں میں چبھ رہا ہے اور ایک تختِ چوبیں مرصّع پر ابلیس، انسان نما لوتھڑا حرکت کرتا ہوا نئے بھیانک عزائم کے احکامات دے رہا ہے ؎

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار
چین قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کَے

یہ دھندلے نقش اب کچھ اجاگر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ گرد و غبار، موج زن انسانوں کا سمندر، شورِ قیامت، ماؤں کے نالے، بچوں کی چیخیں، بیواؤں کی

فریادیں، شہدار کا لہو، ناکام تمناؤں کے دھوئیں کچھ پختہ عزائم لئے، جذبہ خودی ولولہ حب وطن میں مست ایک جنوں کا قافلہ علَم سرخ اٹھائے اس حصار کی طرف بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے۔

زمیں کی نبض رُک گئی
کلاہِ چرخ جُھک گئی

ہیں ؟ یہ تو سب شکلیں شناسا ہیں اور ان سب نمایاں صورتوں میں ایک قاضی جی مرحوم بھی نظر آرہے ہیں۔ اللہ اللہ وہی شوق، وہی ذوق، جذبہ آن وہی ذوق ایمان۔ غالباً آج فرنگی حصار پر آخری فیصلہ کن حملہ ہونے والا ہے ؎

دارد جمال روئے تو امشب تماشائے دیگر
باآنکہ من مے بینمش بہتر زشب ہائے دیگر

میری نگاہیں اب دیوار سے ہٹ کر بستر کے تکیہ پر رُک گئی ہیں۔ دو موٹے موٹے گرم گرم آنسو گرے جو ہاتھ میں موتیوں کی مثل اُٹھائے بیٹھا ہوں۔ کاش ! آج سے اکیس برس قبل مر گیا ہوتا۔

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زردش
کہ تا یکدم بیاسایم ز دنیا و ز شر و شورش

قاری نور الحق صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا، مَیں لحد میں سکون سے سویا ہوا تھا۔ عزیز و اقربا، دوست و احباب اور اِس شاداب نگری سے دُور چلا گیا تھا تُو نے میرا کفن چاک کر کے خوابِ شیریں سے جگایا۔ مَیں اس گردشِ روزگار میں غلطاں ہونا نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے ایک پیمانہ مئے مرکب بہ سمیات پی کر پھر سو جاؤں

یا اگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذتِ آزار نماند

اب میری نگاہیں بے قصد پھر سرخ و سفید خراماں، لرزاں لرزاں نشانات دیکھنے لگ پڑی ہیں۔ یہ زندان فیروز پور کا آہنی در۔ بے خطا پا بجولاں قیدی تختہ دار

تڑپتی لاشیں، جسمیں چار چار فٹ کی غلیظ کوٹھڑیاں، ناقص غذا، بدنما لباس، قید تنہائی، چکّی کی مشقّت، اذیّت پا بجولاں بیدزنی، بھوک ہڑتال، مرن برت۔ چل جوان! سب اچھا۔ اے وطن! تو آزاد ہو جا۔ تیری مقدّس خاک سرسبز و شاداب ہو۔ یہ صعوبتیں کیا چیز ہیں۔ جسم، جان، لہو پسینہ تیرے لئے ایک ناچیز ہدیہ ہیں ؎

تیرے عشق میں کیا کیا نہ میرے محبوب کیا
گریۂ یعقوبؑ کیا، صبرِ ایوبؑ کیا

آج شب ستائیس برس بعد پھر فیروز پور جیل میں گھوم رہا ہوں۔ وہی دیوار و در، کوٹھڑیاں، خیمے، بدذائقہ سالن، لوہے کی بالٹیاں، کنکر اور خاک ملی روٹیاں، فرشِ خاک پہ چٹائیوں کے فرش، رفقاء کی صورتیں اور شکلیں، محبّت، خلوص، زندہ دلی، قہقہے خوفناک زنداں کہ جنّت بریں۔ اے ہم جلیس زنداں! آج میری رہائی ہے۔ رہائی نہیں جدائی ہے۔ سب احباب الوداع کرنے کو جمع ہو گئے۔ ڈیوڑھی تک تشریف لائے۔ وہ افسردہ ہیں پژمردہ۔ کہیں اشک کہیں آہیں، بادلِ ناخواستہ سینے لگ، گلے چمٹ، اوجھل ہوتا ہوں ؎

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شرابِ دوامِ ما

اچھا دوستو! مرحبا، شاید فرنگی سازش کی بلند دیواریں آپ سے پھر ملنے بھی نہ دیں۔ اب میں جیل سے باہر ہوں۔ کھلی فضا، وسیع دنیا، زرق برق لباس، کاریں، بسیں، چہل پہل، شہر بازار، سڑکیں ایوان۔ پتہ نہیں شہر والے ناواقف لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ استقبال کر رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں، جلوس بن گیا، شہر لے گئے، عزّت و احترام اور خدمت کے سب تقاضے پورے کئے۔ اچھا اے میرے اہلِ وطن، اب مجھے گاڑی پر سوار کرا دو۔ گاڑی خراماں خراماں اور پھر رواں دواں چلنے لگی۔ میں گھر آ رہا تھا، پورے دو برس بعد آ رہا تھا، اپنے آبائی مسکن جہاں جھولے میں جھلا آم توڑ توڑ کر کھائے۔ پیاری امّی جی ملیں گی، ابا جان خوش ہوں گے، بھائی دوڑ آئینگے

بہنیں دعائیں دیں گی۔ لیکن نہیں جی چاہتا ہے گاڑی واپس چلی جائے، میں پھر اُسی چار دیواری میں پہنچ جاؤں۔ مجھے اُن رُوحانی دوستوں کی جدائی بالکل ناگوار ہے جن کے ساتھ دو برس ایک چٹائی پر بیٹھ کر کھایا پیا ہنسے کھیلے۔ دورِ نشاط کے ہزار دوست کو جیل کی ایک ساعت کے دوست پر قربان کر دوں۔

اے اجل جاں نہ ہند اہلِ وفا سعی مکن

یا بر درخصت آں غمزہ و خونخوار بیار

اب میری سیاسی زندگی کی پیہم جدّ و جُہد کا آغاز ہوتا ہے۔ تنظیمی سلسلے میں سارے ضلع کا دورہ کر رہا ہوں، مجالس بنا رہا ہوں۔ جشنِ رضا کار، سُرخ عَلَم، سُرخ وردیاں، فلک شگاف نعرے، تماشائی، حیراں و شاداں و فرحاں۔ دعاگناں گُل پاش، پتہ نہیں یہ کس جگہ کا منظر دیکھ رہا ہوں؟ ہے تو کوئی عظیم کانفرنس۔ ہاں اب یاد آیا یہ آل انڈیا احرار کانفرنس دہلی ہے۔ خوشنما سٹیج، دُور دُور تک تنے ہوئے شامیانے، یہ سرخ افواج کی چھاؤنی، تیغ و تیر کے مظاہرے، حدِ نظر تک انسانوں کا جمِ غفیر، بھائی آج ہمیں فرصت نہیں۔ یہ کام وہ کام، یہ جا وہ جا۔ اُف، اب تھک گیا۔ چلو ذرا سستانے کے لئے قاضی جی کے خیمے میں چلیں۔ حاضر ہو سکتا ہوں —— آ جاؤ۔ مولوی گنج دین صاحب کہاں ہیں؟ شامیانے کا ایک پول ٹوٹ گیا تھا، وہاں انہیں فٹ کر دیا گیا ہے۔ پھر کیا تھا۔ مجلس کشتِ زعفران بن گئی۔ اب چٹکلے پہ چٹکلے چل رہے ہیں اور شریکِ مجلس احباب لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

چمکتا ہوا چہرہ، منوّر پیشانی، تبسّم بر لب، گھنی دراز ریش، موئے سر گھنگھریالے، عمدہ لباس، ستھرا بدن۔ عمر بھر دیکھا، ان مار پیچاں اور براق رومال کی کبھی نہ بن سکی۔ ابھی سر پہ رومال ڈالا ابھی سرکا۔ پھر ڈالا پھر سرکا۔ لرزاں لرزاں، ترساں ترساں، دستِ چپ اُٹھتا، پھر دستِ راست اُٹھتا۔ سر پہ جاتے پھر واپس آتے، لیکن ان دو حریفوں میں صلح نہ کرا سکے، تمام عمر ان کی جنگ ختم نہ ہوئی۔

ارے! اب تو قاضی جی تقریر کر رہے ہیں۔ لوگ ساکت و جامد ہیں۔ یہ ہندو

اور سکھ بھی کثیر تعداد میں آگئے ہیں۔ اللہ اللہ شجاع آباد کا خمیر اور دہلی میں اسقدر صاف شستہ اردو! لوگ تو جسدِ بے جان بنے تقریر سُن رہے ہیں۔
چٹکلے، محاورے، بندش، روانی، جوش، آواز کا زیر و بم۔ فرنگی کا نام آیا تو قصرِ بکنگھم پر گونجے، ختمِ نبوت کا بیان چھیڑا تو قادیان پر گرجے۔ لوگوں میں جوش و ولولہ، جذبۂ جہاد اجاگر ہوتا نظر آرہا ہے۔ اکابر سلف کے قصّے سنائے تو نالے اور گریہ اُٹھے، مظلوموں کی داستانیں آئیں تو آہیں نکلیں۔ ظالموں کے ظلم کو للکارا، خون گرم ہوا، تکبیر کا نعرہ گونجا ؎

خدا کی وحدت کو لات و منات کیا جانے
امورِ دین کو سکندر حیات کیا جانے

اب تو تین گھنٹے گذر گئے۔ لوگ روتے روتے تھک گئے۔ آپ بولتے بولتے نہیں تھکتے یہ وہ احرار کانفرنس ہے جس میں آخری تقریر امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم کی تھی۔ ساری رات شاہ جی مرحوم کی تقریر جاری رہی صبح کی اذان آپ نے دی۔ ہزاروں ہندو ہاتھ باندھے کھڑے تھے کہ شاہ جی خدا کیلئے تھوڑا سا قرآن مجید سُنا دیں تاکہ پھر ہم چلے جائیں ؎

ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نرسد
کفر آوردم و در عشق تو ایمان کردم

ایسی عظیم الشان سینکڑوں کانفرنسیں اب میری نظر کے سامنے گھوم رہی ہیں۔ لاہور، لائل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ملتان، بہاول پور، جتوئی، خان گڑھ وغیرہ جن کا ایک ایک لمحہ تیزی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے اور ہر جگہ قاضی صاحب مرحوم ایک نمایاں مرتبہ سے رواں دواں نظر آرہے ہیں ؎

اے کہ ہمراہ موافق بہ جہاں مے طلبی
آں قدر باش کہ عنقا ز سفر باز آید

یہ کونسی جگہ نظر آرہی ہے؟ یہ تو لاہور اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے، گاڑی کا انتظار

ہے۔ بہرحال کہیں جاتا ہے۔ مردانہ انتظار گاہ سے دو گوری چمڑی والے نکل رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں شاید روٹیاں ہیں۔ دیکھو! کتوں کو بلا رہے ہیں اور ٹیپو سلطان شہید کا نام لے لے کر ٹکڑے ڈال رہے ہیں۔ قاضی جی! آپ کا چہرہ سرخ کیوں ہو گیا؟ آنکھیں خون آلود کیوں ہو گئیں۔ پیشانی خشمگیں ہے ——— چند نان خریدے اب شیر گونجا۔ سگانِ آوارہ کو پچکارا اور ایک ایک نامور فرنگی کا نام لے کر نان ڈالتے رہے۔ کلابِ فرنگ بھی نزدیک کھڑے تھے۔ اپنی ہزیمت کا جنازہ اٹھتا دیکھتے رہے۔ بس تصویر لے کر رپورٹ ہی کرو گے نہ؟ اگر ذہنِ شاہی میں آئے تو بندہ کا خون ٹیپو مرحوم کی عزت کے لئے گرنے پر فخر محسوس کرے گا ؎

جیسے راہ زن اور لٹیرے تھے ہمارے راست باز
راہ نماؤں میں نہیں پاتے آج ہم ان کی نظیر

اے دیوار کی پارینہ تصویرو! گم ہو جاؤ۔ اے طویل شب! اب تو اپنی سیاہ چادر لپیٹ لے۔ میں ماضی کی طرف نہیں جانا چاہتا۔ میں ان یادوں کی سمع و بصر سے بھی محروم ہو جانا چاہتا ہوں۔ آج پچیس برس بعد میں دوسری زندگی میں ہوں۔ وطن کی آزادی کا سبب ہم ہوتے، اب لوگ ہمیں وطن دشمن کہتے ہیں۔ اے وطن تیرے لئے ہم نے ہزاروں صعوبتیں برداشت کیں۔ عیش و آرام کو خیرباد کہا۔ تو خشمگیں نہ ہو۔ تیرے تو ہم جانباز ہیں۔ ہاں اگر تو ناراض بھی ہو جائے کوئی بات نہیں، تیرے ہم نیازمند ہیں، ہم نے اپنے خون سے تجھے نہلایا ہے اب اپنے پسینے سے تیری آبیاری کریں گے۔ ہمیں تیرے ثمر کی نہیں تیرے بُن کی ضرورت ہے۔ گالیاں اور دکھ سہیں گے لیکن تجھ سے بیوفائی نہ کریں گے، کیونکہ تجھ کو ہم نے ہی بڑی کوششوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ بچہ ماں کو ہی عزیز ہوتا ہے جو جانکاہ مصیبت کے بعد جنم دیتی ہے تو خوش اور شاد رہ، دُور سے تیری آنکھوں کا سرمہ دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

من آں نیم کہ حرام از حلال نشناسم
شراب بہ تو حلال ست، آب بے تو حرام

قاضی جی آج کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ بس بیگ اٹھاؤ اور تیار ہو جاؤ۔ غلام حاضر ہے لیکن جانا کہاں ہے۔ بک بک نہ کرو، کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ میں ایک تقریر کرنی ہے۔ کوٹ ادو پہنچ گئے، تقریر ہوئی۔ شام کو واپسی بھی ہے۔ کیونکہ دوسرے دن سیت پور جا کر تقریر کرنی ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر آئے، گاڑی رفت گذشت۔ اُن دِنوں کوٹ ادو سے مظفر گڑھ تک بس سروس کا کوئی رواج نہ تھا۔ حیرانی تھی کیا کریں۔ ایک مال ٹرین آگئی۔ اسٹیشن ماسٹر ایک شریف آدمی تھا۔ اُس نے ٹکٹیں دِلوا دیں اور مال ٹرین کے گارڈ کو کہہ کر ہمیں سوار کرا دیا۔ ہم نرم گدّیوں پر نہیں تھے۔ کوئلہ کی بھری سیاہ بوریوں پر آرام فرما رہے تھے تاکہ سفر کی کوفت سے استراحت نصیب ہو۔ پہلے تو ٹرین گارڈ نہایت ترشی سے پیش آیا۔ محمود کوٹ آکر خدا جانے اُسے کیا سُوجھی کہ ہمیں اپنے ڈبہ میں بُلا لیا اور فرش پر بیٹھ جانے کی فیاضی عطا فرمائی۔ قاضی جی کی گفتگو سے ایسا متاثر ہوا کہ قاضی جی کو کرسی اور مجھے بنچ عطا فرمائی۔ روٹی کھلائی، پھل کھلائے، ایسا گرویدہ ہوا کہ جب مظفر گڑھ ریلوے اسٹیشن پر ہم اُترنے لگے تو بصد احترام الوداع کرنے کیلئے پلیٹ فارم کے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ رات ہو چکی تھی۔ ان دنوں مظفر گڑھ میں نہ تو ہماری کوئی جماعت تھی اور نہ ہی کوئی ہم خیال مونس۔ رات بہرحال مظفر گڑھ ہی میں گزارنی تھی۔ نہ ہوٹل نہ سرائے، سردیوں کی رات یخ بستہ، اسٹیشن سے شہر تک گرتے پڑتے پہنچ گئے، لیکن اب کیا کیا جائے۔ کدھر جائیں کوئی جائے پناہ نہیں۔ موجودہ خلیل ہوٹل کے قریب آثارِ قدیمہ کی صورت ایک طباخ گھر تھا۔ وہاں جا گھسے۔ کرایہ پر دو شکستہ چارپائیاں، دو بوسیدہ غلیظ بدبودار نیم عریاں بستر مِل گئے۔ سردی سے بچنا ہی تھا، فوراً قبول کر لئے۔ اس میں گھس کر توس کی ڈرائنگ بن گئے، ان بستروں میں شاید حشرات الارض کی تمام کوتاہ قد اقوام کا بین الاقوامی اشتراکی اجتماع تھا اور ہمیں ضیافت کا انہوں نے خوانِ یغما سمجھا تھا۔ سر سے پاؤں تک سوزش اور جلن، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن،

خدا خدا کر کے صبح کی ؎

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
زندہ بہ آنیم کہ آرام نہ گیریم

ایک آل انڈیا لیڈر کو لے کر گرسنہ شکم، زخمی بدن منزلِ مقصود کو روانہ ہوا اب جو کپڑے اتارے تو خدا جھوٹ نہ لکھوائے۔ کپڑوں پر آن گنت بیش اقسام اجرام ارضی پیوستہ، اور بدن کے سارے چمڑے پر ندیوں کی مثل نم آلود نشان، پہلے کپڑوں کو، پھر ہمیں اُبالا گیا۔ قاضی جی کے گھنگریالے بال اُن کے لئے جائے اماں ثابت ہوئے۔ میرا گنجہ سر شکر ہے، ان ظالموں کو پسند نہ آیا۔ شاید یہاں وہ توپ شکن مورچے نہ بنا سکتے تھے۔ سیت پور پہنچے تو احباب سب جمع تھے، اُلٹا دل لگی! بھانت بھانت کے فقرے، خدا کی قسم سب الم کافور ہو گئے۔

اس وقت یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے قاضی صاحب میرے قریب بیٹھے ہیں، ہنس رہے ہیں، اور ایک پختہ کیلے کا گودا میرے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں ؎

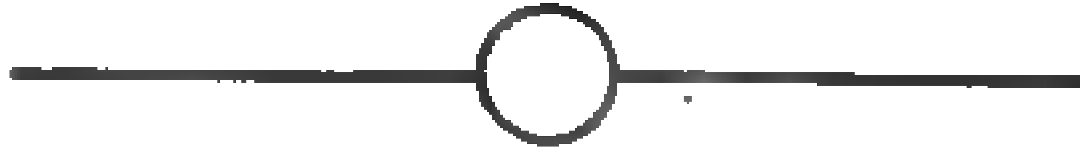
حُبّکَ فِیْ قَلْبِیْ وَ ذِکْرُکَ فِیْ فَمِیْ
وَ وَجْھکَ فِیْ عَیْنِیْ فَاَیْنَ تَغِیْب

دن تو اپنا سایہ بھی اٹھا لیتا ہے۔ اے شب! تو آج اتنی طویل کیوں ہو گئی ہے تو بھی ڈھل جا، وقت بھی ڈھلتا ہے۔ روشنی ٹمٹماتی ہے۔ جوانی ڈھلتی ہے، شباب ڈھلتا ہے۔ اے زنِ پیر! اپنی پرشکوہ سیاہیوں کو اب دھو ڈال۔ آج نہ مرغ سحر ہے، نہ مسجد کا مؤذن۔ وہی پُرہول نقش دیوار ہے اور مَیں ہوں۔ تصویریں ہیں کہ بڑی تیزی سے چل رہی ہیں۔ ارے! یہ گورستان کیسا نظر آ رہا ہے۔ مرمریں بلّوریں قبریں۔ کیا شہرِ خموشاں اسی کا نام ہے۔ ہیں —— یہاں تو کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ تو سنو! اس قبر سے یہ آواز آ رہی ہے کہ اس کرۂ ارض میں ایک ملک ایسا بھی ہے جس کے باشندے اپنے محسنوں کو گالیاں اور راہ زنوں کو

دعائیں دیتے ہیں۔

قاری نورالحق صاحب! آپ نے کس چکر میں ڈالا۔ ماضی کی یادیں کچھ سہانی اور کچھ رُوح فرسا ہوتی ہیں۔ اس پورے برعظیم پاک و ہند میں وہ کونسی جگہ ہے، جہاں ہم نہ پہنچے۔ وہ کونسی تحریک ہے جس میں ہم نہ شریک ہوئے اور ہمارے دلوں میں ایک ہی ولولہ، ایک جذبہ اور ایک ہی جنون تھا کہ یہ غلام آباد آزاد ہو۔ بدیشی اقتدار عدم آباد ہو ——— یہ گرمیاں یہ سردیاں، سفر حضر یا ریل جیل ہر روز کی عادت اور شغل تھا۔ اب آپ کو اس البم میں ایک اور واقعہ دکھاتا ہوں۔ یہ تلمبہ ضلع ملتان ہے۔ یہاں ڈسٹرکٹ کانفرنس ہے۔ اس تین روزہ اجتماع میں حضرت امیرِ شریعت مرحوم، شیخ صاحب مرحوم، مولانا گل شیر صاحب مرحوم، قاضی جی مرحوم، خادم وغیرہ سب حضرات شریک ہیں۔ شب خوابی کے لئے ایک کمرے میں مولانا گلشیر صاحب مرحوم، قاضی صاحب مرحوم اور دو احباب دیگر ——— ٹھہرے ہوئے تھے۔ آخری شب شاہ جی مرحوم کی تقریر تھی جو بارہ بجے رات کہیں جا ختم ہوئی۔ مَیں جلسہ گاہ سے جو کمرے میں آیا تو بستر ندارد، حیران ہوا کیا کروں، سب حضرات سوئے ہوئے تھے۔ ارے بھائی میرا بستر کہاں گیا۔ مولانا گلشیر صاحب مرحوم اللہ بخشے بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ جفاکشی اور سادگیوں کا نمونہ تھے۔ آپ کے چند واقعات چشم دیدہ ہیں۔ جی چاہتا ہے تحریر کر دوں، لیکن موضوع سے نکل جاؤں گا۔ خیر مولانا موصوف میری آواز سُن کر فوراً اُٹھے، فرمایا، میرے بستر پر آجاؤ۔ حضرت! آپ آرام فرمائیں۔ مَیں کہیں سو جاؤں گا۔ کسی صاحب کے نتھی ہو جاؤں گا۔ فکر کی بات نہیں۔ مجھے سونے کا حکم دیا، اپنی ایک مخصوص موٹی چادر لے کر مسجد میں جو کہ قریب ہی تھی، چلے گئے۔ اتنے میں قاضی صاحب مرحوم اُٹھے۔ آواز دی، مولانا! آجائیے، میرا بستر حاضر ہے، ہم دونوں ایک بستر میں ہو جائیں گے، مگر مولانا تو مسجد میں جا ہی چکے تھے۔ قاضی صاحب عقب میں بھاگتے ہوئے گئے تاکہ مولانا صاحب کو واپس لائیں۔ دونوں حضرات مسجد کے اندھیرے میں

گم ہو گئے تھے۔ میں دو خالی بستروں کے درمیان خالی کھڑا تھا، کہ کیا کروں؟ اور سخت نادم تھا کہ میری وجہ سے دو بزرگوں کو تکلیف اُٹھانی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی صاحب تو واپس آگئے، لیکن مولانا نہ ملے۔ غالباً وہ مسجد کے تاریک ماحول میں اور کئی آدمیوں کے درمیان کوئی پختہ اینٹ سر کے نیچے رکھ کر چادر تان کر سو گئے۔ صبح نماز کے بعد ہی تشریف لائے۔ سُنا ہے کہ نیند تختہ دار پر بھی آجاتی ہے۔ نہ معلوم میری نیند آج مجھ سے کیوں ناراض ہو گئی ہے۔ آج بیدار ہوں اور ماضی کے لُطف آگیں تصورات میں محو ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے میں تو یہ سب رویا سمجھ کر بُھلا چکا تھا۔



منظور احمد۔ چیف ایڈیٹر ہفت روزہ "مدینہ" بہاولپور۔

قاضی صاحب ○ ایک لاثانی خطیب

بہت سے لوگوں کو قاضی احسان احمد صاحب کا ابتدائی زمانہ یاد ہوگا۔ دو تین رٹے ہوئے موضوع، چند مخصوص اشعار، نپا تُلا لب و لہجہ تھی کہ قاضی صاحب مہینوں ہر اجتماع اور ہر جلسے میں اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا پڑھتے اور اُس پر تقریر کیا کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ بڑے بڑے اجتماعات میں یوں بولنے لگے کہ مجلسِ احرار کے بہت سے مقررین ان کی خطابت پر رشک کرنے لگے۔ انہیں ہزاروں اشعار ازبر تھے، بلیشمار احادیث یاد تھیں۔ قرآن پاک کی ہر آیت پر بے تکان بولتے اور چٹکلے اور لطیفے تو اس قدر تھے کہ جب سُنانے پر آتے تو گھنٹوں محفل کشتِ زعفران بنی رہتی۔

قاضی احسان احمد صاحب کو حضرت امیرِ شریعتؒ پر بڑا اختیار حاصل تھا، اتنا اختیار کہ شاید عطاء المنعم کو بھی حاصل نہ تھا۔ جب شاہ جی کے عقیدت مند کوئی بات منوانے میں ناکام ہوتے تو وہ قاضی احسان کے پاس چلے جاتے۔ قاضی احسان، شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بات مان لی جاتی۔ جس زمانے میں جلسوں کا رواج تھا اور ہر جگہ مجلسِ احرار کے پلیٹ فارم بنتے تو لوگ شاہ جی کے لئے دیوانہ وار لاہور بھاگتے، مگر شاہ جی کا یہ عالم ہوتا، کہ تقریروں سے فرصت ہی نہ ملتی، مجبوراً شاہ جی سے لوگوں کو مایوس لوٹنا پڑتا۔ مگر اس وقت قاضی احسان کام آتے اور وہ شاہ جی کی ڈائری میں چشمِ زدن میں ردوبدل کر ڈالتے۔ شاہ جی مسکراتے اور قاضی صاحب کی پیشانی چوم لیتے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا، شاہ جی بیمار پڑ گئے۔ قاضی صاحب طویل دورے پر تھے شاہ جی کی عیادت کے لئے نہ پہنچ سکے، حتیٰ کہ شاہ جی شفایاب ہو گئے۔ اتّفاق سے شاہ جی کو ایک جلسے میں لودھراں پہنچنا تھا۔ قاضی احسان احمد پہلے پہنچ چکے تھے۔ شاہ جی کے استقبال کے لئے لوگ اسٹیشن پر جمع تھے۔ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو شاہ جی کو لوگوں نے ہاتھوں پر لے لیا۔ قاضی احسان احمد بھی لوگوں کے سیلاب میں بہہ گئے۔ قیام پر سب لوگ جمع تھے۔ شاہ جی ایک چارپائی پر اُلٹی پالتی مارے سفر کے دلچسپ واقعات سُنا رہے تھے کہ قاضی صاحب آ گئے۔ شاہ جی نے قاضی صاحب کو دیکھا اور آنکھ پھیر لی۔ قاضی صاحب پہلے ہی اس خدشے میں تھے کہ شاہ جی ناراض ہیں لیکن اب خدشہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ قاضی صاحب اُٹھے اور زار و قطار روتے ہوئے پاؤں میں گر گئے ...... شاہ جی تھوڑی دیر تو بے نیاز ہو کر بیٹھے رہے مگر پھر ضبط نہ ہو سکا۔ قاضی صاحب کو اُٹھایا، سینے سے لگایا، پیشانی چومی، اور یہ شعر پڑھنے لگے ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا گشت و ما در کوچہ ہا رُسوا شدیم

اب یہ باتیں قصّۂ پارینہ بن گئی ہیں۔ کہاں مجلسِ احرار اسلام اور کہاں خطابت کی نشہ زدیاں، کہاں رات رات بھر جاگ کر تقریریں سُننے کی آرزو اور کہاں دیوانوں اور قلندروں کی لن ترانیاں؟ وقت بہت آگے نکل گیا ہے، اب پیچھے لوٹ کر دیکھنے کی فرصت کہاں؟ جو لوگ باقی ہیں وہ بھی تیار بیٹھے ہیں۔ شاہ جی کب کے خُلد آشیاں ہو گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی یاد ہی تبرک بن گئی ہے، قاضی احسان زندگی کی بساط لپیٹ گئے، اب شورش ہیں تو انہیں ذیابیطس نے گھیر رکھا ہے اور جیل کی آہنی سلاخیں ان کی زندگی کا نشان بن گئی ہیں۔ ماسٹر تاج الدین انصاری لچکتی ہوئی شاخ ہیں۔ شیخ حسام الدین ٹمٹماتا ہوا چراغ ہیں[1]۔ مولانا مظہر علی اظہر ایسے گوشہ نشیں ہوئے کہ ان کی صورت تصوّر میں نہیں آتی۔ بھانباز مرزا دنیا کی صعوبتوں میں مدغم ہو گئے۔

[1] اب دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اب کس کا ذکر کیجئے اور کس سے راہ رسمِ اُلفت بیان کیجئے۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی اور اپنی زندگی کے جوان لمحے جیل کی کالی کوٹھڑی میں گذار دیئے وہ اس لائق بھی نہیں کہ ان کے نام پر عقیدت کے پھول برسائے جائیں۔ قاضی احسان احمد، اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بیماری نے انہیں اس طرح چارپائی سے لگایا کہ پھر نہ اُٹھ سکے۔ دوستوں، بہی خواہوں، رشتہ داروں اور عقیدت مندوں کی دعائیں اُنہیں موت کے پنجے سے نہ چھڑا سکیں۔ وہ اپنے گھر کا واحد چراغ تھے۔ آج یہ چراغ بُجھ گیا ہے اور اُن کے گھر میں سوائے تاریکی کے اور کچھ نہیں رہا۔ قدرت کا کرشمہ ہے کہ قاضی صاحب کا حقیقی یا سوتیلا بھائی ہے اور نہ بیٹا۔ وہ اولاد نرینہ کے لئے ترستے رہے مگر قدرت نے لڑکیاں بخش دیں۔ اِس طرح اُن کی خطابت کا کوئی وارث نہیں بن سکا اور ان کی جائیداد بھی اولادِ نرینہ کے اِرث سے محروم رہی۔ راقم الحروف کے ساتھ قاضی صاحب کے دیرینہ روابط تھے۔ جامعہ عباسیہ سے فراغت کے بعد طبیعت میں اُبال آیا تو شجاع آباد جا پہنچا اور قاضی صاحب کے ساتھ دوروں پر نکل کھڑا ہوا۔ چھ ۶ ماہ تک خطابت سے مستفید ہوتا رہا۔ بعد میں گھریلو حالات کچھ اس قسم کے ہوگئے کہ ان سے جُدا ہونا پڑا۔ قاضی صاحب کی ڈائری تقریروں اور اجتماعات میں خطابت کی تاریخوں سے بھری رہتی تھی۔ مہینے میں ایک دن بمشکل گھر میں رہنا نصیب ہوتا تھا۔ جس دن وہ گھر میں ہوتے، معتقدین کا تانتا لگا رہتا۔ وہ کوشش کرتے کہ جمعہ کا خطبہ شجاع آباد کی شاہی مسجد میں دیں، مگر بہت کم اس کوشش میں کامیاب رہتے۔ بعض اوقات وہ دو ۲ دو ۲ ماہ کے بعد گھر لوٹتے۔ رات کہیں دن کہیں، صبح کہیں شام کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ان کی زندگی حضرت امیر شریعتؒ کی طرح کچھ جیل میں گذر گئی اور کچھ ریل میں، یعنی ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

قاضی صاحب پر سارا رنگ حضرت امیرِ شریعت کا تھا۔ امیرِ شریعت کے فیض سے وہ میدانِ خطابت کے شہسوار بن گئے۔ مجلسِ احرار کی پہلی صف میں اگر انہیں کھڑا کیا گیا تو یہ بھی حضرت امیرِ شریعت کا فیض تھا اور اگر قاضی صاحب کو ہندوستان کے چپے چپے میں شہرت حاصل ہوئی تو یہ بھی امیرِ شریعت کا فیضان تھا۔ قاضی صاحب کا مقدر اتنا شاندار تھا، وہ شجاع آباد سے اُٹھے تو ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنے نام، اپنی شہرت اور اپنی خطابت کے جھنڈے گاڑ گئے۔ ایک مرتبہ امیرِ شریعت کی نظر قاضی صاحب پر پڑی تو انہیں جوہرِ تابدار بنا ڈالا۔

دفترِ احرار لاہور میں مجلس گرم تھی اور تمام حاضرین سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی جادو بیانی سے مسحور تھے۔ لطیفوں پر لطیفے اور قہقہوں پر قہقہے پڑ رہے تھے۔ تحسین و آفریں اور واہ واہ، سبحان اللہ کا شور بپا تھا۔ کسی نے شاہ جی سے پوچھ لیا حضرت! آپ اپنی زندگی میں ایک دو کتابیں لکھ ڈالئے کام آئیں گی۔ اس پر آپ نے فرمایا میری کتابیں تو قاضی احسان اور شورشؔ ہیں، مجھے کتابیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

مجلسِ احرار میں شاہ جی کو شورش کاشمیری، قاضی احسان، مرزا جانباز اور قیصر مصطفٰے سے بے پناہ پیار تھا اور حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی کی شفقت، توجّہ اور محبت نے ان حضرات کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔

مجلسِ احرار کے پلیٹ فارم پر یوں تو ہر آدمی شعلہ بیان تھا۔ (مجلسِ احرار کے ساتھ جو بھی وابستہ ہوا وہ شعلہ بیان ہوگیا) مگر اس چھوٹی سی دنیا میں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا محمد علی جالندھری، شورش کاشمیری اور قاضی احسان احمد خطابت اور سٹیج کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے، اور یہ اپنی اپنی جگہ خطابت کے روشن مینار تھے، مگر شاہ جی کے سامنے ان سب کے چراغ بُجھ جاتے تھے۔ جب شاہ جی بولتے

تو سوائے مولانا حبیب الرحمٰن کے، سب کے سب غُبر بلیب ہو جاتے۔ شاہ جی کا پورے ہندوستان میں کوئی جواب نہ تھا۔ مجلسِ احرار کو اس لحاظ سے ایک ایسی انفرادیت حاصل تھی جو کسی جماعت کو حاصل نہ تھی۔ ابتدائی دور کے مقررین میں اگرچہ صاحبزادہ فیض الحسن آلو مہار شریف کا بھی احرار سٹیج پر طوطی بولتا......... یہ زمانہ بڑا شقی القلب ہے۔ جب ان لوگوں کا نام آتا ہے تو عقیدت و محبت کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، آخر کیوں؟

قاضی احسان احمدؒ کی اس معاشرے کو ابھی ضرورت تھی۔ وہ حق گو تھے۔ راست باز تھے۔ صداقت پسند اور معتدل مزاج تھے۔ محبّت ان کا شیوہ تھا خلوص ان کی عادت تھی، دین کے شیدائی تھے اور اسلام کے جان نثار۔ ایک بات کو حق سمجھتے تو وہیں پر قائم ہو جاتے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنے مؤقف سے نہ ہٹا سکتی۔ گونجتے تو سرکش ایوانوں کو متزلزل کر دیتے۔ ان کی للکار سے بدعت اور کُفر کے در و بام ہِل ہِل جاتے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایسی انجمن جس میں دوستی کی خوشبو، خلوص کی مہک اور وفا کی چمک تھی۔ آج ان کی جدائی سے بہت سی انجمنیں سوگوار ہیں بہت سے ادارے ملول ہیں اور بہت سے انسان درد و کرب میں مبتلا ہیں ع

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

قاضی صاحب قرآن و سنّت کے پُرانے ماہر تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو شرحِ صدر تھا۔ ان میں خطابت کا جو جوہر تھا وہ خالصاً "وہبی" تھا، اس میں "کسب" کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ قدرت نے انہیں صرف خطابت کے لئے پیدا کیا تھا مگر قاضی صاحب کی خطابت "کسب، محنت اور فیضان" کا نتیجہ تھی۔......... بہر حال یہ دونوں خطیب توحید کے پروانے اور نبوّت کے دیوانے تھے۔ ان سے خدا اور رسول کا ذکر زندہ تھا ان سے دین اور دین کی قدریں زندہ تھیں، اور ان سے اسوۂ حسنہ کی تابندگی قائم

تھی۔ یہ حضرات جب تک زندہ رہے، رسول مدنی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوّت کی حفاظت کا عَلَم اُٹھائے رہے۔ خاتم النّبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نورِ رسالت کی حفاظت کرتے رہے۔ آج اگرچہ وہ منوں مٹی کے نیچے دب گئے ہیں مگر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

واحد ایم اے۔ چیف رپورٹر روزنامہ "امروز" ملتان

تحریک آزادیٔ وطن کا ایک بیباک مجاہد

کائنات کا یہ مربوط نظام، گردشِ لیل و نہار کا یہ باقاعدہ تسلسل، موت و حیات کا یہ لامتناہی سلسلہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس دنیا میں کسی چیز کو بھی ثبات حاصل نہیں۔ ہاں "ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں"۔ صبح کو طلوع ہونے والا سورج یہ پیغام لاتا ہے کہ نصف النہار پر پہنچ کر رو بہ زوال ہونا اس کا مقدّر ہے۔ چودھویں رات کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ پکار پکار کہتا ہے کہ بدرِ ہلال سے بدرِ منیر اور بدرِ منیر سے بدرِ ہلال بننے کا یہ سلسلہ تا قیامِ قیامت قائم و دائم رہے گا۔ بالکل یہی کیفیت موت و حیات کی ہے ہر پیدا ہونے والا بچّہ اپنی فانی زندگی پر اشکبار آتا ہے۔ ہر مرنے والا یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ چند روزہ حیات مستعار گذار کر اسے بہرحال اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، اس لئے ہر ذی شعور اور صاحبِ عقلِ سلیم اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے ابنائے جنس سے ممتاز ہو۔ اس کے دوست ساتھی اور شاہراہِ زندگی کے دیگر رفقاء اسے اپنے لئے روشنی کا مینار قرار دیں اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھیں۔ اسی جذبے نے دنیا میں بیشمار ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جن کی زندگیاں واقعی دیگر انسانوں کے لئے نہ صرف قابلِ احترام بلکہ قابلِ تقلید بھی ہیں۔ یہ حقیقت بھی مسلّمہ ہے کہ موت کی آنکھوں میں ہر چھوٹا بڑا، عالم و جاہل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نہ کسی بادشاہ سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ رعایت کرتی ہے اور نہ کسی مفلس و قلاش کی بیکسی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس پر زیادتی کرتی ہے۔ دنیا میں ایک انسان بڑی بڑی فتوحات کرتا ہے اور عظیم ترین

فاتح کہلاتا ہے۔ اس کی فوجیں، جرنیل، بہادر سپاہی بڑی بڑی عظیم الشّان سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔ بڑے بڑے ملکوں کو پامال کر کے وہاں کی تہذیب و تمدّن کے نشانات مٹا دیتے ہیں لیکن موت کا یہ آہنی جنگلہ اور ہاتھ جب اس کی تنی ہوئی گردن کی طرف اُٹھتا ہے تو نہ اس کے حواری اُسے بچا سکتے ہیں اور نہ بڑے بڑے شہ زور پہلوان اور جانباز سپاہی۔ موت کسی امیر و غریب، فقیر و شہنشاہ کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں چھوڑتی لیکن اس کے باوجود کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن تک موت کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ اپنی پوری تندی و تیزی اور جبر و قہر کے باوجود اس کی زندگی کو عوام سے نہیں چھین سکتی۔ ان کی حیات مستعار فنا پذیری کے باوجود موت کی اس دست برد سے محفوظ رہتی ہے، اور عرصہ دراز تک اس کا تذکرہ نسلاً بعد نسل عوام میں رہتا ہے۔ یہ شخصیتیں کچھ ایسے معیار قائم کر جاتی ہیں جو انسانی تہذیب و تمدّن، مذہبی روایات اور قومی زندگی کا ایک اہم ترین حصّہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے قوم اگر چاہے تو بھی انہیں فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی زندگیوں کو کتابوں کی شکل میں الفاظ کا جامہ پہنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے، اور یہ کتابیں ہمیشہ انسانیت کے متلاشیوں اور بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ایک زندہ و پائندہ شخصیت "قاضی صاحبؒ"۔

قاضی صاحبؒ

کسی شخصیّت کو بنانے میں ماحول، حالات اور واقعات ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قدرت ہر مولود کو فطری طور پر تمام خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازتی ہے، اور اُسے گوناگوں صفات سے آراستہ کر کے اس دارِ فانی میں بھیجتی ہے۔ وہ منصفِ حقیقی اپنے انصاف کے تقاضوں کے ماتحت ہر انسان کو انسانیت کے جو اصول ودیعت کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مخفی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع سب کو یکساں میسّر نہیں آتے۔

لیکن جن لوگوں کو سازگار ماحول اور حقیقی رہنما مل جاتا ہے وہ لوگ عظیم کہلاتے ہیں جلال الدین کے مولائے روم بننے میں جہاں ان کی طبعی اور خلقی صلاحیتوں کو دخل ہے وہاں شمس تبریزؒ کی نگاہِ کرم اور ان کی پاکیزہ صحبت کا ہی اثر ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت قاضی صاحب مرحوم و مغفور کی بھی ہے۔ قاضی صاحب کے جدِّ اعلیٰ کا نام قاضی محمد سلطان تھا.... آپ بانئ شجاع آباد، نواب شجاع کے اساتذہ میں سے تھے۔ وہ آپ کا بہت ادب کرتے تھے۔ کہتے ہیں جب شجاع آباد کی بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو نواب مرحوم نے قاضی محمد سلطان سے مشورہ کیا اور اُن کے آمادہ کرنے پر نواب مرحوم نے یہ بستی بسانے کا منصوبہ بنایا تو قاضی صاحب نے اس کا نام شجاع آباد تجویز فرمایا۔ نواب صاحب نے شہر میں ایک رفیع الشان اور خوبصورت مسجد تعمیر کرائی اور اس کے خطیب کے فرائض قاضی محمد سلطان کے سپرد ہوئے۔ یہ مسجد جسے شاہی جامع مسجد کہا جاتا ہے۔ اسی دور سے اس خاندان کے زیرِ انتظام چلی آرہی ہے۔ یہی معاملہ شاہی عیدگاہ کا بھی ہے۔

قاضی محمد سلطان کے بعد اس خاندان میں قاضی حبیب اللہ ایک بہت بڑی علمی اور روحانی شخصیت گزرے ہیں۔ جو اپنے دور کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے۔ قاضی احسان احمد مرحوم کے والد قاضی محمد امین بھی ایک اچھے عالم تھے لیکن ان کے دوسرے بھائی قاضی محمد یٰسین صاحب ایک عالمِ اجل اور قاضی بے بدل تھے۔

قاضی محمد امین مرحوم کے ہاں کافی عرصہ تک کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی تو خدائے کریم سے انہوں نے دُعا کی جو منظور ہوئی اور آپ (قاضی احسان) شجاع آباد کے شہر میں ربیع الاوّل کے مبارک مہینے کی ۹ تاریخ کو پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق سن عیسوی کے لحاظ سے ۱۹۰۱ء میں ولادت ہوئی۔ والدین نے اس نعمتِ خداوندی کا نام "احسان احمد" رکھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا محمد یٰسین اور والد قاضی محمد امین اور دیگر بزرگوں سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ سرکاری سکول میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ بعد میں شجاع آباد کے مشہور مدرس

اور عالم مولانا اللہ وسایا سے تعلیم حاصل کی۔ قرآنی علوم و معارف، حدیث و تفسیر کے علوم کی تحصیل کے لئے مولانا خلیل الرحمٰن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

قاضی صاحب خاندانی قاضی اور خطیب تو تھے ہی، حالات نے ان کے سینے میں ایک اچھا مقرر بننے کا شوق پیدا کیا۔ قاضی صاحب نے پندرہ سال کی عمر میں تقاریر کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف موضوعات پر بڑی روانی اور پورے اعتماد سے بولنے لگے۔ ان کی ابتدائی تقاریر میں بھی ایسی پختگی تھی اور انہیں اپنے موضوع پر اتنا عبور ہوتا تھا کہ سننے والے انگشت بدنداں ہو کر حیرت سے ان کا منہ تکتے رہ جاتے تھے۔

حضرت امیرِ شریعت سے ملاقات

قاضی صاحب کا عنفوانِ شباب تھا۔ وہ اٹھارہ سال کے خوب رُو نوجوان تھے۔ پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے سات آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی بدحالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ایک طرف مسلمان ہندو برہمن کی کم ظرفی، تنگ نظری اور تعصب کا شکار تھا، تو دوسری طرف اسے انگریزی سامراج اپنا دشمن ازلی سمجھ کر اسے تختۂ مشق بنائے ہوئے تھا۔ اس دور ابتلاء و مصائب میں دردمندانِ قوم کی آنکھیں مسلمانوں کی بے بسی اور بدحالی پر اشکبار ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس دور نے ایسے مسلمان رہنما پیدا کئے ہیں، جن کی دُوررس نگاہوں نے اس بدحالی کے صحیح اسباب و علل کو سمجھا اور اس کا صحیح طور پر تدارک کرنے کے لئے پوری قوم کو از سرِ نو منظم کیا، اور اپنے حقوق کے حصول کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ ان مخلص رہنماؤں اور مجاہدوں میں حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے معجز نما فنِ خطابت سے اعجازِ مسیحائی کا کام لیا اور مسلمان قوم کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک کر انکی پژمردہ روحوں کو نیا جوش، نیا ولولہ اور سرفروشی کا ناقابلِ تسخیر جذبہ دیا۔ ان کی معجز نمائی کی دھاک پورے ملک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میدانِ خطابت کے بڑے بڑے شہسوار اُن کی رکاب تھام

کر چلتے تھے۔ بڑے بڑے خطیب انہیں اپنا امام جانتے تھے اور اس فن میں انہیں مسلّم الثبوت استاد گردانتے تھے۔ شاہ جی مرحوم کے اعجازِ خطابت کا شُہرہ ملتان بھی پہنچا۔ قاضی صاحب شاہ جی مرحوم کی خطابت کا شہرہ سُن کر ان کے قدموں میں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔ دو ۲ سال کا عرصہ اس طرح گذر گیا حتیٰ کہ وہ موقع بھی آ گیا، جس کے لئے قاضی صاحب مدّت سے چشم براہ تھے۔ یہ ۱۹۲۶ء کا سال تھا۔ ملک عبدالغفور انوری کی روایت کے مطابق شاہ جی مرحوم ایک جلسے سے خطاب کرنے ملتان تشریف لائے اس جلسے کی دھوم پورے علاقے میں مچ گئی۔ قاضی صاحب نے بھی شاہ جی کی آمد کا سُنا تو وہ ملتان آئے۔ شاہ جی کا قیام پاک دروازہ میں حاجی ملک برخوردار کے مکان پر تھا یعنی ملک عبدالغفور انوری کے مکان پر۔ انوری صاحب اور قاضی صاحب مرحوم میں دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ چنانچہ انہوں نے قاضی صاحب مرحوم کو شاہ جی کی خدمت میں حاضری کا موقع فراہم کیا۔ اس پہلی ملاقات اور شاہ جی کی شفقت نے قاضی صاحب کو ان کا گرویدہ بنا لیا اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی زندگی شاہ جی کے قدموں پر نچھاور کر دیں گے۔ شام کو بعد نماز عشاء جلسہ ہوا۔ جس میں ملتان ڈویژن کے علاوہ دیگر شہروں سے آئے ہوئے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تقریر سے فارغ ہو کر جب دوبارہ شاہ جی مرحوم اور قاضی صاحب مرحوم کی ملاقات ہوئی تو قاضی صاحب نے شاہ جی سے شجاع آباد تشریف لانے کی درخواست کی۔ اس وقت قاضی صاحب کے والد صاحب قاضی محمد امین بھی موجود تھے، انہوں نے بھی اصرار کیا، لیکن شاہ جی کو پروگرام کے مطابق لاہور کی ایک کانفرنس سے خطاب کرنا تھا اس لئے معذرت کے ساتھ وعدہ کیا کہ آئندہ سال جب کبھی ملتان آنا ہوا تو شجاع آباد ضرور آؤں گا۔ اس طرح دو سال کا عرصہ گذر گیا۔ ادھر قاضی صاحب کی شادی ہو گئی۔ ۱۹۲۸ء میں شاہ جی دوبارہ ملتان تشریف لائے تو اس رات وہ شجاع آباد تک قدم رنجہ فرمانے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ

شاہی جامع مسجد شجاع آباد میں شاہ جی نے ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت اتنی کمزور تھی کہ اتنے بڑے شہر میں صبح کی نماز کے لئے صرف چند مسلمان مسجد میں آتے تھے۔ شاہ جی نے "اصلاحِ معاشرہ" کے موضوع پر اتنی پُرسوز انداز اور مؤثر پیرایہ میں تقریر کی کہ شجاع آباد کے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب آگیا، اور وہ اس بے عملی سے توبہ کرکے ایک فعال جماعت بننے پر آمادہ ہوگئے۔ قاضی محمد امین اس موقع پر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنا سب سے قیمتی سرمایہ، اپنی متاعِ حیات یعنی اپنا اکلوتا بیٹا احسان احمد، شاہ جی کے قدموں میں ڈالا اور کہا، میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے شاہ جی مرحوم نے نوجوان قاضی کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ شاہ جی کی صحبت کے اثر اور فیضانِ نظر نے احسان احمد کو ایک عظیم خطیب بنا دیا۔

مجلسِ احرارِ اسلام شاہ جی مرحوم قاضی صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے اور پھر قاضی صاحب نے اپنی خدمات کی وجہ سے شاہ جی کا اعتماد حاصل کر لیا اور مخلصانہ فرمانبرداری کے جذبے نے قاضی صاحب کو شاہ جی کے اعتماد کا صحیح اہل ثابت کیا۔ حتٰی کہ جب ۱۹۳۰ء میں مجلس احرار اسلام قائم ہوئی تو قاضی صاحب اس کم عمری کے باوجود ضلع ملتان میں مجلس کے صدر بنے اور اس جماعت کی تنظیم کیلئے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ شاہ جی نے انہیں کلکتہ، بمبئی اور دیگر اہم شہروں میں تبلیغ اور تنظیم کے سلسلے میں بھیجا اور پنجاب کا دورہ بھی کیا۔

شیخ الاسلام سے تلمذ قاضی صاحب اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور تنظیمی دورے کے سلسلے میں سوات بھی گئے۔ شاہ جی مرحوم کی معیت میں جب ڈابھیل پہنچے تو حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی صدارت میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ بقول مولانا انوری، قاضی صاحب نے حضرت شیخ الاسلام کے علمی کمال اور بزرگی سے متاثر ہو کر بطور تبرک اور ان کے ساتھ ایک نسبت قائم کرنے کے لئے وہیں اُن کے

سامنے زانوئے ادب تہہ کئے اور قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر پڑھ کر حضرت شیخ الاسلام کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

بیٹے کا انتقال قاضی صاحب کی حب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ قاضی صاحب کلکتہ روانہ ہوئے تو اُن کا نومولود بیٹا بیمار تھا۔ جب وہ کلکتہ پہنچے تو بیٹے کی علالت نے شدّت اختیار کی اور انہیں اطلاع ملی کہ بیٹا بسترِ مرگ پر موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ انہوں نے پھر بھی کوئی خیال نہ کیا، حتّٰی کہ دو تین روز کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بیٹے کے انتقال کی خبر جب قاضی صاحب کو پہنچی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا، اور جماعتی کام میں مصروف رہے۔ ان کے والد قاضی محمد امین نے یہ حالت دیکھی تو انہیں طنزاً مبارک باد کا تار بھیجا۔

مسجد شہید گنج اس کے بعد تو قاضی صاحب کی زندگی کی جداگانہ حیثیت ہو گئی اور شاہ جی کی فرمانبرداری، خدمت گذاری اور تعمیلِ حکم ان کی زندگی کا مقصدِ وحید رہ گیا، اور اپنے آپ کو شاہ جی مرحوم کی مرضی کے تابع کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں قادیان شہر میں ختم نبوّت کانفرنس ہوئی جس میں شاہ جی نے ایک بڑا بلیغ اور عالمانہ خطبہ دیا۔ ختمِ نبوّت پر بڑی مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد شاہ جی پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے کی پیروی میں جو شخص سب سے پیش پیش رہا وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھے۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے جب مجلس احرار اسلام نے مسجد شہید گنج کے لئے تحریک چلائی تو جہاں دیگر علماء رہنمایانِ احرار گرفتار ہوئے وہاں قاضی صاحب بھی ایک جتھے کے ہمراہ گرفتار ہوئے۔ اس طرح ۱۹۳۷ء میں جب انگریز سامراج نے اپنے لگائے ہوئے پودے کی حفاظت کے لئے قادیان شہر میں مسلمانوں کو نماز جمعہ پڑھانے کی ممانعت کر دی تو اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جن شخصیتوں نے جمعہ پڑھایا اور حکومت وقت کو چیلنج دیا، ان میں شاہ جی کے بعد قاضی صاحب کا نام آتا ہے۔ اس موقع پر مولانا محمد قاسم

شاہجہانپوری جیسے بزرگ بھی میدان میں آئے، ان سب پر مقدمے چلے اور ایک ایک سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ملی۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں جب احرار نے دوسری جماعتوں کے ساتھ فوجی بھرتی کے خلاف تحریک چلائی اور عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا تو قاضی صاحب اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ اِن تمام خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ہر بار مجلسِ احرار اسلام کی آل انڈیا مجلسِ عاملہ کے رکن کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا رہا۔ سیاسی اور مذہبی معاملات کے علاوہ قاضی صاحب سماجی بھلائی کے کاموں سے بھی انتہائی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ کوئٹہ کے زلزلے میں متاثر ہونے والے افراد کی بحالی، زخمیوں کی دیکھ بھال اور بے گھروں کی آباد کاری کے سلسلے میں انہوں نے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔

مجلس تحفّظِ ختمِ نبوّت

قیامِ پاکستان کے بعد احرار اسلام نے شاہ جی کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ جماعتی حیثیت سے انتخابات اور دیگر سیاسی امور میں دلچسپی نہ لی جائے۔ چنانچہ احرار کے تمام رہنماؤں کی ساری سرگرمیاں عقیدۂ ختمِ نبوّت کے تحفّظ کی خاطر وقف ہو گئیں اور انہوں نے اپنے اس مشن کو کامیاب بنانے کیلئے تمام وسائل کو مجتمع کیا اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کو آخری نبوّت اور رسالت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہوئے اس عقیدہ کے تحفّظ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی قاضی صاحب نے ہر قسم کی مصیبت و تکلیف کا سامنا کیا۔ قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختمِ نبوّت کے سلسلے میں گرفتار ہوئے اور کافی عرصہ تک نظر بند رہے۔ شاہ جی مرحوم کی رحلت کے بعد وہ مجلس ختمِ نبوّت کے صدر منتخب ہوئے اور تا زیست صدر رہے۔

باپ اور بیٹے کی قربانی

قاضی صاحب کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ انہوں نے تحریکِ آزادیٔ وطن اور تحریکِ ختمِ نبوّت کے لئے باپ اور

بیٹے دونوں کی قربانی دی۔ جب ان کا اکلوتا بیٹا فوت ہوا تو وہ کلکتہ میں تھے، بیٹے کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ جب ان کے والد قاضی محمد امین کا انتقال ہوا تو وہ ختم نبوت کی تحریک میں نظر بند تھے۔ ان کے جنازے کو کندھا تک نہ دے سکے۔ ایک انسان اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔ اس کی عزیز ترین متاع اس کی اولاد ہوتی ہے اور اہم ترین پونجی بزرگوں اور والدین کی شفقت، قاضی صاحب نے یہ دونوں اسلام اور قوم کے نام پر قربان کر دیں

عام زندگی

قاضی صاحب مرحوم نے انتہائی مصروف زندگی گذاری لیکن اس کے باوجود انہوں نے تین مرتبہ حج بیت اللہ اور روضہ اقدس حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی نوجوانی کے عالم میں ہوئی۔ تاہم کامیاب زندگی گذاری۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکی زندہ ہے جو اُن کے چچا زاد بھائی قاضی عبد اللطیف کے عقد میں ہے دوسری بیوی سے چار بچیاں ہیں، جن میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے۔ قاضی صاحب مرحوم عام مولویوں کے برعکس بڑے خوش طبع واقع ہوئے تھے۔ خوش گفتار اور خوش پوشاک تھے۔ مہمان نوازی اور خوش خلقی ان کی دو اہم خصوصیات تھیں۔ ایک دفعہ جو اُن سے ملتا تو پھر اس ملاقات کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ جب کسی سے ملتے، بلا امتیاز چھوٹے بڑے، امیر غریب سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، بغل گیر ہوتے اور آنے والے کی پیشانی پر بوسہ دیتے۔ اُن کی زندگی بڑی خوش گوار گزری۔ انہیں مالی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

فنِ خطابت میں شاہ جی کے جانشین

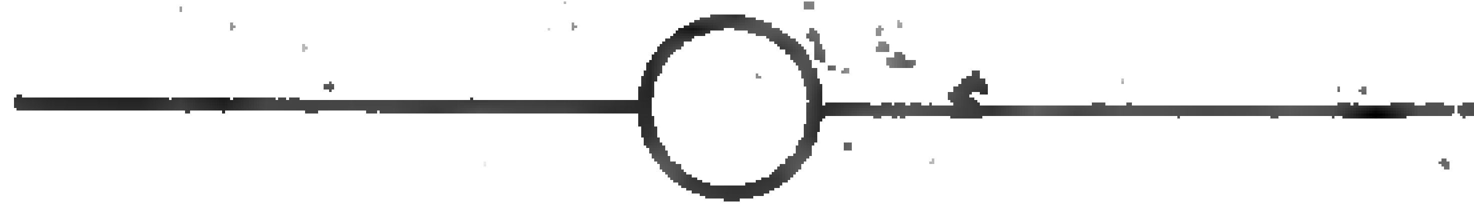
قاضی صاحب، شاہ جی مرحوم کے مرتبہ کو اگرچہ نہ پہنچ سکے تاہم اپنی زندگی میں عقیدت مندوں کا اچھا خاصہ حلقہ پیدا کر چکے تھے۔ ان کی تقریر میں تلوار کی کاٹ اور مرہم کا سکون دونوں ہوتے تھے۔ جہاں ان کی للکار سے پورے برصغیر میں سامراجی لٹیرے اور

ان کے حاشیہ نشین لرزہ براندام ہو جاتے تھے، وہاں وہی گھن گرج دار آواز خوابیدہ مسلمانوں کو جگانے اور میدانِ عمل میں آنے کے لئے ابھارتی تھی۔ وہ اپنی تقاریر میں برجستگی اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے منتخب اشعار اور لطائف اکثر و بیشتر پیش کیا کرتے تھے۔ یہاں ان کی تقاریر سے صرف دو لطیفے بیان کئے جاتے ہیں۔

رہنما: بڑے عرصے کی بات ہے۔ قاضی صاحب چنیوٹ میں ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ موضوع تھا "صراطِ مستقیم"۔ دورانِ تقریر ایک بوڑھے بزرگ رہنما کا واقعہ بطور لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے کسی گاؤں میں ایک کسان گھرانہ آباد تھا۔ انہوں نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ ان کی دیوار میں ایک طاق تھا، جس میں بکری کے کھانے پینے کی اشیاء رکھی رہتی تھیں۔ ایک دن بکری گھر آئی تو اُس نے اس طاقچہ میں گردن ڈال دی۔ اتفاق سے بکری کے سینگ طاقچہ کی چوکھٹ میں پھنس گئے۔ وہیں شور کرنے لگی۔ گھر والوں نے پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے بزرگ سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟ انہوں نے دیوار گرانے کا حکم دیا۔ چنانچہ دیوار گرا دی گئی لیکن وہ چوکھٹ بکری کی گردن میں بدستور پھنسی رہی۔ بزرگ نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ بکری کو اٹھا کر کے اس کی گردن کاٹ لو۔ چنانچہ وہ چوکھٹ علیحدہ ہو گئی، اور گھر کے لوگ اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ ادھر وہ بزرگ اس واقعہ پر آنسو بہانے لگے اور ایک طرف ہو کر اُونچی آواز سے رونے لگے۔ گھر والے ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ باباجی کیا بات ہے تو وہ گھبرائی ہوئی آواز میں فرمانے لگے۔ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ آخری عمر ہے اور میری موت کے بعد تمہیں ایسے مشورے کون دیا کرے گا۔ تم ان قیمتی مشوروں اور اسرار سے محروم ہو جاؤ گے۔

مُلّا: ایک دفعہ دین فروش ملاؤں کی بات ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک مُلا کے نام سے یہ لطیفہ سنایا۔ ایک مُلاجی کنوئیں سے پانی لینے گئے لیکن بدقسمتی سے کنوئیں

میں گر گئے۔ لوگوں نے جمع ہو کر انہیں نکالنا چاہا اور ان سے کہا کہ وہ اپنا ہاتھ بلند کرے اور باہر کے لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں، لیکن ملّا جی اس کے لئے راضی نہ ہوئے ادھر وہ وہیں کنوئیں میں سردی سے ٹھٹھرتے رہے۔ اتنے میں ایک واقفِ حال ادھر آ گیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ کیا بات ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ اندر بڑھایا اور ملّا جی سے کہا لیجئے میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ ملّا جی نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور لوگوں نے اُسے باہر نکال دیا۔ لوگوں نے اس سے وجہ دریافت کی، تو اُس نے بتایا کہ ملّا جی زندگی بھر لوگوں سے لیتے رہے ہیں۔ دیتے نہیں رہے۔ اس لئے اُن کی لغت میں دینے کا لفظ نہیں ہے۔ جب آپ اُن سے کہتے تھے کہ اپنا ہاتھ دو تو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ جب ان سے کہا گیا۔ کہ میرا ہاتھ پکڑو تو وہ فوراً سمجھ گئے۔



قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ

وقت کے آئینے میں

از : منظور ملک سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ "کوہستان" ملتان

قاضی احسان کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی جدید تاریخ کا دَور بھی ختم ہوگیا۔ قاضی صاحب ہمارے درمیان اس دَور کے انسان تھے جب برصغیر کے مسلمان تہذیب و ثقافت کی نئی اقدار سے آشنا ہو رہے تھے۔ ایک طرف ماضی ہمارا دامن گیر تھا، دوسری طرف ہم مغرب کی لامذہبی تہذیب کا تاثر قبول کر رہے تھے۔ جدید و قدیم کی اس کش مکش نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ذہنی اور فکری خلجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس خلجان نے رفتہ رفتہ انگریز کے سامراجی تسلّط کے خلاف ایک زبردست تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ اس دَور نے ہمیں عظیم الشان مقرر دیئے، جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا آزاد، نواب بہادر یار جنگ اور مولانا ظفر علی خاں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ قاضی احسان بھی اس دَور کی یادگار ہیں۔ قاضی مرحوم اس دور کے آخری خطیب تھے۔ جو چند لوگ باقی رہ گئے ہیں، بُجھی ہوئی چنگاریاں ہیں اور مدّت سے خاموش ہیں۔ ان بزرگوں نے مسلمانوں کی مری ہوئی مٹی میں خمیر اُٹھایا۔ پھر قائدِ اعظم آئے، انہوں نے اس ضمیر کو سمیٹا اور اُسے پاکستان کی صورت میں منشکل کر دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری امرتسر سے پاکستان آگئے اور نہ جانے کیوں انہوں نے ملتان کو امرتسر کا نعم البدل تسلیم کرلیا۔ بہرحال خاکِ ملتان اپنے اعزاز پہ نازاں ہے۔ بخاری مرحوم اس آخری دَور میں خاموش پرستاروں میں تھے۔ مرحوم روزانہ کچہری روڈ پہ

انجام دے رہے ہیں جن کی گذر بسر زمینداروں کی داد و دہش پر ہے۔ قاضی صاحب کو میرے خیال سے جزوی ہی اتفاق تھا لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ ابھی روشنی کی چند کرنیں باقی ہیں۔ میں نے کئی بار ان سے گلہ کیا کہ چودھری مرحوم کے ملک کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگ ان کی میراث پر قابض ہیں مگر ان کے ملک سے گریزاں ہیں، تو آپ مسکرا کر ٹال دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب ہمارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ سیاست اب مولانا مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کے سپرد ہے۔

ماضی کا مسکراتا ہوا چہرہ ہم سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اب ماضی کی بزم آرائیوں کی فقط ایک دھندلی سی یاد باقی رہ گئی ہے۔ ان لوگوں کا دم غنیمت تھا۔ وہ سچی بات سُن لیتے تھے۔ اپنی غلطیوں کا خود محاسبہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ میں انہیں کہا کرتا تھا کہ تم لوگوں نے انگریز کے خلاف جنگ لڑی مگر برہمنی سامراج کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ نہ کیا۔ یہ فرض مسلم لیگ نے سرانجام دیا۔ وقت اور واقعات کی رفتار نے ثابت کر دیا کہ علمائے دیوبند کی تحریک کی سمت ایسی تھی جسے منزل نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ قاضی صاحب میرے اعتراضات کا بڑے فن کارانہ انداز سے جواب دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب اس خطۂ پاک میں صرف اس تحریک کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو ناموسِ رسول کے تحفّظ کا احساس دلایا جا سکے۔ حکومت کے اعلیٰ حلقوں سے اس گروہ کا اثر ختم کیا جائے جو دینِ محمدی کا دشمن اور سامراج کا ایجنٹ ہے۔ شاہ جی کے قرب اور سرورِ کائنات سے والہانہ محبّت کے باعث آپ کو شاہ جی کی وفات کے بعد تحریکِ ختمِ نبوت کا امیر مقرر کر دیا گیا۔ بظاہر اگرچہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں مگر یہ تحریک نظم و ضبط کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی منفرد تحریک ہے۔ اخبارات میں کبھی اس تحریک کا ذکر شائع نہیں ہوا، مگر اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ہر سال لاکھوں روپے کے اخراجات اٹھائے جاتے ہیں۔ اکثر مبلّغ تحریک کے خزانے سے تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ بے شمار مدارس کی امداد کی جاتی ہے قاضی صاحب

اور ان کے احباب بے نیاز اس کام کو انجام دے رہے تھے۔ جس روز قاضی صاحب کا انتقال ہوا، شجاع آباد پر رنج و غم کے بادل چھا گئے، سارے کاروبار بند ہو گئے۔ شجاع آباد یقیناً اپنی تاریخ میں کبھی اس قدر سوگوار نہ ہوا ہو گا۔ قاضی احسان کسی کا بھائی، کسی کا چچا، کسی کا باپ اور کسی کا بیٹا تھا۔ آج سب کا مونس و غم گسار چل بسا تھا۔ اب وہ کسے اپنے دکھ سنائیں گے۔ اس کے دروازے سے کئی فیض یاب ہو کر گئے۔ اگر اُسے کبھی کسی کی امداد کے لئے کوئی سفر اختیار کرنا پڑا تو اُس نے سائل سے کبھی خرچ نہیں مانگا۔ اپنے خرچ سے سفر کر کے سائل کی مشکل حل کرتے۔ کمزور کے لئے سراپا رحمت اور طاقتور کے لئے قہر الٰہی تھے۔ ان کے کردار کی یہی دو خصوصیات ان کی ہر دلعزیزی کا باعث تھیں۔ آپ کی جرأت، بے باکی اور حق پرستی اس ایک مثال سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک دفعہ آپ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسۂ عام سے مخاطب تھے۔ اس جلسے کی صدارت متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کر رہے تھے۔ آپ نے اس جلسے میں سکندر حیات کے خلاف تقریر کی۔ اس تقریر کے جواب میں سکندر حیات نے جو کچھ کہا، اس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ سکندر اگرچہ ٹوڈی تھا مگر اس کی دانائی اور ذہانت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ احرار نے فوجی بھرتی کے خلاف تحریک شروع کر رکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس جلسے میں عام مسلمان موجود ہیں اور جو شخص مسلمانوں کو سامراج کی فوج میں بھرتی کر کے حرام موت مروانا چاہتا ہے وہ بھی موجود ہے تو انگریزوں کے خلاف بات کرنے کا اس سے بہتر کون سا موقع مل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سکندر حیات انگریزوں کے جابرانہ نظامِ حکومت کا ایک کل پرزہ ہے۔ اپنے ہی ابنائے وطن کی گردن میں انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں حمائل کر رہا ہے۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

حرم کو بندۂ لات و منات کیا جانے
خدا کے گھر کو سکندر حیات کیا جانے

سکندر حیات خاموش رہا، تقریر سنتا رہا اور زیر لب مسکراتا رہا۔ پھر صدارتی خطبے کا وقت آیا تو اس نے کہا کہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میرے دورِ حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو میرے منہ پر سچی بات کہنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ یہی ایک جملہ تھا جس نے مجھے پانی پانی کر دیا۔

فنِ خطابت

ایک مرتبہ ملتان کی مسجد سراجان والی میں جلسہ عام ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب کی تقریر عروج پر تھی۔ قاضی صاحب مرحوم سٹیج پر کہیں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک شاہ صاحب کی آواز آئی کہ قاضی! سامنے آکر بیٹھو۔ قاضی سامنے آکر بیٹھ گئے۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس حکم کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ بعد میں واضح ہو گیا کہ شاہ صاحبؒ اپنے شاگرد کو فنِ خطابت کے رموز سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ شاہ جی کو قاضی صاحبؒ سے بے پناہ محبت تھی، شاید یہ ان کی محبت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ملتان کو اپنا وطن بنا لیا۔ شاہ صاحبؒ نے قیامِ پاکستان کے بعد سیاست مسلم لیگ کے حوالے کر دی۔ ناموسِ رسولؐ کے تحفظ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ قاضی صاحب بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ایسے وابستہ ہوئے کہ آخر دم تک یہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں قید ہو گئے۔ ایامِ اسیری میں آپ کے والد فوت ہو گئے۔ خاموشی سے رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا مگر اپنے والد کا آخری دیدار نہ کر سکے۔

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

جلال ربّانی - ایڈیٹر ہفت روزہ "عدل" ملتان

ملک کے نامور خطیب تحریکِ ختمِ نبوّت کے روحِ رواں قاضی احسان احمد شجاع آبادی اگرچہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں مگر اسلام کی ترقی اور سربلندی کے لئے انہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ایک سچے عاشق رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین و دنیا کی تمام نعمتوں سے سرفراز کیا۔ دُکھی انسانیت کی خدمت ان کا اصل نصب العین تھا۔ دوست تو ان کے معترف تھے ہی، مگر دشمن بھی ان کے بلند اخلاق اور شرافت کے ہمیشہ قائل رہے۔ اگرچہ آج وہ ہم میں موجود نہیں مگر ان کی بذلہ سنجی، زندہ دلی، عوام دوستی اور حق گوئی کی یادیں اب بھی ہمارے دلوں میں موجزن ہیں چنانچہ مولانا مرحوم کی زندگی کے چند واقعات کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان سے ہمیں اب بھی زندگی کا ایک نیا پیام مل سکتا ہے۔

لاشئ اور لاشے کا فرق

مولانا احسان احمد شجاع آبادی ایک بار راولپنڈی میں ایک عوامی جلسہ سے اسلام اور اس کی اہمیت کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ دورانِ تقریر ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ موجودہ نظامِ حکومت اور اسلامی طرزِ حکومت میں کیا فرق ہے۔ مولانا نے کہا کہ موجودہ حکومت کا نظام اسلامی طرزِ حکومت کے مقابلہ میں "لاشئ" ہے۔ سرکاری رپورٹر بھی پنڈال میں موجود تھا۔ اُس نے اپنی نااہلی یا کسی اور وجہ سے اپنی رپورٹ میں "لاشئ" کی بجائے "لاشے" کا لفظ لکھ دیا۔

حکومت نے مولانا کی تحریر کو امنِ عامہ کے منافی قرار دیتے ہوئے انہیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا اور وہ پندرہ روز تک راولپنڈی جیل میں نظر بند رہے۔ مقدمہ شروع ہونے پر جب عدالت نے مولانا سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنی تحریر میں موجودہ حکومت کو لاشے سے تعبیر کیا ہے؟ اس پر مولانا نے کہا۔ میں نے "لاشی" کہا تھا، لاشے نہیں۔ اس پر عدالت نے مولانا کو باعزت طور پر بری کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

فقیروں کی دُنیا مولانا احسان احمد کے دوستوں میں جہاں غریب اور بوریا نشین لوگوں کے نام آتے ہیں وہاں نوابوں اور وزراء کے نام بھی ملتے ہیں ایک بار مغربی پاکستان کے سابق وزیر مواصلات مسٹر دُرِ محمد اوستو نے مولانا سے شکایت کی کہ ہم تو آپ کے پاس چلے آتے ہیں مگر آپ ہمارے پاس نہیں آتے۔ مولانا نے جواب دیا کہ بھائی فقیروں کی دُنیا امیروں کی دُنیا سے نرالی ہوتی ہے۔ فقیر کبھی وزیروں کے پاس نہیں جاتے بلکہ وزیر فقیروں کے پاس آیا کرتے ہیں۔

عزم و ہمّت کی زندہ مثال تقسیمِ ہند و پاک سے قبل مولانا تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے موقع پر جب کلکتہ میں ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے تو اسی اثنا میں انہیں یہ اندوہناک خبر سنائی گئی کہ ان کا چار ماہ کا بچہ فوت ہو گیا ہے۔ مولانا کو یہ خبر سن کر صدمہ تو اگرچہ پہنچا مگر انہوں نے اپنے جماعتی پروگرام میں کوئی تبدیلی نہ کی بلکہ پہلے سے زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی مہم پر گامزن ہو گئے۔ مولانا مصائب سے کبھی نہیں گھبرائے بلکہ خندہ پیشانی سے حالات کا مقابلہ کیا۔

عشقِ رسول اور جیل ان کے غیر متزلزل عزم و ہمّت کا ایک اور واقعہ ۱۹۵۳ء میں پیش آیا۔ مولانا تحریکِ ختمِ نبوّت کے سلسلہ میں ملتان جیل میں نظر بند تھے۔ اسی دوران ان کے والد ماجد انتقال کر گئے۔ جیل کے حکام نے مولانا سے کہا کہ اگر آپ اعلیٰ حکام سے معافی مانگ لیں تو آپ کو رہا کیا جا سکتا ہے اور آپ اپنے

والد ماجد بزرگوار کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں۔ مولانا نے خشمگین انداز میں کہا، کہ میں نے یہ جیل رسولِ اکرمؐ کے نام کے تحفّظ کی خاطر قبول کی ہے، آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں رسول اکرمؐ کو بھول جاؤں اور والد کی محبت سے متاثر ہو کر آقائے نامدار کو دھوکہ دے جاؤں۔ میں عاشقِ رسولؐ ہوں مجھ پر اس جیسی ایک ہزار مصیبتیں بھی اگر نازل ہو جائیں تو بھی میں اُف نہ کروں گا۔ جیل کے حکام مولانا کے اس دلیرانہ جواب کو سُن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

رسولؐ کا جمال بن

مولانا جب کبھی کسی جلسہ یا تقریب میں جاتے تو طلبا کا ایک ہجوم انہیں گھیر لیتا اور ان سے آٹو گراف کا تقاضا کرتا۔ مولانا نوجوانوں سے بڑی شفقت اور محبّت سے پیش آتے تھے۔ وہ اکثر اپنے آٹو گراف میں یہ شعر لکھتے۔

قوی اگر ہو سامنے تو قہرِ ذوالجلال بن
غریب گر نظر پڑے رسولؐ کا جمال بن

مریض اور اُس کا مرض

مولانا مرزائیت کے شروع دن سے دشمن تھے مگر جہاں تک قادیانیوں کا تعلق ہے، وہ ان سے کبھی تنگ دلی سے پیش نہیں آتے تھے۔ وہ جب کبھی ملتان تشریف لاتے تو چوک بازار میں اپنے چند شناسا قادیانیوں سے ہمیشہ فراخ دلی سے پیش آتے اور ان سے بغلگیر ہوتے۔ ایک بار ایک شخص نے مولانا سے کہا کہ آپ تو مرزائیت کے دشمن ہیں پھر اس دو رخی کا کیا مطلب ؟ مولانا نے کہا کہ بھائی ڈاکٹر مریض کا نہیں بلکہ اس کے مرض کا دشمن ہوتا ہے۔ میں مرزائیت کا دشمن ضرور ہوں مگر انسانوں کا دشمن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے طرزِ سلوک سے ہی یہ لوگ راہ راست پر آجائیں۔

غریبوں کے دوست

مولانا ایک بار ملتان سے شجاع آباد جانے کے لئے جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ایک نامعلوم شخص نے ان کا پلّو پکڑ لیا اور کہا کہ میں ایک مدّت سے حج کرنے کی تڑپ اپنے دل میں لئے ہوئے ہوں۔

مگر غربت کے باعث میرے پاس آج تک جہاز کا کرایہ جمع نہیں ہو سکا۔ یہ کہتے ہوئے وہ آدمی رو پڑا۔ مولانا نے فوراً اپنے ایک ہمراہی سے کہا کہ تمہارے پاس جتنی رقم ہے اس شخص کو دے دو۔ ہمراہی نے فوراً پانچ سو روپے اپنی جیب سے نکالے اور اس شخص کو دے دیئے۔ مولانا نے باقی رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔ انتقال سے چند روز قبل مولانا انوری ناظم مدرسہ خیر المدارس ملتان، قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی عیادت کیلئے شجاع آباد گئے۔ قاضی صاحب کی آواز علالت کے باعث کافی نحیف ہو چکی تھی، اور زبان میں قدرے لکنت بھی آگئی تھی، مگر اس کے باوجود ان کی طبیعت کی شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا، اور قوم کا درد ان کے دل میں ہمیشہ قائم رہا۔ اس موقع پر مولانا نے انوری صاحب کو ارتجالاً جو اشعار سنائے وہ حسب ذیل ہیں ؎

ایک وہ بھی تھا دستور کہ زنجیر ہلا دی
سلطان نے لبیک کہی خوش ہو کے صدا دی
ایک ہم کو بھی اب ایک دستور آیا ہے میسر
کانٹوں نے کیا جرم تو پھولوں کو سزا دی

قاضی مرحوم کی زندگی کے چند اہم واقعات

از :- مولانا محمد یسین صاحب ۔ ملتان

عشقِ رسول ﷺ کی تاثیر

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں میری عمر پندرہ سال تھی۔ ان دنوں میں مدرسہ ریاض الاسلام جھنگ صدر میں زیر تعلیم تھا چند روز تعطیلات گزارنے کے لئے اپنے آبائی گاؤں واسُو آستانہ گیا۔ ہمارے گاؤں کے مڈل سکول میں ایک مدرس جناب محمد ریاض خاں (مرحوم) تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک نیک دِل اور خدا ترس انسان تھے۔ غریب عوام اور محنت کش کسانوں کو ہمیشہ عزتِ نفس کا درس دیتے اور ان میں آزادیٔ فکر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ عوام اور کسانوں پر مظالم کے خلاف بڑے بڑے زمینداروں سے احتجاج کرتے۔ ان دنوں جب گاؤں میں میری ملاقات ان سے ہوئی تو انہوں نے میرے سامنے اس ضرورت کا اظہار کیا کہ اس علاقہ میں بہت جلد ایک عظیم الشان جلسہ کا انتظام کیا جانا چاہیئے، اور اس سلسلہ میں صرف بیباک او کسانوں کے ہمدرد خطیب ہی مدعو کئے جائیں۔ انہوں نے اپنے رفقاء سے مشورہ کے بعد طے کیا کہ جلسے میں حضرت امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو مدعو کیا جائے اور یہ فریضہ راقم الحروف کے سپرد ہوا کہ میں ان حضرات کو جلسہ میں شمولیت پر آمادہ کروں۔ ان حضرات سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا اور نہ کبھی ان سے ملاقات ہوئی تھی لیکن میرے مدرسے کے جملہ اساتذہ ان حضرات کے شیدائی تھے اور دورانِ اسباق اور فارغ اوقات میں ان حضرات کی دینی خدمات، انگریزوں

کے خلاف جدوجہد، عقیدۂ ختمِ نبوّت کی پاسبانی کے کئی واقعات سُناتے۔ جن سے ان کی بے پناہ شجاعت وجرأتِ ایمانی کا اندازہ ہوتا۔ میرے ایک مشفق نابینا استاد مولانا حافظ سلطان محمود علیہ الرحمۃ تھے جو بڑے متّقی اور باخدا بزرگ تھے۔ ان کے حلقۂ درس سے جو لوگ فیض یاب ہوئے ان میں سے اکثر نے نام پیدا کیا۔ وہ ان حضرات سے والہانہ محبّت رکھتے اور ان کی کامیابی کے لئے غائبانہ دعائیں کرتے اور اخبارات کی ایسی خبروں کو بڑی دلچسپی سے سُنتے جن میں ان حضرات کا تذکرہ ہوتا۔ اساتذہ کے اس جذباتی لگاؤ نے مجھے بھی ان حضرات کا غائبانہ شیدائی بنا دیا۔ ان حضرات کی دعوت کے لئے راقم بڑی خوشی سے ملتان روانہ ہوا۔ سب سے پہلے حضرت امیرِ شریعت سے ملاقات ہوئی جو چند دن قبل ہی ملتان میں اقامت گزین ہوئے تھے۔ اپنے احباب اور عقیدتمندوں کے درمیان بڑی شان سے بیٹھے لطائف علمی سُنا رہے تھے۔ میرے ساتھ جس شفقت اور التفات سے پیش آئے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جلسہ میں شمولیت سے تو معذرت فرمائی مگر قاضی صاحب مرحوم کے نام ایک پیغام کے ذریعہ سفارش کی کہ وہ ہمارے جلسہ میں ضرور شمولیت کریں۔ راقم الحروف جب اس غرض سے شجاع آباد پہنچا تو قاضی صاحب مرحوم بخار میں مبتلا تھے اور اپنی ڈیوڑھی میں آرام فرما تھے۔ شجاع آباد کے دکان دار اور سرکاری ملازم اور بہت سے لوگ ان کے پاس کھڑے تھے، اور کچھ لوگ ان کے ہاتھ اور پاؤں دبا رہے تھے۔ راقم ایک اجنبی اور نووارد تھا۔ ڈرتے اور سہمے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہوا قاضی مرحوم نے میری شکل وصورت سے اندازہ کر لیا کہ میں کسی عربی مدرسہ کا طالب علم ہوں بڑی شفقت سے پاس بلایا اور بڑی محبّت سے ملے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ قاضی صاحب سے ہمارے قدیم اور گہرے مراسم ہیں۔ راقم نے اپنی آمد کی غرض بیان کی۔ جلسہ کے انعقاد میں ابھی ایک ماہ باقی تھا۔ مرحوم نے بڑی فراخدلی سے وعدہ کیا اور تاریخ نوٹ کر لی۔ چار روز تک شجاع آباد میں مقیم رہا۔ مجھے قاضی صاحب مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے

اور سمجھنے کا موقع ملا اور ان کی شخصیت عظمیٰ کے نقوش میرے سامنے نکھرے۔ پھر یہ ملاقاتوں کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ کئی بار شجاع آباد آنا جانا ہوا اور بہت سے سفر ان کی رفاقت میں کیے۔ راقم نے محسوس کیا کہ قاضی مرحوم ایک سچے عاشقِ رسول، انگریز کے پکے دشمن اور عوام کے ایک بہترین دوست ہیں۔ شاہ جی کی صحبتوں سے جو فیض انہوں نے حاصل کیا وہ بہت کم دوسروں کے حصے میں آیا۔ وہی خطابت میں شکوہ، وہی محبت اور دوستی کا انداز، وہی حق اور حق پسندوں کی محبت، اور کبھی تو اُن کی ساری خطابت ہی شاہ جی کی خوشہ چینی سے مرتب ہوتی۔ اس خوشہ چینی اور شاہ جی کی صحبتوں کے فیض کا برملا اعتراف کرتے۔ ایک مرتبہ تو مجھے یہاں تک کہہ دیا کہ میرے بچوں کے حلق میں جو نوالہ اُترتا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی ہی کی کفش برداریوں کا صدقہ دیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں عربی فارسی اردو اشعار یاد تھے اور شاہ جی کی طرح برمحل اشعار پڑھنے کا ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ جہلم میں احرار کانفرنس تھی عظیم الشان اجتماع تھا۔ قاضی صاحب کی تقریر اپنے شباب پر تھی۔ جلسہ گاہ کے ایک گوشہ سے کالا بھجنگا، اُدھیڑ عمر کا ایک شخص اُٹھا، جو تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے احرار اور اس کی پالیسوں پر اعتراضات شروع کر دیئے، اور کہا کہ آپ کی جدوجہد بے فائدہ ہے۔ آج تک آپ کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ چند احرار رضاکار اس روسیاہ کی طرف بڑھے مگر قاضی صاحب نے رضاکاروں کو منع کر دیا۔

اور پھر اپنے خطیبانہ طنطنہ سے مرزا سوداؔ کی درج ذیل رُباعی پڑھی ؎

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
او رُوسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اس برمحل رباعی نے سارے مجمع کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ آخری مصرعہ میں "او رُوسیاہ"!

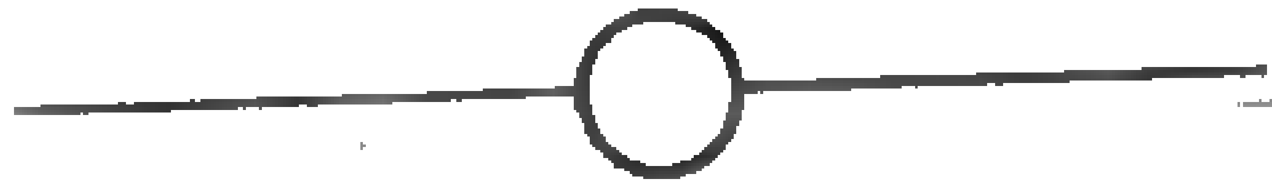
اور قاضی صاحب کے اس کالے کی طرف ہاتھ کے اشارہ نے وہ سماں باندھا کہ ایک دفعہ تو سارے مجمع سے مکرّر مکرّر کی صدائیں گونجنے لگیں۔

زندگی کی اہم رات

عشقِ رسول کی تاثیر تھی کہ کئی منکرینِ ختمِ نبوّت ان کی تبلیغ سے قادیانیت سے نکل کر دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ ایک سی۔ایس۔پی افسر جو کوئٹہ ڈویژن کے کمشنر تھے۔ قاضی صاحب کے دوست تھے، مگر قادیانیت سے متاثر تھے۔ نہ صرف ان کے دماغ کی تطہیر کی بلکہ ان کو اس کام پر لگا دیا کہ ان کا شمار بھی مرزائیت کے بدترین مخالفوں میں ہونے لگا۔ اسی کمشنر نے بہت سے قادیانی دوستوں کو، اور ان کو جو قادیانیت سے متاثر تھے، جمع کیا۔ اور پھر قاضی صاحب کو شجاع آباد سے بلایا۔ قاضی صاحب مرزا غلام احمد کی تصنیفات لے کر کوئٹہ پہنچے۔ اس مسئلہ پر ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات کتابوں کے ورق الٹے رہے۔ حوالوں پر حوالہ دیا جاتا رہا۔ اِدھر صبح ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے ان کو بھی نورِ ہدایت سے منوّر کر دیا، اور قاضی صاحب مرحوم اپنی زندگی کی اس قیمتی رات کا اکثر تذکرہ کرتے اور خدا کا شکر بجا لاتے۔

قاضی صاحب مرحوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ علماء، صوفیاء، شعراء، ممتاز تاجر، صنعت کار، مزدور، کسان، زمیندار سب ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ ہر طبقہ سے دوستی نبھانا ان کی فطرت تھی۔ کتنی غریب لڑکیاں آج اپنے گھروں میں خوش حالی سے آباد ہیں۔ جن کی رخصتی کے مراحل قاضی صاحب مرحوم کی پوشیدہ اعانت سے طے ہوتے۔ کئی طلباء ان کی امداد سے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ کئی نوجوان ان کی سفارش سے باروزگار ہوئے۔ کتنے لوگوں کی کاروباری مشکلات میں ان کی معاونت کی۔ الغرض دوستی اور محبت کا پیکرِ متحرک تھے۔ آج جس کی جدائی کو احباب اپنا ایک ذاتی حادثہ سمجھتے ہیں۔ کس قدر بلند منصب ہیں وہ مخلص احباب جن کو اس ختمِ نبوّت

کے مخلص اور عظیم رہنما کی خدمت کا شرف نصیب ہوا۔ مالکان سلطان فونڈری بابو محمد اسلم و محمد افضل اور ان کے جملہ برادران نے قاضی صاحب مرحوم کی بیماری کے ایّام میں جس فیاضی سے ہر طرح سے خدمت کی وہ نہایت قابلِ رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین۔ قاضی صاحب مرحوم اب اُس دنیا میں پہنچ چکے ہیں، جہاں ہمارے یہ تحسین اور آفرین کے کلمات نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ مقبول اوقات میں ان کے درجات کی بلندی کے لئے دُعائیں ان کو یقیناً مفید ہونگی، اور سب سے بہتر اُن کی یادیہی ہے کہ ہم اپنی بساط کے مطابق عقیدۂ ختمِ نبوّت کی حمایت کریں۔



خطیبِ پاکستان کے ساتھ چند لمحات

از:- السید عبدالستار ہمدانی- ایم اے، ایل ایل بی- خیرپور، ٹامیوالی

یہ کون اٹھا محفلِ ہستی سے عزیزو
خورشیدِ جہاں تاب بھی خوننابہ فشاں ہے

جی چاہتا ہے، آج خون کے آنسو روؤں، گریباں چاک کرڈالوں۔ اس قدر روؤں کہ آج تک اتنا کوئی نہ رویا ہو مگر آنکھوں کا پانی اُس روز سے ختم ہو چکا ہے جس روز گلستان نبوّت کا بلبل اور عاشقِ رسولؐ، لاہور اور ملتان کے معالجین سے مایوس ہوکر گھر لوٹ آیا تھا۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۶ء کو ۳ اور ۴ بجے شام کے درمیان اس دور کا سب سے بڑا خطیب، سفیرِ اسلام اور مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان کا صدر اپنے آبائی گاؤں شجاع آباد میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دُوہرے بدن، دراز قامت، گندمی رنگ اور حسین کتابی چہرہ کا یہ انسان جس کی مقطع داڑھی نور کی شعاعیں بکھیرتی تھی۔ آنکھیں ایسی روشن تھیں کہ نورِ ایمانی کا خزینہ جن میں ملاقاتی کے لئے حد درجہ کشش ہوتی تھی۔ کشادہ پیشانی پر گھنگھریالی زلفیں، اس خادمِ رسول کے حُسن کو دوبالا کئے رہتی تھیں۔ تقریر کے لئے کھڑا ہوتا تو مجمع پر جادو ہو جاتا۔ سامعین گھنٹوں تقریر سُنتے مگر پھر بھی خواہش رہتی کہ خطیب پاکستان بولتے رہیں۔ رفتار میں تمکنت تھی، قدم ناپ تول کے رکھتے۔ مزاج میں ایسی شگفتگی تھی کہ ہر ایک سے، ایک دل موہ لینے والی مُسکراہٹ سے گفتگو کرتے، مگر افسوس صد افسوس کہ موت، ظالم موت نے ہم سے اس قحط الرّجال کے دور میں، ایسے بے مثال انسان اور بلند رُتبہ درویش کو چھین لیا اور اُس نے نہ صرف شجاع آباد

اور ملتان بلکہ ملک کے ہر حصہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں سوگوار چھوڑے ہیں

"ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی"

قاضی صاحب سے راقم الحروف کو بچپن سے عقیدت تھی۔ حافظہ میں قاضی صاحب کا نام اور ان کی شخصیت کا عکس اس وقت سے محفوظ ہے جب میں نے پہلے پہل موصوف کو اپنے آبائی شہر خیر پور، ٹامیوالی (ضلع بہاولپور) کے مدرسہ عربیہ فاضل کے سالانہ جلسہ میں (غالباً ۱۹۵۲ء) تقریر کرتے ہوئے دیکھا۔ قاضی صاحب اس مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں شاہ جی کی معیت میں تقریباً ہر سال تشریف لایا کرتے تھے اور ان بزرگان کا قیام ہمارے ڈیرہ ہی میں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے، قاضی صاحب ہم کو بہت پیار کیا کرتے تھے۔ اس طرح دل میں ان کی عقیدت بیٹھتی گئی اور آخر وقت تک رہی۔ ان کی محبت میں گذرے ہوئے لمحات اور ان کی خطابت کے انداز کو میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ ان کی پیاری باتیں اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کا انداز ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایک دفعہ اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو کئی روز تک طبیعت بے چین رہتی اور ان سے ملاقات کے لئے دل بے قرار رہتا۔ مگر میں تو پھر بھی طالب علم تھا ان کی محبت اور شفقت کے باعث، مجبوریاں ان تک پہنچنے میں مانع نہ ہوتیں لیکن وہ خود بہت مصروف زندگی بسر فرماتے تھے۔ ہر وقت اور ہر لحظہ تبلیغ دین میں مگن رہتے۔ اپنے آقا کی نبوت کے نام پر ساری عمر گھر سے باہر گذار دی ——— اور کلمہ حق کی پاداش میں زنداں میں ۹ سال کا عرصہ گذارا، سختیاں جھیلیں، مصائب اٹھائے مگر آخری سانس تک اپنے عظیم مقصد سے پہلو تہی نہ کی۔ ملک کے کونہ کونہ میں انہوں نے خود پہنچ کر اپنی آواز کو لوگوں تک پہنچایا۔ موصوف کی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ خدا تعالیٰ نے پانچ صالحہ بیٹیاں عنایت فرمائی تھیں۔ بعض اوقات کوئی بیٹی بیمار بھی ہوتی تو چھوڑ کر تبلیغ حق کو روانہ ہو جاتے۔ میں نے کئی بار انہیں بہاول پور کی جامع مسجد میں بخار کی حالت میں موتی بکھیرتے دیکھا ہے۔ اس وجہ سے موصوف سے زیادہ ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا لیکن

جو ملاقاتیں ہوتی ہیں، جتنی تقریریں سننے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ وہ کبھی نہ بھولیں گی، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے قاضی صاحب جیسا بلند اخلاق انسان اور اتنا بڑا خطیب شاہ جی کے بعد نہیں دیکھا۔ وہ بولتے نہیں تھے موتی رولتے تھے اور ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے۔ غالباً اپریل ۱۹۶۶ء ہی کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں لا کالج کا طالب علم تھا۔ اور ہوسٹل میں قیام پذیر۔ صبح سویرے میں دفتر چٹان پہنچا۔ مقصد یہ تھا کہ محترم آغا شورش کاشمیری کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ خیرپور ٹامیوالی میں یوم بخاریؒ کے جلسہ سے خطاب کریں۔ آغا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آغا صاحب نے ہنستے ہوئے پنجابی میں فرمایا کہ نہیں عزیزم میں نہیں جا سکتا۔ میں لاہور سے باہر جاؤں گا ہی نہیں آغا صاحب کے اس جواب سے میں مایوس نہیں ہوا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ وہ کسی مجبوری کے باعث فی الحال یہ جواب دے رہے ہیں، انہیں مجبور کیا گیا، تو بخاریؒ سے اپنے گہرے تعلق کی بنا پر وہ انکار نہ کریں گے۔ اس کے بعد میں جب واپس ہونے لگا تو دفتر میں حمید اصغر نجید سے جو چٹان کے مدیر معاون ہیں، ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے بتایا کہ قاضی احسان احمد صاحب آج یہیں آئے ہوئے ہیں۔ آپ ان سے ملیں اور ان سے آغا صاحب کو کہلوائیں تو پھر کام ضرور ہو جائے گا۔ میں اس تجویز سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ قاضی صاحب میری بات کو رد کر ہی نہیں سکیں گے۔ میں واپس آنے لگا تو آغا صاحب نے بھی خود فرمایا کہ ہاں بھائی قاضی صاحب آج یہیں ہیں اور وہ اپنے داماد نور الحق قریشی کے ہاں نہرو سٹریٹ کرشن نگر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں واپس ہوسٹل آیا مگر کرشن نگر نہ جا سکا۔ میں نے پھر سوچا کہ قاضی صاحب کو شجاع آباد ہی ملوں گا کیوں کہ ابھی یوم بخاریؒ منانے کے پروگرام میں کافی وقت تھا، اور میں نے اگلے روز ہی اپنے گھر جانا تھا۔ دوسرے روز کوئی ایک بجے کے قریب میں لا کالج ہوسٹل سے انار کلی گھر کے لئے کچھ سودا سلف لینے آیا اور اردو بازار تک

چلا گیا۔ مطلوبہ اشیاء لینے کے بعد جب میں چوک لوہاری سے انارکلی میں داخل ہوا تو عنایت اللہ اینڈ سنز سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی دوپٹوں کی دوکان سے جب گزرنے لگا تو میں نے خطیب پاکستان کو دوکاندار سے (جو ایک متشرع جوان ہیں) مصروف گفتگو دیکھا۔ میں دکان سے دو قدم آگے رُک گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں وہ اشیاء تھیں جو میں نے گھر کے لئے خریدی تھیں۔ میں نے اس دکان سے ملحقہ جنرل سٹور پر اپنی اشیاء رکھ دیں اور قاضی صاحب کو السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیئے۔ قاضی صاحب نے مصافحہ کی بجائے مجھے سینے سے لگا لیا۔ معانقہ سے فارغ ہوتے تو میں نے عرض کیا، قبلہ مجھے پہچان تو لیا ہوگا (یہ ملاقات چار سال پہلے کی ایک سرسری ملاقات کے بعد ہوئی تھی) فرمایا۔ نہیں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ نہیں صحیح بتائیے تو فرمانے لگے کہ بھائی! میں نے تو اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔ اگر پہچانا ہوتا تو خبر نہیں کہاں ہوتا۔ میں نے پھر عرض کیا کہ مجھے جواب دیجئے۔ تو فرمایا بیٹے! تمہیں بھول سکتا ہوں؟ میں نے عرض کیا کہ خاکسار عبدالستار ہی ہے تو لطیف مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، ہاں ہاں خیر پور کے ہمدانیوں کو کب بھلا سکتا ہوں۔ اب میں نے جان لیا تھا، کہ قاضی صاحب کو بیس سال کے بعد بھی ملیں تو بھول نہیں سکتے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے پوچھا کہ یہاں کیسے؟ بندہ نے عرض کیا، قبلہ! لا کالج میں تعلیم پاتا ہوں۔ فرمایا، ہوسٹل میں رہتے ہو؟ میں نے کہا۔ جی ہاں۔ اسی اثنا میں ایک آدمی کوکا کولا کی بوتل لے کر آیا۔ جو صاحب دوکان نے میرے پہنچنے سے پہلے قاضی صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے جی میں سوچا کہ قاضی صاحب مجھ سے پینے کو کہیں گے لیکن انہوں نے خود پینی شروع کر دی۔ میں خاموش دیکھتا رہا۔ جب نصف بوتل ختم کر چکے، تو مجھے فرمایا۔ بیٹا لائیر (LAWYER) فقیر کا جھوٹا پی لے گا۔ میں نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے عرض کیا۔ جناب ضرور۔ اس طرح میں نے اس عظیم انسان اور فقیر کا جھوٹا نہایت

مسرت اور افتخار سے پی لیا۔ اب قاضی صاحب اٹھے اور نیلا گبند کی جانب بڑھے۔ میں ان کے ساتھ جا رہا تھا اور دل ہی دل میں انتہائی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ چلنے کے بعد میں نے عرض کیا۔ حضور! آج کھانا میرے ہاں تناول فرمالیجئے۔ تو ہنس دیئے اور مذاق میں فرمایا کہ ہم امیر ہیں غریب کے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ امیر ہیں تو پھر غریبوں سے نفرت کرتے ہیں۔ تو فرمایا۔ بیٹے پھر کبھی کھاؤں گا۔ آج میں نے شام کو سرگودھا جانا ہے۔ جب ہم چوک میں پہنچے تو جہاں ٹریفک کا سپاہی ٹھہرتا ہے میں نے عرض کیا۔ اب آپ کا پروگرام کیا ہے؟ فرمایا کہ بیڈن روڈ جانا ہے وہاں کچھ تھوڑا سا کام ہے، اس کے بعد سلطان فونڈری جاؤں گا اور پھر سات بجے شام سرگودھا روانہ ہوں گا۔ میں نے عرض کیا، اچھا میں پھر یہ سامان ہوسٹل میں رکھ آؤں تو فرمایا۔ میں یہیں نیلا گنبد ہوں گا یا بیڈن روڈ پر ڈھونڈ لینا۔ میں جلدی جلدی ہاسٹل پہنچا، سامان رکھا، اور فوراً واپس آیا۔ نیلا گنبد دیکھا تو قاضی صاحب نہ تھے۔ میں رکشا میں بیٹھ کر بیڈن روڈ پہنچا۔ مگر افسوس، قاضی صاحب کو نہ پایا۔ میں قاضی صاحب کیساتھ چند لمحے اور گزارنا چاہتا تھا، مگر وہ میرے مقدّر میں نہ تھے۔ بیڈن روڈ پر خوب تلاش کیا مگر ان کو کہیں نہ پایا۔ میں انہیں ہر صورت میں ملنا چاہتا تھا مگر شاید انہیں اس کے بعد چلتا پھرتا دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا۔ میں بہت پریشان ہو گیا، مگر ابھی ایک جگہ اور بھی باقی تھی۔ میں فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر سلطان فونڈری پہنچا۔ میری پریشانی کی انتہا نہ رہی جب وہاں دفتر کو بند دیکھا۔ ایک چوکیدار وہاں بیٹھا تھا۔ اُس سے میں نے پوچھا کہ قاضی صاحب تو یہاں نہیں آئے؟ کہنے لگا کہ نہیں۔ آج دفتر بھی بند ہے۔ مالکان خود بھی نہیں آئے، گھر سے پتہ کرو۔ ملتان روڈ پر ان کی کوٹھی ہے۔ میں کوٹھی پر نہ پہنچ سکا کیوں کہ اب شام ہو رہی تھی۔ میں نے ہاسٹل میں پہنچ کر ٹیلیفون ڈائرکٹری سے مالکان سلطان فونڈری کے فون نمبر نوٹ کئے بعد میں ایکسپریس ٹرین سے شجاع آباد روانہ ہوا۔ ساڑھے بارہ بجے شجاع آباد پہنچا اور جامع مسجد

کی راہ لی۔ قاضی صاحب کا گھر مسجد کے اندر ہی ہے۔ مسجد کا دروازہ گزریں تو بائیں جانب ان کے گھر کا دروازہ آتا ہے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بچی باہر آئی۔ میں نے کہا۔ قاضی صاحب کو ملنے آیا ہوں، پردہ کراؤ۔ بچی کہنے لگی کہ اور لوگ بھی بیٹھے ہیں، پہلے ہی سے پردہ ہے، چلے آئیے۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کے قدم اندر رکھا۔ یہ میری قاضی صاحب سے دوسری اہم اور آخری ملاقات تھی۔ اندر گیا اور جب میں ڈیوڑھی سے ملحقہ برآمدے سے نیچے اُترا، تو سامنے کے برآمدہ میں قاضی صاحب کو سوئے ہوئے دیکھا۔ میرے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی۔ میں نے اُسے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر رکھا اور قاضی صاحب کی چارپائی کے قریب ہو کر سلامِ عقیدت و محبت بجالایا۔ قاضی صاحب کمزوری اور تکلیف کے باعث مجھے پہچان نہ سکے۔ فرمایا۔ بیٹا! کہاں سے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ قبلہ! خیرپور سے۔ عبدالستار ہمدانی میرا نام ہے۔ فوراً سمجھ گئے اور شفقت بھرے لہجے میں فرمایا۔ بیٹھو میرے عزیز! خدا تمہیں خوش رکھے۔ میں ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کی کمزوری اور تکلیف کا مجھے اس قدر غم ہوا کہ میں دوسرے پرسانِ حال سے مصافحہ کرنا بھی بھول گیا، اور ان کی شکل کو دیکھتا رہا۔ ان کے بائیں جانب ان کے قریبی عزیز قاضی عبداللطیف صاحب بیٹھے تھے۔ ایک اور رشتہ دار دوائی کی خوراک دے کر بیٹھے تھے۔ ایک دو اور آدمی بھی تیمارداری کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں وفورِ غم کے باعث زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے قاضی صاحب کو اس قدر تکلیف میں دیکھ کر موت سرہانے کھڑی نظر آئی۔ میں نے بڑی جرأت کر کے پوچھا۔ اب کیا حال ہے۔ قاضی صاحب نے زبان سے تو کچھ نہ فرمایا، بلکہ آسمان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھائی اور پھر میں نے محسوس کیا کہ آہستہ سے "اللہ" کہہ رہے ہیں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ میں وہاں بیٹھا۔ اس روز چونکہ جمعہ تھا۔ اسلئے قاضی عبداللطیف صاحب نے ہمیں باہر جانے کے لئے کہا۔ جب ہم اُٹھنے لگے تو قاضی صاحب نے قاضی عبداللطیف سے فرمایا۔ یہ میرے عزیز ہیں، انہیں خیال سے بٹھادیں۔ ہم باہر آگئے تو کچھ دیر کے بعد

ایک بچّے نے کہا کہ اُوپر چلئے۔ مَیں اُوپر چڑھا تو مسجد کی چھت پر بہت بڑا مدرسہ دیکھا۔ اب وہ بچّہ مجھے وہاں چھوڑ کر قاضی صاحب کے خاص کمرے کی چابی لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور کمرہ کھول کر مجھے اندر بٹھا دیا۔ میں اندر قاضی صاحب کے کمرے میں بیٹھا رہا اور اللہ تعالیٰ سے قاضی صاحب کی شفا اور صحت کے لئے دُعا کرتا رہا کہ مولیٰ! تو ہمارے قاضی صاحب کو صحتِ کاملہ عطا فرما۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے خدا کے حضور میں درخواست پیش کی اور پھر میں نے قاضی صاحب کی ایک الماری کو کھولا جسے چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا مگر بند نہ تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی کتابیں یا رسائل الماری میں رکھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کچھ تازہ چھپی ہوئی کتابیں پڑی ہیں جو عربی میں ہیں اور مرزائیت کے رَد میں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح اور کاغذات کی طرف نظر دوڑائی جو اِدھر اُدھر پڑے تھے مگر اطمینان کے ساتھ کسی چیز کو نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ شاید اب ہم اپنے جلیل القدر خطیب کو موت کے آہنی پنجوں سے نہ بچا سکینگے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تاریکی چھا چکی تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا جس پر خطیبِ پاکستان بیٹھا کرتے تھے اور اپنے آپ کو بہلانے لگا۔ اسی دوران وہی بچہ آیا میرے لئے کھانا لایا تھا۔ میں نے ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانا شروع کیا۔ میں دِل میں سوچ رہا تھا کہ کاش آج مَیں حضرت قاضی صاحب کے ساتھ کھانا کھا سکتا اور وہ اپنی گفتگو سے بھی مجھے محظوظ ہونے کا شرف بخش سکتے مگر میری اس خواہش کے منظور ہونے کا وقت بیت چکا تھا۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور برتن واپس کر دیئے پھر نیچے مسجد میں آگیا کیونکہ نماز جمعہ کا وقت قریب ہو چکا تھا۔ وضو کیا اور نمازیوں میں شامل ہو گیا قاضی عبداللطیف صاحب نے تقریر ختم کر کے خطبہ دینا شروع کیا۔ نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ خطبہ سُنا اور پھر نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مَیں چاہتا تھا کہ کسی طرح عصر کے وقت تک قاضی صاحب کے پاس بیٹھا رہوں اور ان سے کچھ باتیں کر لوں کیونکہ پھر میں نے

بجناب ایکسپریس سے ہی ۵ بجے واپس آنا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی بچے نے بتایا کہ قاضی صاحب بیدار ہو گئے اور آپ کو بُلا رہے ہیں۔ میں فوراً بصد احترام ان کی خدمت میں پہنچا۔ کرسی پر بیٹھا تو مجھے بڑی شفقت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کس گاڑی سے جاؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ چناب سے۔ فرمایا۔ اچھا! اسی طرح دس منٹ بیٹھا رہا میری نظریں ان کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ اس دوران ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مجھے غمگیں اور اندوہ گیں دیکھ کر وہ اور بھی مغموم ہو گئے اور مجھے آگے بڑھنے کو کہا۔ میں نے کرسی کو چارپائی کے بالکل قریب کر لیا تو مجھے جھکنے کو کہا۔ میں جُھکا تو مجھے سینے سے لگا لیا اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے مَیں اسی طرح سینے پر منہ رکھے کچھ دیر پڑا رہا۔ اس وقت غم کی جو کیفیت تھی، قلم اس کو ورطۂ تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ اب مجھے اٹھایا۔ میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، تو فرمایا کہ جاؤ! تین چار بار کہا کہ جاؤ۔ غم کے شدید احساس سے میں نے سُنا تو بیخود ہو گیا قریب تھا کہ میری چیخ نکل جاتی مگر سنبھل گیا اور منہ نیچے کر کے بیٹھ گیا۔ قاضی صاحب اب بھی فرما رہے تھے۔ بیٹا جاؤ خدا حافظ! خدا حافظ! وقت پر گھر پہنچ جاؤ۔ لیکن میں تھا کہ وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ آخر وہ سمجھ گئے۔ کہنے لگے، بیٹا کچھ کہنا ہے۔ میں نے کہا حضرت نہیں، مَیں کیا کہہ سکتا ہوں، جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دل کی کیفیت کو بھانپ گئے کہ شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ فرمایا۔ میرا منہ کڑوا ہے۔ مجھے بازار سے انار لا دو۔ میں فوراً بازار سے آدھ سیر انار لایا۔ فرمایا۔ کاٹ دو۔ میں نے بچے کو چاقو اور پلیٹ لانے کو کہا تو فرمایا۔ اچھا، تم جاؤ۔ تمہاری چچی کاٹ کر مجھے کھلا دینگی میں نے انار کرسی پر رکھ دیئے۔ اب وہ بڑی شفقت اور پیار سے الوداع فرما رہے تھے۔ میں نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ انہوں نے صرف داہنا ہاتھ بڑھایا۔ بائیں ہاتھ کو زیادہ تکلیف تھی اور جلدی سے اُٹھ نہ سکتا تھا۔ مَیں نے اس عظیم انسان، مجاہد، درویش،

اور مردِ مومن سے آخری بار مصافحہ کیا اور ہاتھ کو بوسہ دیا اور واپس روانہ ہوا۔ ڈیوڑھی سے ملحقہ برآمدہ میں ایک گداگر بڑھیا بیٹھی تھی۔ چلنے لگا تو فرمایا۔ بیٹا! اسے ایک آنہ دیتے جانا۔ میں نے اچھا کہا اور آگے بڑھا۔ جیب سے ایک آنہ نکال کر بڑھیا کے کشکول میں ڈالا اور ایک بار پھر اس عظیم سرفروش اور جانباز کے چہرہ پر نگاہ ڈالی اور اس طرح آخری دیدار کر کے قاضی صاحب کے گھر سے باہر نکل آیا اور تانگہ میں بیٹھ کر اسٹیشن پہنچا اور جناب ایکسپریس سے گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے نماز پنجگانہ کے بعد اور دوسرے اوقات میں نہایت باقاعدگی سے قاضی صاحب کی صحت کیلئے گڑگڑا کر دعائیں کیں۔ ایک بار پھر غالباً ۲ر نومبر کو خط لکھا مگر جواب نہ آیا کیونکہ تکلیف حد سے بڑھ گئی تھی اور قاضی صاحب کو ڈاکٹر عون محمد خان کے پاس ملتان پہنچایا گیا تھا۔ اس کے بعد اخبارات اور دوسرے ذرائع سے غیر تسلّی بخش خبریں موصول ہوتی رہیں اور حزن و ملال کی گھٹائیں چھاتی رہیں۔ آخر ۲۳ر نومبر کو موت نے ہم سے اس خطیبِ لبیب اور نامور فرزند کو چھین لیا۔ بدقسمتی سے مجھے وفات کی اطلاع ۲۴ر نومبر کو ملی۔ فوراً شجاع آباد روانہ ہوا۔ گاڑی نہ مل سکی، بس سے گیا، جس نے کافی تاخیر کے بعد ۱ بجے شجاع آباد پہنچایا۔ فوراً جامع مسجد میں پہنچا تو نماز ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد قاضی صاحب کی میّت باہر لائی گئی۔ اب وہی انسان جس کی تقریروں میں ہم سبق ڈھونڈتے تھے اور جس کی گفتگو میں شیرینی تھی ہم سے جدا ہو رہا تھا اور ہر شخص آخری دیدار کا منتظر تھا۔ عقیدت مندوں کی تعداد دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ اس چھوٹے سے شہر میں اتنے لوگ کہاں سے آئے۔ شجاع آباد کی کل آبادی ۱۴ ہزار ہے مگر پچاس ہزار انسانوں نے قاضی صاحب کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ

از: حفیظ رضا، پسروری

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

لمبا قد، بھرپور جسم، پُرکشش نگاہیں، سفید و سیاہ داڑھی اور گھنگھریالے بال، یہ ہے تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوّت کی باوقار شخصیت، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، جس نے اپنی نوائے گرم اور سحرِ خطابت سے ملک کے قریہ قریہ، بستی بستی میں ایک والہانہ انداز میں مسئلہ ختمِ نبوّت سے عوام میں ایک غیر فانی انقلاب برپا کر دیا۔ اور اس کے پیشِ نظر آپ کو "خطیبِ پاکستان" کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔

جس زمانے میں راقم الحروف ساتویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا ایک غیر مسلم استاد کلاس میں اکثر شاہ جی اور قاضی صاحب کا نہایت احترام سے ذکر کیا کرتا تھا اور ان کے اندازِ بیان اور عوامی خطابت کی تعریف کرتا۔ استاد صاحب اچھی خطابت کے بہت دلدادہ تھے۔ جب کبھی ہمارے ضلع کے کسی مقام پر شاہ جی یا قاضی صاحب کسی جلسہ میں شرکت کے لئے آتے تو استاد صاحب نہایت اہتمام سے وہاں جاتے۔ چونکہ میری تربیت شروع سے ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں شاہ صاحب کا اکثر ذکر رہتا، لہذا ان حضرات کے نام میرے لئے اجنبی نہ تھے اور انہیں دیکھنے کی میرے دل میں ایک تڑپ تھی۔ غالباً اپریل ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ میرے شہر کی نواحی بستی جونڈہ میں

انجمن تبلیغِ اسلام کی سالانہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کے پروگرام میں قاضی صاحب کی تقریر کا نہایت اہتمام سے اعلان تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ جلسہ میں شرکت کا پروگرام بنایا۔ ہم رات نو بجے وہاں پہنچے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے کو تھی۔ شاعرِ انقلاب جانباز مرزا اپنے مخصوص ترنم میں اس زمانہ کی مشہور نظم سُنا رہے تھے۔ جس کا مطلع تھا۔

غرق ہونے کے لئے ساحل سے ٹکراتا ہوں میں

کھیلتا ہوں موت سے اور زندگی پاتا ہوں میں

آپ کی نظم کے بعد ایک پُر وقار شخصیت، کھدّر کے کپڑوں میں ملبوس مائیکروفون کے سامنے آئی اور چند ہی لمحوں میں حاضرین کی توجّہ کا مرکز بن گئی۔ آپ کا اندازِ بیان نہایت دلکش اور مسحور کن تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ؏

"طوفان کی آغوش میں نیند آنے لگی ہے۔"

اور بے اختیار زبان پر یہ فقرہ جاری تھا ؏

"نزدیکِ ساحل کی حدیں اور گھٹا دو"

آپ مسئلۂ توحید پر اظہارِ خیال فرما رہے تھے اور الفاظ نہایت تسلسل اور روانی کے ساتھ فضا میں بکھیر رہے تھے۔ دورانِ تقریر فضا پر کامل سکوت طاری تھا اور سامعین کے سر عقیدت و جذبات سے جھومتے نظر آ رہے تھے۔ تقریر کے خاتمہ پر لوگ شدّتِ جذبات میں، آپ سے مصافحہ کرنے کی خاطر آگے بڑھ رہے تھے اور آپ ہر ایک سے نہایت شفقت و محبّت سے پیش آ رہے تھے۔ تقریر سُن کر لوگ گروہ در گروہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے اور ہر ایک زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا ؏

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

بعد ازاں مجھے مختلف جگہوں پر آپ کی تقریریں سُننے کا اتّفاق ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں

جب لاہور تنظیم اہل سنت کانفرنس منعقد ہوئی۔ آپ بھی اس کانفرنس میں خطاب فرما رہے تھے اور اس کی ایک نشست نعتیہ مشاعرہ پر مشتمل تھی۔

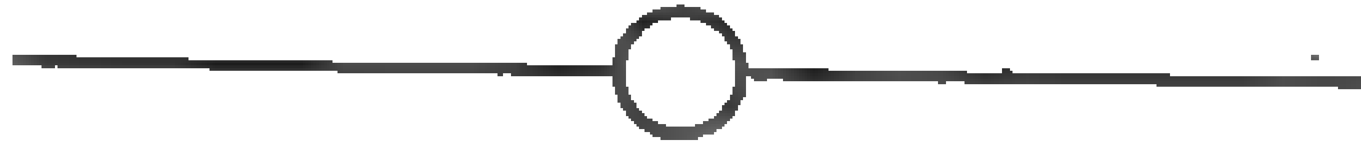
راقم بھی اس میں مدعو تھا۔ جب مشاعرہ میں پہنچا تو اسٹیج پہ دیگر قابلِ ذکر بزرگوں کے ساتھ قاضی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میں خوش ہوا، کہ یہ ملاقات عقیدت و جذبات کے پھول پیش کرنے کے لئے بہترین موقعہ مہیا کرے گی۔ علامہ حسین میر جو اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، نے میرا نام پکارا، اور میں نے حضور سرورِ دو عالمؐ کی خدمتِ عالیہ میں اپنا حقیر نذرانہ پیش کیا۔ میں نے دورانِ مشاعرہ کئی بار آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرتے دیکھے۔ جو سرکارِ مدینہؐ سے آپکی بے انتہا محبت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اختتامِ مشاعرہ پر آپ سے ملاقات ہوئی اور دورانِ ملاقات شعروادب، مذہب و سیاست اور عام دلچسپی کے مسائل زیرِ بحث آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر نہایت دُور رس ہے۔ میں نے جس معاملہ پر بھی بات کرنی چاہی، آپ نے اس پہ اِس خوبی اور تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا کہ آج تک آپ کے علمی اور حُسنِ تدبّر کا مجھ پر اثر ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ آپ حالات کو ہمیشہ گہری نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے اور نتائج سے اکثر بے نیاز رہتے۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا اور ناموسِ رسالتؐ کے تحفظ کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار رہتے۔ آپ کی طبیعت نیلوفری، زبان موسمِ بہار کے پھولوں کی طرح شگفتہ تھی۔ گفتار و کردار میں یگانگت، علم و تحقیق اور شعر و ادب سے گہرا تعلق تھا۔ ناموسِ رسالت کے تحفظ کے لئے آپ نے مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے پلیٹ فارم پر بڑا ہی مفید کام کیا۔ آپ نے مرزائے قادیان کی نبوت کے تار و پود جسے بعض احباب "پوسٹ مارٹم" بھی کہتے ہیں، اس خوبی سے بکھیرے کہ اس غیر ملکی دکان کی

اجارہ داری اب ختم ہو رہی ہے۔ اور عوام مسئلۂ ختمِ نبوت سے بے پناہ محبت کرنے لگے ہیں۔ محبت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کسی عوامی اجتماع میں جب تک ختمِ نبوت کا ذکر نہیں آتا، اس کی کامیابی مشکل ہو جاتی ہے۔ مرحوم قاضی صاحب نے ملک کے اکثر ذمہ دار اربابِ حکومت کے سامنے جس مؤثر انداز میں قادیانی فرقۂ باطلہ کا پسِ منظر پیش کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کی ان خدمات کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔

جن دنوں پنجاب کے الیکشن ہو رہے تھے۔ مجلسِ احرار مرزائی امیدواروں کے خلاف تمام مسلمان امیدواروں کی حمایت کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آپ سمبڑیال پہنچے مسلم لیگ کے جلسۂ عام میں آپ کو تقریر کی دعوت تھی۔ اس جلسہ میں شہیدِ ملت خان لیاقت علی خان مرحوم بھی تقریر کرنے والے تھے۔ شہیدِ ملت، قاضی صاحب کی تقریر کے دوران جلسہ گاہ میں پہنچے، اور اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ آپ کی تقریر پورے شباب پر تھی اور خان لیاقت علی خان کے چہرے کے تاثرات بے اختیار داد دے رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر خان لیاقت علی خان نے لیگی رہنماؤں سے آپ کی تقریر کی تعریف کی۔ اسی روز پچھلے پہر خان موصوف کو سیالکوٹ کے جلسہ میں تقریر کرنی تھی۔ اور آپ ہی کی دعوت پر قاضی صاحب اس جلسہ میں ان کے ساتھ موجود رہے اور جب خان صاحب تقریر سے فارغ ہوئے تو قاضی صاحب نے اپنے مشن کے ماتحت آپ سے وقت طلب کیا۔ شہیدِ ملت نے نہایت مسرت سے فرمایا۔ "آپ شام ۷ بجے میرے سیلون میں تشریف لائیں"۔ قاضی صاحب ۶ بجے میرے ہاں پہنچے اور اسٹیشن پر چلنے کو کہا۔ میں نے آپ کا ٹرنک اُٹھایا، جو مرزا غلام احمد کی تصنیفات سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں اور دوسرے لوگ بھی شہیدِ ملت سے ملاقات کے منتظر تھے لیکن سب سے پہلے نوابِ صدیق علی خان آپ کو لے گئے اور تقریباً ۴۵ منٹ

تک اس فرقہ باطلہ کے عزائم سے آپ کو آگاہ کیا۔ گفتگو نہایت دوستانہ ماحول میں ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے بعد میں فرمایا کہ جن حوالوں میں مرزا تے قادیانی، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تضحیک کا مرتکب ہوا، ان کو پڑھنے کے بعد شہیدِ ملّت کافی دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ قاضی صاحب نے مرزائیت کے متعلق حتی الوسع ہر ایک کو آگاہ کیا ہے۔ بہر حال آپ کی یہ مساعی جمیلہ قابلِ قدر ہیں۔

قاضی صاحب کی زندگی اور اس کے متعلق جد و جہد کے کئی قابلِ فخر کارنامے میرے ذہن میں محفوظ ہیں، جنہیں کسی دوسری فرصت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین۔



قاضی صاحبؒ کی نماز جنازہ

از : جانباز مرزا - ایڈیٹر ماہنامہ "تبصرہ" لاہور

گذشتہ سال ۲۳ر نومبر ۱۹۶۶ء کا دن منحوس ترین دن تھا، جب دِین دار قسم کے مسلمانوں کی قریباً آخری پونجی موت کے ہاتھوں لُٹ گئی۔ موت کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے دامن کی ہواؤں سے جب چاہے وہ کسی کا چراغِ زندگی گُل کر دے شہنشاہوں کی دولت اور اطبار کی رائے دونوں اس کے سامنے اس طرح سپر انداز ہوتی ہیں کہ ساری شیخی کرکری ہو جاتی ہے۔

قاضی احسان احمد گذشتہ آٹھ ماہ سے زندگی کے سہارے موت سے نبرد آزما رہے اس عرصہ میں وہ کچھ کیا جو زندہ رہنے کے لئے کیا جا سکتا ہے لیکن موت کا ایک دن معیّن ہے۔ شجاع آباد کے ڈاکٹر، نشتر ہسپتال کے سرجن، لاہور کے بڑے بڑے دانشور میانوالی کے حکیم سب نے اپنے حوصلے آزما کر دیکھے اور سب نے اپنی رائے کا امتحان کر لیا۔ مگر زندگی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ یہ شاخ اپنے تنے سے ٹوٹ رہی تھی۔ دن کی سفید چادر پر رات کے داغ اُبھر آئے تھے اور موت گھر کی دیواریں عبور کر چکی تھی۔ آٹھ ماہ کی تمام جد و جہد پانی پانی ہو کر زندگی کے راستے سے ہوتی ہوئی موت کے سامنے جا کر ہار گئی۔ آخر وہی ہوا جس کا انتظار تھا۔ خطیبِ پاکستان اپنی خطابت کے تمام زور، اپنی شخصیت کی تمام رعنائیاں اور اپنی محبت کی زلف ہائے دراز کو توڑ کر ہزاروں چاہنے والوں کے آنسوؤں میں اس طرح گُم ہو گئے کہ آج ان کے نشانِ پا تو ملتے ہیں مگر غبارِ زندگی نہ جانے

کہاں جا کر گم ہو گئی کہ اب قیامت تک اس کا انتظار رہے گا۔ پانچ بجے تھے کہ مجھے اچانک سرِراہ قاضی صاحب کی موت کی اطلاع ملی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

اس خیال سے کہ صبح خیبر میل پر جاؤں گا تو یقیناً جنازہ مل جائے گا، اور اسی ارادہ سے رات کے سفر میں بہتری نہ سمجھی۔ صبح اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پشاور اور ٹیکسلا کے احباب بھی خیبر میل میں جا رہے ہیں، اور تسلی ہوئی۔ خیبر میل اپنے مسافروں کو ٹھیک وقت پر پہنچا رہی تھی۔ جیسے جیسے شجاع آباد قریب آرہا تھا، راستے کی ہر شئے غمناک دکھائی دے رہی تھی۔ سرسوں کے پھول پیلے زرد چہرے لئے کھیتوں کے کنارے مرجھائے کھڑے تھے۔ آموں کے پودے شجاع آباد جانے والوں کو آخری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ کہ ساڑھے تین بجے گاڑی شجاع آباد پہنچی۔ تانگہ پر بیٹھتے ہی سوگواروں کا ایک دستہ ملا، اب کہاں جا رہے ہو؟ خاک کی امانت خاک کے سپرد کر دی گئی۔ دل دھک سے رہ گیا ۳۶ سالہ زندگی کے ساتھی نے آدھ گھنٹہ بھی انتظار نہ کیا۔ زمانہ کے رسم و رواج اور دین کے راہنماؤں نے اپنے سفر کی سہولت کے پیشِ نظر کئی دوستوں کو نمازِ جنازہ کی سعادت سے محروم کر دیا۔

تانگہ لے کر قبرستان پہنچے۔ لاکھوں دلوں کو سُلانے والا منوں مٹی کے نیچے آخری نیند سو چکا تھا۔ گرد و پیش کو دیکھا کہ کہیں پھول ہوں تو یار کی قبر پر چڑھاؤں مگر وہ سب مُرجھا چکے تھے۔ آخر آنسوؤں نے ساتھ دیا اور خشک دریا سے وہ طوفان امڈا کہ قبر پر پانی کے چھڑکاؤ کی حاجت نہ رہی۔ جیل اور ریل کے ۳۶ سالہ رفیقِ سفر! تو نے بھی لوگوں سے نہ کہا کہ جانیاز کا انتظار کر لو، وہ آتا ہی ہوگا۔ قاضی صاحب! اتنی بھی کیا جلدی تھی کہ منہ تک نہ دکھا سکے۔ یہ درست ہے کہ میرا منہ تیرے ایسے اچھے دوست کے قابل نہیں تھا۔ تاہم میرا شوق دیکھتا اور میرا انتظار کرتا .... خیر تمہاری مرضی۔ خدا تمہارے آئندہ سفر کو آسان بنائے۔ آمین"۔

یہ کہہ کر آنسو سمیٹ لئے۔ پھر قاضی صاحب کی مسجد میں آیا تو یہاں سوگواروں کا ہجوم تھا۔ دوست دوستوں سے تعزیت کر رہے تھے، اور کرتے بھی کس سے، جو بدقسمت نرینہ اولاد سے محروم مرتے ہیں، ان کی میّتوں کو دوست ہی اُٹھاتے ہیں۔ کاش! قاضی صاحب مرحوم کی کوئی نشانی ہوتی۔ لیکن آہ ...... ! قاضی صاحب کے دونوں داماد قاضی عبداللطیف اور قاری نورالحق سوگواروں سے ملتے ملاتے رہے۔ شام فضا پر اپنے سائے پھیلا رہی تھی۔ دُھوپ مغرب کی جانب اُٹھتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اہلِ خانہ سے اجازت چاہی۔ وہ روکتے رہے کہ رات کی بات ہے، صبح چلے جانا، لیکن شجاع آباد میں میرے لئے اب کوئی کشش نہیں تھی ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

۱۹۳۲ء میں پہلی دفعہ قاضی صاحب کے والد محترم قاضی محمد امین صاحب کی دعوت پر شجاع آباد آیا تھا اور یہ سلسلہ زُلفِ جاناں کی طرح ایسا دراز ہوا کہ قاضی صاحب کے ساتھ برادرانہ رسم و راہ نے گھر کی دیواریں بھی ایک دوسرے کیلئے گرا دیں۔

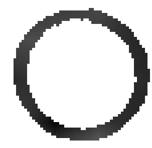
اُن دنوں شجاع آباد کی شاہی مسجد کی وسعت کھجور کے درخت کے برابر تھی۔ نمازیوں کی تعداد بھی محدود تھی اور شہر کی آبادی غیر مسلموں پر مشتمل تھی، لیکن آج مسجد کی رونق اور شہر کی آبادی جب دونوں پر شباب آیا تو خطیب رخصت ہو گیا ؏

یار پہ جو آیا تو قضا بھی آئی

اب ایسا کبھی گاڑی پر شجاع آباد سے گزر ہوا تو تصور کر لیا جائے گا کہ قاضی احسانؒ اسٹیشن پر کھڑے ہیں اور تقاضا کر رہے ہیں کہ جانبازؔ اب کی بار آموں کے موسم میں شجاع آباد نہیں آؤ گے؟

مکتوب از جناب عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ

ڈیرہ اسماعیل خاں



بتاریخ [redacted]۲ر فروری ۱۹۶۸ء

۷۸۶

بخدمت جناب قاری صاحب سلمہ اللہ الرحمٰن

السلام علیکم۔ آپ کی جانب سے ایک تحریر بعنوان "حضرت قاضی صاحب کے احباب کی خدمت میں ضروری درخواست" ہفتہ وار "سنگِ میل" پرچہ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۶۸ء نظر سے گذری۔ قاضی صاحب مرحوم میرے محترم کرم فرما تھے اور اکثر ڈیرہ اسمٰعیل خاں تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے خلاف قبل از نفاذ مارشل لاء ایک مقدمہ اس وقت حکام نے زیر دفعہ ۱۰۸ ضابطہ فوجداری چلایا تھا۔ وہ ضمانت پر رہا ہو گئے۔

مقدمہ کا سال یاد نہیں ہے مگر پیشی پر بوجہ علالت والد ماجد قاضی صاحب مرحوم حاضر نہ ہو سکے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ان کے لئے کمیٹی (احرار و کانگریس) نے سترہ وکلاء کو جناب قاضی صاحب کے مقدمہ کی پیروی کیلئے مقرر فرمایا تھا جن میں سائل نہ تھا۔ جب ڈیرہ بعد از تاریخ پیشی پر آئے، تو مقرر شدہ وکلاء نے جناب قاضی صاحب کو کہا کہ آپ فکر نہ کریں جب مقدمہ بُلایا جائے گا تو وہ پیش ہوں گے۔ میں نے جناب قاضی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ سب غلط کہہ رہے ہیں، وہ ایک ایک کر کے چلے جائیں گے۔ اس خیال سے کہ کوئی ایک آخر پیش ہو ہی جائے گا اور بس صرف میں ہی آپ کے ساتھ رہوں گا اور میں ہی پیروی کروں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب مقدمہ بُلایا گیا۔ تو ان مقرر شدہ وکلاء میں سے کوئی بھی کچہری میں موجود نہ تھا۔ پھر میں

اور قاضی صاحب پیش ہوئے۔ مقدمہ جناب مولوی رشید الدین خان مہتمم خزانہ باختیارات مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں تھا۔ اُن سے درخواست کی کہ جناب قاضی صاحب بوجہ علالت والد بزرگوار حاضر نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب ایک نیک دل اور ہمدرد مسلمان تھے۔ اُنہوں نے درگذر کیا اور ضمانت ضبط نہ کی۔ آخر کار سرکار نے وہ مقدمہ واپس لے لیا۔

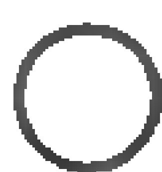
جناب قاضی صاحب مرحوم نے آخری ایّام میں سلسلۂ تقاریر متعلق فتنۂ قادیان شروع کیا ہوا تھا اور متعدد کتب دریں بارہ جمع کئے ہوئے تھے اور بغیر حوالۂ کتب کے روایتی بات کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ کتب مذکور میں اکثر احمدی جماعت ہی کے لوگوں کی تحریر کردہ تھیں۔ آپ کا اسلوب بیان و برہان نہایت زور دار تھا، اور سامعین کو مسخر کر لیتا تھا۔ اور اکثر سامعین پکار اُٹھتے تھے۔ "جزاک اللہ، بالکل درست ہے، اس میں کوئی شک نہیں"۔ اور مجھے غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جناب قاضی صاحب سال ۱۳۷۰ھ میں ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے تو کافی مضمحل دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جسارت کر کے دریافت کیا کہ حضرت کیا بات ہے، آپ تو ہمیشہ ہشاش بشاش رہا کرتے تھے اور اس دفعہ حالت متغیر سی ہے۔ خیر تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرا لڑکا...... خورد سال محی الدین احمد کا انتقال ہو گیا ہے جسکی یاد ایک لمحہ دِل سے نہیں جاتی اور مجھے حکم دیا کہ ایک تاریخی قطعہ اس کی وفات کے متعلق لکھیں۔ میں نے اسی روز قطعہ مذکور لکھ کر ان کے حوالے کیا۔

(قطعہ تاریخ وفات صفحہ آئندہ پر پیش کیا جا رہا ہے)

قطعۂ تاریخی بر وفات محی الدّین احمد یحییٰ معصوم قاضی احسان احمد شجاع آبادی کہ بروز ۳۰ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ در وقوع آمدہ داغِ مفارقت بر دل والدین خود تا زیست ایشان نہاد



من از خاک بودم بخاک آرمیدم — اگر چند روزے چو لالہ شگفتم
مرا خود بردی بخاکم سپردی — بخواہش من از خانۂ تو نرفتم
بخاکم میا تا نیالودہ گردد — سرِ دامنِ تو کہ اکنوں غبارم
ز خاکم دِگر لالۂ تازہ روید — گر از چشمِ تر اشک ریزی بخاکم
بسے خوبرویاں چو من زیرِ خاک اند — منم لیک در بزمِ شاں رکنِ اعظم
محی الدّین احمد منم صدرِ خوباں — بہ بزمِ حسیناں چو بدرِ منیرم
اگر دیدنم میل داری بباید — چو نرگس ترا چشم در انتظارم
بہ گریہ منظر دہ چو یعقوبؑ کنعاں — کہ از من رسد تا بہ مغزت شمیم

بجو سالِ وصلِ محی الدّین احمد
زِ "اکنوں غبارم" کہ اکنوں غبارم
۱۳۷۰ھ

قلبی ہوا خواہی کا دعویدار
عطاء اللہ خاکسار

خطیبِ پاکستان

از: مولانا تاج محمود۔ ایڈیٹر ہفت روزہ "لولاک" لائل پور

خطیبِ پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کی وفات نے رئیس الاحرار امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی جُدائی کے صدمہ کو تازہ کر دیا ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۶۶ء کو خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب کا اپنے آبائی قصبہ شجاع آباد میں وصال ہوگیا اور انہیں دوسرے دِن مغربی پاکستان کے تقریباً تمام شہروں، قصبوں اور علاقوں سے آئے ہوئے ہزاروں عقیدت مندوں، دوستوں اور ساتھیوں نے آخری سلامِ محبت پیش کرنے اور نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد شجاع آباد ہی کے ایک قبرستان میں اپنے والد بزرگوار قاضی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سُلا دیا۔

شجاع آباد، ضلع ملتان جو کسی مسلمان نواب کے نام سے منسوب اور اسی کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ اس شہر میں ابھی تک اس کا تعمیر کردہ قلعہ اور شاہی مسجد کی عمارتیں، اس کی عظمت اور اس کی دینداری کے دو گواہ موجود ہیں۔ کسی زمانہ میں مرکزی اور آباد ترین شہر ہوگا، لیکن مسلمانوں کی حکومتوں کے زوال اور انگریزی حکومت کے آنے کے بعد سے اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہ گئی تھی۔

اس بنجر اور بانجھ سرزمین سے اللہ تعالیٰ نے صدیوں کے بعد شاہ شجاع کے بوسیدہ قلعہ

کی عمارت کے مکینوں سے نہیں بلکہ اس کی بنائی ہوئی شاہی مسجد کے متولیوں اور خدّام کے خاندان سے توحیدِ خداوندی کا منّاد، دینِ قیّم کا مبلّغ، حضورؐ فداہ ابی وامی کی آبرو کا محافظ، محاذِ ختمِ نبوّت کا سپہ سالار اور قافلۂ تحریکِ آزادی کا شہسوار، بطلِ حریت، سفیرِ اسلام، خطیبِ امّت مولانا الحاج قاضی احسان احمد شجاع آبادی پیدا ہوا۔ قاضی صاحب کا پورا خاندان علم و عرفان کا گہوارہ تھا۔ اپنے گھر میں اپنے بزرگوں سے ہی متداولہ عربی علوم و فنون کی کتابیں اور قرآن و حدیث کے فیوض و برکات سے اپنا دامن بھرپور اور اپنا سینہ منوّر کیا۔ قاضی صاحب نے جدید علوم کا کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا ہوا تھا اور نہ ہی انگریزی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ نہ صرف یہ کہ قاضی صاحب سے متاثر ہوئے بلکہ ان کے حلقہ بگوش شاگرد کہلانے پر فخر کرتے تھے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

قاضی صاحب نے شجاع آباد جیسے پسماندہ اور دور افتادہ علاقے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ بڑے بڑے شہروں اور ان میں طرح طرح کی گہما گہمیوں سے دُور ہٹ کر سنسان خاموش اور سناٹے کے ماحول میں انہوں نے کمال یکسوئی اور تیزی کے ساتھ اکتسابِ علوم و معارف کی منازل طے کرلیں۔ ابھی وہ بمشکل اٹھارہ سال کے نیچے ہی تھے۔ ماں، باپ کے اکلوتے فرزند، کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ، لاڈلے اور نہایت ہی پیارے نوجوان تھے۔ گھر سے مسجد، مسجد سے گھر، ان کے والد اور والدہ اس پیارے فرزند دلبند کی ایک پل جُدائی اور اس کا آنکھوں سے اوجھل ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی والدہ اپنے عزیز بیٹے کی اتنی جدائی بھی برداشت نہ کر سکتی تھی کہ قاضی صاحب اپنے ابّا کے ساتھ بازار تک یا قصبہ کے قریب ہی اپنی جدّی زمین، کنوئیں اور باغ تک ہی

ہو آتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی حکومت کے خلاف محکوم ہندوستانیوں میں آزادیٔ ہند کی ابتدا۔ مسلمان علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں علمائے کرام نے ہی آزادیٔ ہند کے لئے باقاعدہ عَلَمِ جہاد بلند کیا تھا جو اگرچہ اس وقت کامیاب نہ ہوا، اور بڑے بڑے علماء اور ان کے مجاہد ساتھیوں کو بڑی بڑی صبر آزما اور جگر سوز قسم کی قربانیاں دینا پڑیں، لیکن وہ آزادیٔ وطن اور سربلندیٔ اسلام کی نیو رکھ گئے۔ پورے برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور جانشینوں کا ایک سلسلہ پھیلتا اور پھولتا گیا۔ انہوں نے ہی دینی اور علمی طور پر توحید و سنّت کا پیغامِ عام کیا، اور انہوں نے ہی انگریزوں سے استخلاصِ وطن اور غلبۂ اسلام کی تحریک کو جاری رکھا۔

لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہندوؤں نے بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ گاندھی جی نے ہندو قوم کی روایتی بزدلی سے ہٹ کر دو ایک تحریکیں انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ پوری ہندو قوم اپنے تمام وسائل سمیت اس کی پشت پر ہو گئی اور تاثر یہ قائم ہونے لگا کہ جب ملک آزاد ہو گا، تو یہی ثابت ہو گا کہ آزادی وطن کے ہیرو کانگریسی ہندو رہنما ہیں اور یہ سہرا کانگریس کے سر ہی ہو گا۔

دوسری طرف انگریزی استعمار اوچھے ہتھیاروں پر اُتر چکا تھا۔ اُس نے پورے ہندوستان میں راجوں، مہاراجوں، نوابوں، سروں، خان بہادروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ٹوڈیوں کے لشکروں کو آزادی پسند عناصر کے خلاف سرگرمِ عمل کر رکھا تھا۔ انگریز، فوجوں، پولیس، ہتھکڑیوں، جیلوں، شاہی قلعہ کی کال کوٹھڑیوں اور سنگینوں کے بل بوتے پر یونین جیک کو برِصغیر کی سرزمین پر زیادہ سے زیادہ عرصہ لہرائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس دوہری آزمائش اور پُرپیچ مصیبت کے

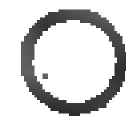
وقت کچھ لوگ مسلمانوں میں سے سروں پر کفن باندھ کر اُٹھے۔ اُنہوں نے تخت یا تختہ کا نعرہ لگایا، اور برطانوی سامراج کو اپنے اسلاف سلطان صلاح الدین مرحوم حضرت سلطان ٹیپو مرحوم، سراج الدولہ مرحوم، شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت سید احمد بریلویؒ، امیر محمد خان پنڈاوہ، بہادر شاہ ظفر اور ان کے ساتھی، حضرت حاجی امداد اللہؒ، مولانا فضل حق خیر آبادیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مشن کی تکمیل کی خاطر للکارا۔ یہ سب لوگ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قافلے کے ہی شہسوار تھے۔ ان کے دلوں، دماغوں میں وہی حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کے انقلابی افکار کی گرمی تھی۔ ہندوستان میں غلبہ اسلام اور اسلامی سلطنت کا قیام ہی ان کا مطمح نظر اور پروگرام تھا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، حکیم محمد اجمل خاں دہلویؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، تحریکِ آزادی کے اس قافلے کے سرخیل اور راہنما تھے۔ ہندوؤں کے لیڈر گاندھی جی کی تحریکیں نمک سازی، مرن برت، چرخہ کاتنا اور لفافے لکھنا وغیرہ تھیں، لیکن ان اکابرین کی تحریک لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُودَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِیَاءَ۔ (اے مسلمانو! یہودیوں اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ) کی تفسیر اور تشریح پر مشتمل تھی۔ اس بے مثال قافلے کے شہسواروں میں حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری پنجاب میں قیام پذیر تھے۔ اگرچہ پورے برصغیر میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف کلمہ حق بلند کیا، لیکن پنجاب جو انگریزوں کے اقتدار کا قلعہ تھا۔ جہاں ضلع سرگودھا، جہلم، کیمبل پور، میانوالی اور ہزارہ کی مائیں اپنے بچے انگریزی اقتدار کے لئے ______ محافظ نوجوان پیدا کرتی تھیں۔ جہاں کے نوجوان انگریزی آقاؤں کی خوشنودی کے لئے ۱۵ روپے ماہوار تنخواہ کے عوض، قبائل

ترکی، بغداد اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کو ظلم و تشدد اور گولیوں کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ پنجابی مسلمانوں نے ہی گیلی پولی میں ترکوں سے معرکہ آرائی کی۔ قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کو ننگے سر، اُسی کے سر کے بالوں سے گھسیٹا گیا۔ یہی پنجابی مسلمان نوجوان تھے، جن کی گولیوں سے حرم شریف کے لوگ زخمی ہو گئے۔ یہی پنجاب ہے جس کے بعض دین کے رہنما، دینِ اسلام کے قزاق اور ڈاکو بن کر شمس العلماء بنے، سرکاری ولی اور سرکاری نبی بنے اور مسلمانوں میں تفرقہ بازی کا بازار گرم کر کے انگریزوں کی اس پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کو کامیاب کیا

خطیبِ پاکستان
حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی

رحمۃ اللہ علیہ

از: محمد عبدالرشید صدیقی سابق جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام ملتان



تعارف

مجاہدِ حرّیت خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم سے بندہ کو ان دنوں تعارف نصیب ہوا جب وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بعد اپنے جذبۂ حمیّتِ اسلامی سے سرشار ہو کر اپنے آغازِ جوانی میں مجلسِ احرار اسلام میں شامل ہوئے۔ انہیں حضرت امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ایمان افروز تقاریر سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔ چونکہ وہ حضرت امیرِ شریعت سے مجنونانہ محبّت رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے حضرت امیرِ شریعت شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت و مصاحبت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر آپ کے ساتھ اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ صرف کیا۔ اور ان کے فیوضِ دینی اور جذباتِ محبّتِ الٰہیہ اور امام الانبیاء، سید المرسلین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت و عصمت اور آپ کے ساتھ عشق کی والہانہ کیفیت کی تابناکیوں سے مالامال ہونے والی منازل طے کرنے میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنا اپنا فریضہ سمجھا۔ اس لئے حضرت شاہ صاحب کی محبّت و فیضِ روحانی اُن پر اس قدر اثر انداز ہوئی، کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر سُننے والے بلا اختیار کہتے تھے کہ قاضی صاحب مرحوم نے ان کی شاگردی کا رنگ پیدا کر دیا ہے اور وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی

نہ صرف زندگی میں قاضی صاحب کی تقاریر سُن کر ان کو داد دیتے تھے بلکہ عام اجتماعات میں اُن کو حضرت شاہ صاحب کی حیات میں ہی ان کا قائمقام یقین کرتے تھے۔ شیر بیشہ حُریّت مجاہدِ اعظم بخاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تو اُن کو جلسوں میں اس لئے دعوت دی جاتی تھی کہ اُن کی تقاریر سے شاہ صاحب کی رُوح تازہ ہو جاتی ہے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے خطاب میں برصغیر ہند و پاکستان میں اپنے پایہ کے بلند ترین خطیب تھے اور علماء و صلحاء اُمّت کے تاثرات کے مطابق بین الاقوامی شہرت کے لحاظ سے خطابت اُن پر ختم ہو چکی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی اشاعت، عصمتِ انبیاء، شانِ رسالت بالخصوص حضرت خاتم النّبیین سیّد الاوّلین والآخرین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم سے مجذوبانہ محبّت اور آپ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ناموس کی پاسبانی میں جو خدمات ان کی ہیں، اور اُن سے آزادیٔ ہند، انگریز دشمنی، قادیانیت اور منکرینِ نبوّت کی ریشہ دوانیوں کو ختم کروانے میں جو کام حضرت شاہ صاحب سے ۵۰ سال کی زندگی میں لیا، اُن کے بعد اور اُن کی زندگی ہی میں وہی خدماتِ جلیلہ محترم مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ نے پوری صلاحیّت اور مجلسِ احرارِ اسلام کی وفاداری میں انجام دیں۔ نیز حضرت شاہ صاحب کی طرح خیبر سے لیکر کلکتہ تک آپ نے بھی برصغیر میں تبلیغی دورے کر کے حضرت شاہ صاحب مرحوم کی خلافت اور قائمقامی کا حق ادا کیا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، قاضی صاحب نے بھی ہند و پاکستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر اپنی جوانی اور صحت کی پرواہ کئے بغیر تبلیغ کا حق ادا کیا۔ گو حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا اُن کی حیات میں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے، ناموسِ رسولِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پاسبانی، تحفّظِ ختمِ نبوت اور صحابۂ کرامؓ کی عزّت پر قربان ہونے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتوں میں گذرا۔ مگر قاضی صاحب نے

بھی انہی مقاصد پر اپنی جوانی کا بہت سا حصّہ جیلوں کی نذر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح گذارا۔ میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دو بزرگانِ دین کی مجاہدانہ خدمات اور سعیِ آخرت کی مساعی کو قبول فرما کر اُن کو دارِ آخرت میں سُرخرو فرما کر جنّت الفردوس نصیب فرمائے۔ آمین! اور ان کے وارثین کو ان کے نقشِ قدم پر چل کر اُن بھولی بسری روایات کو تازہ رکھنے کی توفیق نصیب فرمائے اور حق گوئی کی نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازے۔ آمین۔

قاضی احسان احمدؒ کی خدماتِ جلیلہ

خطیبِ احرار مولانا قاضی احسان احمد مرحوم نے مجلسِ احرارِ اسلام میں شامل ہوتے ہی اپنی بھرپور جوانی کے جس دَور میں اپنی خدمات کا آغاز کیا، وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بعد مجلسِ احرار اسلام کے عروج کا دَور تھا۔ جبکہ صوبہ پنجاب میں سر ظفراللہ خاں قادیانی سر میاں فضل حسین مرحوم سابق وزیرِ تعلیم صوبہ پنجاب کا طوطی بولتا تھا، اور ان دونوں نے برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے لئے جنگی تیاریوں میں پوری دلچسپی لے کر برطانوی سامراج کو کامیاب کرنے کی سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۴ء کے آخری ایّام تھے اور ان دنوں انگریزی راج کی برقراری کے لئے یہ ہر دو اصحاب پنجاب میں سر سکندر کے ساتھ مل کر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے میں بظاہر مسلمانوں کے دلکش رہنما بنے ہوئے تھے اور برطانوی حکومت کی اس پالیسی میں پورے ممد و معاون تھے کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ اس وقت پنجاب میں ہندوؤں کی متکبرانہ حکمتِ عملی اور جبر و استبداد کے طریقِ کار سے دفاتر میں چونکہ مسلمان بڑے زخم خوردہ اور زبوں حالی اور ہندو گردی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس لئے سر میاں فضل حسین نے برطانوی حکومت کی وزارت میں مسلمانوں کی ہمدردی و حمایت میں ہر طرح خدمات انجام دے کر انہیں ہندوؤں کی ظالمانہ دستبرد اور دفاتر میں ایذا رسانی

سے بچانے کی بہتر تدابیر اختیار کیں اور مسلمانوں کو ملازمتوں میں ہر طرح آسائش مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا مجلس احرار اسلام کے اکابر نے بھی اس وقت احرار کانفرنس منعقدہ حبیبیہ ہال لاہور میں مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی صحیح حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے کانگرس کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف مخلوط انتخاب کی بجائے جداگانہ انتخاب کی قرارداد منظور کر کے نہرو رپورٹ کے زخموں کا اندمال کرتے ہوئے مسلمانوں کے تحفّظِ حقوق کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، اور جب اکالیوں نے پنجاب میں ۵۶ فیصد حقوق کے مطالبہ پر مسلمانوں کے خلاف خون کی ندیاں بہانے کی دھمکیاں دینی شروع کیں تو اکابر احرار بالخصوص حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمان افروز تقاریر میں اکالیوں کے نظریات کی دھجیاں بکھیریں۔ ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کی جگہ سر محمد شفیع مرحوم کی زیرِ قیادت آل انڈیا مسلم کانفرنس قائم ہو کر ۵۶ فیصد حقوق کے مطالبات کو دہرایا جا رہا تھا۔ تو پنجاب میں مجلس احرارِ اسلام کے راہنماؤں نے مسلمانوں کے ان مطالبات کی تائید میں اپنی مساعی تیز تر کر دی تھیں۔ ان دنوں احرار لیڈروں کی زیر قیادت قاضی احسان احمد مرحوم نے صوبہ پنجاب کے تمام اضلاع میں دورے کر کے اپنی پُرجوش تقاریر میں مجلس احرار اسلام کے مقاصد کو پورے طور پر تقویت پہنچائی۔ ان ایّام میں پنجاب میں سر فضل حسین کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا اور سر سکندر حیات اور سر ظفر اللہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات سے علیحدہ برطانوی حکومت کی خوشنودی کے لئے ۴۹ ½ فیصدی حقوق (پنجاب میں) مان کر مسلمانوں کی نظر میں معتوب ہو رہے تھے۔ ایسے حالات میں احرار راہنماؤں نے عامۃ المسلمین کے جذبات کا پورا احترام کرتے ہوئے اپنے پُرجوش اجتماعات کو انتہائی کامیاب بنایا۔ پھر ۱۹۳۵ء کے آغاز میں جب یہ سرگرمیاں بہت مضاعف ہو گئیں تو سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور سر ظفر اللہ نے ان سرگرمیوں کو بُرا منانے کا رنگ اختیار کیا۔ قضائے الٰہی سے مئی ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں زلزلہ کا عذاب

آیا۔ جس میں ۳۰ ہزار کے قریب آبادی تباہ و ہلاک ہوگئی، اور جب وہاں سے بلوچستان سے باہر کے باشندگان (جو کوئٹہ میں سالہا سال سے آباد تھے اور زلزلہ سے بچ گئے تھے) اس تباہی کے بعد اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہونے کے لئے صوبہ پنجاب کے ہر ضلع میں ریل سے گذرتے تو مجلس احرارِ اسلام کے زیرِ انتظام، ہر ریلوے سٹیشن پر اُن سے ہمدردی کرنے کے لئے کیمپ لگائے گئے تھے، جہاں احرار رضا کاران کے خورد و نوش اور آسائش کا انتظام کرتے تھے۔ انہی دنوں لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر باغ میں ایک، عظیم الشان کیمپ لگایا گیا تھا اور احرار لیڈران خود رات دن وقف رہ کر خدمات سرانجام دے رہے تھے اور پشاور تک تمام مرکزی مقامات پر مجلس احرار اسلام کے رضا کاران شبانہ روز ان خدمات میں مصروف تھے۔ اس لئے ان دنوں پنجاب اور صوبہ سرحد کے بچہ بچہ کی زبان پر "احرار زندہ باد" کے نعرے جاری تھے۔ احرار سرخپوش ہر جگہ گلی کوچوں میں زلزلہ زدگان کی خدمات سرانجام دے رہے تھے تو اس موقع پر قاضی احسان احمد مرحوم تمام پنجاب میں گھوم کر احرار کیمپوں کی سرپرستی فرما رہے تھے۔ ان دنوں پنجاب کے تمام اضلاع میں احرار کے جلسوں اور کانفرنسوں کی بھرمار جاری تھی۔ انہی دنوں ملتان میں باغ عام و خاص میں صوبہ احرار کانفرنس بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی جس میں صوبہ احرار کانفرنس کا استقبالیہ میر عبدالقیوم صاحب ایڈووکیٹ مرحوم لائل پور نے پڑھا، اور شیخ حسام الدین صاحب امرتسری مرحوم نے خطبۂ صدارت دیا۔ اس کے ساتھ رضا کارانِ احرار کانفرنس کا اجلاس زیرِ صدارت صاحبزادہ فیض الحسن منعقد ہوا۔ جس میں مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ ابھی مجلس احرار مرکزیہ کی یہ تمام سرگرمیاں جاری تھیں کہ بدقسمتی سے پنجاب میں سکھوں کی امن شکنی اور اسلام دشمنی نے ہولناک صورت اختیار کی، اور سکھوں نے لاہور میں مسجد شہید گنج کو شہید کر کے گردوارہ کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ جس نے اسلامیانِ برصغیر میں

ہیجانِ عظیم پیدا کر دیا اور پنجاب میں حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم کی زیر قیادت مجلس "اتحادِ ملت" کے نام سے ایک نئی جماعت نے تحریکِ شہید گنج شروع کر کے مسلمانوں کو جوش دلا کر نہ صرف مظاہروں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کر دیا بلکہ شہید گنج حاصل کرنے کے لئے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی۔ جس سے سینکڑوں مسلمان گولیوں کا نشانہ بن کر شہید ہوئے مجلس احرار اسلام کے راہنماؤں نے اس وقت اپنی صواب دید سے یہ رائے دی مسجد شہید گنج مظاہروں اور سول نافرمانی سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ عدالت میں قانونی چارہ جوئی کی آئینی تدابیر اختیار کرنے یا سکھوں سے سمجھوتہ کی صورت میں یہ گرہ بہ آسانی کھل سکتی ہے۔ مگر حالات نے ناگوار صورت اختیار کی، جس کے نتیجہ میں مجلسِ احرار کے راہنماؤں کے خلاف رائے عامہ یکسر بدل گئی، اور احرار لیڈر نہ صرف معتوب ہو کر رہ گئے، بلکہ احرار لیڈران کو ہر جگہ گالی گلوچ کا نشانہ بنایا گیا اور اُن پر عوام نے سب و شتم کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ان دنوں بڑی آزمائش میں احرار لیڈروں اور احرار ورکروں نے دن گذارے مگر اپنی اصابت رائے اور حق گوئی میں کوتاہی نہ کی۔ مرحوم قاضی احسان احمد صاحب نے بھی اُن دنوں اپنے راہنماؤں کی طرح اپنی جماعتی مدافعت میں نمایاں حصہ لیا۔ تاآنکہ پنجاب میں اسمبلی کے انتخابات شروع ہو گئے تو بڑی پریشانی کے باوجود جب احرار لیڈروں نے حلقہ دیہاتی "راہوں" ضلع جالندھر، حلقہ شہری لاہور ڈویژن، حلقہ شہری ملتان ڈویژن اور دیگر حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کئے تو ان کی حمایت کے لئے قاضی صاحب مرحوم نے ان حلقوں میں پورے جوش و خروش سے تقریری خدمات انجام دیں۔ جس سے تین چار حلقوں میں احرار امیدوار نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ ان میں سے مولانا مظہر علی صاحب اظہرؔ، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائلپور، چودھری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم راہوں ضلع جالندھر وغیرہ کا نام کامیاب اصحاب میں شمار ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کے دنوں میں جنگ میں برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کے خلاف تقاریر کے سلسلہ میں جب جمعیۃ علماء ہند کے

معزز راہنمایان اور لیڈرانِ احرار قید و بند میں چلے گئے تو قاضی صاحب مرحوم نے بھی ان دنوں اپنے جماعتی پروگرام کے مطابق قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس کے بعد انقلاب کا دور جب شروع ہو گیا، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سازش سے تقسیمِ ملک کے وقت تبادلۂ آبادی کی نوبت آئی اور تحریکِ قیامِ پاکستان کا سرگرم معرکہ شروع ہوا تو مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے قاضی صاحب نے تحریکِ پاکستان کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ پاکستان کی حمایت میں میاں ممتاز دولتانہ کے حلقۂ انتخاب میں جا کر کام بھی کیا، اور وہ آخر دم تک پھر پاکستان کے دردمند سپاہی بن کر رہے۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۲ء میں مرزائیت کے خلاف تحریکِ ختمِ نبوّت شروع ہوئی تو قاضی احسان احمد مرحوم نے اس میں مخلص رہنما اور مخلص جانباز کی حیثیت سے حکومت کے زیرِ عتاب قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اور جیل سے رہا ہونے کے بعد سے، اپنی موت تک پاکستان کے وفادار شہری کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ آہ! قاضی صاحب مرحوم اپنی دینی و سیاسی خدمات کی وجہ سے برصغیر ہند و پاکستان میں اس قدر مقبول تھے کہ جہاں کہیں کسی دینی ادارہ، مذہبی درس گاہ یا سیاسی جلسہ کا اشتہار دکھائی دیا، اس میں قاضی صاحب مرحوم بطور خطیبِ پاکستان، عندلیبِ چمنستان اسلام اور تحفظِ ختمِ نبوّت کے مجاہد کارکن کی حیثیت سے مدعو نظر آتے تھے۔ آپ نے ہر جگہ ختمِ نبوّت کے صدر کی حیثیت سے اپنے آخری اوقات تک اپنے فرائض بخوبی انجام دیئے اور اسی جذبۂ ایمانی میں بھرپور صورت میں آپ نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں آپ نہ پہنچے ہوں۔ مجھے ان کی مرض الموت سے پہلے ضلع ہزارہ میں حویلیاں کے مقام پر آخری تقریر کی اطلاع ملی۔ جب میرے بہت سے احباب بڑی بے چینی سے ہری پور، سرائے صالح وغیرہ سے ان کی تقریر سننے کے لئے حویلیاں جا رہے تھے، بندہ ان دنوں سرائے صالح میں قیام پذیر تھا مرحوم محمد سرور خاں ساکنہ باندی ضلع ہزارہ، والہانہ جذبہ سے ان کی تقریر سننے گئے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ اپنی بیماری سے قبل اپنے انگریز دشمنی کے جذبہ سے سرشار اور اس دور کے انگریز

کے پٹھوؤں اور برطانوی راج پر شیدا ہونے والے پیروں کی مذمت کرنے کے لئے میرے ہاں بڑی بے چینی سے گھر پر تشریف لائے اور میرے نام سے شائع شدہ ایک پُرانا پمفلٹ "پیرانِ عظام کا دُعا نامہ" یعنی ۱۹۱۹ء کی جنگ میں پنجاب کے مقتدر پیروں کی طرف سے پنجاب کے ظالم گورنر سر اوڈ وائر کی خدمت میں جو سپاسنامہ شائع ہوا تھا، اُس کی تلاش کرنے آئے۔ اُس سپاسنامہ میں اُن پیرانِ عظام نے برطانوی راج کو "ابرِ رحمت" سمجھ کر ترکانِ آلِ عثمان کے خلاف جنگِ عظیم میں برطانیہ کے خلاف لڑنے پر "اُن کی کوتاہ اندیشی" کا فتویٰ صادر فرمایا تھا۔ تمام کتب سے بھرپور الماریوں میں اس پمفلٹ کی تلاش میں ناکام ہو کر، انہوں نے مجلسِ احرارِ اسلام مرکزی کے رہنماؤں کے خطبہ ہائے صدارت اور کانفرنسوں کے اجلاسوں کی بہت سی کاپیاں حاصل کیں اور خاصہ لٹریچر اکٹھا کر کے لے گئے۔

گذشتہ سال ۱۹۷۸ء میں مجھے ۴۵ برس کے بعد اللہ کریم نے دوبارہ حج بیت اللہ الحرام کی سعادت نصیب فرمائی اور جب بندہ مسجدِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں ایک ماہ تک پنجگانہ نمازوں کی ادائیگی کی سعادت حاصل کر رہا تھا، تو ایک دن مجھے اپنے مخلص بزرگ حضرت مولانا شیخ عبدالغفار حسن صاحب استاذ ادب مدینہ یونیورسٹی نے واقعات کے تذکرہ میں یہ اہم ذکر فرمایا کہ جب مرحوم مولانا قاضی احسان احمد صاحب حج کرنے آئے اور مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی میں روضۂ اطہر سید الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے تشریف لائے تو حُسنِ اتفاق سے مفتی احمد یار خان گجراتی مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب مرحوم نے تفننِ طبع سے قاضی صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "قاضی صاحب! آپ یہاں کیونکر آ گئے ہیں۔ آپ کے ہاں تو شدِ رحال کی وجہ سے یہاں آنا ضروری نہیں"۔ تو حضرت قاضی احسان احمد صاحب مرحوم نے برجستہ جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "مفتی صاحب! ہماری تو انتہائی خوش قسمتی اور ازلی خوش نصیبی ہے کہ ہم حضور سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر درود و سلام پڑھنے میں اپنی نجات اور آخرت میں ——— اپنی سُرخروئی کا موجب

یقین رکھتے ہیں۔ یہ حضرات حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام و اتباع شریعت
میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ آپ کی محبت میں ہی نہیں بلکہ عقیدت کے چشمے سے سیراب ہو کر سیدنا حضرت محمد
کو پیش نظر رکھ کر سوادِ اعظم کے مسلک حق پر گامزن ہیں۔

حضرت قاضی صاحب مرحوم کی ساری عمر تبلیغ پر صرف ہوئی۔ اسی حالت میں مرحوم مغفور ہو کر
رہ گئے۔ غفر اللہ لہٗ و جعل الجنۃ مثواہٗ۔

گزشتہ رات بندہ نے رات کے وقت خواب میں جامع مسجد میں ایک عجیب
نقشہ دیکھا جس میں حضرت قاضی صاحب مرحوم کے ساتھ نمازیوں کی دینی درسگاہ
یاد دہانی کا اہتمام کرتے دکھائی دیتے۔ عزیز محترم قاری صاحب بندہ کو یاد سے تاکید
عہد پر گامزن ساتھیوں میں سے ایک ہیں۔ شہداء کی نماز جنازہ کے موقع پر ملاقات
ہوئی ان کی ترغیب پر بندہ نے یہ خامہ فرسائی کرتے ہوئے قاضی صاحب مرحوم کی
سوانح حیات پر اپنے مشاہدات اور اپنی رفاقت کے کچھ تأثرات لکھ دیئے ہیں۔ ورنہ قاضی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اپنی خدمات کے لحاظ سے اس قدر وسعت پذیر ہے کہ بندہ اپنی ضعیفی اور
حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے زیادہ خامہ فرسائی نہیں کر سکتا۔ آخر میں میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اُن کی خدمات جلیلہ کو قبول فرما کر قیامت کے دن اُن کے نامۂ اعمال میں ان کی نیکیوں کو محفوظ
نقوش بنا کر اُن کو مغفور و محمود بنا کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے۔ آمین۔

قاضی صاحبؒ کی شگفتہ مزاجی

— ذاتی تاثرات —

از — حافظ قاری فیوض الرحمٰن صاحب، ہیڈ شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

14.5.72 محترم المقام جناب قاری صاحب

سلام مسنون۔ حسب الارشاد حضرت قاضی صاحبؒ کے بارے میں چند باتیں ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اسے شامل فرما لیجئے۔

غالباً ۶۳-۱۹۶۲ء میں مرکزی جامع مسجد حویلیاں سٹیشن میں ہم نے جلسۂ سیرت النبیؐ کے لئے آپ کو دعوت دی۔ آپ نے وعدہ فرما لیا۔ نماز عشاء کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ لیکن حضرت قاضی صاحبؒ ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ راقم نے لوگوں کو بہلانے کے لئے تقریر شروع کر دی۔ اتنے میں آپ گاڑی کے ذریعہ تشریف لے آئے اور ساتھ والے مکان میں بیٹھے کہیں تقریر سنتے رہے۔ جب مسجد میں پہنچے تو ہماری خوشی کی حد نہ رہی۔ لوگ دُور دُور سے آپ کی تقریر سننے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ حضرت قاضی صاحب نے "سیرت الرسولؐ" کے مقدس موضوع پر ایسا بصیرت آموز خطاب فرمایا کہ لوگوں کو علمائے حق اور علمائے دیوبند سے پوری عقیدت ہو گئی۔ تقریر کے بعد مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔ "چھپے رستم ہو، ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی"۔ میں نے کہا کہ حضرت مجھے سخت تشویش تھی کہ کیا بنے گا۔ لوگ آپ کو سننے کے لئے آئے بیٹھے ہیں۔ آپ کے آنے تک انہیں بہلاتا رہا۔ اور ساتھ ہی یہ ڈر تھا کہ اگر آپ تشریف نہ لائے تو عوام میں سخت رسوائی ہو گی۔ مجھے سینے سے لگا کر فرمایا "میرے عزیز! جو لوگ اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت انجام دیتے ہیں، اللہ انہیں کبھی رسوا نہیں کرتا"

ہمارے ایک مخلص کارکن بھائی مہاب الدین خاں صاحب سے فرمایا کہ "مہاب الدین نیچے ہو کر میری بات سنیں، یا ہمارے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ اگر رکھنا ہے تو پھر داڑھی رکھ لیں۔ یا میری داڑھی مونڈھ دیں"۔ کچھ اس انداز سے فرمایا کہ بھائی مہاب الدین صاحب تڑپ کر رہ گئے۔

نفاستِ طبع مسجد کے ساتھ ہی بھائی مہاب الدین صاحب کے گھر کی گلی ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے فرمانے لگے کہ انگریز بدبخت کو پتہ نہیں تھا کہ قاضی کیسے مرے گا۔ اگر اُسے پتہ ہوتا تو وہ مجھے کبھی جیل نہ بھیجواتا، بلکہ گندی گلیوں میں سے گزار دیتا۔ میری موت کے لئے یہی کافی تھا۔

۱۹۶۴ء میں آپ کو باغ جناح ایبٹ آباد میں جلسۂ سیرت کو خطاب کرنا تھا۔ آپ تشریف لائے۔ میں اپنے بعض پروفیسر صاحبان کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔ وہ کھڑے آپ کی تقریر سنتے رہے۔ بعد میں انہوں نے یہ گواہی دی کہ "واقعی قاضی صاحب، ایک عظیم خطیب ہیں"۔

جلسہ کے بعد مصافحوں اور معانقوں کا دور شروع ہوا۔ آپ ساتھ ساتھ فرما رہے تھے یہ بے وفا کہاں سے آگئے ہیں، یہ بے وفا کہاں سے آگئے ہیں؟ میں دُور کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، اس فقرہ پر دُور ہی سے یہ کہہ دیا کہ "جناب اہلِ وفا اس طرف کھڑے ہیں"۔ فرمانے لگے "اہلِ وفا؟ ایسے بے وفا تو زمانہ میں کہیں نہ ہوں گے"۔ ان کے بے وفا کہنے میں بھی لطف آتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۵ء میں آپ دوبارہ اس طرف تشریف لائے۔ ایبٹ آباد کے علاوہ آپ نے "نواں شہر" کی ایک مسجد میں خطاب فرمایا۔ بعد میں ملاقات ہوئی تو بہت شفقت فرمائی۔ رات اکٹھے ہی حاجی منصف خاں صاحب کی کوٹھی پر رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور بھی احباب تھے۔ نہایت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ "اب تو آجاؤ" اور یہ ذمہ داری سنبھالو۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں اور اس قابل نہیں رہے۔ مجھ پر آپ کے اس ارشاد کا ایسا اثر ہوا کہ میں نے دل ہی دل میں چند دنوں کے لئے شجاع آباد آپ کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ عرض کیا کہ حضرت مجھے ساتھ رکھ لیں اور مجھے سکھائیں۔ جب

آپ سے کچھ سیکھ لوں گا تو پھر عمل بھی کروں گا۔ فرمانے لگے، آپ کو شجاع آباد آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ بے دھڑک لوٹ جائیے البتہ ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب اور فوائد عثمانیؒ کا مطالعہ جاری رکھیں۔ مولانا بدر عالم صاحبؒ مدنی کی کتاب "ترجمان السّنۃ" کا مطالعہ نہ بھولیں۔ چوہدری افضل حق کی کتابیں بھی پڑھتے رہا کریں۔ میں نے یہ تمام کتابیں خریدلیں اور مطالعہ شروع کردیا۔

جاتے ہوئے ایبٹ آباد کے اڈہ پر ملاقات ہوگئی۔ معانقہ کرتے ہوئے فرمایا "میرا بابو کب تک کالج پڑھتا رہے گا"۔

واپسی پر جامع مسجد صدر ایبٹ آباد میں آپ نے تقریر فرمائی۔ کھانے پر ملاقات ہوئی۔ حضرت قاضی صاحب کے پاس حلوے کا ڈونگہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں سے بڑے بڑے نوالے خود اپنے ہاتھ سے اُٹھا اُٹھا کر احباب کے منہ میں خود ڈالتے جاتے تھے۔ دوسروں پر میں بہت ہنستا رہا، اتنے میں میری باری آگئی۔ قاضی صاحبؒ نے ایک بڑا سا نوالہ لیا اور میرے منہ میں ڈالنا چاہا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! حلق میں پھنس جائے گا اور اگر میں اس سلسلہ میں کام آگیا تو اخبار والے بھائی خوب سُرخی جمائیں گے "حلوے کے شہید" اس پر فرمایا "اس طرح آپ کی جان کسی صورت نہیں بچ سکتی، یہ تو ضرور آپ کے منہ میں ڈالوں گا"۔ البتہ اتنا کرم فرمایا کہ مقدار پہلے کی نسبت کچھ کم کردی۔ نیز فرمایا "گھبرائیے نہیں، پوری تاریخ گواہ ہے کہ حلوہ کسی کو کبھی حلق میں پھنسا ہے، نہ اس سے کوئی موت واقع ہوئی ہے۔ تسلّی رکھیئے"۔ وہ لقمہ اُٹھایا اور میرے منہ میں ڈال دیا۔ اسی طرح کھانا کھاتے ہوئے اچھی اچھی بوٹیاں دوسروں کے منہ میں ڈال دیتے۔ فرماتے تھے کہ اہلِ عرب ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور اُن کی یہ عادت مجھے بہت پسند آئی ہے، اسی لئے اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ حضرت درخواستی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

غالباً ۱۹۶۵ء کے اوائل کی بات ہے کہ مولانا شفیق الرحمٰن صاحب نے مجھے فرمایا

کہ حضرت قاضی صاحبؒ سے ایبٹ آباد کی تقریر کا وقت لے لیجئے۔ قاضی صاحبؒ کو مولانا عبدالطیف صاحب جہلمی کے سالانہ جلسہ پر تقریر کرنا تھی۔ مولانا موصوف نے رفیقِ محترم قاری عبدالمجید صاحب کو میرے ساتھ کر دیا۔ اسی جلسہ سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی دامت برکاتہم نے بھی خطاب فرمایا۔ غالباً ان کے بعد آپ کی تقریر ہوئی۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ آپ بھی خوب بولے۔ نعروں پر نعرے، داد پہ داد اور تحسین پہ تحسین کا سلسلہ دورانِ تقریر مسلسل جاری رہا۔ رات تو تقریریں سُننے گذری۔ صبح ناشتے پر تفصیلی گفتگو کا موقع ملا۔ مَیں نے ایبٹ آباد کے لئے آپ کو دعوت دی۔ بار بار یہی فرما رہے تھے کہ ایبٹ آباد والے ایسے ہیں، ایبٹ آباد والے ایسے ہیں؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ حضرت! آپ اتنے شکی المزاج کب سے ہوگئے ہیں؟ برجستہ فرمایا کہ "میری جان! جب سے آپ سے واسطہ پڑا ہے۔ اس جواب پر پوری مجلس کشتِ زعفران بن گئی۔ آپ چھری سے کیک کاٹ رہے تھے۔ مَیں نے قاری عبدالمجید صاحب سے کہا کہ آیئے چلیں۔ حضرت قاضی صاحب بھی حیران ہوگئے۔ فرمانے لگے کیوں؟ مَیں نے قاری صاحب سے کہا کہ چھُری والوں سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے، انہیں تو کاٹنے سے غرض ہے۔ فرمایا کہ "میری جان اور کہہ لیجئے، لیکن آپ ہی کے لئے تو کاٹ رہا ہوں"۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب کو حویلیاں سے گذرنا تھا۔ ہم منتظر تھے۔ اتنے میں آپ تشریف لے آئے۔ میں نے کہا کہ کب سے آپ کا مُنتظِر ہوں۔ فرمایا مُنتظِر یا مُنتظَر۔ میں نے کہا کہ منتظِر بالکسر، فرمانے لگے، مُنتظَر بالفتحہ۔ بات سے بات پیدا کرنا اُن کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ کسی سنگترے بیچنے والے نے کہا، اچھّے سنگترے، اچھّے سنگترے۔ تو اس پر پوری تقریر کر دی۔ "اچھّے سَنگ ترے"۔ اچھّی رفاقت و دوستی نجات کا سبب ہوتی ہے۔

مولانا محمد اکرم صاحب مرحوم سابق ناظم جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان، سلطان فونڈری لاہور والوں کے بھتیجے محمد عارف صاحب کی شادی میں شرکت کے لئے، بی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور، حضرت قاضی صاحبؒ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہاں ملاقات ہوئی۔ میں اپنی نشست سے اُٹھا تو جیبی رومال وہیں رہ گیا۔ واپس آیا تو حضرت قاضی صاحبؒ سے پوچھا۔ فرمانے لگے، رُومال کہ سرِمال۔ سر نیچے کر کے فرمانے لگے، کہ "سرِمال بھی حاضر ہے"۔

آپ اکثر یہی گِلہ کرتے تھے کہ خط نہیں لکھتے۔ میری بدقسمتی کہ تساہل ہو جاتا رہا۔ ایک مرتبہ، رات کے وقت خط لکھا اور آئندہ صبح سپردِ ڈاک کرنے کے لئے رکھ دیا۔ صبح اخبار پر نظر پڑی تو آپ کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل کو ایک سخت دھچکا لگا۔ فوراً زبان پر وُہ آیت آگئی، جو ایسے موقعوں پر آیا کرتی ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

پیغام

نحمدہ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم۔ بندہ، قاضی احسان احمد صاحب
مرحوم و مغفور کو اس زمانہ سے دیکھتا رہا جب اُن کا عہدِ جوانی یدطولانی رکھتا تھا منظر دلکش،
مسکراہٹ دلفریب، چہرہ دیدہ زیب، بیان آتش آلود اور سیرت رشک آفرین تھی!
یہ بات بلا مبالغہ ہے کہ آں مرحوم، امیرِ شریعت کی زندگی کے بہتر رفیق اور ان کے بعد الممات،
صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ قافلۂ احرار کے بہادر سالار اور مجلس تحفظِ ختمِ نبوۃ کے سرتاج، کاش کسی
قلم نے اُن کے کلمات کو ذخیرۂ اوراق کیا ہوتا۔ بسیار دینی اور مفلس ادارے تھے، جن کو حضرت
خطیبِ پاکستان مرحوم کی ایک جنبشِ بیان نے غنی کر دیا، افسوس اس یادگارِ سلف،
بیوہ پرور، یتیم نواز شخص کے پیچھے کوئی ایسا ہوتا جو یہ کہتا "میں اس مرحوم کا بیٹا ہوں"۔

افسوس کہ گل رُخان کفن پوش شدند — وز خاطرِ یکدگر فراموش شدند
آنان کہ بعد زمان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

یادش بخیر! اللہ تعالیٰ اس مرحوم کی زندگی کی خطائیں معاف فرمادیں۔ اور پس ماندگان
کو صحیح یادگار بنائیں۔ عزیز مخلص محترم قاری نور الحق زید مجدہ کی مساعی ممدوحہ کو اللہ تعالیٰ
قبول فرمادے۔ موصوف، مرحوم کے بعد آپ کی صحیح جانشینی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

عبدالعزیز عفی عنہ
مہتمم مدرسہ عزیز العلوم۔ شجاع آباد
۲۴ صفر ۱۳۹۲ھ

مولانا فاضل حبیب اللہ، جامعہ رشیدیہ کا مکتوب گرامی بنام نورالحق

مدرسہ جامعہ رشیدیہ (رجسٹرڈ) ساہی وال

۱۰ صفرالمصفر ۱۳۸۹ھ

28/4

حضرۃ المحترم زید احسانکم السامی

سلام مسنون، نیاز

والانامہ شرفِ صدور لایا۔ مافیہا سے مطلع ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ!

محسنِ اعظم حضرت قاضی صاحب مرحوم و مغفور نے اپنی حیات میں آخری مفصّل تقریر مسئلہ جہاد کے عنوان پر، مارچ کے اواخر میں، جامعہ رشیدیہ کے سالانہ اجلاس کی آخری شبانہ نشست میں دو گھنٹے مسلسل فرمائی تھی ......

موضوع انوکھا اور بیان عجیب تھا۔ مسئلہ جہاد بیان فرماتے ہوئے "ختم نبوۃ" کا جوڑ یوں لگایا کہ "اسلام کے بنیادی عقائد میں ہر قسم کی نبوت ختم اور بند ...... مگر ہر قسم کا جہاد تا قیامت جاری و ساری"! بار بار فرماتے اور عوام سے کہلواتے کہ:۔

ہمارا عقیدہ ہے ——— نبوۃ بند اور جہاد جاری ......

اُن کا عقیدہ ہے ——— جہاد حرام اور نبوۃ جاری ......

اسلام کا نظریہ ——— "جہاد جاری نبوۃ ختم"

غیر اسلام کا عقیدہ ——— "نبوۃ جاری اور جہاد ختم"

اسلام و کفر کا اعتقادی فرق خوب کھول کر، وضاحت سے بیان فرمایا۔

اس پر یہ شعر پڑھا ؎

اب چھوڑ دو اے دوستو جہاد کا خیال

دین میں حرام ہے اب جنگ اور قتال — درثمین

ایک گھنٹہ تقریر کی تھی، درمیان میں عارضہ قلب کا دورہ پڑ گیا..... بیٹھ گئے۔ پانی پیا۔ پھر بیٹھ کر تقریر پوری فرمائی۔ ایک دو رفقاء نے ریکارڈ بھی کی تھی، مگر افسوس کہ اب دستیاب نہیں...... اور ریکارڈ ٹوٹ گیا۔

جامعہ سے "علیل" شجاع آباد تشریف لے گئے۔

اس کے بعد لاہور کسی ایک تقریب پر صرف چند منٹ خطاب فرمایا تھا۔ خادم راقم وصال سے ایک ہفتہ عشرہ قبل شجاع آباد حاضر ہوا تھا تو باوجودیکہ ڈاکٹروں نے ملاقات پر پابندی کر دی تھی۔ جب میرا نام معلوم ہوا تو اندر بلا لیا اور حاضری کے وقت حسبِ اخلاق میرے ماتھے کو چوما۔ اور علامہ طالوت کا یہ شعر پڑھا ؎

مجھ کو حبیب کیوں نہ ہو میرے حبیب کا حبیب
حاصلِ حبِّ دین ہے، جامعہ رشیدیہ

اور فرمایا کہ آخری تقریر جامعہ کے اجتماع پر ہوئی تھی، اس کے بعد "تمہارا بیمار" چلا آ رہا ہوں۔

آہ! باتیں ان کی یاد رہیں گی۔

احسان مند
فاضل حبیب عفی عنہ

قاضی صاحبؒ کے احباب

اگر قاضی صاحب کے احباب کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک الگ کتاب کی ضرورت محسوس ہو گی۔ جماعتی احباب سے قطع نظر اُن کے رفقاء ملک کے ہر حصّہ اور ہر طبقہ سے متعلق تھے۔ وہ ہر ایک کے دوست تھے اور ہر شخص اُنہیں دوسروں کی نسبت عزیز تر سمجھتا تھا علاوہ ازیں ان کے بیٹوں، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کی تعداد بے شمار ہے۔ مگر بایں ہمہ بعض حضرات سے اُن کے خصوصی مراسم تھے۔ بعض احباب مشکلات و آلام میں ان کے کام آئے، اور مرحوم عمر بھر ہر جگہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ دوست نواز تھے اور دوستوں کی خاطر بقدرِ وسعت کر گزرنے کے عادی تھے۔

قاضی صاحب کے احباب میں اوّل درجہ جماعتی احباب کا آتا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ قاضی صاحب نے زندگی کا بڑا حصّہ گزارا، مَیں نے ان کی زبان سے کلمۂ خیر کے علاوہ کچھ نہیں سُنا۔ اپنے اکابر کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔ حضرت شاہ جیؒ کا تو ذکر ہی کیا۔ انہیں اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بڑے ادب سے کیا کرتے تھے۔ چودھری افضل حقؒ، شیخ حسام الدینؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ، مولانا گلشیرؒ مولانا محمد علی جالندھریؒ، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا غلام غوث ہزاروی، صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ آلو مہار شریف، آغا شورش کاشمیری، مرزا غلام نبی جانباز، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد حیات، مولانا تاج محمود اور دیگر حضرات و اکابر کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے۔ بعض اوقات اگر جماعتی احباب میں کوئی اختلاف رونما ہو جاتا تو ان کی ازحد کوشش ہوتی کہ رنجشیں اور غلط فہمیاں دور کرائیں۔ ایک موقع پر مولانا جالندھری مرحوم اور جناب

آغا شورش کے مابین اختلافات رونما ہوئے تو انہوں نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر کے جھگڑے کی شدت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

جماعتی احباب کے علاوہ ان کے احباب کی فہرست میں اعلیٰ سرکاری افسر، کاروباری لوگ، فیکٹریوں اور کارخانوں کے مالک، انگریزی و عربی مدارس کے طلبہ، شعراء و صحافی، امیر و غریب سب شامل ہیں۔ سب سے زیادہ جن لوگوں نے قاضی صاحب کی خدمت کا شرف حاصل کیا وہ مالکان سلطان فونڈری بادامی باغ جناب صوفی محمد اسلم مرحوم، مولانا محمد اکرم مرحوم تھے نیز ان کے بھائی جناب حاجی محمد افضل اور حافظ محمد اشرف بھی شامل ہیں۔

قاضی صاحب جب لاہور آتے تو ان کا اکثر قیام سلطان فونڈری میں ہوتا۔ مالکان فونڈری کی کار، فون وغیرہ ان کے لئے ریزرو ہوتا تھا۔ ہر بھائی دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آپ کی خدمت کو سعادت سمجھتا تھا۔ تحریکِ ختمِ نبوت کی جب لاہور میں انکوائری ہو رہی تھی، آپ نے جماعت کی طرف سے تحقیقاتی عدالت میں بھرپور حصہ لیا، ان کا قیام فونڈری میں تھا۔ ہر صبح آپ نئی اچکن پہن کر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتے، اور سارا دن کار باہر کھڑی رہتی۔ چونکہ مالکان فونڈری ڈیل ڈول میں آپ ہی کی طرح تھے اس لئے ہر بھائی کی اچکن آپ کو فٹ آتی۔ فونڈری میں دورانِ قیام آپ اپنی پسند کا کھانا پکواتے تھے۔

بیماری کے ایام میں مالکان فونڈری نے قاضی صاحب کی بھرپور خدمت کی۔ لاہور کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور حکیم فونڈری میں آکر آپ کا علاج کرتا تھا۔ قیمتی سے قیمتی دوائی منگوائی جاتی۔ ملک امیر محمد خاں مرحوم سابق گورنر مغربی پاکستان نے بارہا اپنی خدمات پیش کیں، مگر آپ کا یہی جواب ہوتا کہ مجھے فونڈری میں ہر چیز میسر ہے۔ آپ کی وفات کے بعد مولانا محمد اکرم صاحب مرحوم نے زندگی بھر اہلِ خانہ کی خاموشی سے خدمت کی۔ راقم الحروف دورانِ تعلیم مولانا کے گھر کافی عرصہ مقیم رہا۔ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بڑی بے تکلفی اور

شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ "چور" کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ مولانا مرحوم رات کے دو ۲ بجے گھر میں "چور" کی تلاش کرتے رہے، حالانکہ "چور" ان کے گھر کا ایک فرد تھا۔ میری بہت سی سہانی یادیں ان سے وابستہ ہیں، فرصت ملنے پر قلمبند کروں گا۔ مولانا محمد اکرم اور اُن کے بڑے بھائی صوفی محمد اسلم صاحب وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ آمین۔

قاسمی جیولرز ملتان روڈ کے حاجی محمد شفیع صاحب سے گھریلو حد تک مراسم تھے۔ ان کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ اسی طرح حاجی عبداللطیف، جناب حاجی محمد یار، اور حاجی محمد اسلام صاحب، حیدر آباد والوں سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

ملتان، میں آپ کے احباب میں خواجہ عبدالقدوس، محمد افضل صاحب زرگر، محمدؐ اقبال صاحب "پرنس کلاتھ ہاؤس کے محمود صاحب، اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز کے مالکان، اندھی کھوئی کے "شیخ عبدالحمید، حاجی شوکت علی وغیرہ شامل ہیں۔

ٹوبہ ٹیک، سنگھ کے فیض احمد صاحب سے مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ ایامِ بیماری میں فیض صاحب نے بہت خدمت کی، اور آج تک ان کے رویّہ میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اہلِ خانہ کو تسلّی وصبر کی تلقین میں فیض صاحب کا بڑا حصّہ ہے۔ ہر عید پر مبارکباد دینے باقاعدگی سے شجاع آباد آتے ہیں، مولانا محمد اشرف، مصاحب کی حیثیت سے ان کے شریکِ سفر ہوتے ہیں۔

حافظ آباد کے چوہدری محمد شفیع، چوہدری محمد یوسف صاحبان سے قاضی صاحب بہت محبّت فرماتے تھے۔ شادی بیاہ میں بطور خاص شرکت کرتے تھے۔ اس شریف گھرانے کے اہلِ خانہ سے تعلقات بدستور موجود ہیں۔

سکھّر کے حاجی محمد شفیع صاحب، این۔ اے مختار والوں سے آپ کے مراسم بھائی چارگی

کی حد تک تھے۔ایک دوسرے سے نجی اور گھریلو معاملات میں بھی مشورے ہوا کرتے تھے۔
حاجی صاحب مہینہ میں ایک آدھ خط مرحوم بھائی کی بچیوں کو لکھ دیا کرتے ہیں۔
شکارپور کے حکیم عبدالستّار اور ان کے لڑکے منظور چنہ پر بڑی شفقت کیا کرتے تھے۔
کوئٹہ کے منظور احمد مالک مغل ریڈیو سروس اور ان کی اہلیہ قاضی صاحب کے فدائی ہیں۔انہیں "ابا" کہا کرتے تھے۔گرمیوں میں آپ کا قیام انہیں کے ہاں ہوتا تھا۔بھائی منظور کو اگر کوئی مشکل پیش آئی تو آپ آبدیدہ ہوگئے۔اُسے خوشی پہنچی تو آپ فرحت سے کھِل اُٹھے۔

کراچی کے حاجی لال حسین قریشی سے قاضی صاحب کے تعلقات دو بھائیوں کے تعلقات تھے۔ان کے بچے مشتاق اور اشتیاق، قاضی صاحب کو ماموں کہا کرتے تھے۔کراچی میں انہیں کے ہاں قیام ہوتا تھا۔حاجی صاحب اور ان کی اہلیہ قاضی صاحب کو یاد کرکے آج بھی روتے ہیں۔
خیرپور ٹامیوالی کے سیّد عبدالسّتار شاہ ہمدانی، قاضی صاحب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ویسے خیرپور کے سارے سادات کا قاضی صاحب احترام کرتے تھے۔جناب عباس علی شاہ، منظور الحسن شاہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن شاہ اور محمد طیّب شاہ سے گہرا تعلق تھا۔عبدالستار شاہ نے اپنے تاثرات قلمبند بھی کئے ہیں جنہیں شریکِ اشاعت کرلیا گیا ہے۔
بھکّر کے حافظ نور محمد طاہر، قاضی صاحب کے نرالے فدائی ہیں۔آپ کا نام زبان پر آتے ہی اس نوجوان کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔
پکّا لاڑاں (بہاولپور) کے ریاست علی، قاضی صاحب کی وفات کے بعد آج تک اپنی بہنوں کو باقاعدہ عیدی بھیج کر مرحوم کی یاد دل میں بسائے ہوئے ہیں۔
بوریوالہ کے مولانا عبدالرحیم مدرسہ اسلامیہ، محمد حنیف صاحب صرّاف اور ان کے لڑکے میاں محمد شریف صابر ایڈووکیٹ کو دل سے چاہتے تھے۔بہاول پور کے سیّد عبدالرشید شاہ اور حافظ سیف سے انہیں محبت تھی۔

دھنیسر پائیں (گوجرانوالہ) کے چوہدری امانت علی پر آپ کی خصوصی شفقت تھی۔
فقیر والی کے مولانا فضل احمد اور مولانا ولی محمد صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلانے کے لئے یہ شعر لکھا ؎

اُن کی خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا   اور مری شومیٔ قسمت کہ ایفا نہ ہوا

شجاع آباد میں آپ کی ایک "کابینہ" تھی جو ہمہ وقت آپ کے پاس رہتی کسی کے ذمہ سفر کا انتظام کرنا تھا۔ کسی کے فرائض میں آپ کی والدہ ماجدہ کی خدمت شامل تھی۔ کوئی مہمانوں کے قیام و طعام کا ذمہ دار تھا اور کسی کے سپرد "پاؤں دبانے" کا محکمہ تھا۔ ان میں شیخ عبدالمجید، محمد یسین صدیقی، چوہدری محمد افضل علوی، محمد شفیع مولانا امید علی امام شاہی جامع مسجد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی "کابینہ" کے ساتھ ہر وقت خوش رہتے تھے۔ آپ اگر گھر پر ہیں تو کبھی کھانا گھر بیٹھ کر نہیں کھایا بلکہ دوستوں کی معیت میں تناول کیا۔ کسی کے منہ میں روٹی کا بڑا لقمہ، بوٹیوں سمیت ڈال رہے ہیں کسی کے منہ میں انگوروں کا گچھا ٹھونس رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں پر کبھی اپنی عظمت، بڑائی یا پارسائی کا رعب نہیں ڈالا۔ سردیوں میں شکار اور گرمیوں میں نہر پر آم کھانے کی روایات تازیست زندہ رکھیں۔ شاہی مسجد کے موذن عبدالمجید کو کالے رنگ کی نسبت سے اپنا "بلال" کہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی، جو نہ صرف شجاع آباد بلکہ ملک کی قابلِ قدر علمی اور برگزیدہ شخصیت ہیں ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسی طرح، مولانا عبدالعزیز صاحب مہتمم مدرسہ عزیز العلوم کی علمیت کے بہت معترف تھے۔ انہیں مدرسہ کے لئے اراضی، قاضی صاحب نے افسران سے مل کر دلائی۔

مقامی زمینداروں میں رانا تاج احمد نون ممبر قومی اسمبلی، رانا غوث بخش، رانا ریاض حسین اور محمود خاں ملکسی کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ حاجی خادم حسین ٹھیکیدار سے مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ کو بیٹی کہا کرتے تھے، جن سے اہلِ خانہ کے مراسم

قائم ہیں۔ موضع جھنگی والا میں چونکہ ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اس لئے وہاں کے ہر شخص کی عزت کرتے تھے۔ احباب کے زمرہ میں ملک رحیم بخش کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ میاں نور محمد ارائیں، صوفی اللہ وسایا کرم علی والا اور حافظ احمد بخش کو اپنا بھائی اور بیٹا کہا کرتے تھے۔ حافظ احمد بخش نے ایامِ بیماری میں آپ کی بڑی خدمت کی۔

شجاع آباد شہر میں ہر ایک سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ ان کے نزدیک مقامی و مہاجر کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ شہر کے معززین سے ملتے وقت حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ حاجی حافظ غلام لیسین، حاجی اللہ دتہ، ڈاکٹر محمد ادریس، ڈاکٹر محمد اظہر، عبدالوحید قریشی، شہاب الدین سبزی فروش، عزیز احمد سابق حوالدار، ڈاکٹر قادر بخش، محبوب الٰہی اور ان کے بیٹے مشتاق احمد، بودلہ صاحبان میں پیر کفایت اللہ، قاری نظام الدین، منشی محمد بخش مرحوم اور میاں خان محمد محرر چنگی سے دوستانہ تعلقات تھے۔

قاضی صاحب اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آتے۔ غریب رشتہ داروں کی خاص طور پر مالی امداد کرتے تھے۔ اپنی حقیقی ہمشیرہ جو بہاولپور بیاہی ہوئی ہیں کی آخر وقت تک مالی امداد کرتے رہے۔ انکی خواہش تھی کہ ان کے بھانجے شہزادہ شبیر احمد اور بشیر احمد اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ اپنے رشتہ داروں میں مولانا قاضی عظیم الدین، محمد افضل سابق مجسٹریٹ، بھائی تاج، مولانا قاضی محمود الحسن، قاضی بشیر احمد، عبدالحمید، عبدالرشید، قاضی عبدالعزیز کا احترام کرتے تھے۔

شجاع آباد میں اپنی نسبتی ہمشیرہ، ان کے لڑکوں ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر محمد اظہر سے مشفقانہ نوک جھونک رہتی تھی۔ اورنگ زیب صاحب ایڈووکیٹ نے ایامِ بیماری میں بڑی خدمت کی حافظ محمد اسعد سعدی سے محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنے برادرانِ نسبتی قاضی حبیب اللہ، قاضی عبدالغنی اور قاضی عبدالعزیز سے خصوصی انس تھا۔ قاضی عبدالعزیز سے گھریلو معاملات میں مشورے لیتے۔ میری اہلیہ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ طاہرہ! قاضی عبدالعزیز کی بیٹی ہے۔ قاضی عبدالعزیز کو قدرت نے ایک دردمند دل عطا کیا ہے۔ معاملہ فہمی اور ادراک و شعور کی دولت

سے مالامال ہیں۔ قاضی صاحب کی وفات کے بعد بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے اپنی بہن اور بھانجیوں کا غم غلط کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہن اور بھانجیوں پر قاضی عبدالعزیز کا سایہ ایک باپ کا سایہ ہے۔ خدا یہ سایہ تا دیر قائم رکھے۔ آمین۔ اسی طرح اپنے داماد خان محمد علی خاں، بی۔ اے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کے والد خان خدا بخش خاں کو انتہائی مخلص انسان سمجھتے تھے۔ یہ ان کے خلوص ہی کی بات تھی کہ آپ اپنی دختر عزیزہ عابدہ بتول جسے آپ بادشاہ بیٹی کہا کرتے تھے، کا نکاح محمد علی خاں سے کر دینے پر راضی ہو گئے۔

قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ دینی مدارس کو دین کا قلعہ خیال کرتے تھے۔ بہت سے دینی مدارس آپ کے تعاون سے چلتے تھے۔ ان کے سالانہ جلسوں اور کانفرنسوں میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ملتان کے مدرسہ قاسم العلوم، خیر المدارس اور تعلیم الابرار، فقیر والی کے مدرسہ قاسم العلوم، خان پور کے مدرسہ مخزن العلوم، مظفر گڑھ کے مدرسہ احیاء العلوم، ساہیوال کے مدرسہ جامعہ رشیدیہ، کوٹ ادو کے مدرسہ مظاہر العلوم، ڈیرہ غازیخان کے مدرسہ قاسم العلوم، بھکر کے مدرسہ دار الہدیٰ، ڈیرہ اسماعیل خان کے مدرسہ عربیہ نعمانیہ، کلاچی کے مدرسہ نجم المدارس، کہروڑ پکا کے مدرسہ جامعہ حنفیہ تعلیم القرآن والحدیث، سرگودھا کے مدرسہ سراج العلوم، لاہور کے مدرسہ جامعہ مدنیہ، راولپنڈی کے مدرسہ فرقانیہ، کرتار پور اور راجہ بازار کے مدرسہ تعلیم القرآن، پشاور کے مدرسہ اشرف العلوم، کانفرنسوں میں چنیوٹ اور پنڈی بھٹیاں کانفرنس میں بطور خاص شرکت کرتے تھے۔ وفات والے سال میں تین مدارس یعنی مولانا ابو الحسن قاسمی کے مدرسہ تعلیم الابرار، مولانا فاضل حبیب اللہ کے مدرسہ جامعہ رشیدیہ اور لاہور کے جامعہ حمیدیہ مغلپورہ میں تقریریں فرمائیں۔

حضرت مولانا السید گل بادشاہ صاحب امیر جمعیۃ صوبہ سرحد اور حضرت مولانا سید مبارک شاہ صاحب سیکرٹری صوبہ سرحد کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ۵۸ء میں سوات میں موسمِ گرما کے زریں لمحات بہت یاد کرتے تھے جہاں وہ سابق والئی سوات کے والد بزرگوار سے بھی ملے تھے۔

آئینۂ خطوط

کسی انسان کو پڑھنے اور سمجھنے کیلئے اس کی تحریر اور خطوط مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اس کے اندازِ تحریر اور اندازِ بیان کا پتہ چلتا ہے بلکہ لکھنے والے کی شخصیت کا مکمل عکس آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

خط نویسی بھی ایک فن ہے اور کامیاب خط وہ ہے جو تکلفات سے بے نیاز ہو کر لکھنے والا کچھ اس انداز سے خط لکھے گویا مکتوب الیہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور وہ اس سے گفتگو کر رہا ہے چنانچہ غالب کے خطوط میں یہی بے ساختہ پن موجود ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ خطوں میں قصیدہ گوئی، ثقیل تمثیلات، مشکل محاورات، بے جا القاب اور فضول رکھ رکھاؤ اختیار کرتے ہیں، وہ فنِ خط نویسی سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ نابلد ہوتے ہیں۔

غرض کسی کی تحریر، لکھنے والے کے کردار کی عکاس ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے زندگی میں مختلف حضرات کو خطوط لکھے۔ ان کے ہر خط میں بے تکلفی کے علاوہ پند و نصائح کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خط کو نصف ملاقات یا اظہارِ تعلق کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تبلیغ و وعظ کا ایک واسطہ بھی خیال کرتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ مبلغ اسلام تو تھے ہی، لہٰذا خطوط میں بھی جا بجا ان کے مبلغ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ان مشاہیر کے خطوط درج کیے گئے ہیں، جنہوں نے مختلف اوقات میں قاضی صاحب کو لکھے۔ دوسرے حصہ میں قاضی صاحب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے چند خطوط شامل ہیں جو انہوں نے اپنے قریبی دوستوں، عقیدتمندوں اور متعلقین کو لکھے۔

خطوط نقل کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ا : جو خط نقل کیا گیا ہے، بلا کم و کاست نقل کر دیا گیا ہے۔

ب : خطوط کا اندراج کرنے میں مراتب کا لحاظ رکھنے کی بجائے تاریخِ تحریر کو اولیت دی گئی ہے۔

نور الحق

حصّہ اوّل

(۱) برصغیر پاک و ہند کے مفتیِ اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا خط حضرت قاضی صاحبؒ کے والد مرحوم کے نام۔

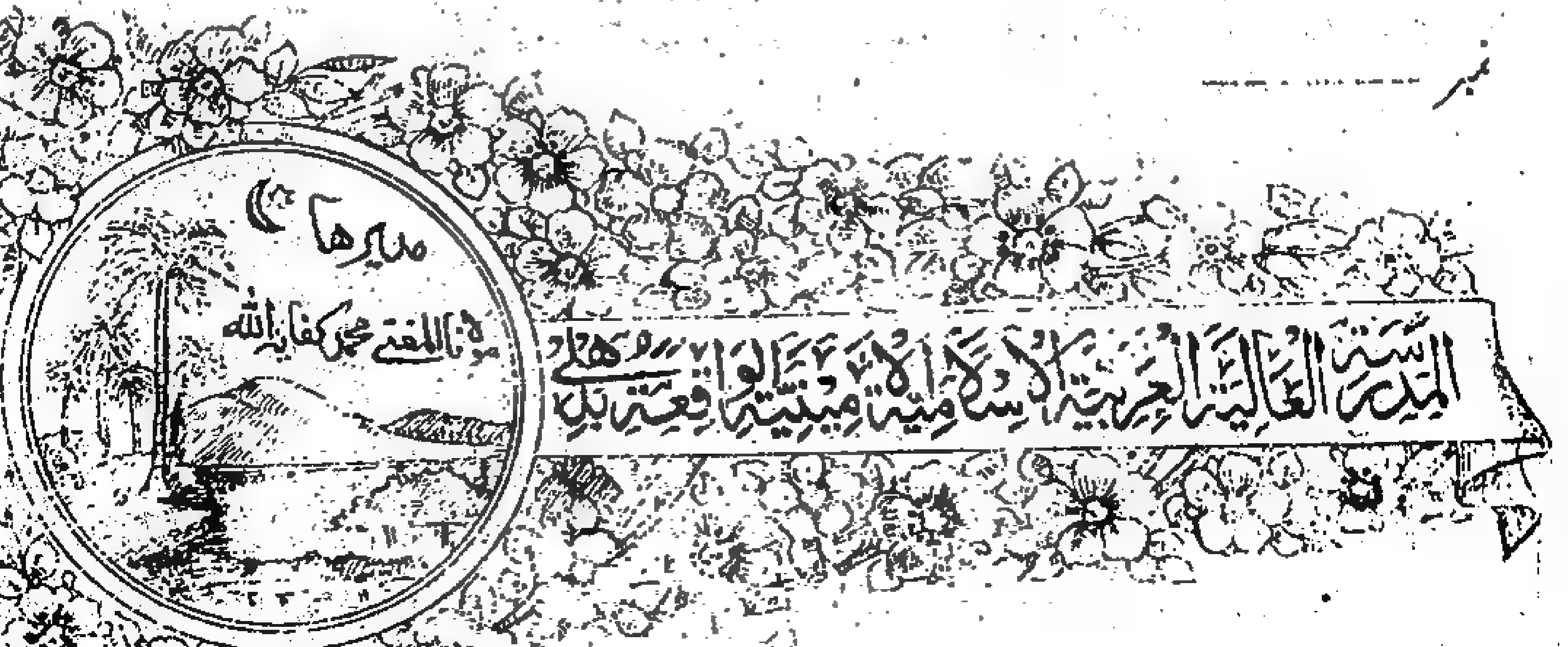
مورخہ ۳۰-۸-۸

مکرّمی جناب قاضی محمد امین صاحب دام مجدہم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ آپ کے صاحبزادے جناب قاضی احسان احمد صاحب دہلی میں ہیں اور یہاں نوجوانانِ دہلی کے اصرار سے ان کا قیام ذرا طویل ہو گیا۔ جناب کی رفعِ تشویش کے خیال سے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا کہ وہ بخیریت اپنے فریضۂ ملکی و ملّی کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے عزم و استقلال اور خدمتِ وطن کے جوش میں ترقی عطا فرمائے۔ آج وہ جمعیۃ علماء کی طرف سے اجمیر شریف جا رہے ہیں۔ وہاں ایک پُرجوش ورکر کی ضرورت تھی۔ پرسوں وہاں سے دہلی واپس آ جائیں گے۔

امید ہے کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا۔ والسّلام۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ



مکرمی جناب قاضی محمد امین صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے صاحبزادے جناب قاضی احسان احمد صاحب دہلی میں ہیں اور یہاں نوجوانانِ دہلی کے اصرار سے ان کا قیام ذرا طویل ہوگیا۔ جناب کی رفعِ تشویش کے خیال سے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا کہ وہ بخیریت اپنے فریضۂ ملکی وملی کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے عزم واستقلال اور خدمتِ وطن کے جوش میں ترقی عطا فرمائے۔ آج وہ جمعیۃ علماء کی طرف سے اجمیر شریف جارہے ہیں وہاں ایک پرجوش ورکر کی ضرورت تھی پرسوں وہاں سے دہلی واپس آجائیں گے امید کہ مزاجِ اقدس بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد کفایت اللہ غفرلہ

(۲) سید محمد شفیع صاحب کا خط بنام والد مرحوم حضرت قاضی صاحبؒ

۱۶ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ

قبلہ وکعبہ ام دامت معالیکم

سلام مسنون و آداب خادمانہ۔ عزیزی قاضی احسان احمد صاحب سلمہٗ یہاں ۱۴ اگست سے جمعیۃ علمائے ہند کی تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مخلصانہ مواعظ اور پرجوش تقریریں عامۃ المسلمین کو از بس مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے اجمیر شریف بھی ایک تقریر کے لئے گئے تھے۔ الحمد للہ کہ وہاں بھی ان کی تقریر سے مسلمانوں کو کافی استفادہ کا موقع ملا اور برادرانِ وطن نے بھی ان کی مساعی کو نظرِ استحسان سے دیکھا وہ لوگ تو اجمیر میں زیادہ قیام کے لئے مُصر تھے لیکن مرکزی ہدایت کے باعث ان کی فوری واپسی ہوئی۔ اب ان کو لکھنو و بنارس کا سفر درپیش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا معین و مددگار ہو۔

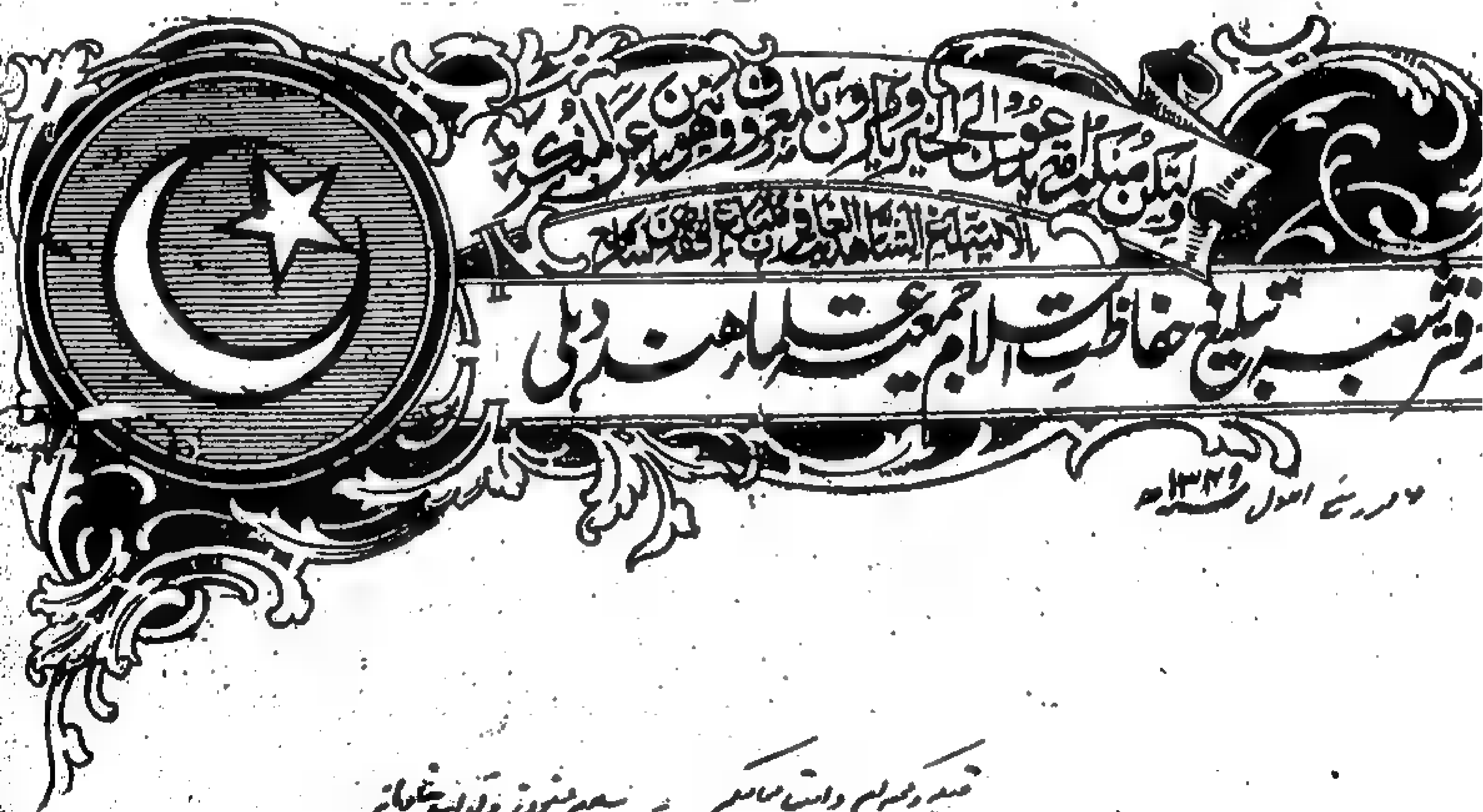
جناب والا کی طمانیتِ خاطر کے لئے عریضہ ارسال ہے، اور میں ایسے لائق فرزند اور نونہال کی مخلصانہ خدمات اور سرفروشانہ جذبات پر جس قدر بھی ہدیۂ مبارکباد پیش کروں، کم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لائق فرزند کو اپنی نعمتوں اور انعاماتِ دارین سے نوازے، اور ملک وملت کے لئے اس لہلہاتے ہوتے نونہال کو ہمیشہ سرسبز رکھے اور اس کی بہار سے آپ کو مسرت وتفاخر عطا فرمائے۔ آمین

زیادہ احترامات!

جناب کا ادنیٰ ....؟

سید محمد شفیع

سردفتر جمعیۃ علمائے ہند $\frac{8}{30}$ 12



مخدوم و مکرم بندہ دامت معالیکم ۔ سلام مسنون و آداب خادمانہ

عزیزی [illegible] جناب احمد سعید صاحب یہاں [illegible] گذشتہ سے جمعیۃ علماء کا تبلیغی حفاظت اسلام کا کام کر رہے ہیں۔ ان کی مخلصانہ [illegible]
اور پر جوش تقریریں عامۃ المسلمین کو از بس مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء کی جانب سے اجمیر شریف
بھی ان کی تقریریں کرائی گئیں۔ الحمد للہ وہاں بھی ان کی تقریر سے مسلمانوں کو کافی استفادہ ہوا [illegible] بلکہ
[illegible] نے بھی ان کا [illegible] سے دیکھا ۔ [illegible] اجمیر [illegible]

مدرسہ میں مدرس کی ہدایت کے اعتبار سے ان کا فیصلہ صحیح ہوگا ۔ اب تو [illegible] کلکتہ واپسی

کا سفر درپیش ہے ۔ اللہ تعالیٰ رضا میں مددگار ہو۔

جناب والد کی ملاقات خاطر کے لئے بالفعل اب [illegible] اور میں اپنے دوستوں فرزند ارجمند [illegible] کا شکریہ [illegible]

اور [illegible] حضرات ہیں جس [illegible] ہوں ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

خیر اندیش [illegible]

[illegible]

۱۲ [illegible] ۳۰

---

(۳) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا خط بنام قاضی احسان احمد صاحبؒ

۲۰- اسٹور روڈ کلکتہ

۲۰ ۱۱/ ۳۳ء

حبی فی اللہ۔ خط پہنچا۔ افسوس ہے کہ میں کوئی ایسی کتاب نہیں بتلا سکتا جو بحالتِ موجودہ آپ کے مقصد کے لئے کار آمد ہو۔ البتہ اگر اس علاقہ کے ضروری حالات میرے علم میں آجائیں تو میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ اسلامی نظامِ حکومت کے اصول پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کیا اقدام وہاں کئے جا سکتے ہیں اور مناسب حال اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مجھے اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ نواب یوسف علی خاں صاحب کے پیش نظر یہ مقصد ہے۔ بلاشبہ بحالتِ موجودہ ممکن نہیں کہ کامل اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ تاہم بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، اور اگر علم و بصیرت کے ساتھ قدم اُٹھایا جائے تو عجب نہیں اس بارے میں ایک وقیع نمونہ قائم ہو جائے۔

لیکن خط و کتابت کی جگہ بہتر تھا کہ کوئی صاحب مجھ سے مل لیتے جنہیں وہاں کے تمام

حالات کا علم ہوتا۔ میں انشاء اللہ عنقریب دہلی کا قصد کروں گا۔ پہلی ڈسمبر سے ۱۵ تک وہاں ملاقات ہو سکتی ہے، اور دہلی بمقابلہ کلکتہ کے قریب ہے۔ یا تو آپ آجائیں، یا کوئی اور صاحب، جو ضروری سوالات کا جواب دے سکیں۔

بہت ہی بہتر ہوتا، اگر یوسف علی خاں صاحب خود مل سکتے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو پھر آپ علاقہ کی تفصیل حالت تحریر کریں۔

آبادی کتنی ہے؟ رئیس کو کس درجہ کے اختیارات حاصل ہیں؟ آبادی تمام تر مسلم ہے یا غیر مسلم بھی ہیں؟ موجودہ حالت عدالتی اور انتظامی حیثیت سے کس نوعیت کی ہے وغیرہ۔

والسّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

۳۰- اشٹور روڈ کلکتہ
۳۰/۱۱/۳۶ء

جناب من تسلیم خط ملا۔ افسوس ہے میں کوئی ایسی کتاب نہیں بتلا سکتا جو بحالت موجودہ آپکے مقصد کیلئے سازگار ہو۔ البتہ اگر آپ اس علاقہ کے ضروری حالات میرے علم میں لے آئیں تو میں آپکو بتلا سکتا ہوں کہ اسلامی نظام حکومت کے اصول پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کیا اقدام وہاں کیے جا سکتے ہیں اور مناسب حال نظام اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مجھے اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ نواب یوسف علی خان صاحب کے پیش نظر یہ مقصد ہے۔ بلاشبہ بحالت موجودہ ممکن نہیں کہ کامل اسلامی نظم قائم کیا جا سکے تاہم بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور اگر علم و بصیرت کے ساتھ قدم اٹھایا جائے تو عجب نہیں اس بارے میں ایک وقیع نمونہ قائم ہو جائے۔

لیکن خط و کتابت کی جگہ بہتر تھا کہ کوئی صاحب مجھ سے مل لیتے جس سے کہ تمام حالات کا علم ہوتا۔

میں ان شاء اللہ عنقریب دہلی کا قصد کروں گا۔ یہاں ڈسمبر سے
15 تک وہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور دہلی بہ نسبت کلکتہ کے
قریب ہے۔ یا تو آپ آ جائیں یا کوئی اور صاحب جو ضروری
سوالات کا جواب دے سکیں۔

بہت اچھا ہو اگر یوسف علی خان صاحب خود مل سکیں

اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو پھر آپ علاقہ کی مفصل حالت
تحریر کریں۔ ~~[illegible]~~
~~[illegible]~~ آبادی کتنی ہے؟ رئیس کو کس درجہ کے اختیارات
حاصل ہیں؟ آبادی تمام تر مسلم ہے یا غیر مسلم بھی ہیں؟ موجودہ حالت
بدامنی اور شورش کی نوعیت کیا ہے؟ وغیرہ

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابوالکلام

(۴) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز مکرم قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی جن کی پُر جوش ملی خدمات سے عموماً لوگ واقف ہیں۔ ان کی خدمت میں میری استدعا ہے کہ وہ اپنے پروگرام میں جمعیۃ علماء اسلام کے مقاصد کو تقویت دینے اور اس کی شاخیں قائم کرنے کو بھی شامل کریں، کیوں کہ اس وقت یہ بھی ایک ذریعہ علماء کے مؤثر طور پر

کام کرنے کا ہے۔

شبیر احمد عثمانی۔ یکم نومبر ۱۹۴۸ء
صدر جمعیۃ علماء اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز مکرم قاضی احسان احمد شجاع آبادی جنکی پُر جوش ملی خدمات سے عموماً
لوگ واقف ہیں اور ملی خدمت میں میرے راستہ صاف کر دیا۔ انہوں نے پروگرام میں جمعیۃ علماء اسلام
کے مقاصد کو تقویت دینے اور جابجا اس کی شاخیں قائم کرنے کا بے مثال کام کیا
کیونکہ اس وقت یہی ایک ذریعہ علماء کے مؤثر طور پر کام کر سکنے کا ہے
شبیر احمد عثمانی
صدر جمعیۃ علماء اسلام
یکم نومبر ۴۸ء

---

⑤ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش، ایڈیٹر روزنامہ "احسان" لاہور کا خط

عزّ اسمہٗ

لاہور۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۵۰ء

محترمی ومجبی! مولانا صاحب زاد مجدہم

السّلام علیکم! میں نے "پاکستان میں مرزائیت کا مقام اور مستقبل" کے زیر عنوان مقالات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "الفضل" کے کسی پرانے پرچے سے مرزا بشیر کا ایک حکم نقل کر کے مجھے پہنچا دیں گے جس میں اس نے اپنے ایک پیرو کو محض اس بنا پر جماعت سے خارج کر دیا کہ اس نے کسی سرکاری محکمہ کی ملازمت قبول کرنے سے پہلے اپنے امیر کی اجازت نہیں لی۔ یہ حوالہ اور اس قسم کے دوسرے حوالے جلد ارسال فرما کر شکر گزاری کا موقع دیں۔ اگر اس سلسلہ مضامین کی تحریک کے دوران میں آپ لاہور ہوتے تو مجھے بہت مدد مل سکتی تھی۔

والسّلام
نیازمند مرتضیٰ احمد خاں

(۶) (جب مولانا مرحوم کو حوالہ مذکور بروقت پہنچ گیا تو انہوں نے دوسرا خط شکریہ کا لکھا، جو درجِ ذیل ہے)

عزّ اسمہٗ

لاہور - ۲۵ مارچ ۱۹۵۰ء

محبی! مولانا صاحب زادمجدکم

السّلام علیکم! اُمید ہے مزاج اقدس بخیر و عافیت ہیں۔ مطلوبہ حوالہ بروقت موصول ہوا۔ شکریہ! آج نویں قسط حوالہ طباعت ہو رہی ہے۔ کل آخری قسط لکھوا کر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے گا۔ اگر "الفضل" کا فائل ہوتا تو میں مرزا کے رویاؤں کی سیاسی حیثیت پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ بات کسی آئندہ فرصت پر دیکھی جائے گی۔ مضامین انشاء اللہ آپ کی نظر سے گزر رہے ہوں گے۔ کل میں اعلان کر رہا ہوں کہ جو اصحاب ان مضامین کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر ان کی اشاعت کرنا چاہیں، وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر مجلسِ احرار بندوبست کر لے تو بہتر ہے۔ یہ مضامین ہمارے آئندہ کام کے لئے بنیادی خشت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اِن خطوط پر آواز اُٹھانی چاہیئے جو اس میں مذکور ہیں۔

والسّلام! مرتضیٰ احمد خاں

---

(۷) امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط

۱۵ر نومبر ۵۱ء

سیالکوٹ - سیّد عطاء اللہ بخاری

عزیزی قاضی جی - السلام علیکم

اس دن ملتان آپ سے ملے مگر اتنی مختصر ملاقات ہوئی کہ ہم کوئی بات چیت نہ کر

سکے۔ آپ نے کہا۔ میں گھر جاتا ہوں، میں چُپ ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ملتان آئے اور گھر تک نہ آئے۔ دنیا میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں مجھے سکون حاصل ہوتا تھا۔ کیا اب وہاں سے بھی سکون کی جگہ پریشانی نصیب ہو گی۔ قاضی جی! جس کام کو حسن و خوبی سے شروع کیا جائے اس کا اختتام بھی خیر و خوبی سے ہونا چاہیئے۔ میں ۲۰-۲۱ تک ملتان پہنچ جاؤں گا۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ جمعرات کو ملتان آ جائیں اور ہم گھر میں بیٹھ کر کچھ باتیں کر لیں۔ اس سے زیادہ لکھنا مناسب نہیں۔ بس آپ جمعرات کو تشریف لے آئیں اور بہر حال تشریف لے آئیں۔ والسلام بچوں کو دعائیں اور باقی سب خورد و کلاں کو السلام علیکم حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں اماں جی کی خدمت میں السلام علیکم۔

دعاگو! سید عطاء اللہ بخاری

مجلس احرار اسلام سیالکوٹ

التاریخ ۱۵ نومبر

نمبر ____

سیالکوٹ سید عطاء اللہ بخاری

عزیزی قاضی جی السلام علیکم

اس دن ملتان آپ سے ملے مگر ذاتی مختصر ملاقات ہوئی کہ ہم کوئی بات چیت کر سکے۔ آپ نے کہا میں گھر جاتا ہوں میں چپ ہو گیا اس کے بعد آپ ملتان آئے اور گھر تک نہ آئے دنیا میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں مجھے سکون حاصل ہوتا تھا کیا اب وہاں سے بھی سکون کی جگہ پریشانی نصیب ہو گی۔ قاضی جی جس کام کو حسن و خوبی سے شروع کیا جائے اس کا اختتام بھی خیر و خوبی سے ہونا چاہئے۔ میں ۲۰-۲۱ تک ملتان پہنچ جاؤں گا میری دلی تمنا ہے کہ آپ جمعرات کو ملتان آ جائیں اور ہم گھر میں بیٹھ کر کچھ باتیں کر لیں۔ اس سے زیادہ لکھنا مناسب نہیں بس آپ جمعرات کو تشریف

لے آئیں اور بہر حال تشریف لے آئیں والسلام بچوں کو دعائیں اور باجی کو درود سلام

کو السلام علیکم عزیز قاضی صاحب کی خدمت میں اور اماں جی کی خدمت میں السلام علیکم

دعاگو

[illegible]

---

(۸) محترم جناب ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کا خط

۷۸۶

۱۶ر نومبر ۱۹۵۱ء بروز ہفتہ   قاضی صاحب

السلام علیکم - میں خود حاضر ہوتا - مجھے حاضر ہونا چاہیئے تھا مگر اس بُری طرح پھنسا بیٹھا ہوں کہ کیا عرض کروں - پرسوں مولانا محمد علی صاحب تشریف لائے تھے اور سارا قصّہ بیان فرما کر کہتے تھے کہ بتائیے اب میں کیا کروں - وہ بہت مغموم تھے - ان کا یہ کہنا درست تھا کہ "قاضی صاحب کے لئے میرے دل میں بے حد عزّت' احترام اور محبّت ہے" - فرماتے تھے کہ میری طبیعت کی اُفتاد سے احباب اچھی طرح جانتے ہیں بسا اوقات مصیبت کا باعث بن جاتی ہے - آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا کے خلوص میں آپ سمیت کسی کو بھی شک نہیں گذرا - پھر ایسے رفیق کی غلط بات بھی برداشت کر لینا چاہیئے - جب وہ نادم بھی ہوں اور تعلّقات کی وجہ سے سخت پریشان بھی ہو گئے ہوں تو آپ کو درگذر سے کام لینا چاہیئے - اس مرتبہ وہ بے حد مغموم اور دل برداشتہ تھے - وہ فرماتے تھے کہ "میں قاضی صاحب کو ناراض نہیں دیکھ سکتا - مجھے اپنے چھوٹے بھائی صاحب سے معافی مانگ لینا ہے - میں نے قصور کیا ہے یا نہیں - جب بھائی یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے قصور کیا، اور وہ ناراض بھی ہیں تو اب میں ان کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا" میرے عزیز بھائی! اگر ان کا اس قسم کا خط آئے تو غصّہ کو تھوک دینا - میری یہ خواہش ہے، میں اسے التجا بھی سمجھتا ہوں

کہ آپ اپنے دل میں کوئی شکوہ یا غصہ نہ رہنے دیں۔

قبلہ والد صاحب، والدہ صاحبہ کی خدمتِ عالیہ میں سلام علیک عرض ہے۔
گھر میں سب کو دعا و سلام۔ دعاگو

تاج الدین انصاری

میں نے اوکاڑہ والوں کو خود کہا تھا کہ صدارت قاضی صاحب ہی فرمائیں گے۔
اسے قبول فرمالیجئے، تاکید ہے۔

---

(۹) حضرت شاہ صاحب ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

یکم مارچ، ملتان شہر

میرے قاضی جی! اسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

بہت دن ہوئے میں نے اپنے پڑوسی میاں احمدیار کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا تاکہ انکے ایک عزیز کا کام آپ کے ذریعہ انجام ہو جائے۔ لیکن ابھی تک وہ بیچارے پریشانی میں مبتلا ہیں، اور ان کا کام کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ قاضی جی! میں تو جیسا تھا ہوں آپ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت صلاحیتیں عطا کی ہیں اور بہت لوگوں کو آپ سے فائدے پہونچتے رہتے ہیں۔ بارہ برس سے میاں احمدیار کی ہمسائیگی میں پڑا ہوا ہوں اور الحمد للہ کہ اچھی گذر رہی ہے۔ اگر ان کا کام نہ ہوا تو آپ خود سوچ لیں، میری اس حالت میں مجھ پر کیا گذریگی۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ان کا حق پر ہونا آپ پر ثابت ہو چکا ہے آپ نے جو مہربانی کی ہے اس کے تو وہ ممنون ہیں لیکن قدرے بہتر از یں۔ مشکلات کا اندازہ مجھے بھی ہے لیکن میری گذارش بھی قاضی احسان احمد سے، کسی ایرے غیرے سے نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب کے یہ لوگ آپ کے یہاں سے تہی دامن واپس نہیں آئیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

میری تکلیفیں آج کل بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ دعاؤں کا محتاج ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو خیریت سے رکھے۔ آمین۔ والسلام۔ دعاگو: سیّد عطاء اللہ بخاری ـــــ بڑی مشکل سے یہ چند سطریں اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کریں۔

---

(۱۰) حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب قادری صدر مجلسِ عمل کا خط

۲۰ فروری ۵۳ء

مکرم و محترم حضرت مولانا احسان احمد صاحب ادام اللہ برکاتہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ڈھاکہ کے لئے جناب منتخب ہوئے ہیں اور آپ کی معیت میں صاحبزادہ محمد سلیمان صاحب ہوں گے۔ یہ سفر آپ کو ہوا میں کرنا ہے۔

خرچہ سفر کے لئے آپ لاہور پہنچ کر مولانا اختر علی خاں صاحب سے فیصلہ کرنا ہے وہ بذریعہ چک رقم منگوا کر آپ کے پیش کریں گے۔ واپسی کا کرایہ نقد ہمراہ لے جائیں گے ڈھاکہ سرگرم تبلیغ فرمائی جائے۔ والسلام

ابوالحسنات قادری

مکرر عرض کہ ڈھاکہ پہنچ کر لٹریچر چھپوانے کے لئے کچھ علیحدہ رقم بھی ہمراہ لے جائیں جو وہاں بزبان بنگلہ چھپنا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالحسنات قادری

مجلس عمل - آل مسلم پارٹیز کنونشن پنجاب

شمارہ ۳۶۷ تاریخ ۲۰ فروری ۵۳ء

مکرم و محترم حضرت مولانا احسان احمد صاحب دام مجدکم برکاتہم السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ڈھاکہ کیلئے حضور منتخب ہوئے ہیں اور آپ کی معیت میں صاحبزادہ محمد سلیمان صاحب ہونگے

جس میں وہ کیا مواد پیش کرنا ہے۔
خرچ سفر کے لئے آپ [illegible] پیش کرتا ہے۔
وہ [illegible] ۔ [illegible]
دعا ہے کہ [illegible] تبلیغ [illegible] ۔

والسلام
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

---

(۱۱) جناب سعید ملک صاحب امیر جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کا خط

اچھرہ، لاہور، پاکستان مورخہ 9/7/53

مکرّمی و محترمی! السّلام علیکم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، حکومت پنجاب نے اینٹی قادیانی تحریک کے سلسلہ میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا ہے۔ جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ کمیشن کے سامنے قادیانی مسئلے کے سارے پہلو واضح کر دے۔ لہٰذا آپ سے التماس ہے، کہ آپ تمام ضروری لٹریچر اور مواد لے کر لاہور تشریف لے آئیں تاکہ اس مسئلے کے سلسلہ میں آپ کی معلومات اور تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مولانا داؤد غزنوی صاحب کا بھی ایک خط ارسال خدمت ہے۔

اگر آپ تشریف نہ لا سکیں تو مہربانی کر کے مندرجہ ذیل عنوانات کے سلسلہ میں ہمیں مواد فراہم کریں۔

۱: مرزا صاحب، مرزا بشیر الدین صاحب اور "الفضل" کی ایسی تحریریں جن میں مسلمانوں

کی تکفیر کی گئی ہو، ان کی دلآزاری کی گئی ہو اور ان پر بحیثیت ایک امت کے حملے کئے گئے ہوں۔

۲: ایسی تحریریں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس گروہ کی شروع سے اب تک یہی پالیسی ہی ہے کہ یہ مسلمانوں سے الگ ایک امت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳: چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب کی مرزائیت نوازی۔

۴: پاکستان کے تصور کی ان لوگوں نے ہمیشہ مخالفت کی۔

۵: پاکستان کے قیام کے بعد ان کی ایسی حرکات جو مسلمان عوام کو مشتعل کرنے کیلئے کافی تھیں۔

جن جن کتابوں یا اخبارات میں ایسی تحریریں پائی جاتی ہوں وہ حامل ہذا کے ہاتھ روانہ کر دیں اور ان سے رسید حاصل کر لیں، انشاء اللہ آپ کو واپس کر دی جائیں گی۔

ویسے بہتر یہی ہوگا کہ آپ خود تشریف لے آئیں۔ والسلام

احقر: سعید ملک امیر جماعت اسلامی صوبہ پنجاب

---

(۱۲) مولانا سید داؤد غزنوی (ایم۔ایل۔اے) صدر مجلس اہلحدیث پاکستان کا خط

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی!

آپ نے اخبارات کے مطالعہ سے معلوم کیا ہوگا کہ تحقیقاتی کمیشن ہماری تحریک کے سلسلہ میں تحقیقات کر رہی ہے کہ اس میں جو فسادات ہوئے ہیں اسکی ذمہ داری کس پر ہے۔ اگر اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کے نتائج دُور رس ہوں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل اشتعال انگیزی اور منافرت پھیلانے کی کوشش رہی ہے اُسے کمیشن کے سامنے لایا جائے، اور اگر ہم اس وقت چُوک گئے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم اس غفلت اور تساہل کی تلخی محسوس کرتے رہیں گے۔

اس لئے سب دوستوں کی رائے ہے کہ آپ لاہور تشریف لائیں اور پورے ساز و سامان

کے ساتھ تشریف لائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کھلے بندوں اس میں حصہ لیں۔ اگر آپ موا
مہیا کرنے میں امداد فرمائیں تو یہ کافی ہوگا۔

اس مقصد کے لئے یہ عریضہ دستی آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ جواب باصو
سے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہوں گا۔ والسلام

داؤد غزنوی ۹/۷/۵۳



سید داؤد غزنوی
ایم - ایل - اے

فون
شیش محل روڈ

مکرمی جناب قاضی احسان احمد صاحب زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی!

آپ نے اخبارات کے مطالعہ سے معلوم کیا ہوگا کہ تحقیقاتی کمیشن ہماری تحریک کے متعلق تحقیقات کر رہا ہے کہ اس میں معروف حضرات بیان دے رہے ہیں۔ اس کا اثر بڑا دور رس پڑے گا۔ اگر اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ [illegible] کی طرف سے [illegible] اشتعال انگیزی اور منافرت پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کے سامنے لایا جائے۔ اور اگر ہم اس وقت چوک گئے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم اس غفلت [illegible] کی تلخی ہم محسوس کرتے رہیں گے۔

اس لئے سب دوستوں کی رائے ہے کہ آپ لاہور تشریف لائیں اور پورے [illegible] کے ساتھ تشریف لائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کھلے بندوں اس میں حصہ لیں۔ اگر آپ مواد مہیا کرنے میں امداد فرمائیں تو یہ کافی ہوگا۔

اس مقصد کے لئے یہ عریضہ دستی آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ جواب باصواب سے مطلع فرمائیں

والسلام

داؤد غزنوی

۹/۷/۵۳

(۱۳) مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کراچی کا خط

برادر عزیز جناب قاضی احسان احمد صاحب زیدت عنایتکم

السلام علیکم۔ جناب کا گرامی نامہ ملا۔ آپ کی رہائی سے خوشی ہوئی۔ اس سے قبل آپ کے ایک خادم کی زبانی والد صاحب کی علالت کا حال معلوم ہو گیا تھا لیکن عریضہ لکھنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ اچانک وصال کی اطلاع ملی۔ جس سے بہت قلق ہوا، اور پھر یہ خیال ہوا کہ مہاجرہ[1] کی والدہ کو خط لکھ دوں مگر آپ کے مذاق کا اندازہ نہیں تھا، اس لئے نہ لکھ سکا۔ میں اوائل شوال میں ٹنڈو الہ یار چلا گیا تھا اور ابتدار سال کی وجہ سے قیام کسی قدر طویل رہا۔ واپسی پر مکرمت نامہ ملا۔ میں ۱۲ر جولائی ۵۳ء کو ملتان جا رہا ہوں۔ خیال ہے کہ حاضر ہو کر تعزیت کا فریضہ ادا کروں۔ معلوم نہیں، ان دنوں میں آپ موجود ہوں گے یا نہیں؟ مجھے ملتان ہی میں اطلاع مل جائے تو اچھا ہے۔ باقی خیریت ہے۔ عزیزہ مہاجرہ کو دعا۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ سلام مسنون عرض ہے۔ والسلام

بندہ احتشام الحق تھانوی عفی عنہ

11.7.53

(۱۴) شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحبؒ امیر جمعیۃ علماء اسلام کا خط

۲۲ محرم الحرام ۱۳۷۵ھ

محترم المقام فی عقیدتی عند اللہ و عند الناس قاضی احسان احمد صاحب زیدت معالیکم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا یہ فیصلہ ہے کہ آئندہ رات کے ۲ بجے تشریف لے جانے والے ہیں۔ اس لئے احباب کرام کی یہ رائے ہے کہ اگر رات کو آپ کے پاکیزہ ترین خیالات کا اظہار ہو تو انسب ہے۔ ان کی مصالح کی بنا پر میں بھی اسی کی تائید کرتا

---

[1] آپ کی تیسری بیٹی ساجدہ، مراد ہے۔

ہوں۔ فقط

۲۰

زیدت معالیکم
احمد علی

۱۳۷۳ھ
۲۳ محرم الحرام

محترم المقام فی مقدورہ عند اللہ و عند الناس زید مجدہم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا یہ فیصلہ ہے۔ کہ آئندہ رات کے ۳ بجے تک لیٹے جاتے رہیں۔ میرے احباب کرام کی یہ رائے ہے۔ کہ اگر رات کو آپ کے پاکیزہ ترین خیالات کا ہو تو بہتر ہے۔ ان کی تعلیم کی بنیاد رکھنا میں بھی اسی کی تائید کرتا ہوں

---

(۱۵) حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان کا خط

مکرمی محترمی جناب قاضی صاحب ادام اللہ فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک عرصہ سے جناب والا کو خیر المدارس کے متعلق شکایات و شبہات، جلسہ سالانہ میں تشریف اور تعاون سے مانع رہے ہیں اگر اس طویل تجربہ کے بعد جناب کے قلبِ صافی سے ان کا اثر زائل ہو چکا ہو اور قلبِ سلیم کدورت سے صاف ہو تو محبانہ درخواست ہے کہ خیر المدارس کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۲۲-۲۳-۲۴ مارچ ۵۷ء ہونا قرار پایا ہے۔ تاریخ نوٹ فرما کر تشریف آوری کے وعدہ سے ممنون فرمایا جائے اور اس خالص دینی درسگاہ کی اعانت سے عند اللہ اجر جزیل اور عند خدامِ مدرسہ شکر کا موقع دیا جائے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔ والسّلام

طالب دعا۔ خیر محمد، ملتان ۱/۵۷/

(۱۶) حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایڈیٹر ماہنامہ "الفرقان" لکھنو کا خط

۲/۷/۵۷ محب محترم قاضی صاحب زیدت الطافکم

وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ۔ جی ہاں۔ اللہ کی شان ہے جن سے اتنا قرب تھا، اب ان سے اتنے دُور کر دیئے گئے ہیں۔ میری بعض ضرورتیں اٹکی ہیں لیکن پہنچنا آسان نہیں۔

مولوی احمد رضا خان صاحب کے رسالہ کا نام "الاعلام بان ہندوستان دار السّلام" ہے، میرے پاس تھا لیکن جب اس لائن سے طبیعت ہٹی تو اس قسم کی کتابوں کی حفاظت تک کا خیال نہیں رکھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ بریلی میں بھی نہیں مل سکے گا۔ ان کتابوں کی طباعت کا سلسلہ عرصہ سے بند ہے۔ اس لئے قریب قریب سب نایاب ہو چکی ہیں۔ تاہم اسی خط کے ساتھ ایک دوسرا خط بریلی کے ایک دوست حکیم عبد الرشید کو لکھ رہا ہوں کہ اگر وہ دستیاب ہو سکے تو آپ کو براہ راست بھیج دیں۔ مکرّر یہ ہے کہ امید بہت کم ہے۔ فیصلہ کن مناظرہ کا ایک نسخہ انشاء اللہ کل روانہ ہو جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون پہنچا دیجئے گا۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

(۱۷) حضرت مولانا دوست محمد صاحب قریشی صدر تنظیم اہل السنت پاکستان کا خط

۱۶/۱/۵۹ بخدمت رئیس المقررین حاجی الحرمین حضرت قاضی صاحب زیدت معالیکم

سلام مسنون۔ ۲۹ر دسمبر کو ڈویژن بہاولپور کے سربراہ حکام کا یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس

ڈویژن میں کسی جلسے میں کوئی باہر کا مقرر اگر تقریر نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر اگر ہم اجازت لینے میں کامیاب ہوگئے تو قریش آباد احمد پور شرقیہ والے جلسے میں ۲۶ رجب کو تشریف لانا ضروری ہوگا، ورنہ خیر۔

بہر حال بشرط منظوری دوبارہ اطلاع دوں گا۔ والسلام

آپ کا :۔ دوست محمد قریشی عفی عنہ

---

(۱۸) حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن شیخ الجامعہ و ناظم امور مذہبیہ بہاول پور کا خط

بہاول پور ۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء

محترم المقام حضرت قاضی صاحب زاد مجدہم العالی

السلام علیکم و علی من لدیکم۔ مزاج عالی

آں محترم کے سرفراز نامہ کا جواب کافی دیر کے بعد دے رہا ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں آپ کے بھتیجے برخوردار عبیدالرحمان کی شادی کے انتظام اور "ہجوم کار سرکار" کے باعث بے حد مصروف رہا۔ اس لئے ترسیل جواب میں غیر معمولی تعویق ہوگئی، پھر عذر پیش کرتا ہوں "العذر عند کرام الناس مقبول"

آپ نے اپنے گرامی نامہ میں جو شعر سپرد قلم فرمایا ہے اس نے ہم سب کو بے حد متاثر کیا۔ استحضاراً اس شعر کو پھر نقل کرتا ہوں ؎

جو دیکھئے تو بہت سلسلے بہت رشتے   جو سوچئے تو جہاں میں ہر آدمی تنہا

واقعی یہ شعر حقیقت کا ایک مرقع ہے۔

اُمید ہے بھابی جان ہسپتال سے با عافیت گھر آچکی ہوں گی۔ ان کی صحت کے لئے دست بدعا ہوں۔ میں آپ ایسے مخلص اور مہربان کی مخلصانہ دعاؤں کا بے حد محتاج ہوں۔ دعواتِ صالحات سے یاد رکھئے گا۔ اللہ تعالے آپ حضرات کو سلامت

باکرامت رکھے۔
رحم اللہ عبداً قال آمین ۔ ثم السلام مع الاکرام۔
مخلص نیاز مند ! محمد عبدالرحمٰن عفی عنہ
ناظم محکمہ امور مذہبیہ بہاولپور

(۱۹) مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کراچی کا خط

۹ صفر ۱۳۸۴ھ باسمہ تعالےٰ ۲ رجون ۱۹۶۴ء

گرامی مفاخر جناب محترم قاضی احسان احمد صاحب احسن اللہ الیکم وزادکم احسانا وتوفیقا الی الخیر

تحیۃ وسلاما و ۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہو۔ میرے مخلص محترم جناب مولانا اسمٰعیل (جھنگ) کی خواہش و آرزو ہے کہ آپ ان کے سالانہ اجلاس میں تشریف لے جاکر رونق بڑھائیں۔ اگر موصوف کی یہ خواہش پوری ہو گی تو میں بہت خوش ہوں گا اور آپ کا ممنون ہوں گا۔ بہرحال احسان تو ہے ہی قابل تشکر و امتنان، ورنہ جو سراپا احسان ہو، ان کے احسانات کا کیا ٹھکانا ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین کی خدمتِ مرضیہ لے اور مخلصین کے ساتھ احسان کی توفیق عطا فرمائے ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

والسلام محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

(۲۰) حضرت مولانا مجاہد الحسینی سابق ایڈیٹر "آزاد" "نوائے پاکستان"

۱۶ رجون ۱۹۶۴ء مخدوم محترم حضرت قاضی صاحب زید فضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ مزاج گرامی ! حسب وعدہ "امروز" کا ایک "تراشا" ارسالِ خدمت ہے ۔ اس مقدمہ کا پوری طرح خیال رکھنا چاہیئے ۔ تراشے کے نیچے تاریخ وغیرہ کا اندراج موجود ہے۔ امروز ۱۳ رجون جلد ۱۷، نمبر ۹۷ ۔ اور اگر مکمل پرچہ درکار ہو تو وہ بھی مہیا ہو سکتا ہے

ڈاکٹر کمال صاحب (احمد حسین کمال، ایڈیٹر ترجمان اسلام) سے معاملہ اگر طے ہوگیا ہو اور انہوں نے کام شروع کر دیا ہے تو انہیں تمام مواد مہیا کرنا چاہیئے، اور اگر اُن سے کوئی بات طے نہ ہوئی ہو اور معاملہ معلّق ہو تو مولانا (محمد علی صاحب جالندھری مرحوم) سے آپ ذرا دریافت تو فرمائیں کہ اِدھر اس قدر انقباض ـــ اور اُدھر یہ شرح وبسط۔ آخر نظرِ عنایت کے کچھ تو محرکات ہوں گے ـــ! جولائی میں انشاءاللہ حاضری کا ضرور پروگرام بناؤں گا۔

آپ کی ذاتِ گرامی اور رہائش گاہ، دونوں تاریخ کے ایک نہایت ہی قیمتی اور سنہرے باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جی یہ چاہتا ہے کہ اس تاریخ کی ورق گردانی کی جائے اور ماحصل ضبطِ تحریر میں لا کر اسے آئندہ نسلوں کے سپرد کر دیا جائے۔! خدا کرے، کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے، اور ساون بھادوں کی سی موسمی گھٹن جلد کافور ہو کر موسمِ بہار کی سی رنگینیاں اور شادابیاں نمودار ہو جائیں

ہمشیرہ محترمہ کی خدمت میں ہم سب کا مؤدبانہ سلام عرض ہے۔ بچوں سے پیار۔ ننّھی ٹھانی ؓ ـــ ماشاءاللہ اب تو بڑی ہوگئی ہوگی۔! اس سے ٹھانی کی فرمائش۔

احباب و پرسانِ احوال کی خدمت میں سلام۔

مولانا قاری نورالحق صاحب کی خدمت میں سلام۔

آپ کا :۔ مجاہد الحسینی

---

(۲۱) مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی ناظمِ عمومی جمعیۃ علماء اسلام کا خط

محترم المقام جنابِ مستطاب حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۱۰/۶/۶۶

۲۸-۲۹ مئی ۶۶ء کو عزیزالاسلام ہائی سکول لاہور میں متحدہ اسلامی محاذ کا کنونشن

منعقد ہوا۔ اس میں حضرت درخواستی صاحب مدظلہ کی اپیل پر مختلف افراد اور مختلف جماعتوں نے کم و بیش ہزار ہزار کی رقمیں لکھائیں۔ اس موقع پر حضرت مولانا محمد علی صاحب ناظم اعلیٰ مجلس ختم نبوت (رخصتی) نے متوجہ کرنے پر فرمایا کہ میں اپنے امیر حضرت قاضی صاحب سے دریافت کروں گا۔ یہ رقم کفر و ارتداد کی روک تھام کیلئے نشر و اشاعت کیلئے جمع کی گئی ہے۔

اب جناب سے گذارش ہے کہ اس بارہ میں اپنی روایاتی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مناسب امداد منظور فرما کر محترم شیخ حسام الدین صاحب یا احقر کو اطلاع بخشیں۔ حضرت درخواستی صاحب مدظلہ کی بھی یہی خواہش ہے۔

آپ کی صحت کے لئے علاوہ اجتماعات کے پنجگانہ نمازوں کے بعد دعا کرتا رہتا ہوں، اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔ یہ آپ کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اور اس مشن کی خاطر جو آپ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ نے اب تک ارتداد کے سوا شرک و بدعت کے خلاف جو حکیمانہ اسلوب سے تبلیغ فرمائی ہے وہ ہمیں دعاؤں کیلئے مجبور کرتی ہے۔

جواب کا منتظر

غلام غوث ہزاروی

ناظم عمومی متحدہ اسلامی محاذ، لاہور

Central Office

United Islamic Front Pakistan

LAHORE.

مرکزی دفتر

متحدہ اسلامی محاذ پاکستان لاہور

حوالہ ۱ تاریخ ۱۴/۶

والیکم طلہ عو...

محترم المقام جناب مستطاب حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی ...

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

۲۸ - ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء کو عزیز الاسلام ہائی سکول لاہور میں متحدہ علماء محاذ کا کنونشن منعقد ہوا - اس میں حضرت درخواستی صاحب مدظلہ کی اپیل پر مختلف افراد اور مختلف جماعتوں نے کم و بیش ہزار ہزار کی رقمیں لکھائیں اس موقعہ پر حضرت مولانا محمد علی صاحب ناظم اعلیٰ مجلس ختم نبوت (رحمتی) نے متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے امیر حضرت خاص صاحب سے درخواست کرونگا - یہ رقم کفر و ارتداد کی روک تھام کے لئے نشر و اشاعت کے لیے جمع کی گئی ہے -

اب جناب سے گذارش ہے کہ اس بارہ میں اپنی روایتی حمیت روایات کو قائم رکھتے ہوئے مناسب امداد منظور فرما کر مخدومی شیخ حسام الدین صاحب یا احقر کو اطلاع بخشیں - حضرت درخواستی صاحب مدظلہ کی بھی یہی خواہش ہے -

آپکی صحت کے لیے علاوہ اجتماعات کے پنجگانہ نمازوں کے بعد دعا کرتا رہتا ہوں اور کر ہی کیا سکتے ہیں - یہ آپ کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اور اس مشن کی خاطر جو آپکی ذات سے تعلق رکھتا ہے - آپ نے اب تک ارتداد کے سوا شرک و بدعت کے خلاف جو حکیمانہ اسلوب سے تبلیغ فرمائی ہے وہ ایسی دعاؤں کے لیے مجبور کر رہی ہے - والاجر عنداللہ - فقط

جواب کا منتظر

[illegible] ناظم عمومی متحدہ علماء محاذ

لاہور -

(ب) بعض لیڈروں، وزیروں اور افسروں کے خطوط

حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ، نہ صرف علماء اور صلحاء کی نگاہوں میں ممتاز تھے بلکہ سیاسی لیڈروں، وزیروں اور افسروں میں بھی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان خطوط کے نقل کرنے میں بھی اولیت تاریخِ تحریر کو دی گئی ہے علاوہ ازیں اُن خطوط کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے جنہیں لکھنے والے نے دستِ خود سے لکھا۔ ورنہ بیشمار ایسے چھپے ہوئے خطوط موجود ہیں جو عام طور پر "بڑے لوگ" اپنے "ثنا خوانوں" کو دس پیسے کے ٹکٹ لگا کر بھیج دیا کرتے ہیں۔ چونکہ میں انہیں "خط" کے زمرہ میں شمار کرنے سے قاصر تھا لہٰذا اُن کا نقل کرنا کتاب اور صاحبِ کتاب کے شایانِ شان نہیں سمجھا۔

چند خطوط من وعن نقل کئے جا رہے ہیں جو درجِ ذیل ہیں۔

---

(۱) سندھ کے مشہور لیڈر شیخ عبدالمجید سندھی کا خط

بندر روڈ کراچی   ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء

مکرم و محترم حضرت مولانا قاضی محمد احسان صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ جناب والا، مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی شاخیں تقریباً ہندوستان کے ہر صوبہ میں قائم ہو چکی ہیں، صرف سندھ ہی ایسا صوبہ ہے جسمیں اب تک ایک شاخ بھی قائم نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ سے جن حضرات کو لیگ کے مرکزی بورڈ نے منتخب کیا تھا، اس میں سے سوائے خاکسار کے باقی حضرات نے لیگ کے نصب العین اور پروگرام کی طرف کچھ بھی توجہ نہیں دی، بلکہ اپنے اپنے خیال کے مطابق جُداگانہ کام کرنے لگے، لیکن بفضلِ خدا، اس سے پیشتر چند دوست و احباب کی امداد سے

آزاد پارٹی کے نام سے ایک تحریک سندھ میں جاری کی جاچکی تھی اور جب یہ دیکھا گیا، کہ سندھ کی ہر قومی جماعت اور سربرآوردہ اصحاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا نام سُنتا بھی گناہ تصوّر کرتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ آزاد پارٹی نے مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کے دستور العمل اور پروگرام کو اختیار کر لیا ہے اور وہی سندھ میں مرکزی بورڈ کی شاخ ہے۔ اس کے بعد ہم کوشش کرتے رہے کہ یہ تحریک تمام سندھ میں پھیل جائے جس کا نتیجہ اس وقت تک یہ نکلا ہے کہ پچپن [۵۵] شاخیں صوبہ کے مختلف اضلاع میں قائم ہو چکی ہیں اور تینتیس [۳۳] مسلم نشستوں میں سے تقریباً پندرہ [۱۵] کے لئے، ہم امیدوار کھڑے کر سکتے ہیں۔

اب فیصلہ یہ ہوا ہے کہ مؤرخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء بروز اتوار بوقت گیارہ بجے صبح خالق ڈینا ہال کراچی میں سندھ آزاد پارٹی کانفرنس منعقد کر کے سندھ مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کو قائم کیا جائے۔ مسٹر محمد علی جناح صاحب کانفرنس کی صدارت فرمائیں گے اس لئے ہم نہایت ہی صمیم قلب سے آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ کانفرنس کی شرکت فرماتے ہوئے اس نازک وقت میں سندھ کے مسلمانوں کی صحیح راہنمائی فرمائیں۔ آپ کی شرکت سندھ کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا کر دے گی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا وہ صوبہ جو آپ سب بزرگوں کی کوششوں کے بعد جداگانہ حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس میں سچّا اسلامی جوشِ عمل پیدا کر دیا جائے تاکہ آئندہ سندھ اسمبلی کے اندر ایسے لوگ منتخب ہو جائیں جو سنٹرل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے پروگرام پر عمل پیرا ہو کر سندھ کو ترقی کی طرف لے جائیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نازک موقع پر آپ تمام مشغولیتوں کو چھوڑ کر یہاں تشریف لا کر ایسی فضا پیدا کر دیں جس سے وہی نمائندگان کامیاب ہو سکیں جو سنٹرل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کریں۔ یہ حقیقت تو آپ پر پوری طرح روشن ہے کہ صوبہ سندھ بلحاظ ترقی دوسرے صوبوں سے بہت پسماندہ ہے

اس لئے جب تک آپ سب بزرگ تشریف لاکر کوشش نہ فرمائیں گے، تب تک سنٹرل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لئے سازگار فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی تشریف آوری کی تاریخ سے مطلع فرمائیں گے تاکہ اسٹیشن پر آپ کا استقبال کیا جاسکے۔ آپ کے سفر کے اخراجات سندھ آزاد پارٹی ادا کرے گی اور اگر کسی ضروری وجہ سے جناب نہ آسکیں تو ایک ایسا پیام مسلمانانِ سندھ کے نام ارسال فرمائیں جو فضا کو سازگار بنادے۔

نیازمندان

شیخ عبدالمجید پریذیڈنٹ سندھ آزاد پارٹی

مولوی ثنا ءاللہ خاں۔ جنرل سیکرٹری

کراچی شہر

---

(۲) نواب مشتاق احمد گرمانی سابق مرکزی وزیر و سابق گورنر مغربی پاکستان

راولپنڈی — یکم نومبر ۱۹۵۰ء

محبی و مکرمی قاضی احسان احمد صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

محترمی بابا فقیر اللہ صاحب نے مجھے آپ کا مکتوب دیا۔ چودھری نجم الدین صاحب کے متعلق میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، دوبارہ یاددہانی بھی کرادوں گا۔ میں انشاءاللہ اسی مہینے لاہور جاؤں گا، تو زبانی ذکر ان کے متعلق کروں گا۔

باباجی کی زبانی علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرزند عطا فرمایا ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالےٰ مولود مسعود کو لمبی عمر دے۔ بلند اقبال اور صالح کرے اور ملت کا صحیح خدمت گذار بنادے۔ آمین

والسلام

مشتاق احمد گورمانی

---

(۳) سردار بہادر خاں سابق مرکزی وزیر و سابق پولٹیکل ایجنٹ بلوچستان

۷۸۶

کراچی　　　　17/XII

کرم فرمائے من قاضی صاحب

آپ کا گرامی نامہ مِل کر باعثِ مسرّت ہوًا۔ میں چند دنوں سے کراچی آیا ہوًا تھا، اور ۲۰ ماہ حال کو کوئٹہ واپس چلا جاؤں گا۔ آپ کے نیک خیالات کے اظہار کے لئے تشکّر میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دعا کروں کہ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔

محترم شورش صاحب کو شاید مغالطہ ہوًا ہوگا۔

مجھے اپنی زندگی میں جب بھی آپ سے ملنے کا اتّفاق ہوًا، آپ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ آپ نے میرے دورِ وزارت کے کام کا حوالہ اپنے خط میں دیا ہے۔ مَیں جملہ احباب اور ملک کے اکثر لوگوں کا جو کہ اس خیال کے حامل ہیں مشکور ہوں۔ میرا اپنے متعلق یہ اندازہ ہے کہ مجھے جو کچھ کرنا چاہیئے تھا وہ میں نہیں کر سکا۔ خدا اور عوام میری کوتاہیوں کو معاف کریں۔ مجھے دعا بعد از نماز میں اگر یاد کرتے رہیں تو مشکور ہوں گا۔

جملہ پرسانِ حال کو السّلام علیکم۔

آپ کا　　ناچیز

سردار بہادر خاں

---

(۴) سیّد احمد نواز، سابق صوبائی وزیر کا خط

گیسٹ ہاؤس　　　　۱۵-۵-۵۲

مکرّمی و محترمی جناب قاضی صاحب

السّلام علیکم۔ بہاولپور کے الیکشن کے لئے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اس گرمی

کے زمانے میں تکلیف دے رہا ہوں - معاف فرمادیں -

پہلی گاڑی سے تشریف لاویں - آپ کا

سید احمد نواز

---

(۵) محمد حسین صوفی، سابق کمشنر کوئٹہ، چیف سیٹلمنٹ کمشنر و سیکرٹری کابینہ گورنمنٹ آف پاکستان کا خط -

ا - برٹن روڈ کراچی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۵ء

مکرمی قاضی صاحب

السلام علیکم - آپ کا نوازش نامہ ملا - یاد آوری کا شکریہ! ہرکارہ ڈاک (جو ایک دن میرے مکان پر ہمارے ساتھ شریکِ گفتگو رہا تھا) کا کہنا ہے کہ آپ کی تقریروں کا میمن جماعت پر نہایت اچھا اثر ہوا ہے - ان میں سے کم از کم ۱۵ فیصد آدمی سچے دل سے ارادہ کر چکے ہیں کہ آئندہ بلیک مارکیٹ نہیں کریں گے یہ

اللہ کرے "زورِ بیاں" اور زیادہ

آج کل جبکہ ملک ایک نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے، چودھری محمد علی جیسے مخلص اور قابل لیڈر کا دم غنیمت ہے - دعا کریں کہ خدا ان کی صحت برقرار رکھے، تاکہ وہ اپنے نیک عزائم کو عملی جامہ پہنا سکیں -

نشاط اور نسرین کو عزیزہ طاہرہ کا سلام پہنچا دیا، وہ دونوں بھی اُسے اور اُس کی بہنوں کو السلام علیکم عرض کرتی ہیں - پرویز اور ارشد بفضلِ خدا خیریت سے ہیں -

میری بیوی کی طرف سے آپ کو اور بیگم صاحبہ کو سلام مسنون -

اُمید ہے، ہم اکتوبر کے آخر تک لاہور چلے جائیں گے - اِس سے پہلے کراچی آنے کا کوئی پروگرام مرتب ہو تو مطلع فرمائیں - قبلہ شاہ صاحب سے ملاقات ہو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

۶ عبدالوحید خان سابق [illegible] کا خط

[illegible]

[illegible]

No 42-M (IBS) 65

[illegible]

[illegible]

آپ کا خط مورخہ ۲۶ شوال المکرم جس کے ساتھ دو رسید بھی ہیں موصول ہوا۔ اور اس کے جواب میں آپ کی ہدایات کے مطابق عرض کر رہا ہوں۔ میں ان شاء اللہ ۱۱ اور ۱۲ مارچ کو ڈاک بنگلہ چھپا ہاؤس میں مقیم ہوں گا۔ اس کے بعد ۲۱ مارچ تک پروگرام غیر یقینی ہے کیونکہ درمیان میں مجھے اپنے گاؤں حیدرآباد جانا ہے۔ اگر آپ ۱۲ مارچ کو بوقت ۷ بجے چھپا ہاؤس میں تشریف لا سکیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ آپ سے گفتگو ہو سکے گی۔ دعا کے وقت مجھے یاد رکھیے گا۔ فقط والسلام

قاضی احسان احمد صاحب — نیازمند

امام و خطیب جامع مسجد شجاع آباد — عبدالوحید خان

---

۷ سید انیس شاہ جیلانی کا خط

محمد آباد۔

6/3/1965

قاضی ما

وعدہ یہ تھا کہ سبی (کوئٹہ) سے لکھیں گا لیکن اب آپ شجاع آباد سے لکھتے ہیں، کہ

"وہی شب و روز کا سفر ہے اور وہی آپ کا احسان"۔ خدا یہ مسلسل سفر مبارک کرے مگر میں تو یہی کہوں گا کہ اب پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیے اور ردِ مرزائیت میں ایک عظیم کتاب مرتب فرما کر قوم و ملک کو زیر بارِ احسان کریں۔ اس موضوع کی اہمیت سے آپ بے خبر نہیں ہیں۔ یہ کام اگر آپ بھی نہ کر سکے تو کون کرے گا۔ تقریر کے غازی تو آپ ہیں ہی، اب ذرا تحریری جہاد کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی بے توجہی لائقِ تحسین نہیں ٹھہرے گی۔ یا پھر یہی اہتمام کیا ہوتا کہ اس موضوع پر آپ کی تقریریں چھپ جاتیں۔ بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا مگر ؂

"بزم کا رنگ دیکھ کر لب نہ مگر ہلا سکے"

اس وہم کا علاج ہو تو کیونکر، ہماری بزم کی رونق آپ کے دم سے تھی۔ آپ کے جاتے ہی رنگ اُڑ گیا۔ آپ کی بُری (حالانکہ کوئی بات بُری ہوتی ہی نہیں) بھلی سبھی باتوں پہ پیار آتا ہے اور بے اختیار آتا ہے۔ آپ یہ سوچتے ہی کیوں ہیں کہ آپ کے چاہنے والے نعوذ باللہ خفا بھی ہو سکتے ہیں۔ یقین جانئے میری تمنا یہ ہے کہ آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی سعادت حاصل کروں، خدا چاہے گا تو اب کی رمضان آپ کے پہلو میں گزاروں گا۔ اس کی حیثیت خود نوشت سوانح عمری کی سی ہوگی۔

خاکسار : انیس

---

(۸) جناب راحت ملک ایڈیٹر انچارج روزنامہ "زمیندار" لاہور

محترمی و مکرمی جناب قاضی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ لاہور آئے اور چلے بھی گئے۔ آمد کا علم نہ ہوا، اور جانے کا علم بھی اس وقت ہوا جب آپ شجاع آباد پہنچ چکے تھے۔ اب اگر میں گلہ کروں

تو بتائیے آپ کے پاس کیا جواب ہوگا۔ محبوب اور چاہنے والے میں ایک ہی ادا تو امتیازی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ سو آپ نے اس کا مظاہرہ کر کے ادائے دلبری سے ہمارے دلِ نالہ سنج کے لئے اشتیاق و محبت و خلوص میں اضافہ کر دیا ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

انہیں ہے قافلے والوں سے نسبت
ہمیں نسبت ہے گردِ رہگذر سے

یہ شعر میں نے آج سے تین سال قبل کہا تھا۔ آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اسے آپ ہی کے لئے موزوں کیا تھا اور یا پھر اس وقت آپ ع

آتے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا

والے ریکارڈ کے ایک مصرع کے مصداق ہیں۔

محبوب قاضی صاحب! شاید آپ کو اپنی اس ادا کا احساس نہ ہوتا ہو لیکن آپ غور فرمائیں کہ خلوص و محبت کے جو نقوش آپ دورانِ ملاقات و خطابت دلوں پر منقش کرتے ہیں، اس کے بعد ذرا اپنی اس ادائے بے رخی کا ہلکا سا تصور بھی ذہن میں لائیے تو شاید احساس کی دبی ہوئی چنگاری چشمِ زدن میں جگمگا اٹھے۔ آپ کا مقام ہم ناچیز لوگوں کی نگاہوں میں کیا ہے، شاید آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ آپ تو ہمیں راستے کا سنگِ میل سمجھ کر گذر گئے لیکن ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں ہوتے ہوئے آپ کی چشمِ التفات کے بھوکے ہیں۔ دریں حالات آپ کا آنا اور چپکے سے چلے جانا، بتائیے تکلیف دہ ہے یا نہیں؟ اور اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے۔ اگر آپ مجھے مجاہد صاحب کو کہہ کر ٹیلیفون ہی کر دیتے تو میں دنیاداری کے تمام دھندے چھوڑ کر فوراً حاضرِ خدمت ہو جاتا لیکن ع

ہم کو اُن سے ہے وفا کی اُمید......؟

دوسرا مصرعہ آپ خود مکمل کر لیجئے۔ قاضی صاحب خدا آپ کو صحت، مسرت، دولت اور لمبی عمر عطا فرمائے اور خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے آمین۔ مجھے آپ نے جیت

لیا، آپ کے خلوص نے مجھے شکست دے دی۔ میں نے زندگی بھر خلوص اور محبت میں کسی سے مات نہیں کھائی تھی، آپ نے مجھے شکست دے دی۔ آپ نے مجھے جیت لیا۔ خدا آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے آمین، ثم آمین۔ آپ نے مجھے صراطِ مستقیم دکھائی۔ خدا آپ کے اہل وعیال پر مسرتیں اور رحمتیں نازل کرے آمین۔

سنائیے آج کل کیسے گذر رہی ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

میری طرف سے تمام احباب کو سلام۔

مخلص :- راحت ملک

ایڈیٹر انچارج روزنامہ زمیندار پوسٹ بکس ۲۷۴ لاہور

---

(۹) مولانا کوثر نیازی مرکزی وزیر اوقاف، حج و اطلاعات پاکستان کا خط

حضرت گرامی! سلام و رحمت

آپ تو بھول گئے! مگر "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار" کے مصداق میں نہیں بھولا۔ "شہاب" کی رسید بک بھجوا رہا ہوں۔ ایک پرت کاٹ کر دینا ہے دوسرا اپنے پاس رکھنا ہے اور ہمیں نام، پتے کی اطلاع بذریعہ خط۔

شجاع آباد کی ایجنسی بھی ابھی تک قائم نہیں ہوئی۔ آپ مجھ پر جو بے تکلفانہ شفقت فرماتے ہیں، اس کے سبب آپ کے ایک ہی بار ارشاد فرمانے سے اس زحمت دہی کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔

ملتان آ تو رہا ہوں مگر خدا جانے! زیارت ہو گی کہ نہیں۔ بہرحال شجاع آباد کا ایک سفر میرے ذمہ ہے۔

کوثر نیازی

لاہور۔ ۱۰/ اپریل ۱۹۶۵ء

(۱۰) انگلینڈ سے ایک خط

24 OCT 1965

محترم مکرم جناب قاضی صاحب جی

آپ کا محبت بھرا خط ملا۔ آپ نے جو راجستھان سے لے کر آزاد کشمیر کا دورہ کیا ہے، اس دوران آپ کی لاہور کی تقریریں یہاں سُنی گئیں تھیں۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں ہمارے مُلک میں آپ جیسی اگر دینی شخصیتیں رہیں تو اللہ تعالےٰ ہماری مدد کرے گا جس کا بڑا سبب کہ ہمارا مطالبہ جائز ہے اور ہم حق پر ہیں۔ انگلینڈ میں مقیم کشمیریوں اور پاکستانیوں نے لاکھوں پونڈ پاکستان ریلیف فنڈ میں چندہ دیا۔ ہزاروں جوان یہاں سے پاکستان پر جو بزدلانہ حملہ ہوا ہے، ہندوستان کے خلاف جنگ لڑنے کیلئے بالکل تیار بیٹھے ہیں بلکہ اشارہ کے منتظر ہیں۔ میری دعا ہے، خداوند کریم ہمارے پاکستان کا نام ہمیشہ کیلئے بلند رکھے۔

نیز میں خیریت سے ہوں۔ صرف آپ کی دعا کی ضرورت ہے۔ میرے گھر اور امی سے آپ کو دعا بندگی قبول ہو۔ ہم آپ کی سلامتی کیلئے ہمہ وقت دعا گو ہیں۔

فقط۔ والسلام

دعا گو

فضل حسین، برمنگھم۔ انگلینڈ

(ج) دورانِ علالت بعض احباب کے خطوط

(۱) جناب منظور ملک، ایڈیٹر روزنامہ "کوہستان" ملتان

بسم اللہ

قصور

26.4.66

مکرم و محترم قاضی صاحب۔ السلام علیکم

آپ سے تعلق خاطر میرا سرمایۂ حیات ہے اور جب جی چاہا، اس سرور سے لُطف اندوز

ہوا ہوں۔ ایک طویل عرصہ بعد جذباتِ مروّت و الفت کو تازہ کرنے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو بیمار دیکھ کر دُکھ پہنچا۔ اپنے احساسات کے اظہار کے لئے الفاظ کی طرف سے تہی دامن ہوں بس "بلے زبانی ہے زباں میری"۔

اللہ تعالےٰ آپ کو جلد صحتِ کاملہ عطا کرے اور صحت و تندرستی والی لمبی عمر عطا کرے آمین۔ آپ تندرست ہو جائیں تو کسی روز حاضر ہو کر فیض حاصل کروں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

والسلام مخلص

منظور ملک

تمغۂ شجاعت۔ ایم۔ اے

ڈویلپمنٹ افسر بنیادی جمہوریت قصور

---

(۲) ایک منہ بولی بہن کا خط

سلانوالی

30.4.66

محترم بھائی

سلام و رحمت۔ اخبارات و رسائل کے مطالعے سے آپ کی علالت کی خبر پڑھ کر سخت پریشان ہوں۔ یہاں سب خورد و کلاں، عورت و مرد آپ کی صحت کیلئے دعا کر رہے ہیں میں بھی اپنی گنہگار جبیں کو ربِّ محمدؐ کی چوکھٹ پر رکھ کر اپنے بھائی کے لئے یوں شب و روز دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالےٰ ! برادرِ مکرم قاضی احسان احمد صاحب مدظلہ العالی کو ، ملک و ملّت اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے تادیر زندہ و سلامت رکھ۔ انہیں صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرما۔ آمین یارب العٰلمین۔

مکرّم بھائی ! ان چند لفظوں کے سوا اور کچھ لکھا نہیں جاتا۔ میری بھابی جان (اللہ کرے اُن کا سہاگ قائم و دائم رہے۔ آمین) اور میرے بھتیجوں کو سلام

بچوں کو پیار۔ آپ کی مضطرب بہن

جنّت الفردوس

محمد رمضان حلوائی۔ سلانوالی ضلع سرگودھا

---

(۳) جناب محمد اجمل خاں صاحب لغاری کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجمل باغ 17.5.66

بخدمت مکرّمی و محترمی قاضی احسان احمد صاحب زاد لطفہٗ

سلام مسنون! مزاج شریف

آپ کی علالت اور صحت کی خبر بیک وقت اگلے روز اخبار میں دیکھنے میں آئی تشویش کے ساتھ ساتھ اطمینان ہوا کہ آپ رو بصحت ہیں۔

اپنی خیریت کے مفصّل احوال سے خوش فرمائیں۔

سیّد نور الحسن شاہ صاحب بخاری کی کتاب عادلانہ دفاع موصول ہوئی۔ مطالعہ کیا، خوب پایا۔ موصوف نے حق ادا کر دیا۔

آپ کا مقدمہ بھی نظر سے گذرا۔ معلوم ہوا کہ تحریر میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ کاش کچھ مدّت پہلے آپ نے اسکی طرف توجہ دی ہوتی۔ آج دلچسپ تصانیف ہمارے سامنے ہوتیں۔

محترم سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب اور آپ اس دور کے فنِ خطابت میں بالترتیب بادشاہ و وزیر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن دونوں نے اپنے فرمودات قلمبند نہ کئے۔

اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ میری تمنّا یہ ہے کہ بقیہ زندگی، قلم ہاتھ میں لیں اور دیرپا خدمت انجام دے جائیں۔ والسّلام

محمد اجمل لغاری

(۴) جناب آغا شورش کاشمیری کا خط

۲۰ر مئی ۱۹۶۶ء

برادرِ گرامی قدر! سلامِ خلوص

مولانا تاج محمود کے فون سے معلوم ہوا کہ آپ بیمار ہیں۔ اطلاع تو پہلے بھی تھی، کہ طبیعت آپ کی اچھی نہیں، لیکن جو روایت کل پہنچی ہے، اس سے سخت صدمہ ہوا۔ روح و دل سے آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کلی عطا فرمائیں۔ آپ کی تندرستی ہم سب کی زندگی ہے۔ باور کیجئے آپ سے جو تعلقِ خاطر ہے صورتِ حال سے آگاہ ہو کر دل سخت آزردہ ہو گیا ہے۔ میں ہی نہیں میرا گھر بار اور میرے دفتر کے تمام اہلکار آپ کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مطلع فرمائیں حقیقت یہ ہے کہ دینی محاذ پر ہمارا جو کارواں چل رہا ہے، اس کے آپ سردار ہیں اور سردار کی صحت پورے قافلہ کی صحت ہوتی ہے۔ والسلام۔

آپ کا اپنا
شورش کاشمیری

---

(۵) جناب محمد حسین صوفی۔ سی ایس پی کا خط

۱۹ ر گاف روڈ۔ لاہور — ۶ر جون ۱۹۶۶ء

مکرمی جناب قاضی صاحب

السلام علیکم۔ پچھلے دنوں ظہور احمد پنڈی والے کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت بہت علیل ہو گئی تھی۔ بارے یہ سن کر تسلی ہوئی کہ اب آپ خدا کے فضل سے رو بصحت ہیں اور ملتان سے واپس شجاع آباد تشریف لے گئے ہیں۔ دعا ہے کہ خدائے پاک آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے تاکہ آپ تبلیغِ اسلام کے سلسلہ میں اپنی مساعیٔ جمیلہ جاری رکھ سکیں

براہِ کرم اپنی موجودہ کیفیت کے بارے میں اطلاع دیں تاکہ مزید تسلّی ہو جائے۔
گذشتہ عید الاضحیٰ کے موقع پر گلستانِ فاطمہ میں عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ اتفاقاً عزیز نور الحق صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کا ذکرِ خیر بھی ہوا۔ ہمارا دونوں کا خیال ہے کہ آپ کو اپنی صحت کا خیال پہلے کی نسبت زیادہ رکھنا چاہیئے۔
دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کو تا دیر خدمتِ دین کے لئے زندہ و سلامت رکھے آمین۔
میری بیوی بھی اس دعا میں شریک ہیں اور آپ کی مزاج پُرسی کر رہی ہیں۔
جملہ احباب کو السّلام علیکم۔ عزیزان کو پیار۔

فقط

نیازمند

محمد حسین صوفی

---

⑥ مولانا قاضی محمّد زاہد الحسینی کا خط

۱۷ صفر ۱۳۸۶ھ

7.6.66

محترمی و مکرّمی زید مجدکم و عافاکم اللہ من شر النوائب

اخبارات سے جناب کی علالتِ طبع کا معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ ربِّ کریم بطفیل سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اُمّت کی قیادت کیلئے شفاءِ کاملہ عاجلہ سے سرفراز فرمائے آمین۔
خطبہ جمعہ میں اور درسِ قرآنِ حکیم کے بعد جناب کی صحتِ کاملہ کے لئے باقاعدہ دعا جاری ہے۔ اُمید ہے، لاکھوں ہتھیلیوں کو ربِ کریم خالی نہ چھوڑیں گے۔

والسّلام

مخلص خادم
قاضی محمد زاہد الحسینی
کیمبل پور

---

(۷) جناب صاحبزادہ عبدالحمید عباسی انکم ٹیکس آفیسر شکارپور (سندھ)

محترم و مکرّم و معظم جناب قاضی احسان احمد صاحب مدظلہم العالی

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ بندہ بعافیت اور طالب عافیت ہے۔ آپ کی علالت سے پریشانی اور فکر تھا۔ اب رسالہ میں آپ کی صحتیابی پڑھ کر اللہ پاک کا شکریہ ادا کیا۔ آپ باقیات الصالحات میں سے ہیں، اللہ پاک آپ کو تادیر سلامت رکھے اور آپ کے فیوض و برکات سے ہمیں بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

اب اس خوشی میں ایک پُرتکلّف دعوت ہو جانی چاہیئے، اور مجھے بھی اس میں یاد فرمائیں۔ گھر میں سب کی خدمت ماوجب۔ والسّلام

تحریر 29.7.66

بندہ عبدالحمید عفی عنہ

انکم ٹیکس آفیسر شکارپور

---

(۸) جناب سیّد مظفرّ علی شمسی، سیکرٹری ادارہ تحفّظ حقوقِ شیعہ لاہور

برادرِ معظم قاضی صاحب

سلام مسنون۔ آپ کی علالت کا پڑھ کر بڑی تشویش تھی۔ اللہ بطفیلِ محمدؐ و آلِ محمدؐ آپ کو جلد از جلد صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آپ کی ذات دوستانِ ختمِ نبوّت اور اور ملک و ملّت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ آپ کی تندرستی دشمنانِ دین کی موت ہے اللہ آپ کو صحت فرمائے۔ میں دُعاگو ہوں۔

بچوں کو پیار۔

دعاگو

مظفرّ علی شمسی

---

(۹) کالج کے ایک طالب علم کا خط

نحمدہٗ و نصلّی

حضرتی ادام اللہ فیوضکم والطافکم

ایک مدت سے کوشاں تھا کہ آپ کو خط لکھوں۔ مگر کچھ تو قرب امتحان کے باعث عدیم الفرصتی اور فکر و ذکر کی باہم ناچاقی اور کچھ حجاب مانع آیا کہ زمانے کی رواں دواں جوئبار سے ایک کنارا خطاب کرے بھی، تو آغاز کس سے کرے، کہاں سے کرے۔ نہ آداب سے واضح نہ القاب سے آگاہ، نفسِ مضمون پر ضبط تو دُور کی بات ہے۔ اگلے روز "نوائے وقت" میں آپ کی "بحالیٔ صحت کی درخواست دعا" کا اعلان پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا اور میں آپ کے ارشاد کی تعمیل پر یہ سوچ کر مجبور ہو گیا ؎

میرا وعدہ تری نگاہ نہیں

اپنے وعدے پر برقرار ہوں میں

آپ کی تندرستی کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ الٰہی اگر سلف کی یہ تابندہ یادگاریں بھی امتدادِ زمانہ اور حوادثِ زماں کے سامنے سپر انداز ہو گئیں تو پھر تیرے محمد عربی کے دینِ حنیف پر تن من دھن نچھاور کرنے والے فرزانے اسلام کی قندیل کو کیونکر روشن رکھ سکیں گے۔ والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ننگِ اسلاف

انوار احمد بگوی متعلم ایم بی بی ایس، سال پنجم۔ لاہور

---

(۱۰) حفیظ رضا پسروری کا خط

لاہور | باسمہ العزیز | ۱۷ ذوالحجہ

گرامی قدر! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مکتوب گرامی عید سے ایک روز قبل پسرور مل گیا تھا۔ اس خط سے مجھے کس قدر

مسرت ہوئی ہے کہنے یا لکھنے کی بات نہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ؂

طوفان کی آغوش میں نیند آنے لگی ہے
نزدیکیٔ ساحل کی حدیں اور گھٹا دو

مجھے اُمید ہے کہ یہ سلسلہ لُطف و کرم جاری رہے گا۔ آپ کی پھنسیوں کی تکلیف سے متعلق پڑھ کر از حد فکر ہے۔ دُعا ہے، اللہ پاک آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائیں آمین۔ براہِ کرم موجودہ کیفیت سے مطلع فرمائیں۔

آپ کی دعوت کا صدقِ دل سے شکر گزار اور احسان مند ہوں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں اور اس کے بعد ان تقاضوں نے دل کی کئی خواہشیں دبا کر رکھ دی ہیں۔ آپ کی ملاقات کے لئے دل ہمیشہ تڑپتا رہا ہے اور اب بھی عالمِ ضبط و عالمِ فریاد میں آپ کی یاد اور احسان نوازی میرے ساتھ قدم بہ قدم چل رہی ہے۔ انشاء اللہ، مستقبل قریب میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ اس عرصہ میں لاہور تشریف لائیں تو قیام کے لئے غریب خانہ کو اگر منتخب فرمائیں تو عین کرم ہوگا۔

آپ کا اپنا

حفیظ رضا پسروری

حصّہ دوم

اس حصّہ میں حضرت قاضی صاحب مرحوم کے بعض خطوط کو نقل کیا جا رہا ہے جو انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور متعلّقین کو لکھے۔ ان خطوط میں قارئین اندازہ کر سکیں گے کہ قاضی صاحب کا انداز تحریر و تخاطب کیا تھا۔ نیز وہ خطوط کو صرف ذریعۂ نصف ملاقات ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مخاطب کو نیکی کی تلقین، بُرائی سے اجتناب، پریشانی و تفکّر سے بے خوفی، مسرّت و شادمانی میں یادِ خداوندی کو اپنائے رکھنے کی ترغیب دیں۔ ابتداً خیال تھا کہ قاضی صاحب کے خطوط کو جو انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف اصحاب کو لکھے، یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کروں کیونکہ ہر خط میں ایک سبق ہے، لیکن ایسا نہ کر سکا۔ ان خطوط میں بیک وقت آپ کو مخاطب سے قاضی صاحب کا تعلّقِ خاطر، اسلام و ملک سے محبت، دعائیں اور خلوص کی بہاریں نظر آئیں گی۔ آئیے ہم سب ان بہاروں کی لطافتوں سے محظوظ ہوں۔

نور الحق

(۱) حضرت مولانا محمد سعید صاحب[1] امام و متولی شاہی مسجد کروڑ پکا کے نام خط

برادرِ مکرم و معظم مد فیوضہم

السّلامُ علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

برادرِ عزیز مولوی محمد عمر صاحب معہ عطیہ تشریف لائے۔ عنایت نامہ ملا ۔ پڑھا ۔ الحمد للہ ہم سب بعافیت ہیں، اور آپ سب کی خیریت کے طالب۔ عزیزم قاری صاحب سلمہ ربہٗ کا خط میرے پاس نہیں آیا۔ باقی رہا ان کی تراویح سنانے کا مسئلہ تو بھائی جان ! وہ بفضلہٖ تعالیٰ خود مختار ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کی پسند کو ترجیح دی ہے اور انشاء اللہ تا زیست ایسا کروں گا۔ باقی رہا میری رائے کا معاملہ، اپنے دل کی کہوں، سُنئے اور میرا پاگل پن ملاحظہ فرمایئے۔ جی چاہتا ہے، ایک لمحہ نور العین اعنی نُور الحق سلمہٗ کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دوں عمدہ کھلاؤں، پہناؤں۔ جس طرح ابّا جان مجھے جھڑکتے تھے، جھڑکوں۔ رُوٹھوں، وہ مجھے منائیں پھر گود میں لے کر چُوموں۔ جس طرح میں ابا جان کی گود میں لیٹ جاتا تھا، نُور الحق کو گود میں لٹا کے بھینچوں۔ غرضیکہ ایسے ہزاروں تصوّرات ہیں، اور یہ میرے وہ خواب ہیں جن کی تعبیر محال ہے۔ بہر حال دل ٹھنڈا ہے کہ نور الحق سعید الفطرت اور صاحب حیا و حلم بیٹا ہے۔ ربّ العزّت اس نونہال کی بہارِ جانفزا سے ہی اس عاجز کو اور سارے خاندان کو مسرور رکھے۔ آمین۔ بھائی جان میں پیاسا ہوں۔ یہ بات دانستنی تو ہے لیکن گفتنی نہیں ۔ خیر میں بہت دُور نکل گیا ؎

راضی ہوں میں اسی میں جس میں تری رضا ہو

نلکہ کی مشین تیار ہے، لیکن پانی کتنا گہرا ہے، پائپ کتنا لگے گا، اس سے بے خبر ہوں۔ آگاہی بخشیں۔ چوہدری صاحب کے نام عریضہ ارسالِ خدمت ہے۔ یہاں سب گھر والوں کی طرف سے ہدیہ دعوات و سلام و نیاز و پیار۔

---

[1] راقم الحروف کے والد ماجد مدظلہ

برجیس بتول بہت ستاتی ہے۔ اب خیر سے پلنگ سے گرنے کی مشق فرمائی جارہی ہے پوچھتا ہوں۔ کچھ کھایا ہے۔ سر ہلا دیا جاتا ہے نہ نہ نہ نہ۔ بسکٹ کھائے ہیں۔ نہ نہ نہ نہ۔ دودھ پیا ہے نہ نہ نہ نہ۔ دونوں ہاتھوں سے تالی پیٹنا خوب آگیا ہے اور سلام کرنا بھی۔ آپ کی بیٹی کو بخار ہے۔ اس کیلئے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

دعاگو و دعاجو :۔ احسان احمد عفی عنہ

[illegible]



قاضی احسان احمد

قاضی جامعہ مسجد

شجاع ۔ آباد

برادر مکرم و معظم مد ظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

برادر عزیز مولوی محمد عمر جان صاحب عطیہ تشریف

[illegible]

[illegible]

ایسے ہزاروں تصورات ہیں۔ اور یہ میرا وہ خواب ہے کہ جس کی
تعبیر محال ہے۔ بہرحال عرض کرنا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے سعید الظفر سلمہ
جیسا حیا و حلم بیٹا ہے۔ رب العزت اس خوش حال کی بہار جانفزا
سے ہی اس عاجز کو اور سارے خاندان کو مسرور رکھے آمین۔ بھائی جان
میں پیاسا ہوں۔ یہ بات دانستنی تو ہے۔ لیکن گفتنی نہیں۔ خیر
یہ بات دور نکل گئی ہے۔
راتیں ہوئی میں اسی پر جس میں تر جا رہا ہے
نکلا کا نقشہ تیار ہے۔ لیکن پانی کٹ گیا ہے۔ یا شاید کٹ گیا
اس سے بے خبر ہوں۔ آغا جی نقشہ چوہدری صاحب کے نام سفارش کی
خدمت ہے۔

میاں صاحب، عزیزوں لیکھ صاحب بہ دعوات و سلام و نیاز و پیار

ہر جیسی شعوان بہت [illegible] ہے اب
خیر بلینک سے گزرنے کی مشق [illegible]
پوسٹ پہ [illegible] دیا جاتا ہے
[illegible] بلکہ تماشہ [illegible] دودھ پیا ہے
[illegible] دودھ شعور سے [illegible] خوب آتا ہے
[illegible] سلام کرنا بھی۔ آپ کی بیٹی کو پیار۔ انکے لئے خصوصی دعا کی درخواست

[illegible]

(۲) برادرم منظور احمد صاحب مغل ریڈیو سروس کوئٹہ کے نام خط اُن کے بچے کی ولادت پر

۵ جنوری
عزیزم زاد اللہ درجاتکم

وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آسمان کے تاروں، کائنات کے درختوں کے پتوں اور پھولوں، سمندروں کے قطروں

سے بھی زیادہ مبارکیں ہوں اور میرے پیارے بیٹے[1] اور میری پیاری بیٹی[2] اور یہ پھول کھلے، اور ملک و ملّت کو اپنے پیارے اخلاق اور پاکیزہ سیرت سے مہکا دے۔ آمین ثم آمین۔

جس طرح اس فرحت بخش تار نے ہمارے گھر میں عید کرائی ہے شاید کبھی ہوئی ہو۔ خیر آتیں، دعائیں، مبارکبادیں، غرضیکہ ہمارے اعزہ اور احباب نے حیرت سے پوچھا کہ یہ سب کچھ کس تقریب میں ہو رہا ہے۔ عرض کیا گیا۔ پوتے کی ولادتِ باسعادت کی مسرت میں۔

ہماری التجا بارگاہِ الٰہی میں یہ ہے کہ قادر کریم زچہ و بچہ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اب یہ دعا ہے کہ یہ نیک ہو اور اس کی عمر دراز ہو۔ ہم سب کی طرف سے وہاں سب کو درجہ بدرجہ بترتیب مدارج ہدیہ سلام مسنون کے بعد مبارکباد عرض کریں۔ میری تجویز..... خالد سیف اللہ کی تھی۔ طاہرہ بتول، مسرور احمد پکار رہی ہے۔ تمہاری امّی کہتی ہیں جو مدینہ طیبہ والی مائی کہہ گئی ہے، وہی رہے۔ اچھا خاصا پرابلم بن گیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ جو آپ لوگوں کو منظور ہو، ہمیں وہی منظور ہے۔ میں تو خیر نورِ نظر ہی کہوں گا۔ ہاں کوئی حرکت خلافِ شریعت نہ ہو۔ جس نے عطا کیا ہے اس کے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ محمد افضل بھی محبت بھرے سلام اور دعائیں دے رہے ہیں۔

عزیزہ زبیدہ سلمہا کی صحت کا خاص خیال رکھیں اور مفصل حالات سے جلد آگاہی بخشیں۔

والسّلام

دعاگو

احسان احمد عفی عنہ

---

[1] راقم الحروف کی لڑکی [2] منظور صاحب

[3] اہلیہ منظور صاحب

(۳) جناب مولوی عبدالرحمٰن ابنِ انور مدرس مدرسہ تعلیم القرآن منچن آباد کے نام خط

۲ر جمادی الثانی بشرفِ نظر عزیز القدر زید مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خیریت نامہ ملا۔ رب العزت ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے سلامت بعافیت رکھے اور ہمارے محبوب وطن کو کفار ناہنجار کے تمام حملوں وسازشوں سے محفوظ ومامون رکھے الحمدللہ کہ افواج پاکستان مظفر ومنصور ہوئیں اور دشمن خائب وخاسر ہوا۔ زیارت روضۂ اقدس مبارک ہو۔ انشاء اللہ اس مقدس خواب کی تعبیر بھی مبارک ہوگی۔ مبارک، مسرت مبارک۔ فی الحال پروگرام ملتوی ہیں۔

والسلام دعاگو

احسان احمد عفی عنہ

---

(۴) یہ خط حفیظ رضا پسروری کے نام ہے۔ جس میں قاضی صاحب مرحوم نے اپنے متعلق حفیظ صاحب کے ذاتی مشاہدات" شائع شدہ ۹ر ستمبر ۱۹۵۶ء ——— روزنامہ نوائے پاکستان لاہور" (جسے گلدستہ احباب" کے باب میں آپ پڑھ آئے ہیں) پڑھ کر سپردِ قلم کیا۔

۱۲ر صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

برادر مکرم! وعلیکم السلام

مجھے حکم نامہ ملا۔ میری انتہائی خواہش وکوشش کے باوجود زیارت نہ ہوئی۔ جناب کی قلم کاریوں سے مجھے تکلیف ہوئی۔ احقر ترین کائنات کے چہرے؟ پیارے محتاجِ دعا ہوں۔ اُس دن چہرہ روشن ہو۔ جب کئی چہرے سیاہ کر دیئے جائیں گے، اور کئی روشن۔ خیر میں جب لاہور آیا، زبانی لڑائی ہوگی

مطلوبہ تاریخ نہیں دے سکتا۔ ۱۱ر اکتوبر کو آپ کی بھتیجی طاہرہؓ بتول کی شادی ہے اور آپ کو معہ اہل و عیال شریک ہونا ہے۔ اسے التجا سمجھیں یا حکم۔ بہر حال حاضری دینا ہوگی میں کوئی موزوں تاریخ مقرر کر کے اطلاع دوں گا۔ عزیزان کو پیار۔ از اندرون بہ اندرون دعوات۔

بہ بارگاہِ مجاہد ہدیۂ سلام مسنون و مضمون واحد۔ دعاگو

احسان احمد عفی عنہ

---

(۵) خواجہ عبدالقدوس ملتان کے نام

برادرِ مکرم! السلام علیکم۔ آپ سے رخصت ہو کے آیا تھا کہ لاہور سے تار آیا۔ تمام کتابیں اور فائلیں لے کے جلدی پہنچو۔ اسی وقت تیار ہو کے بذریعہ کوئٹہ پسنجر لاہور روانہ ہو گیا۔ صبح معلوم ہوا کہ چیف جسٹس صاحب وہ تمام حوالہ جات اصل دیکھنا چاہتے ہیں جو تمام مسلمانوں نے اپنے اپنے بیانات، جرح یا بحث میں پیش کئے ہیں۔ بحمد اللہ تعالےٰ تمام کے حوالہ جات پیش کر دیئے گئے۔ مجھے میرے محسنوں نے فرمایا کہ تجھے مبارک ہو۔ تو نے

اسلام کا کیس مکمل پیش کر دیا ہے۔ پیارے بھائی! اس مبارک باد کے اصل مستحق آپ ہیں اللہ تعالےٰ تمہاری پریشانیاں دور فرمائے اور اطمینانِ قلب عطا فرمائے آمین۔ لاہور سے فارغ ہو کے یہاں آیا۔ لاہور سے چٹھی لکھی تھی کہ جناب اسٹیشن تک آجائیں۔ میں نے میل میں سفر اس لئے کیا تھا کہ آپ کو اسٹیشن تک آنے میں آسانی ہوگی۔ اسٹیشن پر بہت ڈھونڈا مگر زیارت نہ ہو سکی۔ سامان اسٹیشن پر چھوڑ کر شہر گیا۔ دکان سے پتہ چلا کہ کراچی تشریف لے گئے ہیں گھر آیا۔ آپ کی ہمشیرہ کے وضع حمل کے ایام قریب ہیں، اور صحت اس کی ویسے بگڑی ہوئی ہے۔ میں نے فقیر والی وعدہ کیا ہوا تھا وہاں گیا اور ۲۳ر مارچ رضیہ بیگم اہلیہ مخدوم زادہ حسن محمود کی قل خوانی تھی۔ اس میں تمام سرحد، سندھ، ریاست

اور پنجاب کے وزرار، امرار، مخادیم شریک تھے۔ قل خوانی میں شریک ہوا۔ مخدوم زادہ سخت مغموم ہیں۔ مَیں نے آپ کی طرف سے بھی تعزیت کر دی تھی اور کہا تھا کہ وہ بہاولپور سے ہو گئے ہیں اور اس رنج و غم میں برابر کے شریک ہیں۔ آج واپس آیا ہوں۔ جمعہ پڑھا کے ایک دن کے لئے مجھے میانوالی جانا ہے۔ سخت اُداس ہوں، دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کے رقعہ جات ملے۔ میرے لاہور جانے سے پہلے محترم و مکرّم خواجہ صاحب..... (عبدالقدوس کے والد صاحب مراد ہیں) سے یہاں گفتگو ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ میرے دل میں اس کی بہت عزّت ہے، مگر تمہارا بھائی زود رنج ہے، بات برداشت نہیں کرتا۔ میں نے کہا۔ مظلوم اور سچّا کیا کرے۔ آپ اُسے فریاد کا حق بھی نہیں دیتے۔ کہنے لگے، مَیں اُسے گلے لگاؤں گا۔ روپے چھپانے کے متعلق مجھے عبدالقدوس سے کوئی گِلہ نہیں۔ عبدالحمید کے ایسے الفاظ سُننے میں آئے تھے، پتہ نہیں پھر کیا ہوا۔ احوال سے آگاہی بخشیں۔ میری ہمشیرہ اور بچوں کی صحت سے بھی مطلع فرمائیں۔ از اندرون بہ اندرون دعوات۔ احباب کو سلام مسنون۔

دعاگو

آپکا احسان احمد عفی عنہ

(۶) قاضی فیض احمد، ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام

۲ر اپریل

عزیزم! کل گھر سے برائے جامعہ رشیدیہ روانہ ہوا۔ سرگودھا پہنچا۔ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ تمام عالمِ اسلام یتیم ہوگیا۔ میرے پیارے! یہ پورے عالم کی موت ہے۔ سیدھا لاہور پہنچا۔ جنازہ بذریعہ ہوائی جہاز دہلی روانہ ہوا، جہاں حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت مولانا، اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں حضرت نظام الدین اولیاء دہلی کے مقدس گورستان میں دفن کر دیئے گئے۔ سارا لاہور ہی نہیں ساری دُنیا کے دین سے محبت رکھنے والے مسلمانوں نے اس صدمۂ عظیم کا غم محسوس کیا ہے۔ میں تمہارے حکم کی تعمیل اس صدمہ کی وجہ سے نہیں کر سکا۔

(قاضی صاحب کا صدمہ خط ہی سے ظاہر ہے کہ آخر میں اپنا نام، سلام و دعوات تک لکھنا بھول گئے)۔

قاضی فیض احمد اور ان کی اہلیہ کے نام خطوط

میں نے بھائی فیض احمد سے حضرت قاضی صاحب کے خطوط مانگے۔ انہوں نے تیس کے قریب خطوط بھیج دیئے۔ انتخاب میری صوابدید پر رکھا۔ ان خطوط میں میاں بیوی کے نام علیحدہ علیحدہ خطوط بھی شامل ہیں۔ جن میں دونوں کو اپنے اپنے طور پر ہدایت کی گئی ہے۔ غالباً میاں بیوی میں بعض اشیاء کی خرید و فروخت کا جھگڑا تھا۔ قاضی صاحب کو معلوم ہوا، تو انہوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے کی تلقین فرمائی۔

مرتّب

(۷) فیض احمد صاحب کے نام ۴؍شوال المکرم

نورِ چشمی ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

واحد بخش تمہاری اُمّی والے پیسے ۱۴۵ روپے لایا تھا، جو تقسیم ہو گئے۔ کنوں اور مالٹے عید کے دن کام آئے۔ عید گاہ میں تاریخی اجتماع تھا، میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا عید گاہ جو ۴ ایکڑ رقبہ میں ہے ناکافی رہی۔ صفیں باہر تھیں الحمد للہ۔

تمہارا کمانا اہل وعیال کے لئے ہے۔ اگر رفیقۂ حیات کی رضا کے لئے چار پیسے خرچ ہو جائیں تو کوئی قیامت نہیں آجاتی۔ اللہ تعالےٰ زیادہ رزق میں برکت عطا فرمائے گا۔ میں تمہاری امّی کی رضا کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ میرے میاں! اِن کی راحت کے لئے تو جھوٹ عبادت بن جاتا ہے۔ سمجھے آپ۔ میرا دوسرا عریضہ میری بیٹی جی کو دے دینا۔ سارے گھر والوں کی طرف سے بہت بہت دعائیں۔ طاہرہ بتول معہ بچوں کے لاہور گئی ہیں، صرف بلقیس ہمارے پاس ہے۔ میں ایک ہفتہ کے لئے سندھ جا رہا ہوں۔ بجملہ بزرگان وعزیزان نام بنام سلام مسنون۔

دعاگو احسان احمد عفی عنہ

---

(۸) اہلیہ محترمہ فیض احمد کے نام خط ۴؍شوال المکرم

میری پیاری بیٹی جی! السلام علیکم

آج پہلی دفعہ اپنی بیٹی کو خطاب کر رہا ہوں۔ میں تم سے ہر حال میں راضی ہوں اور تمہاری دونوں جہانوں کی سرخروئی اور سرفرازی کا طالب ہوں۔ بیٹی جی! مرد کو ڈھانپے عورت اور رُسوا کرے عورت۔ جس خاوند کی اطاعت و رضا کے لئے اقربا چھوڑ دیئے، اس کی رضا کے لئے اگر چند غیر ضروری یا ضروری اشیاء ترک کرنی پڑیں تو اللہ تعالےٰ بہت بہت اجر عطا فرمائیں گے۔ عزیزم فیض احمد صاحب ہمیشہ ہمیشہ تمہارے مدّاح اور خوش رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اس مسرت کو سلامت بعافیت رکھے۔ اور تمہارے گھر سے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ

آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت میسّر آئے آمین۔ تمہاری امّی تمہیں دعائیں دے رہی ہیں۔ میری نواسیوں اور نواسوں کو کاکل بوسی و دیدہ بوسی۔

والسّلام دعاگو احسان احمد عفی عنہ

---

(۹) مرتب کے نام ایک اہم خط

میرے نام حضرت قاضی صاحب مرحوم کے اس قدر خطوط موجود ہیں کہ اگر انہیں الگ کتابی شکل میں شائع کروں تو اس سے ان کی محبت کے مختلف گوشے ظاہر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اُن خطوط میں میری توصیف کا پہلو نکلتا ہے۔ میں نے کوئی کتاب لکھی، کسی اخبار میں مضمون چھپا، ریڈیو سے تقریر نشر ہوئی، قرآن سُنایا، تراویح پڑھائیں، غرض کوئی موقع ہو وہ حد درجہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اِن وجوہات کی بنا پر اُن خطوط کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جو خط یہاں نقل کر رہا ہوں اس میں ایک ایسے معاملہ کی نشاندہی کی گئی ہے جس میں مرحوم شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری مرحوم اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہ ناظم جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کا، جناب آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان لاہور کی مسلسل بے رحمانہ پالیسی کے خلاف بیان دینے پر اتفاق تھا، مگر قاضی صاحب مرحوم اپنی نرم خو پالیسی اور عفو و درگذر کے میلان کے پیش نظر نہ صرف خود بیان دینے سے بچے رہے بلکہ تینوں بزرگوں کو بھی آغا صاحب کے خلاف بیان دینے سے مانع رکھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر قاضی صاحب مرحوم آج زندہ ہوتے اور اپنے اس "جماعتی بھائی" کے بے رحمانہ قلم کی جولانیاں جو کئی سال سے "اغیار" سے داد وصول کر رہی ہیں، ملاحظہ کرتے، تو شاید اپنے سابقہ موقف سے منحرف ہو جاتے اور تینوں بزرگوں کی سیاسی بصیرت کے قائل ہو جاتے۔ میں ایک ایسی جماعت سے منسلک ہوں جس کے قائدین کا وجود آغا صاحب کے نزدیک "گالی" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب نے دورانِ انتخاب

ملتان میں طلباء کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے راقم الحروف کے متعلق بھی یہ ارشاد فرمایا تھا کہ :۔

"قاضی احسان احمد شجاع آبادی زندگی بھر تحریکِ ختمِ نبوّت کی اپنے خون سے آبیاری کرتے رہے مگر ان کا ایک عزیز قاری نورالحق خدا دشمن نظام کے علمبرداروں کے جھنڈے تلے چلا گیا ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ "ندائے ملّت" لاہور ۲۴ مئی ۷۰ء صفحہ ۱ کالم ۱)

مجھے خدا دشمن نظام کے علمبرداروں کی فہرست میں شامل ہونے پر تعجب تو ضرور ہوا مگر اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر کسی تقریر یا تحریر میں آج تک آغا صاحب کی شان میں گستاخی کا کوئی کلمہ تک نہیں کہا، حالانکہ انتخابی تقاریر میں ہر خطیب کو معرکہائے خطابت دکھانے کا موقع میسّر تھا۔ اب جب کہ آغا صاحب نے خود ہی یاد فرمایا تو اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا کیونکہ آغا صاحب کو میری تیز و تند تقریروں کا علم تھا۔ مگر میرے سامنے آغا صاحب کے چہرے کا وہ تاثر گھوم گیا جب وہ آنکھیں نیچی کئے سول ہسپتال کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کو ان الفاظ میں خطاب فرما رہے تھے کہ :۔

"مفتی صاحب! آپ نے اور آپ کی جماعت نے جمعیۃ علمائے اسلام کے سٹیج سے تاریخی کانفرنس (مئی ۱۹۶۸ء) میں میری تقریر پر گرفتاری سے لے کر آج تک جس طرح بے مثال تعاون و مہربانی کی ہے، میں آپ کا تادمِ زیست خادم رہوں گا۔ میرا ایک باپ تھا جس کا نام عطاءاللہ شاہ بخاری تھا، میرا ایک بھائی تھا جس کا نام قاضی احسان احمد تھا۔ دونوں فوت ہو چکے ہیں آپ میرے باپ بھی ہیں اور میرے بھائی بھی۔"

مَیں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی ممبر قومی اسمبلی کی معیت میں چونکہ آغا صاحب کا عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان میں "صفائی کا گواہ" رہ چکا تھا، اس لئے "استغاثہ کا گواہ" بننا

پسند نہ کیا اور مہر بر لب رہا، اور اپنے چچا کی شان میں جوابی طور پر کسی گستاخی کا ارتکاب تک نہ کیا، حالانکہ چنیوٹ کانفرنس کے آخری اجلاس میں آغا صاحب کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان پر جس انداز میں مَیں نے نکتہ چینی کی تھی۔ آغا صاحب نے معلوم ہونے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا تھا۔ بہرحال ان سطور میں شکایت کا اظہار بادلِ ناخواستہ کرنا پڑ گیا ہے۔ جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خط کی فوٹو سٹیٹ کاپی پیش خدمت ہے۔

۵ر ذی الحجہ

نورِ نظر[1] سلمہ اللہ تعالے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خیال تھا کہ بھیرہ سے واپسی پر ملاقات ہو جائے گی۔ بخار ہی میں واپس آیا۔ دن کو جامعہ حمیدیہ میں تقریر کی اور رات کو دو بجے تک جامعہ رشیدیہ منٹگمری میں۔ شیخ صاحب، مولانا ہزاروی صاحب، مولانا جالندھری کو بیان دینے پر مُصر تھے۔ میں ہرگز ہرگز اس کے حق میں نہیں تھا۔ ایک بھائی کی بے عزتی ہو تو بھی میرا نقصان، دوسرے بھائی کے خلاف پروپیگنڈا میں بھی میرا ہی نقصان۔ بحمد اللہ تعالیٰ میں انہیں روکنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ آپ آغا صاحب کو کتاب پہنچا دیں۔ ان واقعات کا ذکر نہ کریں آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں نے گلی گلی قریہ قریہ "چٹان" کو اپنا پرچہ کہہ کے بیچا ہے۔ اب اس کے متعلق کچھ بھی کہنے سُننے کو ہلاکت سمجھتا ہوں۔ ڈھول ماہی کو آپ کا حکم نامہ سُنایا اور سمجھایا گیا۔ خُوب قہقہے لگائے۔ مگر عمل یہ ہے کہ نوری مسجد سے بھی آگے بڑھ کے شہر تک پہنچنے کا مبارک اقدام فرما چکے ہیں۔ اب ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہے، اور دربان نگران بیٹھے ہیں۔ آپ کی امّی پوچھ رہی ہیں، عید کا کیا پروگرام ہے۔ جرابوں نے راحت پہنچائی

---

[1] نورِ نظر اکرام الحق سلمہٗ مراد ہے۔

مجھے راحت پہنچانے والے کو میرا اللہ ابدی راحتیں عطا فرمائے۔ عبدالحمید صاحب ٹیلیفون پر پوچھتے تھے کہ کام کی رفتار کیا ہے۔ آپ انہیں ٹیلیفون کر لیں۔ والسلام۔

سارے گھر والوں کی طرف سے دعائیں۔

بلقیس پاس بیٹھی سلام لکھوا رہی ہیں (نشان انگوٹھا)

ڈھول ماہی کا تعمیل نامہ (نشان انگوٹھا)



قاضی احسان احمد امام شاہی جامع مسجد

شجاع آباد، پاکستان

نور نظر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

خیال تھا کہ معبیرہ سے واپسی پر ملاقات ہو کر جا سکی [illegible]

تمہارے ہاں میں واپس آیا۔ دل کو جامعہ حسینیہ میں تشریف کی [illegible]

اور [illegible]

شیخ صاحب مولانا ہزاروی [illegible]

بیان حدیث پر مشتمل تھے۔ میں ہر گز ہر گز اس [illegible]

میں ایسی تھا۔ [illegible]

دوسرے جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈا ایسی بھی ہے بعض اوقات

محمد اشرف تھا۔ میں ایک رنگین کتاب کا مسودہ دے گیا ہوں

آپ آغا خان کو کتب پہنچا دیں۔ اس واقعہ کا

ذکر نہ کریں۔ آپ مجھ کو جواب دیتے ہیں۔ کہ پیش گوئی مگر

تحریر تو یہ چیستان کو اپنا پرچہ کہہ کے بھیجا ہے

متعلق کچھ بھی کہنے سننے کو ہدایت کیجئے گا

کو آپ کا حکم نامہ ملا یاد رہا سمجھا گیا۔ خوب شعر تھے

لگا ہے۔ مگر عمل یہ ہے کہ تو ان کی بس آگے بڑھ کر شہر تک پہنچوں

کا پیار ہے اقدام فرما چکے ہیں۔ اس غریب کو جان کا دروازہ بند

ہے اور دربان تنگ کرنے بیٹھے رہے۔ آپ کی اس پر مجبوری بھی

عید کا کیا پروگرام ہے۔ جرابوں نے راحت پہنچائی۔ مجھے راحت

پہنچانے والے کو مرزا اسد اللہ ابو الحسن علا فرمائے۔ عبدالحمید صاحب

شیشیوں میں پیچ پھنستے تھے۔ کہ کام کی رشتہ رکھا ہے آپ اپنا

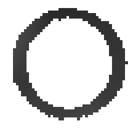
حمید
۵/۵ ۴۶ء

شیشیوں کا ریس۔ شاید ہے۔ ورق
تک ہے مگر بدوکون سیلوٹ دعا ہے

مجلس پاس بیٹھ سکتے کھوا دی ہے

در معمول ناہی کا تفصیل بتا ہے

⑩ قاضی صاحب کی زندگی کا آخری خط



یہ خط حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رحلت سے پورے دو ماہ قبل جب وہ علاج کے سلسلہ میں سلطان فونڈری بادامی باغ لاہور میں مقیم تھے اپنی بیگم کو خط لکھا۔ جس کی فوٹو سٹیٹ کاپی پیش خدمت ہے۔

لاہور

۲۰ ستمبر

میری مشفقہ و محسنہ رفیقۂ حیات! اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے

السلام علیکم۔ نورِ چشمی محمد علی خاں صاحب سلّمہٗ تشریف لائے۔ پردے گرنے اور پنکھا گرنے کی منحوس خبر خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میری بادشاہ بیٹی کی علالت کی خبر سے دل بیٹھ گیا۔ جی چاہتا ہے کہ اُڑ کے پہنچوں۔ "میڈی سائیں میکوں ڈاڈھی موجھ آئی ہے"۔ درد بدستور ہے۔ علاج جاری ہے۔ ہو سکا تو ہفتہ کے دن میں خیبر میل سے آؤں گا۔ اگرچہ جگر کے بہت بڑھ جانے کے بعد سفر کی، اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت ہے۔ مگر سخت اُداس ہوں۔ قطعی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون بھیجوں گا۔ اطمینان فرمائیں۔ مبلغ

چھ صد روپے ارسال خدمت ہیں۔ مجھے اداسی نے اور کمزور کر دیا ہے۔ کرنل امیر دین صاحب میو ہسپتال دیکھ گئے ہیں۔ اُن کی وہی رائے ہے جو نشتر ہسپتال والوں کی تھی۔ سب کو سلام۔ تمہارا پیارا بیٹا نور الحق سلمہٗ شب و روز خدمت میں لگا ہوا ہے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے حقِ اولاد ادا کر رہا ہے۔ میرا رُواں رُواں راضی ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑوں کو بہت بہت پیار و دعائیں۔ والسلام

دعاگو

تمہارا اور صرف تمہارا خادم

احسان احمد

[illegible]

بہت بڑا ہو جانے کے بعد کوئی اکھڑ جیسے
کہ کیا نعمت ہے۔ مگر بہت اداس ہو

کہ حق اولاد دادا کو پہنچا ہے۔ میرا دوان دوان پانی

ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو بہت محبت پیار

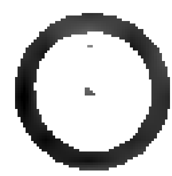
دو دعائیں۔ والسلام

دعاگو

تمہارا اور صرف تمہارا ابا قاسم

[illegible]

قاضی صاحبؒ کے آخری لمحات



جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ حضرت قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ شاہانہ طبیعت کے مالک تھے۔ شاہانہ طبیعت کا یہ انداز، نہ صرف لباس و خوراک اور رہن سہن تک محدود رہا، بلکہ جن احباب کو قاضی صاحب مرحوم سے دوران علالت ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی یقیناً تائید کریں گے کہ اُن کے سامنے میز پر مختلف ادویات بڑے سلیقہ اور خوبصورت انداز میں رکھی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک الماری مخصوص تھی جس میں ان کی دوائیاں ترتیب کے ساتھ رکھی ہوتیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی خوشی و غمی میں کسی حد تک مبالغہ آرائی سے کام لینے کے عادی تھے۔ وہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ۱۰۲، ۱۰۳ درجہ بخار کی حالت میں تقاریر کرنے اور سفر وغیرہ پر جانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

تکلیف کا آغاز اپریل میں ہوا۔ سب سے آخری تقریر مدرسہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں جہاد کے عنوان پر ہوئی۔ بعد کے جتنے پروگرام ڈائری میں درج تھے، ان کے لئے اخباری طور پر احباب کو اطلاع کرنا پڑی کہ حضرت قاضی صاحب تکلیف کی وجہ سے کسی جلسہ میں شرکت نہیں کر سکتے، لہذا انہیں معذور سمجھا جائے۔

ابتداً بخار اور جگر کی بیماری کی تحقیق شجاع آباد کے ڈاکٹر جناب محمد ادریس صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس نے کی اور انہی کی زیر نگرانی علاج شروع ہوا۔ اس دوران قاضی صاحب

کے احباب جب بھی آتے تو وہ قاضی صاحب کے سامنے میز پر پڑی مختلف ادویات دیکھتے تو ہنس کر کہتے۔ قاضی صاحب! جانے دو اب تو بیماری کا مکر چھوڑ دو۔ چنگے بھلے خواہ مخواہ بستر پر پڑے رہتے ہو۔ قاضی صاحب صرف مسکرا دیتے۔ اس جان لیوا بیماری سے قبل جب بھی قاضی صاحب بیمار پڑتے یا کسی مرض میں مبتلا ہوتے، مجھے موقع مل جاتا، تو کہتا کہ اب خدا کے لئے آرام کیجئے۔ دَوروں اور سفروں کو خیر باد کہہ دیجئے۔ تو اپنی زبان کو ہاتھ میں لے کر کہتے کہ شاہ جی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "جب تک یہ (زبان) چلتی رہے تم بھی چلتے رہو۔ اگر بیٹھ گئے تو پھر کبھی نہیں اُٹھ سکو گے۔" چنانچہ اب کی بار ایسا ہی ہوا۔ زبان تو چل رہی تھی مگر قاضی صاحب بیٹھ گئے تھے، اور ایسے بیٹھے کہ اُٹھ نہ سکے۔ البتہ اُٹھانے والوں نے اپنے کندھوں پہ اُٹھا کر قبرستان کی طرف منتقل کر دیا۔

مرض بڑھ رہا تھا۔ علاج جاری تھا۔ ایک ایک دن میں کئی ٹیکے لگوائے جاتے تھے۔ مگر مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران قاضی صاحب چل پھر لیتے اور بعض اوقات مسجد میں بھی نماز پڑھ لیتے۔ بیماری کے دوران، جب قاضی صاحب کے احباب ملنے آتے تو شعر و شاعری، طنز و مزاح اور بذلہ سنجی کی محفل گرم ہو جاتی، اور جب تک احباب کا جمگٹا رہتا، بزم آرائی جاری رہتی۔ بارے ان سے درخواست کی جاتی کہ آپ آرام فرمائیں کہ ڈاکٹر ہدایت کرتے ہیں۔ مگر ان کے کانوں میں جوں تک نہ رینگتی۔ پھر اہلِ خانہ نے یہ سوچا کہ ملنے والوں پہ پابندی لگا دی جائے۔ تاکہ وہ کسی طرح آرام کر لیں۔ جب اس پر عمل کیا جانے لگا تو پُرسانِ حال ناراض ہونے لگے، اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ خود قاضی صاحب نے ہمیں ہدایت کی کہ مجھے کسی سے نہ ملایا جائے بلکہ آرام کرنے دیا جائے۔ اب جب خود قاضی صاحب نے اہلِ خانہ کو کہہ دیا، تو یہ ہمارے دل کی بات تھی۔ ہم نے مقدور بھر کوشش کی۔ البتہ کوئی باہر سے اگر پہلی مرتبہ آتا تو قاضی صاحب

کی اجازت سے اُسے ملاقات کا موقع دے دیا جاتا۔

میرا خیال ہے، قاضی صاحب کی طرف سے ملنے کی ہدایت جہاں تکلیف کی زیادتی کی وجہ سے تھی وہاں اس وجہ سے بھی تھی کہ بعض منچلے جو صرف رونمائی کے عادی تھے، اُن کی طرف سے جب ملاقات پر اصرار بڑھتا اور بعض شرفا۔ تو اس حد تک بات کرنے سے بھی نہ جھجکتے تھے کہ "ہمارا نام لے کر کہہ دو کہ وہ آئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ آرام کر رہے ہوں تب بھی انہیں جگا دو"۔ اس پر ظاہر ہے کہ قاضی صاحب کے دل میں خفگی پیدا ہوتی اور اُنہوں نے ہدایت کر دی کہ آرام کی صورت میں مجھے بیدار مت کیا کرو۔ ایک صاحب جو ضرورت سے زیادہ قاضی صاحب مرحوم سے بے تکلّف تھے۔ انہوں نے ادیبانہ انداز میں کچھ اس طرح خط لکھا کہ "آزاد پرندے کو پابندی کے پنجرے میں جکڑ دیا گیا ہے"۔ جب یہ خط قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا، تو قاضی صاحب نے خط کو دیکھا۔ ایک آہ بھری اور آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو رخساروں پر گر پڑے۔ اپنی اہلیہ کو بُلا کر کہا کہ میری رفیقۂ حیات! تمہیں اس سے کہیں زیادہ میرے اِن دوستوں کی زبانوں سے باتیں سُننا پڑیں گی مگر یاد رکھنا صبر کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔

غرض شجاع آباد کے علاج سے مایوسی کے بعد احباب کے مشورہ سے ملتان کے مشہور معالج جناب حکیم عطاء اللہ اور نشتر میڈیکل کالج کے مشہور ڈاکٹر عبد الرؤف کا رُخ کرنا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر رؤف نے اپنے قریبی کمرہ میں جگہ مہیّا کی۔ چند روز تک قاضی صاحب وہیں رہے۔ ڈاکٹر عبد الرؤف نے مکمل معائنہ کے بعد ان کے قریبی دوستوں کو کہا کہ یہ مرض لاعلاج ہے اور قاضی صاحب کے جگر پر خطرناک کینسر (CANCER) ہے۔ وہ پہلے ڈاکٹر ہیں جنہوں نے قاضی صاحب کی بیماری کی صحیح تشخیص کی۔ ڈاکٹر رؤف اور احباب نے یہ خبر قاضی صاحب تک نہ پہنچنے دی۔ مگر قاضی صاحب ایک باشعور مریض تھے۔

وہ سمجھ گئے، دال میں کچھ کالا ہے۔ بہر حال اُنہیں دوبارہ شجاع آباد پہنچا دیا گیا۔ اور وہیں ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب کا علاج ہونے لگا ـــــ اُدھر لاہور سے سلطان فونڈری کے مالکان صوفی محمد اسلم، جناب محمد افضل اور قاسمی جیولرز کے مالک، جناب حاجی محمد شفیع صاحب اور دیگر احباب کا شدید تقاضا ہو رہا تھا کہ شجاع آباد اور ملتان میں ڈاکٹروں اور ادویہ کا بآسانی دستیاب ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا لاہور میں علاج معالجہ کی خاطر آپ آ جائیں۔ چنانچہ قاضی صاحب اوائل ستمبر میں بمعیت حافظ محمد اورنگ زیب چشتی اور برادر نسبتی قاضی عبدالعزیز صاحب وغیرہ بذریعہ تیز گام لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر مالکان سلطان فونڈری صوفی محمد اسلم، جناب محمد افضل صاحب کے علاوہ آغا شورش کاشمیری، جماعت اسلامی کے نعیم صدیقی اور راقم الحروف موجود تھے۔

حضرت قاضی صاحب کو سلطان فونڈری بادامی باغ پہنچا دیا گیا اور حافظ محمد اشرف صاحب یکے از مالکان سلطان فونڈری کا ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ چونکہ اہلیہ حضرت قاضی صاحب اور بچیاں ساتھ تھیں، اُنہیں مَیں اپنے کرایہ کے مکان واقع سنت نگر لاہور لے گیا۔ چند روز تک اُن کا وہیں قیام رہا۔ بعد میں وہ شجاع آباد چلی آئیں۔

لاہور میں حضرت قاضی صاحب کے علاج میں مالکان سلطان فونڈری نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ ایک طرف ملک کے مشہور معالج حکیم نیّر واسطی، جناب شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی کا علاج کیا گیا تو دوسری طرف لاہور کے مشہور معالج ڈاکٹر اختر، ڈاکٹر امیرالدین اور ڈاکٹر کرنل ضیاء سے رابطہ قائم رہا۔

چنانچہ دورانِ علاج اگر کسی روز قاضی صاحب کی طبیعت سنبھل جاتی تو دوست اور مخلص ساتھی خدا کا شکر بجا لاتے لیکن اگر کسی روز طبیعت بگڑ جاتی تو سب کو تشویش لاحق ہو جاتی۔ لاہور میں دورانِ قیام حافظ محمد اورنگ زیب، حافظ احمد بخش اور جناب قاضی فیض احمد صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ والے مختلف ایّام میں قاضی صاحب

کی خدمت میں مصروف رہے ۔ لاہور میں چونکہ مستقل قیام تھا، لہٰذا میں دن کی وقت اپنی معاشی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد، شام کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ سُلطان فونڈری میں حضرت قاضی صاحب کے پاس آجاتا تھا۔ قاضی صاحب کی طبیعت اپنی بیٹی اور میرے بچّوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی اور اس طرح یہ وقت گذر رہا تھا۔ لاہور کے تمام مشہور اطبّا۔ اور ڈاکٹروں نے اتفاق رائے سے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ڈاکٹر، عبدالرؤف کی تشخیص کی تائید کی ۔ اور سب نے جگر پر کینسر بتایا جو ایک مہلک اور لاعلاج مرض ہے ۔ قاضی صاحب کو علم ہو چکا تھا کہ اُنہیں کیا مرض لاحق ہے ۔ اس کا علاج ممکن نہیں، لیکن بایں ہمہ اپنے جماعتی دوستوں اور احباب کی محفل لگ جاتی، تو پھر شعر و شاعری اور ظریفانہ طرزِ تکلم جاری ہو جاتا۔

کبھی اپنے درخشاں ماضی کا ذکر آتا، اگر کسی وقت کوئی ایسا دوست ملنے آجاتا، جو ماضی میں کسی لحاظ سے قاضی صاحب سے منسلک رہا ہو تو پھر اس سے بات چیت میں یہ خیال نہ رہتا کہ وہ بیمار ہیں اور ڈاکٹروں کا مشورہ زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا ہے۔

لاہور میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قیام رہا۔ دورانِ قیام مختلف مکاتیبِ فکر سے متعلق اشخاص، قاضی صاحب کی عیادت کو آتے رہے ۔ جماعتی احباب میں مولانا محمد علی جالندھری، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبیداللہ انور، مولانا سید حامد میاں، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، آغا شورش کاشمیری، مولانا مظہر علی اظہر، مرزا غلام نبی جانباز، بریلوی مکتب فکر کے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد اور دیگر حضرات ۔ حکومت کی طرف سے بعض وزراء اور افسروں کے علاوہ ملک امیر محمد خاں مرحوم گورنر مغربی پاکستان نے حسن انسان دوستی، دوست نوازی، اور ہمدردی و شفقت کا مظاہرہ کیا، اُس سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ملک صاحب اگر لاہور میں ہیں تو وہ خود قاضی صاحب کی خبر ٹیلیفون پر دریافت کر رہے ہیں اور

اگر وہ لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو ٹیلیفون پر اطلاع دے کر جا رہے ہیں کہ میں فلاں وقت لوٹوں گا اور اپنے ماتحتوں کو کہہ جاتے تھے کہ وہ اُنہیں، قاضی صاحب کی خیریت سے مطلع کرتے رہیں۔ ملک صاحب نے بارہا قاضی صاحب سے کہا، کہ "مجھے کوئی خدمت کا موقع دیجئے"، کسی ڈاکٹر کو کہنا ہو، کوئی دوائی لینی ہو، کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو میں حاضر ہوں۔" قاضی صاحب تشکّر کے لہجے میں فرماتے کہ ملک صاحب! مجھے بحمدہٖ تعالیٰ یہاں گھر کا سکون میسّر ہے اور علاج کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت حاصل ہے۔ لاہور کے تمام مشہور ڈاکٹر اور حکیم یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ دوائیاں مل رہی ہیں، بس دُعا کا محتاج ہوں۔

ایک شام نمازِ مغرب کے بعد سلطان فونڈری کی مسجد میں، میں ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ شجاع آباد سے قاضی صاحب کی بیٹیاں عابدہ، ساجدہ اور شاہدہ بتول ملنے آئی ہوئی تھیں کہ سلطان فونڈری کا مین گیٹ کُھلا اور ایک جھنڈے والی کار داخل ہوئی۔ اُس نے چپراسی سے پوچھا کہ یہاں قاضی احسان احمد شجاع آبادی آئے ہوئے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ جی ہاں، اور پھر وہ، ہمارے پاس مسجد کے قریب لے آیا۔ یہاں چارپائی بچھی ہوئی تھی اور قاضی صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ کار والے صاحب کرسی پر بیٹھ گئے، قاضی صاحب سے خیریت پوچھی اور کہا کہ "ملک صاحب راولپنڈی میں ہیں۔ اُن کا عصر کے وقت ٹیلیفون آیا تھا کہ قاضی صاحب کی خیریت دریافت کر کے رات تک مجھے اطلاع کرو۔ مجھے سُلطان فونڈری کی جائے وقوع کا علم نہیں تھا، نیز پُل کے نیچے پانی و کیچڑ بہت تھا۔ لہٰذا پہنچنے میں دیر ہوگئی، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" قاضی صاحب نے یہ باتیں سُن کر تبسّم فرمایا اور ان کی تکلیف کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ میری طرف سے پیغام پہنچا دیں کہ اب چند دنوں کا مہمان ہوں۔ میری عاقبت خیر کے لئے دعا کریں اور بس۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اُس نے اجازت

مانگنے سے پہلے ایک لفافہ نکالا اور قاضی صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ ملک صاحب فرما رہے تھے کہ ایک مہینہ ختم ہونے کو آیا قاضی صاحب نے کوئی خدمت کا موقع نہیں دیا۔ یہ حقیر چیز واپس کرنے کے لئے نہیں بلکہ قبول کرنے کے لئے ہے۔ دوستوں کے اصرار پر قاضی صاحب نے لفافہ رکھ لیا اور شکریہ ادا کیا۔ اب کار والے صاحب تو چلے گئے اور قاضی صاحب نے لفافہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے لفافہ کھولا تو ایک ہزار روپے کے نوٹ تھے جو ملک صاحب نے بھیجے تھے۔

غرض ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد جب مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہو رہا تھا تو قاضی صاحب نے سب دوستوں سے کہا کہ اب میں گھر جاتا ہوں کیونکہ اہل و عیال کے لئے سخت اُداس ہوں۔ زندگی کے باقی ایّام وہیں گذارنا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جس روز واپس شجاع آباد کے لئے تیاریاں ہو رہی تھیں، قاضی صاحب خود بھی بہت روئے اور مجھے بھی بہت رُلایا۔ جب ہم باپ بیٹا رو رہے تھے، تو قاضی صاحب کے وہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، جن کی تعبیر میں خود دیکھ رہا ہوں۔ قاضی صاحب نے فرمایا "بیٹا! میں جا رہا ہوں، تم پر سب سے زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور تم مجھے بہت رو ؤ گے" آج جس طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں تو معلوم یہ نگاہیں کتنی دُور تک جاتی ہیں، لیکن بحسرت واپس لوٹ آتی ہیں۔ آخر واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، اور ہم ایک روز خیبر میل کے ذریعہ لاہور سے شجاع آباد پہنچ گئے۔

ابھی چند ہی روز شجاع آباد میں گذرے ہوں گے کہ کسی نے مشورہ دیا کہ میانوالی میں ایک حکیم صاحب ہیں، ان کے ہاں علاج کے لئے جانا چاہیئے۔ دو ایک روز وہاں لگ گئے مگر وہاں سے مایوس واپس لوٹے۔ کسی دوست نے ملتان کے ڈاکٹر عون محمد خان کا نام تجویز کیا کہ وہ بڑے ماہر سرجن ہیں۔ اُن سے رابطہ قائم کیا جائے۔ ڈاکٹر خان کو قاضی صاحب

کا مکمل تعارف کرایا گیا تو وہ خود شجاع آباد گئے۔ انہوں نے طبیعت دیکھی اور کہنے لگے کہ چلئے میرے ہسپتال میں ایک ہفتے کے اندر اندر دوڑنے لگ جائیں گے۔ اور پھر تقریریں شروع کر دیں گے۔ مایوس چہروں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ معصوم بچّیوں کے کملائے ہوئے چہروں پر بشاشت آگئی۔ ان کے لئے ڈاکٹر خان کے یہ جملے عالم یاس میں اُمید کی نئی کرن بن کر چمکے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی امیدوں کے آخری سہارے اپنے بوڑھے ابّا کے لئے دعاؤں میں مشغول ہوگئیں۔ حضرت قاضی صاحب کو کار میں ملتان لیجایا گیا۔ ڈاکٹر خان نے ہسپتال کا ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا۔

اس سفر میں قاضی صاحب مرحوم کے گھر سے بھی ساتھ تھیں۔ روٹی وغیرہ پکانے کے علاوہ قاضی صاحب کی دیکھ بھال بھی ان کے ذمّہ تھی۔ انہوں نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح شب و روز خاوند کی خدمت کا حق ادا کیا۔ وہ نہ صرف خود اس خدمت میں مصروف تھیں بلکہ ان کے بھائی اور قاضی صاحب کے برادرِ نسبتی جناب قاضی عبدالعزیز صاحب جو وہاڑی میں وثیقہ نویس تھے، قاضی صاحب کی خدمت کے لئے رخصت لے کر آگئے تھے وہ ایک طرف قاضی صاحب کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور دوسری طرف شجاع آباد میں اپنی معصوم بھانجیوں کی تسلّی و تشفی کرتے رہتے تھے۔ راقم الحروف لاہور سے اپنا کاروبار ختم کرکے ملتان چلا آیا تھا، صرف سامان لاہور میں تھا۔ میرے علاوہ شجاع آباد سے، قاضی عبداللطیف صاحب اور شیخ عبدالمجید بھی ڈاکٹر خان کے ہسپتال میں مقیم رہے۔

ڈاکٹر خان کے سامنے اب مسئلہ جگر کے اپریشن کا تھا۔ اُدھر نقاہت اور ضعف اسقدر پیدا ہو چکا تھا کہ ہنستا کھیلتا چہرہ کملا چکا تھا۔ خوبصورت اور سرخ چہرے پر سے بشاشت غائب ہو چکی تھی۔ کسی قسم کی خوراک ہضم نہیں ہو رہی تھی اور انجکشن کے ذریعہ گلوکوز دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر خان اب مریض کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کر رہے تھے کہ ایسا نہ ہو اپریشن کے ساتھ ہی مریض ضعف و نقاہت کی تاب نہ لاتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو جائے۔ چنانچہ

وہ اپریشن سے آخر وقت تک بچتے رہے۔ موت اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی۔ اس کا آہنی پنجہ سکڑتا چلا جا رہا تھا۔ زندگی رختِ سفر باندھ رہی تھی۔ اس کا اقتدار پُرامن طور پر منتقل ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر کے سامنے، بے سہارا بیوی اور کمسن بچیوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ اب قاضی صاحب کچھ عرصہ کے مہمان ہیں۔ دورانِ قیامِ ملتان ایک غریب شخص درخواست لے کر آیا کہ فلاں زمیندار نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اور واپس نہیں کرتا۔ قاضی صاحب نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے لکھا کہ:۔

"دیکھو! یہ صحیح ہے کہ میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن ابھی تک زندہ ہوں، اس کی بیٹی فوراً اس کے حوالہ کر دو۔"

چنانچہ دوسرے روز اس کی بیٹی اُسے واپس کر دی گئی۔ اس واقعہ سے قاضی صاحب کو بسترِ علالت پر بڑی خوشی ہوئی۔

اس طرح دوسرا واقعہ میرے متعلق تھا۔ شاہی جامع مسجد شجاع آباد کے مؤذن۔ عبدالمجید جسے قاضی صاحب کے احباب ان کا "بلال" کہتے تھے، نہایت غریب اور بے سہارا شخص تھا۔ اُس نے بڑے صبر آزما مراحل میں اپنے چھوٹے لڑکے محمد رفیق کو کالج کی تعلیم دلائی۔ اس کا بی۔ ایس۔ سی کا نتیجہ بڑی دیر سے نکلا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ خود بے چارا یونیورسٹی کا چکر لگا آیا تھا، لیکن داخلہ سے محروم رہا۔ اب قاضی صاحب کو اس کے داخلہ کی فکر لاحق تھی۔ مجھے حکم دیا کہ فوراً لاہور جاؤ اور اس کے داخلہ کے لئے کچھ کرو۔ مجھے مایوسی تھی کہ اب داخلہ کیسے ہوگا۔ لاہور پہنچا۔ اِدھر اُدھر داخلہ کیلئے کوشش کی مگر بے سود۔ قاضی صاحب نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا کہ داخلہ کے متعلق جلدی کرو، کہیں بچے کا سال ضائع نہ ہو۔ بالآخر ایک وزیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں اُن کا رقعہ لے کر یونیورسٹی پہنچا۔ دوسرے روز داخلہ مل گیا۔ اس سے انہیں بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

دس پندرہ روز ملتان میں قیام کرنے کے بعد اُنہیں پھر شجاع آباد لایا گیا۔ مَیں اُن دِنوں داخلہ دلانے کے سلسلہ میں لاہور تھا۔ جب واپس آیا تو قاضی صاحب گھر پہنچ چکے تھے۔ یہ نومبر کا دُوسرا ہفتہ تھا۔ موت کا آہنی پنجہ قریب تر ہو رہا تھا، اور قاضی صاحب اس سے پوری طرح باخبر اور تیار تھے۔ اب ڈاکٹر خان کا علاج گھر پر ہو رہا تھا۔ مگر یہ ساری کوششیں علاج برائے علاج کی حد تک تھیں۔ کوئی قابلِ ذکر ڈاکٹر، حکیم اور طبیب نہیں تھا جس سے علاج کے سلسلہ میں مشورہ نہ کیا گیا ہو۔ اور مقدور سے بڑھ کر صحت کیلئے کوششیں نہ کی گئی ہوں، مگر خدا کو منظور نہ تھا۔ گھر میں مکمل سکوت اور خاموشی کا عالم طاری رہتا اور قاضی جی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی شاہدہ بتول کو اپنے پاس بُلا کر اس کی طرف دیکھتے اور بات چیت کرتے۔ میرا چھوٹا لڑکا نورِ نظر اکرام الحق سلّمہ، جو قاضی صاحب کا ہم شکل و ہم مزاج ہے، کو بُلاتے اور اس سے پیار کرتے اور وفات سے صرف دو دن پہلے اس کو اپنے ہاتھ سے اٹھنی دی کہ اس کو کوئی چیز لے کر کِھلا دو۔ اپنی اہلیہ سے کہتے "گھبراؤ نہیں۔ اللہ میاں پر بھروسا کرنا۔ خدا تمہارا سب سے بڑا نگہبان ہے۔ مَیں تم سے راضی ہوں، خدا بھی تم سے راضی ہو۔"

لاہور سے علالت کے دوران اپنی اہلیہ کے نام خط لکھا جو قاضی صاحب کی زندگی کا آخری خط ہے۔ جسے کتابِ ہٰذا میں شریکِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔

گھر میں ہر وقت مکمل سکوت، اور گھر کا ہر فرد خدمت کے لئے موجود رہتا۔ البتہ رات کے گیارہ بارہ بجے کے بعد ہم آہستہ آہستہ رخصت ہو جاتے۔ صرف اماں جی (اہلیہ قاضی صاحب) اپنا بستر قریب بچھا لیتیں اور وہیں لیٹ جاتیں۔

میں نے ایک چیز جو خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ موت کے آخری لمحوں تک قاضی صاحب نے صفائی و پاکیزگی کو برقرار رکھا۔ علالت کے دوران علی الصبح اٹھنے کا معمول ایّامِ تندرستی کی طرح تھا۔ وہ چار بجے خود اٹھتے اور دوسروں کو جگاتے۔ سب

سے پہلے ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کرتے۔ پھر صابن سے ہاتھ منہ دُھلواتے اور تیل کنگھا کر کے کپڑے بدلوا کر لیٹ جاتے۔ چنانچہ آخری روز تک یہ معمول جاری رہا۔ یہی وجہ تھی کہ چھ سات ماہ کی مسلسل علالت کے باوجود، اُن کے منہ اور بدن سے بدبو نہیں سونگھی گئی۔ ورنہ عام طور پر مریضوں کے پاس قریب جانے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ مرض کے علاوہ مریض کے منہ، کپڑوں اور بدن میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، جس سے عیادت کرنے والوں کو دماغی کوفت ہوتی ہے۔ مگر قاضی صاحب نے آخری روز بھی حسبِ معمول ٹوتھ پیسٹ کی۔ منہ اور سر دھویا۔ بالوں میں کنگھا کیا، اور نیا کرتہ اور چادر زیبِ تن کئے۔

مجھے یاد ہے کہ وفات کے روز جب علی الصبح بیدار ہوئے اور چاروں لڑکیاں، طاہرہ بتول، عابدہ بتول، ساجدہ بتول اور شاہدہ بتول اپنے باپ کو ٹوتھ پیسٹ کرا رہی تھیں تو اُنہوں نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ آج چارج تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ ۲۳؍ نومبر کی صبح کا ہے۔ مزید فرمایا۔ آج سے میں تمہارا ابّا بن گیا ہوں، تم میری پیاری بیٹیاں ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ۲۳؍ نومبر سے قبل بھی ابّا تھے اور باپ بیٹیوں کا رشتہ موجود تھا مگر یہ آج چارج کیوں تبدیل ہو رہا ہے اور بیٹیوں کے ابّا کیوں بن رہے ہیں۔ بیٹیاں ہنس پڑیں اور کہنے لگیں۔ ابّا جان! آپ تو ہمارے پہلے بھی ابّا ہیں، آج دوبارہ کیسے بن رہے ہیں۔ تو فرمایا۔ میں جو کہہ چکا ہوں کہ چارج تبدیل ہو گیا ہے۔ امّاں جی نے پوچھا میرے آپ کیا لگتے ہیں۔ تو کہنے لگے، تمہارا تو خادم ہوں۔ قاضی صاحب کے اس جملہ کو کہ آج (۲۳؍ نومبر مطابق ۹؍ شوال) چارج تبدیل ہو گیا ہے، ہم نے اُن کی صحت پر محمول کیا۔ کہ الحمدللہ آج بیداری کے بعد یہ جملہ صحت کی علامت ہے۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ چارج تبدیل ہونے کا مطلب دارِ فانی سے دارالبقاء کو کوچ کر جانا ہے اور یہ جملہ آج (۲۳؍ نومبر) ہی کو ۳½ بجے سہ پہر حقیقت بن جائے گا اور اُنکا چارج

شجاع آباد سے تبدیل ہو کر عالمِ برزخ کو نور شاہ قبرستان میں چلا جائے گا ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جب میں اندر آیا، تو امّاں جی نے مجھے کہا کہ تمہیں بُلایا جا رہا ہے۔ میں فوراً اُن کے پاس گیا تو فرمایا کہ جاؤ۔ قاضی عبدالعزیز (برادر نسبتی قاضی صاحب)، قاضی عبداللطیف، افضل علوی، حافظ اُمید علی کو بُلا لاؤ ——— اُنہیں بُلایا گیا۔ عبدالمجید مؤذن اور حافظ عبدالرزاق خواجہ کو بھی بُلا لیا۔ قاضی عبدالعزیز بھی آ گئے۔ قاضی عبداللطیف صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ دس بجے کے قریب ملتان تشریف لے گئے ہیں۔ بہر حال یہ سب حضرات اندر آ گئے۔ امّاں جی، قاضی صاحب کی چارپائی پر پاؤں کی طرف بیٹھی رہیں اور یہ حضرات ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں اور قاضی عبدالعزیز صاحب، قاضی صاحب کے سرہانے کھڑے تھے۔ قاضی صاحب نے اشارہ کیا کہ مجھے بٹھا دو۔ انہیں چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ میں سہارا دے کر پیچھے بیٹھ گیا۔ دائیں بائیں نرم تکیے رکھ دیئے گئے اور قاضی صاحب نے کہنا شروع کیا کہ "میں نے دو شادیاں کیں، دونوں سے اولاد ہوئی۔ تم میری بیوی اور بچیوں کا خیال رکھنا۔ خاندان میں جھگڑے ہوتے ہیں، تم اتحاد و اتفاق سے رہنا"

اتنی باتیں کی تھیں کہ زبان لڑکھڑانے لگ گئی۔ کہنے لگے، مجھے لٹا دو۔ ہم نے لٹا دیا اور یہ سب آدمی چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے "دیکھو! مجھے جنّت نظر آ رہی ہے۔ خوش بُو محسوس کر رہا ہوں۔ دُور دراز تک باغات ہی باغات ہیں۔ پھر کلمہ شریف پڑھا۔

اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ مجھے پاخانہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہم ایک طرف ہٹ گئے۔ پھر کہا۔ پیشاب کرا دو۔ اس کے بعد کہا کہ مجھے سیدھا کر کے لِٹا دو، اور میری ٹانگیں بھی سیدھی کر دو۔ سب کچھ کہنے کے مطابق کر دیا گیا۔

راقم الحروف، قاضی عبدالعزیز صاحب، اہلیہ قاضی صاحب اور چاروں بیٹیاں

موجود تھیں۔ مَیں اور قاضی عبدالعزیز صاحب سرہانے کی طرف تھے۔ اُنکی بند آنکھیں اچانک کُھلیں اور متحرک ہو کر بند ہو گئیں۔ سانس کے رُک رُک کر چلنے کی آواز اچانک ختم ہو گئی۔ چہرہ جو ضُعف و نقاہت کی وجہ سے سوکھ چکا تھا، ایکدم کِھل گیا۔ آنکھیں جو ضعف کی وجہ سے اندر دھنس چکی تھیں، سرمئی ہو کر پھیل گئیں۔ مَیں اِن اچانک تبدیلیوں کی وجہ سے سکتہ (STUNNED) میں آ گیا۔ کیونکہ آج تک مَیں نے قریب سے موت کو نہیں دیکھا تھا۔ قاضی عبدالعزیز صاحب نے قاضی صاحب کے چہرے کے اردگرد کپڑا باندھنا شروع کر دیا۔

بیٹیوں نے ابّا ابّا پُکارنا شروع کیا۔ وہ چُپ تھے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ قاضی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

بیٹیاں اپنے ابّا جان کو بار بار پُکار رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی شاہدہ بتول جو مجسمۂ شرم و حیا ہونے کی وجہ سے کم گو اور خاموش طبع ہے، پاگلوں کی طرح ابّا ابّا چلّا رہی تھی اور کہنے لگی۔ میرے ابّا زندہ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔

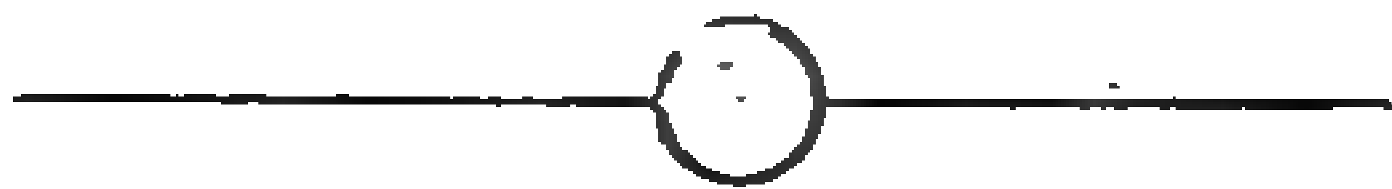
شجاع آباد میں قاضی صاحب کی وفات کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ بعد میں دیگر احباب کے توسط سے ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں قاضی صاحب کے احباب اور عقیدت مندوں کو ٹیلیفون اور تاروں کے ذریعہ اطلاعات پہنچا دی گئیں۔ شام چھ سات بجے کے درمیان ریڈیو سے ان کی وفات کا اعلان کرا دیا گیا۔ مغربی پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں قاضی صاحب کی وفات کی خبر سے ایک کہرام مچ گیا۔ جس نے خبر سُنی، شجاع آباد کا رُخ کیا۔ دور دراز سے رشتہ داروں، عقیدت مندوں، اور دوستوں کا تانتا بندھ گیا۔

۲۴ نومبر علی الصبح گھر میں قاضی صاحب کو غسل دیا گیا۔ غسل کے وقت یہ حضرات موجود تھے۔ شیخ قمرالدین لدھیانوی، ملتان، حاجی لال حسین کراچی، حاجی

محمد شفیع سکھر والے ۔ خواجہ عبدالقدوس ملتان ۔ مولانا محمد سعید صاحب کرڑ یکا قاضی فیض احمد ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔ مقامی حضرات میں سے قاضی عبدالعزیز ۔ قاضی عبداللطیف ۔ شیخ عبدالمجید ، قاضی عبدالحفیظ (برادر نسبتی) محمد افضل علوی ، محمد لیسین صدیقی ۔ ڈاکٹر محمد ارشد ، حافظ محمد اسعد سعدی ، اور راقم الحروف شامل تھے ۔

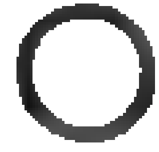
ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آئے ۔ شجاع آباد میں بہت بڑا اجتماع ہوا ۔ حضرت مولینا محمد عبداللہ درخواستی صدر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان بذریعہ خیبر میل تشریف لے آئے ۔ نماز جنازہ ۲۴ ، نومبر بروز جمعرات ۳½ بجے گورنمنٹ سکول شجاع آباد کے وسیع گراؤنڈ میں ادا کی گئی اور حضرت درخواستی نے امامت کے فرائض انجام دیئے ۔

ملک کی اہم شخصیتوں کی طرف سے تعزیت کے پیغامات آئے ۔ جن میں اس وقت کے گورنر محمد موسیٰ خان کا بیگم قاضی صاحب کے نام ' تار شامل ہے ۔ اہم پیغامات کی تفصیل آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں ۔ مختلف اخبارات و رسائل نے نمبر نکالے شعراء نے اپنے اشعار میں قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ دوستوں ، عقیدتمندوں اور جان نثاروں نے خاموش آنسوؤں کے ساتھ اپنے محبوب کو الوداع کہی ۔ بیوہ اور بچیوں نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ اپنے آخری سہارے کو رخصت کیا ۔ اور اس طرح ختمِ نبوت کا شیدائی ، فخرِ احرار ، آزادی کا سپاہی ، حریت کا پیکر لاکھوں فدائیوں کو پرنم چھوڑ کر اس دارِ فانی سے دار البقاء کو سدھار گیا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔



پیغاماتِ تعزیت

خطیبِ پاکستان مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ کی وفاتِ حسرت آیات پر مشاہیر کے تعزیتی پیغامات



(۱) جنرل محمد موسیٰ صاحب گورنر مغربی پاکستان

گورنر محمد موسیٰ نے بیگم قاضی احسان احمد صاحب کے نام ۲۴ر نومبر کو ٹیلیگرام بھیجتے ہوئے لکھا :۔

"مجھے آپ کے عظیم شوہر قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی وفات کی خبر سے دِلی طور پر افسوس ہوا ہے۔ آپ میری طرف سے اس دلگداز سانحہ پر تعزیت و ہمدردی قبول فرمائیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی رُوح کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے اور آپ سب کو یہ جانکاہ حادثہ برداشت کرنے کی توفیق بخشے، آمین"۔

محمد موسیٰ

(۲) مولانا افتخار احمد صاحب بگوی امیر حزب الانصار بھیرہ مغربی پاکستان نے بیگم قاضی صاحب کے نام ٹیلیگرام میں لکھا :۔

"قاضی صاحب کی وفات سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُنکی مغفرت فرمائے"۔

(۳) مجلسِ تحفّظِ ختمِ نبوّت چنیوٹ نے تعزیتی تار میں لکھا۔

"ہم کارکنان کی طرف سے قاضی احسان احمد صاحب کی وفات پر تعزیت قبول فرمائیں"۔

(۴) سیّد مراتب علی شاہ بخاری پرنسپل پاک سٹینڈرڈ کالج لاہور نے راقم الحروف کو تار بھیجا۔ جس میں لکھا کہ:۔

"اساتذہ اور طلباء قاضی صاحب کی وفات پر نہایت مغموم ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی رُوح کو مقامِ علیّین عطا فرمائے۔"

(۵) جناب عبدالحمید صاحب عباسی، انکم ٹیکس آفیسر شکار پور نے راقم الحروف سے بذریعہ تار بایں الفاظ تعزیت کی۔

"قاضی صاحب کی وفات سے سخت صدمہ ہوا۔ یہ ایک قومی نقصان ہے میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔"

(۶) بیگم آغا شورش کاشمیری نے بیگم قاضی احسان احمد کو تعزیتی تار بھیجا جسمیں لکھا

"مجھے اور میرے نظر بند شوہر کو قاضی صاحب کی وفات پر بہت دُکھ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا مقام بلند فرمائے، اور آپ کو اپنے خاوند کا دُکھ برداشت کرنے کی توفیق بخشے۔"

میر جعفر خاں صاحب جمالی مرحوم و حاجی شاہ نواز جمالی نے بیگم قاضی صاحب کے نام تعزیتی تار بھیجا۔

(۷) "قاضی صاحب کی اچانک وفات سے ہمیں شدید دھکا لگا ہے۔ براہِ کرم ہماری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ خدا آپ کو یہ نقصانِ عظیم برداشت کرنے کی توفیق دے۔ یہ بہت بڑا قومی نقصان ہے۔"

تعزیتی قرار دادیں

برقی پیغامات کے علاوہ درج ذیل تعزیتی قرار دادیں مختلف انجمنوں، دینی و سیاسی جماعتوں اور تعلیمی و تبلیغی اداروں کی طرف سے موصول ہوئیں جن میں چند اہم قرار دادوں کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) تعزیتی قرار داد مجلسِ مرکزیہ تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان، ملتان

۲۷ر شعبان ۱۳۸۶ھ

قابلِ صد تعظیم بہن، سلمکم اللہ

نقل تجویز ع۱: اجلاس مرکزی مجلسِ شوریٰ تحفظِ ختمِ نبوّت پاکستان منعقدہ ۲۶ شعبان ۱۳۸۶ھ دفتر ختمِ نبوّت، ملتان۔

"مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس یقین کرتا ہے کہ حضرت خطیب پاکستان، مولانا قاضی احسان احمد صاحب مرحوم و مغفور کے وصال کی وجہ سے جو صدمۂ عظیم ان کے اہلِ خانہ کو پہنچا ہے۔ مجلس ان کے غم میں برابر کی شریک ہے۔ یہ صدمہ ان کے خاندان، پسماندگان اور جماعت ختمِ نبوّت ہی کا نہیں بلکہ مرحوم کا وصال پوری ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا صدمۂ عظیم ہے۔"

مجلس ان کے اہلِ خانہ کو اپنے ہمہ قسمی تعاون کا یقین دلاتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ وہ جب کبھی مجلس کو یاد کریں گی تو مجلس کو اپنے مرحوم قائد کے رفقاء کی حیثیت سے ہمیشہ حاضر پائیں گی۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنّت الفردوس میں مقاماتِ عالیہ عطا فرمائے اور

آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔"

شرکاءِ غم: اراکینِ مجلسِ شوریٰ

شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب جامعہ رشیدیہ ساہیوال، حضرت مولانا محمد علی جالندھری، حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر، حضرت مولانا امین الدین صاحب ڈیرہ اسماعیل خان، حضرت مولانا نذیر حسین صاحب ٹنڈو عاقل (سندھ)، جناب ماسٹر اختر حسین صاحب ملتان۔

بقلم: محمد شریف جالندھری دفتر ختم نبوت ملتان

---

(۲) انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کی تعزیتی قرارداد

نمبر ۱۴۶۲ مورخہ ۷-۱۲-۶۶

"انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کا یہ اجلاس پاکستان کے نامور خطیب، بلند پایہ عالم اور جدوجہدِ آزادی کے بے باک قائد قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی وفاتِ حسرت آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہے کہ وہ پاک ذات مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے پسماندگان اور اُن کی بیگم صاحبہ محترمہ اور اُن کے بچوں، اقارب و احباب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

نیز یہ اجلاس قاضی صاحب مرحوم کی اُن عظیم الشان خدمات کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو مرحوم نے ملک و ملت کی آزادی کامل اور تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں انجام دیں۔ والسلام

ملک جمال الدین

جنرل سیکرٹری انجمن فیض الاسلام راولپنڈی

(۳) جامعہ محمدی، جھنگ، مغربی پاکستان

مؤرخہ ۱۷-۸-۸۶ھ $\frac{12}{66}$ء عدد ۲۱۹۶

مکرم پسماندگان محترم قاضی صاحب مرحوم و مغفور

السلام علیکم۔ قاضی صاحب مرحوم و مغفور کی خبرِ انتقال پُر ملال سے صدمہ ہوا۔ انّا للہِ واِنّا الیہِ راجعُون۔ قاضی صاحب ہمارے خاص مہربان ہمدرد رفیق تھے۔ اللہ کریم غریقِ رحمت فرمائے۔ جامعہ میں مرحوم کے لئے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ اللہ کریم مرحوم کی ملی و دینی خدمات قبول منظور فرمائے۔

بکرمہٖ تعالیٰ۔ والسلام

خیر اندیش

محمد ذاکر غفرلہٗ ناظمِ عمومی

جامعہ محمدی شریف۔ ضلع جھنگ

---

(۴) میونسپل کمیٹی، مُلتان

نقل ریزولیشن نمبر (الف) مجلسِ عام منعقدہ مؤرخہ $\frac{11}{66}$-۳۰ میونسپل کمیٹی مُلتان

مندرجہ ذیل تجویز منجانب مخدوم محمد سجاد حسین صاحب قریشی وائس چیرمین بلدیہ ملتان، بتائید خان حمید نواز خاں صاحب موصول ہوئی جو کمیٹی کی خدمت میں پیش ہے۔

"حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی وفات حسرت آیات پر یہ ایوان اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور لواحقین سے اُن کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔"

عبارت ریزولیشن

مخدوم محمد سجاد حسین صاحب قریشی وائس چیرمین بلدیہ کی تجویز پر جن کی تائید خان حمید نواز خاں نے کی۔ ایوان نے حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی

وفاتِ حسرت آیات پر دعائے مغفرت پڑھی اور پاس کیا کہ قرارداد کی نقل اُن کی بیوہ کی خدمت میں ارسال کی جاوے۔

No. 1739/MC DATED 21.12.66

دستخط انگریزی

ریکارڈ کیپر۔ ملتان میونسپلٹی

---

⑤ انجمن اسلامیہ، شہر سیالکوٹ

نمبر ۴۳ مورخہ ۶-۱۲-۶۶

مکرمی محترمہ بیوہ قاضی احسان احمد صاحب مرحوم شجاع آبادی

السلام علیکم۔ جنرل کونسل انجمن اسلامیہ شہر سیالکوٹ کا اجلاس بتاریخ ۲۷ر نومبر ۱۹۶۶ء زیر صدارت جناب خواجہ حاکم الدین صاحب منعقد ہوا۔ جس میں قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اراکینِ انجمن نے دِلی رنج و غم کا اظہار کیا اور دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق مرحمت فرماوے۔

دستخط اُردو : خواجہ محمد جمیل

آنریری جنرل سیکرٹری۔ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ

---

⑥ جماعت اسلامی مغربی پاکستان

مکرمی و محترمی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ قاضی صاحب کے انتقال کی اطلاع سے دلی صدمہ ہوا اللہ تعالےٰ اُن کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے۔ کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور

۶۲۵

اپنی رحمت کے سائے میں بلند درجات سے نوازے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اور جماعت کے مرکزی دفتر کے تمام رفقاء (جناب نعیم صدیقی، چوہدری رحمت الٰہی، جناب نصیر حسین، سید صدیق الحسن گیلانی، ملک غلام علی، جناب خلیل حامدی، چوہدری محمد اسلم سلیمی، جناب محمد سلطان، سید فیض الرحمن، جناب احسان الحق، رانا رفیق احمد جناب چراغ الدین اور عبدالرحمٰن صاحب صاحب) آپ کے ساتھ شریکِ غم ہیں اور مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

خاکسار

(۸) طفیل محمد

بخانہ قاضی احسان احمد صاحب مرحوم شجاع آباد ضلع ملتان

لاہور میں تعزیتی جلسہ

ان تعزیتی قرار دادوں کے علاوہ قاضی صاحب مرحوم کا ملک کے گوشہ گوشہ میں سوگ منایا گیا۔ قرآن خوانی اور تعزیتی جلسے تقریباً ہر بڑے شہر میں منعقد ہوئے جس میں اکابرینِ ملت اور راہنمایانِ قوم نے ملک کے مایۂ ناز فرزند ملتِ اسلامیہ کے محبوب راہنما، پاسبانِ ختمِ نبوت، جنگِ آزادی کے بے باک اور نڈر سپاہی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ سب سے بڑا جلسہ باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ۴ دسمبر ۱۹۶۶ء، بروز اتوار منعقد ہوا جس میں مختلف طبقہ کے زعماء نے

(۴) قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یہاں ہم صرف اسی ایک جلسہ کی روئداد بشکریہ روزنامہ "امروز" لاہور سے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

قاضی احسان احمد نے جبر کے اس دور میں علم آزادی بلند کیا، جب کہ حق گوئی جرم تصوّر کی جاتی تھی۔

تعزیتی جلسے میں مقررین کا اظہار عقیدت (امروز کے رپورٹر سے)

لاہور ۱۹ دسمبر۔ مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام باغ بیرون موچی دروازہ میں منعقد ہونے والے ایک جلسہ عام میں آج قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مختلف مکاتیب فکر کے راہنماؤں نے مرحوم کی قومی و ملّی خدمات کو سراہا اور ان کی موت کو ملک و ملّت کے لئے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔

صدر جلسہ شیخ حسام الدین نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور کے مسائل دنیا کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں، جو چھوٹے ملکوں کے لئے بالخصوص لمحۂ فکریہ ہیں۔ لہٰذا ہمیں جلد سنبھل جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا، قاضی احسان احمد شجاع آبادی ایسے وقت میں دارِ فانی سے رخصت ہوئے جب کہ ان کی شدید ضرورت تھی۔ ان سے پہلے جانے والے زعماء کرام کے بعد اُن کی ذات گرامی غنیمت تھی۔ مرحوم تو اپنا فرض ادا کر گئے، اب باقی ماندہ کام کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، جسے نبھانا ہمارا فرض ہے۔

مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا مظہر علی اظہر نے تقریر کرتے ہوئے کہا متحدہ ہندوستان کے علماء کرام نے اُس وقت علم جہاد بلند کیا تھا جب کہ دنیا کے بیشتر حصّوں میں مسلمانوں کو شکست ہو چکی تھی۔ انہی علماء کرام کی جدوجہد کے نتیجے میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اور وہ انگریزی سلطنت جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، اپنے زیر تسلّط تمام ممالک کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مولانا مرحوم بھی اُنہی علماء میں شامل تھے جو ساری زندگی قوم کو جگانے کی خدمات انجام دیتے رہے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اپنی تقریر میں کہا

کہ مولانا مرحوم بھی اسی قافلے سے تعلق رکھتے تھے جس نے آزادیٔ ملک کے لئے ایک اہم کردار انجام دیا۔ جنگِ آزادی کے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے دست راست تھے۔ انہوں نے کہا۔ تعزیتی جلسوں کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ان میں بزرگوں کی یاد منانے کے ساتھ ان کے ناتمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے طریقے دریافت کئے جائیں۔

مولانا عبدالستار نیازی نے کہا۔ مولانا مرحوم عمر بھر ختمِ نبوت کے مشن پر قائم رہ کر خدمات انجام دیتے رہے۔ انہوں نے کہا۔ موجودہ دنیا کے مسائل کا حل یہ ہے کہ حکام اور عوام اپنی زندگیوں میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالیں۔

ماسٹر تاج الدّین انصاری نے مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا، ملک میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے مخالفین میں بھی مقبول ہوں قاضی احسان احمد شجاع آبادی ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں سے تھے۔ وہ بڑی محبت اور نرم روی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

جناب عبدالرؤف شباب مفتی نے کہا۔ مولانا مرحوم بڑے خلیق، ملنسار اور کشادہ ظرف تھے اور اپنے سیاسی مخالفین سے بھی انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ مرحوم بڑے بے باک اور حق گو تھے۔ انہوں نے ختمِ نبوت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں بیش بہا قربانیاں دیں، اور اپنی زندگی میں قومی و ملّی مفاد کو ہر مسئلے پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کے جذبۂ حبّ الوطنی پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ نے اپنی تقریر میں کہا۔ مولانا مرحوم کی موت ایک بہت بڑا سانحہ ہے اور ان کے کارہائے نمایاں مدّتوں یاد رہیں گے۔ انہوں نے کہا، کہ قاضی صاحب برطانوی حاکمیت کے اُس دَور میں حق کے لئے آمادۂ پیکار رہے جب حق بات کہنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔

ملک امجد حسین ایڈووکیٹ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ اگر علماء اسلام انگریزی استبداد کے خلاف جہاد نہ کرتے تو مسلمان پاکستان جیسی نعمت سے سرفراز نہیں ہو سکتے تھے۔ قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی بھی ان علماء اسلام میں سے ایک تھے۔ اُنہوں نے کہا۔ پاک ، اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج کے لئے بنا تھا۔ قاضی احسان احمد اور اُن کے رفقا ، نظریہ کو صحیح طور پر سمجھنے والوں میں سے تھے۔

جلسے سے مولانا منظور احمد، مولانا مختار احمد، مولانا محمد ضیاء القاسمی ، مولانا خالد علوی اور دیگر کئی مقررین نے خطاب کیا۔

ان قرار دادوں اور جلسوں کے علاوہ مُلک کے ممتاز اخبارات نے خطیبِ پاکستان مولانا قاضی احسان احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر خاص نمبر نکالے۔ جن میں قاضی صاحبؒ کے حالاتِ زندگی، کارنامے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ اس سلسلہ میں روزنامہ "امروز" اور روزنامہ "کوہستان" ملتان کے نمبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بعض حضرات کے مضامین "گلدستۂ احباب" میں درج کئے جا چکے ہیں۔ قارئین ملاحظہ فرمالیں۔

آئندہ صفحات میں بعض دیگر اخبارات و رسائل کے مختصر مقالات درج کئے جاتے ہیں۔

ملکی پریس کی طرف سے خراجِ عقیدت

(۱) روزنامہ "مشرق" لاہور

شُعلہ مقال خطیب قاضی احسان احمد شجاع آبادی انتقال کر گئے

اس عنوان کے تحت روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے

ممتاز عالمِ دین، شعلہ بیان خطیب اور مرکزی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے صدر قاضی احسان احمد شجاع آبادی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گذشتہ چھ ماہ سے جگر کے سرطان میں مبتلا تھے۔ نہ دعاؤں نے کچھ کام کیا اور نہ دوائیں کارگر ہوئیں وقت گزرتا گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اٹھارہ سال کی عمر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیرِ قیادت انگریزی استبداد کے خلاف آزادی کا علم بلند کیا۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند میں آزادی و بغاوت دو ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کا سیاسی مسلک مجلسِ احرارِ اسلام کا تھا۔ جہاں تک شعائرِ دینی کا تعلق ہے وہ عمر بھر اسلام کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں تقریباً آٹھ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ انگریز حکمرانوں نے چاہا کہ انہیں تعزیر سے زیر کر لیں لیکن ہر آزمائش نے ان کے جوہرِ خطابت کو جلا بخشی اور وہ سیاسی افق پر اُبھرتے ہی چلے گئے۔ جس مردِ مجاہد کو بڑی سے بڑی طاقت زندگی میں شکست نہ دے سکی اُسے موت نے زیر کر دیا ——— خود موت پر کیا گذری ہو گی۔

مجلسِ احرارِ اسلام کے قائد سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۲۸ء میں ملتان آئے، تو شجاع آباد کے ایک زمیندار قاضی محمد امین نے اپنے بیٹے قاضی احسان احمد کو ان کے سپرد کر دیا۔ اس وقت قاضی احسان احمد صاحب کی عمر ۱۸ سال تھی اور وہ ملتان کے ایک مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شاہ جی نے ایک کمسن لڑکے کی اس طرح تربیت کی، کہ اس کی تمام طبعی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آگئیں اور وہ شعلہ بیان خطیب بن کر مقبولِ عام ہوئے اور ان میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔ وہ پورے برصغیر میں گھومے اپنی تقریروں سے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کو انگریز کے خلاف صف آرا کر دیا۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ شیفتگی اور محبت تھی۔ ۱۹۲۸ء میں مغل پورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل ڈکرٹے نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی، جس پر پرنسپل کے خلاف ایجی ٹیشن میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے بھرپور حصہ لیا اور انہیں گرفتار کر کے چھ ماہ کے لیے جہلم کی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ ان کی پہلی نظربندی تھی۔ جب وہ رہا ہوئے تو انہوں نے پورے پنجاب کا دورہ کر کے مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کی۔

۱۹۳۰ء میں مجلسِ احرارِ اسلام نے تحریکِ کشمیر شروع کی تو قاضی صاحب اس میں بھی پیش پیش رہے۔ اس دفعہ بھی انہیں گرفتار کر کے کچھ عرصہ کے لیے جیل میں قید کر دیا گیا۔ قاضی صاحب زندگی میں انگریز اور قادیانیت کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے ان دو طاقتوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ ۱۹۳۱ء میں قادیان میں ان کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس وقت قاضی صاحب گورداسپور میں تھے۔ وہ فوراً اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قادیان پہنچ گئے، جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دفعہ ۱۰۸/ ۷ کے تحت انہیں ایک سال سزا ہوئی۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ مجلسِ احرارِ اسلام نے ملک گیر بنیاد پر

پر تحریک عدمِ تعاون کا اعلان کر دیا اور عوام کو فوج میں بھرتی سے روکنے کیلئے مہم شروع کر دی۔ قاضی صاحب اِس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ انہیں اس تحریک کے آغاز ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور یہ تحریک چلانے پر تین سال کی سزا دی گئی۔ انہوں نے تین سال کا یہ عرصہ راولپنڈی اور ملتان کی جیلوں میں گذارا۔ ۱۹۳۶ء میں تحریک شہید گنج کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور میانوالی جیل میں چھ ماہ نظر بند رہے۔

تحریکِ ختمِ نبوّت

نرم خُو، نرم مزاج، حد درجہ رقیق القلب اور دوستوں کیلئے انتہائی دردمند، یہ تھے قاضی احسان احمد شجاع آبادی، جن کی یاد ان کے لاکھوں عقیدت مندوں کو عمر بھر غم زدہ رکھے گی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت میں انہوں نے قید کی بیشتر میعاد ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں گذاری۔ اس کے بعد رہا ہوئے تو زندگی کے باقی دن مطالعہ اور درس و تدریس کے لئے وقف کر دیئے اور بالآخر چند ماہ کی علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء

(۲) خدام الدّین، لاہور

پاکستان کا مشہور دینی پرچہ ہفت روزہ "خدام الدّین" لاہور، اپنی اشاعت ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء میں قاضی صاحب کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے

"اِک چراغ اور بجھا"

پرچہ مکمل ہو چکا تھا کہ شجاع آباد سے یہ رُوح فرسا خبر آئی کہ شیر بیشۂ حرّیت، قاطعِ شرک و بدعت، صدر مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوّت، خطیبِ پاکستان، حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی ۲۳ نومبر کو پونے چار بجے شام اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

قاضی صاحب مرحوم کئی ماہ سے سرطانِ جگر کے مرض میں مبتلا تھے اور چند ہفتوں سے تو حالت تشویشناک چلی آتی تھی۔ ملتان اور لاہور کے مشہور اطبا اور ڈاکٹروں نے آپ کے علاج کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ کوئی افاقہ نہ ہوا اور حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ دواؤں کے ساتھ دعائیں جاری تھیں، بارگاہِ الٰہی میں کئی لوگ منتیں مان رہے تھے، گڑگڑا کر اُن کی صحتِ کاملہ و عاجلہ کے لئے بارگاہِ خداوندی میں درخواستیں گذاری جارہی تھیں، مگر کارکنانِ قضا و قدر کو یہی منظور تھا کہ سفارتِ اسلام کے فرائض انجام دینے والا یہ دھڑکتا ہوا دل ڈوب جائے، چمنستانِ ختمِ نبوت کا یہ چہکتا ہوا عندلیب منقار زیر پر ہو جائے، اور لاکھوں مسلمانوں کی اُمیدوں کا یہ چراغ گُل ہو کر موت کی تاریک وادیوں میں کھو جائے ؎

ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی

حضرت قاضی صاحبؒ نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو بلبلِ بستانِ رسالت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ بگوش ہو گئے اور تا دمِ آخر اسی قافلے کے حدی خوانوں میں شریک رہے۔ طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں، گرفتار ہوئے، قید و بند کی سختیاں اٹھائیں، آلام و مصائب سے دوچار ہوئے مگر اپنی راہ نہ بدلی اور بالآخر ملک و ملّت کی ناموس کی خاطر گھلتے، ختمِ نبوّت کے ترانے گاتے، اصحابِ رسولؐ کے عشق میں مگن، اپنے اکابر و اسلاف کی عظمت کے گیت گاتے، راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ بے شک آپ کی وفات اِس دَور کی خطابت کی موت ہے، اور ایک سانحۂ عظیم جس کی تلافی سخت مشکل ہے ؎

ضرورت جتنی جتنی بڑھ رہی ہے صبحِ روشن کی
اندھیرا اور گہرا، اور گہرا ہوتا جاتا ہے!

ادارہ "خدام الدین" قاضی صاحب مرحوم کے پسماندگان اور مجلسِ ختمِ نبوّت کے

اراکین بالخصوص مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری مدظلہ، اور مناظر اسلام حضرت مولانا لال حسین اختر مدظلہ، ناظم اعلیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے صدقے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی اہلیہ محترمہ، پانچ بچیوں، قاضی عبداللطیف، قاضی نورالحق اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین، یارب العلمین۔

ادارہ "خدام الدین" اپنے تمام قارئین سے حضرت قاضی صاحب مرحوم کے لئے ایصالِ ثواب کی درخواست کرتا ہے۔

۳ روزنامہ "ملت" لائل پور لکھتا ہے:

"آہ! قاضی احسان احمد شجاع آبادی"

حضور رسالت مآب کی محبت ان کے جسم و روح میں پوری طرح رچ بس گئی تھی ان کی رس بھری آواز میں اخلاص تھا، سوز تھا اور درد تھا۔ اس لئے ان کی زبان سے جو بھی لفظ نکلتا وہ تاثیر سے پُر ہوتا۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں بھی داعی توحید و رسالت تھے۔ مزاح کی چاشنی ان کی گفتگو کو اور بھی زیادہ پُر اثر بنا دیتی، لیکن وہ غیر سنجیدہ مذاق کے ہرگز عادی نہ تھے۔

اپنے ہمعصر واعظوں اور مبلغوں کے مقابلہ میں وہ ہر لحاظ سے امتیازی مقام رکھتے تھے۔ بالخصوص اس لحاظ سے کہ وہ قادیانیت کے بھی خلاف بولتے تو فریق مخالف کے لئے نفرت و حقارت کا اظہار کرنے کی بجائے محبت و رافت کا انداز اختیار کرتے۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی اپنے دوستوں، رفیقوں اور عقیدت مندوں پر ہر ممکن حد تک احسان کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن دوسروں کے احسان کا زیر بار ہونا اُن کو کبھی پسند نہ آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شجاع آباد کی پرانی آبادی میں درویشوں کی سی زندگی گذارتے

رہے اور اسی حالت میں داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اُن کا مخصوص لباس، مخصوص لب و لہجہ، مخصوص اندازِ خطابت ــــ اور اُن کی محبوب شخصیت ــــ سانحہ ارتحال کی خبر سُن کر سب کچھ ذہن میں سما گیا۔

ایک آہ! ایک آہ!! اور پھر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کے قرآنی الفاظ زبان پر جاری ہو گئے۔ بیشک ہم سب اللہ پاک ہی کے لئے ہیں اور ہم سب کو اللہ پاک ہی کے پاس جانا ہے، لیکن کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو زندگی بھر اللہ پاک ہی کے ہو کر رہتے ہیں اور جب اس دارِ فانی سے کوچ کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملتے ہیں تو اُن کا ہر جاننے والا اُنہیں "اللہ والے" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم بلا شبہ "اللہ والے" تھے۔ دنیا والوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اگر کوئی تعلق تھا تو صرف اس حد تک کہ دنیا والوں کو دین کی بات سمجھاتے، اور اللہ والوں کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے۔ وہ کوئی بڑے پایہ کے عالمِ دین نہ تھے لیکن صحیح معنوں میں خادمِ دین تھے۔

اُن کا بس ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ مشغلہ تھا خدمتِ دین ــــ دعوتِ دین کو عام کرنا اور اس جد و جہد میں اخلاص و انہماک سے کام، ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ بلند بانگ دعوؤں کو چھوڑیئے عمل کو دیکھا جائے تو مرحوم قاضی احسان احمد نے شمعِ اسلام کا پروانہ بن کر اسی شمعِ ہدایت پر اپنی متاعِ زیست قربان کر کے ایک روشن مثال قائم کی ہے۔

وہ سراپا پکار تھے وہ مجسم صدائے حق تھے، وہ ایسے واعظ اور مبلغ تھے کہ ان کی وعظ و تبلیغ شجرِ اسلام کی آبیاری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکی تھی۔ ان کے قلب کا سوز، اور اُن کی رُوح کا گداز، اُنہیں حق کا پاسدار اور حقیقت کا راز دار بنا چکے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح بستی بستی، گلی گلی اسلام کا پیغام عام کرتے اور ختمِ نبوت کی صدائے حقیقت بلند کرتے پھرتے۔ درویشِ حق پرست اور اپنی تبلیغی دُھن میں مست قاضی احسان احمد مرحوم صحیح معنوں

میں مردِ آہن تھے۔ مرحوم کو بجا طور پر بلبلِ بستانِ نبوت اور پروانۂ شمعِ رسالت کہا گیا ہے۔ مرحوم اپنے سیاسی دور میں مجلسِ احرارِ اسلام سے وابستہ رہے ہیں، لیکن پاکستان کے قیام کے بعد جب اس تنظیم کو سیاسی اعتبار سے زوال پذیر ہونا پڑا، اور داخلی طور پر بھی اس میں اختلافات رونما ہو گئے تو قاضی احسان احمد مرحوم عملاً مجلسِ احرار اسلام کی سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے، لیکن آخر دم تک تحفظِ ختمِ نبوت سے متعلق سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔

اپنے مذہبی پیشوا اور سیاسی راہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں گہری عقیدت تھی اور اندازِ خطابت میں مرحوم انہیں کا سارنگ اختیار کر چکے تھے۔

مرحوم کی بھرپور دعوتی سرگرمیاں اس وقت تک جاری رہیں، جب تک سرطان کے موذی اور مہلک مرض نے انہیں بسترِ مرگ پر لیٹنے کے لئے مجبور نہ کر دیا۔ یہی مرض بالآخر اُن کے لئے جان لیوا ثابت ہوا، اور مرحوم اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نورِ حق سے منوّر کر دے۔ اُن کی اصلاحی و تبلیغی خدمات اُن کے لئے بہترین توشۂ آخرت ثابت ہوں اور اُن کا شمار اللہ تعالیٰ کے مقربین میں ہو جن کا جینا اور مرنا حق ہی کے لئے ہوتا ہے۔

پاکستان ہی کو نہیں، پورے عالمِ اسلام کو آج ایسے مخلص خادمانِ دین کی اشد ضرورت ہے جو اپنی شخصیت بنانے کے بجائے اپنے آپ کو دعوتِ دین کی خدمت میں جھونک سکیں اور خصوصیّت کے ساتھ مرحوم قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے اس پسندیدہ وصف کو اپنا سکیں جو مختلف اسلامی فرقوں میں اتحاد برقرار رکھنے کے لئے ان کی خدمات کے باعث نمایاں ہو کر سامنے آتا رہا ہے۔ یہی اتحادِ اسلامی ہی عالمِ اسلام کے اتحاد کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اسلئے اس بنیاد کو مستحکم کرنے کی آج ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں کہ وہ ایک مردِ باخدا تھے، مرد

باصفا تھے اور مردِ باوفا تھے۔

(۴) ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے آرگن ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور نے اپنے شمارہ ۲؍ دسمبر ۱۹۶۶ء میں درج ذیل عنوان کے تحت اداریہ سپردِ قلم کیا۔

"دو دیئے اور بجھے"

گذشتہ ہفتے حضرت مولانا عبدالخالق صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث کبیر والا کی اچانک وفات کا صدمہ ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ اچانک خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی وفات کی خبر نے دلوں کی غمگینی میں اور اضافہ کر دیا۔ قاضی صاحب اس قافلہ کے اہم فرد تھے جس نے امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری قدس سرّہ کی قیادت میں انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ قاضی صاحب ایک بے باک اور نڈر شخصیت کے حامل تھے۔ انگریز کا ظلم و تشدّد اور اس کی سختیاں ان کو اپنے مقصدِ حریّت سے نہ ہٹا سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد امیرِ شریعت نے سیاست سے کنارہ کشی کر کے تحفظ ختمِ نبوّت کی بنیاد رکھی تو قاضی صاحب بھی تحفظ ختمِ نبوّت میں شامل ہو گئے، اور اپنی زندگی کا مقصدِ وحید صرف "مرزائیت" کی تردید بنا لیا۔ کئی سالوں سے تحفظِ ختمِ نبوّت کے صدر تھے۔ اسی سال کے اوائل میں آپ کی صحت یک دم خراب ہو گئی۔ پہلے گردوں میں پیپ کی تشخیص کی گئی۔ بعد ازیں مرض کا نام جگر کا سرطان رکھا جانے لگا۔ بہرحال مرض جان لیوا ثابت ہوا اور آپ ۲۳؍ نومبر ۱۹۶۶ء کو پونے چار بجے لاکھوں عقیدت مندوں کو داغِ مفارقت دے کر اپنے اللہ سے جا ملے ـــــــ اب دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

---

۵ ہفت روزہ "چٹان" لاہور

۔ قی لا یو یو ۱۹۸۰ اگست لصو!

ملک کے مشہور ہفت روزہ "چٹان" لاہور میں

جناب آغا شورش کاشمیری اپنے رفیق سفر کو ان الفاظ ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

جس روز میں گرفتار ہوا، قاضی صاحب لاہور میں بیمار پڑے تھے۔ انہیں جگر میں سرطان ہو گیا تھا۔ موت پر انہیں زندگی ہی طرح اطمینان تھا۔ مطلب ہے، کہ اس جان لیوا مرض سے وہ مطلقاً پریشان نہ تھے۔ ہم سب مایوس تھے، دل میں کانٹا چبھ چکا تھا کہ جس تصویر کو ہم اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ قبر کی شاہراہ پر ہے اور موت کی طرف بعجلت قدم بڑھا رہی ہے۔ مجھے گرفتار کر کے منٹگمری سنٹرل جیل بھجوا دیا گیا۔ قاضی صاحب لاہور سے رخصت ہو کر اپنے گھر شجاع آباد چلے گئے۔ پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی، حتیٰ کہ میرے ایام قید ہی میں جب کہ میں لاہور میو ہسپتال میں زیر علاج تھا انہیں بلاوا آ گیا، اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جس وقت ان کی خبر رحلت مجھے سنائی گئی، میں ڈھائیں مار مار کر رونے لگا۔ زندگی کے سفر کی روداد جو ان کے اور میرے درمیان ۳۰ برس پہلے شروع ہوئی تھی، ایکا ایکی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ ہم کہاں کہاں رفیق سفر نہیں تھے سیاست کے کھیل میں بھی، انگریزوں کی جیل میں بھی اور اکثر و بیشتر ریل میں بھی۔

قاضی صاحب نے، جب تک غلامی کا دور رہا، انگریزی سامراج کے خلاف بے تکان جدوجہد کی۔ انگریز چلا گیا تو ختم نبوت کی تحریک کے صدر ہو گئے۔ معنوی لحاظ سے وہ بخاری کے جانشین تھے، خطابت میں ان کی ہو بہو تصویر تو نہیں لیکن ان کے محاسن خطابت کا سب سے بڑا عکس تھے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اسلام کے لئے وقف پایا۔ حتیٰ کہ اسلام و نبوت کے ذوق و شوق میں جان ہار گئے۔ وہ ایک منفرد خطیب تھے۔ انہیں بجا طور پر لسان اسلام کہا جا سکتا ہے۔ ذرا سوچئے خطابت کا وہ قافلہ بسرعت تمام اوجھل ہوتا جا رہا ہے جس کا نام احرار تھا۔ بخاری اس کے سرخیل تھے، قاضی حدی خوان، اس

دبستان کے سبھی نامور خطیب اُٹھ گئے۔ خال خال باقی تھے وہ کنارہ کش ہوگئے۔ اب احرار کی پُرانی رونقیں ختم ہو چکی ہیں، کھنڈر رہ گئے ہیں۔

قاضی صاحب خطابت کے عناصر اربعہ تھے۔ قرآن کی بلاغت، زبان کی سلاست، بیان کی ندرت، اور وجدان کی رفاقت۔ فی الجملہ وہ کئی خطیبوں کے ایک خطیب تھے۔ اُن کا وجود ایک ادارہ، ان کی شخصیت ایک انجمن اور ان کی ذات ایک جماعت تھی۔ وُہ عجز و انکسار کا دبدبہ اور بیان و اظہار کا ہمہمہ تھے۔ کاش وہ ابھی نہ مرتے لیکن قدرت کی منشاء کے سامنے انسان بے بس ہے۔

جانے کس کا مصرع ہے، اظہار کی شدّت ملاحظہ ہو ؎

مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس ہے

——— اللّٰھم اغفرلہٗ

۶ "شہاب"

ہفت روزہ "شہاب" اپنے شمارہ ۲۷ نومبر ۱۹۶۶ء میں بعنوان ——"آہ! قاضی احسان احمد شجاع آبادی" ایک اچھوتے انداز میں قاضی صاحب کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

"آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ بطلِ حریّت، خطیبِ ملّت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ تقریباً ایک سال سے سرطان کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ بہت علاج معالجہ کرایا اور سخت معاشی مشکلات کے باوجود کرایا لیکن موت کا وقت کیسے ٹلتا، یہ منزل تو آنی ہی تھی، ہر ایک کو اس پہ پہنچنا ہے۔ قاضی صاحب بھی اس پہ پہنچ گئے"۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دنیا والے رو پیٹ کر پہنچتے ہیں، اور وُہ خنداں و فرحاں پہنچے۔ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسّم برلبِ اوست

قاضی صاحب مرحوم نے اپنی پوری زندگی خدمتِ دینِ متین کے لئے وقف کئے

رکھی - وہ ایک عصر ساز خطیب تھے اور گلے سے نہیں، دل سے بات کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایک دلِ دردمند عطا کیا تھا، اور وہ اپنی قوم کے اخلاقی اور دینی زوال پر سخت دل گرفتہ تھے۔ بارہا ان حالات نے اُن کو رُلایا، بارہا خلوت میں انہوں نے اپنے رب کے حضور آہ و زاری کی لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ احیائے دین کی کوئی واضح صورت دیکھے بغیر جنّت کا سفر اختیار کر لیں۔

قاضی صاحب کے مشتاقانِ دید، اُن کے عقیدت مند، ان کے دوست احباب کو تو اب اُن کی یاد تڑپاتی ہی رہے گی کہ ان کا بدل ملنا محال ہے، مگر مسئلہ محض رنج و الم سے حل نہیں ہو جاتا، اس سلسلے میں ہم سب پر کچھ ذمّہ داری بھی تو عائد ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے پانچ بچّیوں اور ایک بیوہ کو اپنے پیچھے سوگوار چھوڑا ہے۔ دنیا انہوں نے نہیں کمائی کہ وہ جائداد بنا کر جاتے، اب ان بچّیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ان بچّیوں کی، جنہیں وہ اپنے بیٹوں سے بڑھ کر محبوب رکھتے تھے۔ ایک فرض حکومت کا ہے۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایّوب خاں، قاضی صاحب مرحوم کا دل سے احترام کرتے تھے کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ وہ مرحوم کے اہل و عیال کے لئے ایک معقول وظیفہ مقرّر کر دیں۔ دوسرے نمبر پر ان کے احباب و عقیدتمند آتے ہیں، کیا وہ لفظی ہمدردی کے بجائے عمل سے بھی مرحوم کی دوستی کا کوئی ثبوت فراہم کرنے کے لئے تیار ہیں؟ کاش کہ ایسا ہو! دُنیا سے رخصت ہونے والے کے ساتھ اصل ہمدردی یہی ہے کہ اس کے پسماندگان کا خیال رکھا جائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مردِ قلندر کو اپنے جوارِ رحمت میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب فرمائے اور ان کی لغزشوں کو معاف اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔"

(۷) "لولاک" لائل پور

مذہبی حلقوں میں معروف دینی اخبار ہفت روزہ "لولاک" جو ہمارے مشفق مولانا

تاج محمود صاحب کی زیر سرپرستی' لائل پور سے شائع ہوتا ہے، اپنی اشاعت ۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء میں اپنے رفیقِ خاص قاضی صاحب کو نہایت شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

"حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین' قافلہ اسلام کے شہسوار، تحریکِ آزادیٔ وطن کے سپہ سالار' احرارِ اسلام کے روحِ رواں' محاذ ختمِ نبوّت کے پاسبان، خطیبِ پاکستان حضرت مولانا الحاج قاضی احسان احمد شجاع آبادی وصال پا گئے"۔

شجاع آباد۔ ۲۳ نومبر، ملک کے نامور مذہبی راہنما، تحریکِ آزادی کے قافلہ کے عظیم سپہ سالار، مجلسِ تحفّظِ ختمِ نبوّت کے سربراہ حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب آج ۳ ½ بجے شام شجاع آباد میں واصل بحق ہو گئے۔ قاضی صاحب کچھ عرصہ سے بیمار تھے۔ انہیں یرقان اور سرطانِ جگر کا مرض تھا۔ قاضی صاحب کا ہر ممکن علاج کرایا گیا لیکن آخر انہیں قضائے الٰہی کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا اور انہوں نے اپنی پیاری جان اپنے محبوب جانِ آفریں کے سُپرد کر دی۔ قاضی احسان احمد صاحب شجاع آباد کے مشہور قاضی خاندان کے مشہور عالمِ دین اور شاہی مسجد شجاع آباد کے خطیب حضرت مولانا قاضی محمد امین صاحب مرحوم کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے آغازِ جوانی میں ہی حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنی زندگی حفاظتِ دینِ مصطفٰے اور تحریکِ آزادیٔ وطن کے لئے وقف کر دی تھی۔ آپ کا شمار مجلسِ احرارِ اسلام کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا کوئی کونہ، گوشہ، بستی اور شہر ایسا نہیں ہوگا، جہاں قاضی صاحبؒ نے اپنا عشقِ رسالت و توحید میں ڈوبا ہوا پیغام نہ پہنچایا ہو۔

آپ نے تحریکِ آزادیٔ وطن اور بالخصوص تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، فرنگی حکومت کے مظالم سہے، فرنگی پولیس کے تشدد کا

شکار ہو کر ہی لاٹھی چارج میں اُن کا ایک بازو توڑ دیا گیا تھا، جو اگرچہ جُڑ گیا تھا لیکن آخر تک کمزور رہا۔

قاضی صاحب کا رونگٹا رونگٹا عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا تھا۔ انہوں نے آزادیٔ وطن کے بعد حضور فداہ ابی و امی کے تاج و تختِ ختمِ نبوت کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا تھا۔ ملک کی آزادی، تحریکِ آزادیٔ کشمیر، دینِ مصطفےٰ کی تبلیغ، ملک کے غریبوں، کسانوں، مزدوروں کے حقوق کے لئے آواز، مسئلہ ختمِ نبوت کی تبلیغ و حفاظت، اور اسلام کے خلاف فرنگی سازشوں کے تار و پود بکھیرنے کے سلسلے میں قاضی صاحب نے کیا کیا عظیم خدمات انجام دیں ہیں، اس کے متعلق کسی انصاف پسند مؤرخ کے قلم کی عظیم خدمات کی ضرورت ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی بھر کی دینی، ملکی و قومی اور ملّی خدمات کو قبول فرمائے اور ملّتِ اسلامیہ کو بالعموم اور قاضی صاحب مرحوم کے لواحقین اور ساتھیوں کو بالخصوص اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق ارزاں فرمائے۔"

(۸) "کائنات" بہاولپور

بہاولپور ڈویژن کے مشہور ہفت روزہ اخبار "کائنات" اپنی اشاعت ۲۸ نومبر ۱۹۶۶ء میں بارگاہِ قاضی احسان احمد میں منفرد انداز میں نذرانۂ خلوص پیش کرتا ہے۔

"پاکستان کے مایۂ ناز خطیب قاضی احسان احمد شجاع آبادی طویل علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اِنّا للہ واِنّا اِلیہ راجعون۔ مرحوم کا شمار ان چند خطیبوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی قوتِ بیان، زورِ استدلال، جذبہ و عمل اور اخلاص کی بے پناہ دولت کے ساتھ، نہ صرف بدعات و سیئات کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا، بلکہ غیر ملکی سامراج کی قوتِ قاہرہ کے سامنے بھی ایک چٹان کی طرح سینہ سپر رہے۔ عقائد کی تطہیر کے لئے عالمِ دین فروش اور صوفی مکر کوش کے پھیلائے ہوئے دامِ تزویر سے سادہ لوح عوام کو بچانے اور گم کردہ راہ لوگوں کو اسلام کے جادۂ حق کی طرف راہنمائی کرنے کے ساتھ

غیر ملکی حکمرانوں کی سطوت و جبروت کو دعوتِ مبارزت جن بے گلیم درویشوں کے حصہ میں آئی، قاضی احسان احمد بھی اُنہیں میں شامل تھے۔ دو محاذوں پر بیک وقت نبرد آزمائی حرارتِ ایمانی، مستحکم قوّتِ ارادی اور مقصد کے ساتھ لگن کی ایک روشن دلیل ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

قاضی احسان احمد اور ان کے طائفہ کے دوسرے بزرگ ناموسِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے جس طرح اعصابی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، اور جس طرح انہوں نے اس راہ کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، وہ محبّتِ رسول کی ایک بیّن علامت ہے اور یہی ایک نیکی اُن کی اُخروی نجات کیلئے کافی ہے۔

زمانے کا چلن اب بدلتا جا رہا ہے اور پرانی قدریں بڑی سرعت کے ساتھ مٹتی جا رہی ہیں۔ تہذیب کی نئی روشنی اور مادیت پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان نے ——— ایمان کا نُور اور توحید پرستی کی روشنی کو گُل کر کے رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری دارِ فانی سے اُٹھتا ہے تو اُس کا نقشِ ثانی اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ اور قاضی احسان احمد، اللہ کو پیارے ہوتے ہیں تو مشتاقانِ دید کو کوئی دوسرا قاضی احسان احمد دکھائی نہیں دیتا۔ قاضی احسان احمد کی موت ایک فرد کی موت نہیں، بلکہ ایک ادارہ کی موت ہے، جس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔ اس قسم کے نابغہ افراد ہی کے لئے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

قاضی احسان احمد اب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے احباب اور عقیدتمندوں کے پاس اب اُن کے لئے آنسوؤں کے نذرانے کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بشری کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور اُنہیں جوارِ رحمت میں جگہ

عنایت کرے۔ آمین۔"

⑨ "الاعتصام" لاہور

جماعت اہلِ حدیث کا ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" اپنے اخبار مورخہ ۲؍دسمبر ۱۹۶۶ء میں قاضی صاحبؒ کے فراق میں برابر کا شریک ہے۔ لکھتا ہے :۔

"۲۳؍نومبر بروز بدھ صدر انجمن تحفظِ ختمِ نبوّت اور مشہور احرار لیڈر مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی بھی اس دارِ فانی کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

"قاضی صاحب مرحوم مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے دستِ راست اور احرار کے سرگرم لیڈروں میں نمایاں رہے۔ خصوصاً عقیدۂ ختمِ نبوّت کی تبلیغ کے لئے آپ کی مساعی سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے آزادیٔ وطن کیلئے بھی بیشمار قربانیاں دی ہیں اور قید و بند کے مصائب بھی جھیلے۔ تبلیغِ دین کا جذبہ آپ کے ایک ایک عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ تقویٰ، تدیّن، نیکی کے لحاظ سے بلا امتیاز سبھی حلقے آپ کا بیحد احترام کرتے تھے۔ گذشتہ دنوں سے آپ بیمار چلے آ رہے تھے لیکن افاقہ نہ ہو سکا۔ قاضی صاحب موصوف جیسی شخصیتیں ہر روز پیدا نہیں ہوتیں، اور اب تو یہ مسئلہ تشویشناک صورت اختیار کر گیا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں جو بھی اُٹھتا ہے اُس کی جگہ پُر ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہم قاضی صاحب مرحوم کے ورثا، اعزہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے قارئین کرام سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ موصوف کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ اَللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ۔"

⑩ "المنبر"

اہلِ حدیث حضرات کا ایک اور ہفت روزہ "المنبر" ۲۵؍نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں قاضی صاحب کی وفات پر رقمطراز ہے :۔

"مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ وتغمدہٗ بغفرانہ ـــــ سرتاپا سوز

وحرارت، از اوّل تا آخر مبلّغ وخادم دین، ہمہ جہتی مصلح عقائد ومنقح افکار، مضطرب دل اور ہمہ تن مصروف فکرمند دماغ کے حامل ——— باطل نظریات کے دشمن، سچائی کے علمبردار، مسلمانوں کو ایک وحدت کی حیثیت میں دیکھنے کے آرزومند اور اُمّتِ مسلمہ کو پھر سے عہدِ نبوّت کی سی زندگی کی جانب متوجہ کرنے میں ہمہ تن مصروف رہنے کے بعد بالآخر اپنے مالک وآقا کے حضور حاضر ہوگئے۔

رسمی الفاظ میں صحیح معنوں میں ان کی وفات سے ایک ہولناک خلاء رونما ہوا ہے، اور بالخصوص ختمِ نبوّت کے اساسی عقیدہ کی وضاحت اور اس عقیدے سے اُمّت کو منحرف کرانے والی قوتوں کی بے نقابی اور ان کی انتشار انگیزی سے امت کو بچانے کے محاذ پر اضطراب انگیز خلا پیدا ہوا ہے ——— لیکن اس سب کے باوجود ہم دل وزبان سے وہی کہیں گے جس سے ہمارا آقا خوش ہو جائے، جس کے حضور ہم سب جانے والے ہیں ——— ہم مرحوم مغفور قاضی صاحب کی بچیوں اور دوسرے اعزّہ کے ہم نوا ہو کر بارگاہِ ربّ العزّت سے دست بدعا ہیں۔

اللّٰهم اغفرله وارحمه واعفه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله۔ اللّٰهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده۔

ہم قاضی صاحب مرحوم کے جملہ اعزّہ، بالخصوص ان کی اہلیہ محترمہ، اُنکی بچیوں اور ان کے داماد قاضی عبداللطیف صاحب سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں، اور اُن کے لئے صبر ورحمت کی دُعا کرتے ہیں۔"

(۱۱) "اسد" لاہور

شیعہ حضرات کا ہفت روزہ "اسد" لاہور بھی قاضی صاحب کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے مؤرخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۶ء بعنوان "قاضی صاحب وفات پا گئے" لکھتا ہے:۔

ہم نے یہ خبر انتہائی رنج وغم کے ساتھ سُنی کہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے

طویل علالت کے بعد ۲۳ ؍ نومبر ۳½ بجے بعد از دوپہر اس سرائے فانی سے عالمِ بقا کی طرف کوچ فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

قاضی صاحب مختلف العقیدہ ہونے کے باوجود بڑے ہی اخلاق و مروّت سے پیش آتے تھے۔ وہ کم و بیش دس سال سے "اسد" کے خریدار تھے، اور باقاعدہ چندہ ادا کرتے تھے۔ مرحوم نے اپنی وفات سے قریباً پندرہ ۱۵ روز قبل بھی "اسد" کی وی۔پی وصول کی تھی۔ وہ مجلسِ تحفّظِ ختمِ نبوّت کے سربراہ اور خوش بیان خطیب تھے۔ مرحوم کی خطابت میں مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی خطابت کی جھلک نمایاں تھی۔ قاضی صاحب مرحوم تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں متعدّد بار جیل گئے۔ وہ مجلسِ احرار سے طویل مدّت تک وابستہ رہے۔ عشقِ رسول ؐ اُن کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ موت نے ایک خلیق اور جادو بیان خطیب کو پاکستان سے چھین لیا۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور اُن کے پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔"

(۱۲) "تبصرہ" لاہور

ماہنامہ "تبصرہ" لاہور میں قاضی صاحب مرحوم کے دیرینہ رفیق اور جماعتی ساتھی جناب مرزا غلام نبی صاحب جانباز نے ماہ جنوری ۱۹۶۷ء کے ایڈیٹوریل میں اپنے مرحوم دوست کو ایک اچھوتے انداز میں درجِ ذیل عنوان کے تحت نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

"ایک اور فلک نے کروٹ لی، ایک اور ستارہ ڈوب گیا"

خزاں کا موسم ہو تو باغ کی ہر شئے ویران دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح جب قوموں پر انحطاط کے دِن آتے ہیں تو اُن کے دانش وروں کی کھیپ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔

۲۳ ؍ نومبر کو خطیبِ پاکستان کی موت عالمِ اسلام میں ایک ایسے شخص کی موت تھی جس کے گرد ماضیٔ قریب کی سیاسی اور مذہبی تاریخ احاطہ کئے ہوئے تھی۔

جس نے اِس دَور کے مورّخ کو تاریخ کے لئے عنوان دیئے۔ اور حالات کو اپنی جدّ و جُہد سے ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا کہ جس کے آگے پھر کوئی دیوار ایسی نہیں جو قافلے کا راستہ روک سکے، یا اپنی نحوست کو اقدارِ جمہور، اقدارِ سُلطانی کے قدموں میں ڈال دے۔

خطیبِ پاکستان قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۱ء میں میرے ساتھ پہلی مرتبہ، مجلسِ احرار اسلام کی توسیع کے لئے لاہور سے راولپنڈی تک گئے۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات، جہلم اور اس طرح دوسرے شہروں میں وہ اپنی خداداد خطابت کے جواہر پارے بکھیرتے گئے۔ گو اُن دنوں اُن کا یہ فن، اُن کی عمر کی طرح پختہ نہیں تھا تاہم دین کی محبّت اور وطن عزیز کے عشق نے ان کی گفتگو کو عوام میں اس قدر مقبولیت بخشی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیاسی میدان کے شہسواروں میں شمار ہونے لگے۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے احرار راہنماؤں کی تربیت سے وہ سونے کی مانند نِکھر کر ہر طاغوتی طاقت سے ٹکرائے اور اس راستہ کے ہر مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

پاکستان کی بنیاد کے ساتھ ہی قاضی صاحب مرحوم نے، مرزا غلام احمد کے باطل مذہب پر بھرپور حملے کئے اور پھر پاکستان کے ذمّہ دار حاکموں سے مِل کر اس مذہب کی اندرونی اور بیرونی سازشوں کو اُن کے سامنے بے نقاب کیا۔ یہ اُن کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ اسلام اور مسلمان اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

قاضی صاحب جس طرح نجی زندگی میں وفادار تھے، خاندانی اور جماعتی وفاداریوں سے بھی وہ اسی طرح عہدہ برآ ہوتے تھے۔ دوستوں میں بیٹھ کر وہ دوست ہوتے اور سیاسی جماعت میں ان کی رائے ایک سُلجھے ہوئے مشیر کی سی ہوتی۔ بازار میں چلتے ہوئے راہگیروں سے اُن کے طرزِ تکلم میں شفقت اور محبت جھلکتی تھی۔ مذہب پر گفتگو میں عقیدت کے جو پھول خطیبِ پاکستان کے منہ سے جھڑتے، اس دور کے علماء میں یہ خوبی بہت کم نظر

آتی ہے۔ ۲۳ر نومبر سے ایسا گمان ہونے لگا کہ قضا و قدر کے فیصلے جس انداز اور عاجلانہ طریقہ سے رقم ہونے لگے ہیں، شاید مشیّتِ ایزدی ان بگڑتے ہوئے حالات کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے پرانے نقشے مٹانے کی فکر میں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ نیک دل لوگوں کو درمیان سے اُٹھایا جا رہا ہے۔ موجودہ معاشرے نے اپنے لئے جو راستہ تجویز کر لیا اور احکامِ خداوندی سے بغاوت کے جو عَلَم اُٹھا رکھے ہیں، خالقِ کون و مکاں کو یہ ادائیں پسند نہیں کہ جو گُل بوٹے اُس نے اپنے لئے اُگائے ہیں، کہیں اُنہیں ابلیس کے گل دانوں کی زینت نہ بنایا جائے۔ یا اُن سے صنم خانوں کی رونق بڑھائی جائے، ورنہ خطیبِ پاکستان کی صحت عمر اور اُن کا چلن ابھی ایسے نہیں تھے کہ موت اُنہیں ہم سے اس قدر جلدی جُدا کر دیتی۔ بلاشبہ موت کا ایک دن معیّن ہے لیکن بظاہر اسباب اس قدر کمزور نہیں تھے کہ امیرِ شریعتؒ اور مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہم سے یہ آخری سہارا بھی چھین لیا جاتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ آؤ عذابِ الٰہی سے پیشتر اپنے آپ کا جائزہ لیں اور بگڑنے سے پہلے سنورنے کی کوشش کریں اور جو شخصیتیں ہم میں باقی رہ گئی ہیں، ان کے قریب ہو کر مرنے والوں کے مشن کی تعمیل کریں۔

شعراء کا خراجِ عقیدت

سفیرِ اسلام قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نام

قبل از وفات

اس زمیں میں اے سفیرِ سُنّتِ خیر البشر
تا بہ کے حالاتِ ناہنجار پر سوچا کریں

یہ بھی کوئی بات ہے کافر گروں کے ہاتھ میں
دینِ قیّم کی عناں اور ہم دیکھا کریں

گالیاں اسلاف کو دیتے رہیں بدعت فروش
یہ جہاں چاہیں، جسے چاہیں، اُسے رسوا کریں

ان کی بے قابو زبانوں کو نہ ہو کوئی لگام
منبر و محراب پر تکفیر کا غوغا کریں

بند حجروں میں بتانِ نرم خُو کے ہم رکاب
شب کی تنہائی میں شغلِ بادہ و مینا کریں

آئے دن اپنے بزرگوں کے مقدس نام پر
یہ تماشائے زبوں، پیرانِ تسمہ پا کریں

لُوٹ کر سادہ دِلوں کا مومنانہ اعتقاد
اس پہ یہ طرّہ کہ اُن کی روٹیاں توڑا کریں

فرض ہے ہم پر کہ ان نازک ترین حالات میں
باندھ کر سر پر کفن اشرار کو ننگا کریں

مَیں قلم کے زور سے اُن کا تبختر توڑ دوں
آپ اُنہیں جادو بیانی سے تہ و بالا کریں

آپ کو بخشا ہے قدرت نے زباں کا بانکپن
اپنے اس اعجاز سے توحید کا چرچا کریں

اے دبستانِ بخاریؒ کے خطیبِ نامور
اب کہاں تک گردشِ تقدیر کا شکوا کریں

شرک کے نرغہ میں ہے توحید کا جاہ و جلال
یہ دغا دونوں، یہ پیشِ خواجہؐ بطحا کریں

اے مکینِ گنبدِ خضریٰ ہمیں یہ تو بتا
اُمّتِ احمد رضا سے کس طرح نپٹا کریں

التفاتِ خاص کا صدقہ، ہمیں توفیق دے
بتکدوں کو توڑ ڈالیں، حشر اِک برپا کریں

ہم تہی دستوں پر یالاکوٹ کا یہ قرض ہے
شرک کی بنیاد ڈھا دینا ہمارا فرض ہے

آغا شورش کاشمیری

ہفت روزہ "چٹان" ۶۲-۱۰-۲۲

بُلبُلِ بُستانِ نبوّت قاضی احسان احمد علیل ہیں



یارب شہِ بطحا کی محبّت کا صلا دے
اِس بُلبُلِ بُستانِ معانی کو شفا دے

یہ شخص سرِ خیل ہے یارانِ وطن کا
اس کے لب و لہجہ کو بخاریؒ کی نوا دے

اِس شخص کا اسلوبِ بیاں اور قوی کر
وہ سحر اِسے بخش کہ مُردوں کو جِلا دے

اِس شخص سے زندہ ہیں روایاتِ سلف کی
خوف اس کی خطابت کا حریفوں پہ بٹھا دے

اِس شخص کی توقیر، رسالتؐ کی نگاہ میں
قرآن کی آیات کے صدقے میں بڑھا دے

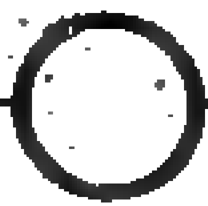
یارب تری رحمت کے سزاوار ہیں ہم بھی
جو سنگِ گراں راہ میں حائل ہیں ہٹا دے

سرمایہ و محنت کی کشاکش کے نگر میں!
شاہوں کے تبختر سے فقیروں کو لڑا دے

اسلام ہو پھر غلغلہ انداز، جہاں میں
احرار کی یلغار پہاڑوں کو ہلا دے

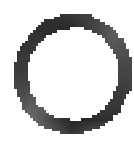
شاہوں کے لئے خونِ رعایا بھی روا ہے
شورشؔ کو مگر دولتِ تسلیم و رضا دے

ہفت روزہ "چٹان"
شورش کاشمیری



قاضی احسان احمد شجاع آبادی

قاضی احسان احمد شجاع آبادی بہت دنوں سے صاحب فراش ہیں۔ آجکل آپ مالکانِ سلطان فونڈری بادامی باغ لاہور کے ہاں ان کی دوستانہ و مخلصانہ کوششوں سے زیر علاج ہیں۔ اشعارِ ذیل اُن سے برادرانہ تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہیں۔



درد کی شدّت کچھ ایسی ہے کہ دل افگار ہے
چھ مہینے سے سفیرِ اسلام کا بیمار ہے
اس کے فیضانِ خطابت سے ہر اک خورد و کلاں
حشر تک حلقہ بگوشِ سیّد الابرار ؑ ہے
قادیاں میں اس کی تقریروں سے اب تک زلزلہ
ایک دزدیدہ نبوّت کے لئے تلوار ہے
استقامت میں یگانہ، جاں سپاری کی دلیل
شہسوارِ عرصۂ قربانی و ایثار ہے
اس کی صحت کے لئے شورش دُعا کرتے رہو
ننگ و ناموسِ رسالت کا علمبردار ہے

شورش کاشمیری

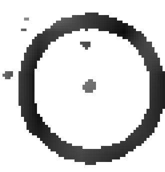
ہفت روزہ "چٹان"

۵-۹-۶۶

بعد از وفات

"ہو گیا ہم سے جُدا وہ مردِ حق"

خطیبِ پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے انتقالِ پُر ملال پہ چند اشعار



اے شجاع آباد تجھ میں دفن ہے — سرزمینِ پاک کا فرزندِ دیں
مُلک و ملّت کا تھا لاثانی خطیب — جس کا ثانی مُلک میں کوئی نہیں
جس کے ہر اک لفظ میں اِک سحر تھا — جس کی ہر اک بات دلکش دلنشیں
تھا رسولِ پاک کا ادنیٰ غلام — جس کا سینہ تھا محبّت کا امیں
بہرِ آزادی وہ زنداں کا اسیر — صبحِ آزادی وہ درخشندہ جبیں
جس کا ہے احسان ساری قوم پر — چُھپ گیا ہے ہم سے تابندہ نگیں
یاد آئیں گی وہ بزم آرائیاں — ہُوک سی دل سے اُٹھے گی بالیقیں
چشم نم ہے آج اس کی یاد میں — آج ہر اِک قلب ہے اندوہگیں
جا مِلا ہے آج، اپنے شاہ سے — ہو گئی مسرور وہ رُوحِ حزیں
آج اس منزل پہ جا پہنچا ہے وہ — جس جگہ سے کوئی بھی لوٹا نہیں

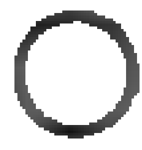
مطلعِ انوار ہو، اُس کی لحد
ہو خُدایا اُس کی تُربت عنبریں

بشکریہ ہفت روزہ "لولاک" — حافظ لدھیانوی

۹ - ۱۲ - ۶۶

"بابِ فردوسِ قاضیؒ احسان"

حضرت مکرّم، سلامِ محبت، مزاج گرامی!
جانشینِ امیرِ شریعت، خطیبِ پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی بھی چل بسے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اُن کی وفات حسرت آیات کی خبر سُنتے ہی تاریخ وفات ہوگئی۔ میں اس مہینے پے درپے کئی رُوحانی حادثات کا شکار ہوا ہوں۔ قاضی صاحب کی وفات پر چند اشعار سے زائد نہ کہہ سکا کیونکہ شدّتِ جذبات اظہارِ خیالات پر غالب آگئی۔ سو یہ چند اشعار نذر "لولاک" ہیں



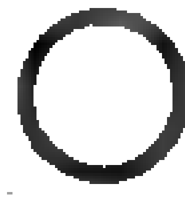
قصۂ زیست کا ہے یہ عنوان — رات دِن ہو رہا ہے یہ اعلان
پڑھ لو قرآن میں سورہ رحمان — سُن بھی لو کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان
آج دُنیا سے ہو گیا رُخصت — طُوطیِ گلستانِ پاکستان
صوت و آہنگ میں عطاء اللہ — اور سیرت میں بُوذرؓ و سلمانؓ
دِل نگہدارِ تاج و تختِ رسولؐ — اور سینہ تھا، حافظِ قرآن
سر میں عشقِ رسولؐ کا سودا — دل میں جذبِ محبتِ یزدان

ہے یہ تاریخِ انتقال اُن کی
بابِ فردوسِ قاضیؒ احسان

۱۳۸۶ھ

بشکریہ، ہفت روزہ "لولاک" — قلم برداشتہ ——— آزاد شیرازی
۶۶ - ۱۲ - ۹ — پرنسپل طبّیہ کالج، شاہدرہ، لاہور

نازتھا جس پہ بخاریؒ کو وہ انسان گیا



مطلعِ عشق گیا، مقطعِ عرفان گیا
منصبِ ختمِ نبوّت کا نگہبان گیا

جب کوئی سامنے پُرپیچ سا عنوان گیا
لب کھُلے اور خیالات کا طوفان گیا

نطق اظہار کے پیرائے میں اُمید گئی
ذوقِ گفتار کے انداز میں ارمان گیا

گنجفہ باز فراست کی وہ تطہیر ہوئی
شُعبدہ سازِ سیاست کا لہو چھان گیا

تیرے ہم چہرہ تھے افرادِ قرونِ اُولیٰ
میں اُنہیں تیرے خد وخال سے پہچان گیا

قادیانیتِ دوراں کے فسوں ٹوٹ گئے
اور تو اور، فرنگی بھی تجھے مان گیا

جس نے ہر دار کو گلزار کا ہمسر جانا
عشق سو جان سے اُس شخص پہ قربان گیا

ہمسفر میرِ شریعتؒ بہت تھے، لیکن
نازتھا جس پہ بخاریؒ کو وہ انسان گیا

آج بکھرے ہوئے گلیوں میں ہیں نغماتِ حدیث
آج اِک، سوئے عدم، قاریٔ قرآن گیا

جا تو سکتا نہیں گلشن سے پپیہا شاکرؔ
لوگ کہتے ہیں شجاع آباد سے احسان گیا

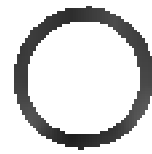
بشکریہ ہفت روزہ "چٹان" مورخہ ۶۶ - ۱۲ - ۱۲ شاکرؔ کنجاہی



قاضی احسان احمدؒ

چراغ اور اک بجھ گیا دوستو!

حضرت قاضی احسان احمد صاحبؒ کی وفات کا علم مجھے بروقت نہ ہو سکا۔ طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اسلئے گھر سے باہر نہ نکلا۔ ظہر کے قریب اخبار مشرق دیکھا تو رات ایک خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر سامنے آگئی۔ اب شجاع آباد پہنچنا ممکن نہ رہا تھا۔ لہذا نماز جنازہ کی شرکت اور آخری زیارت سے محروم رہا۔ قاضی صاحب کی موت نے پہلے زخم بھی تازہ کر دیئے۔ بہرحال مرحوم و مغفور کے اہل و عیال و دیگر برادرم قاضی عبداللطیف صاحب اور حافظ نورالحق صاحب کا غم تنہا اُن کا غم نہیں۔ اسمیں نہ صرف میں ہی بلکہ پوری جماعت برابر کی شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علییّن میں جگہ دے اور ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ میرے یہ اشعار میرے جذبات کے آئینہ دار ہیں (امین گیلانی)



سُوئے منزل احساںؔ رُخصت ہوا
سرائے سے مہمان رُخصت ہوا

یہاں ختم جب آب و دانہ ہوا
مسافر عدم کو روانہ ہوا

اندھیرا نہ ہو کیوں سوا دوستو!
چراغ اور اِک بجھ گیا دوستو!

قضائے الٰہی بہانہ بنی
حقیقت اچانک فسانہ بنی

ہوا قلب زخمی پھر اِک تیر سے
پھر اِک مات کھا لی ہے تقدیر سے

یہ سچ ہے، غمِ دِل سوا ہو گیا
کہ قاضیؔ بھی ہم سے جُدا ہو گیا

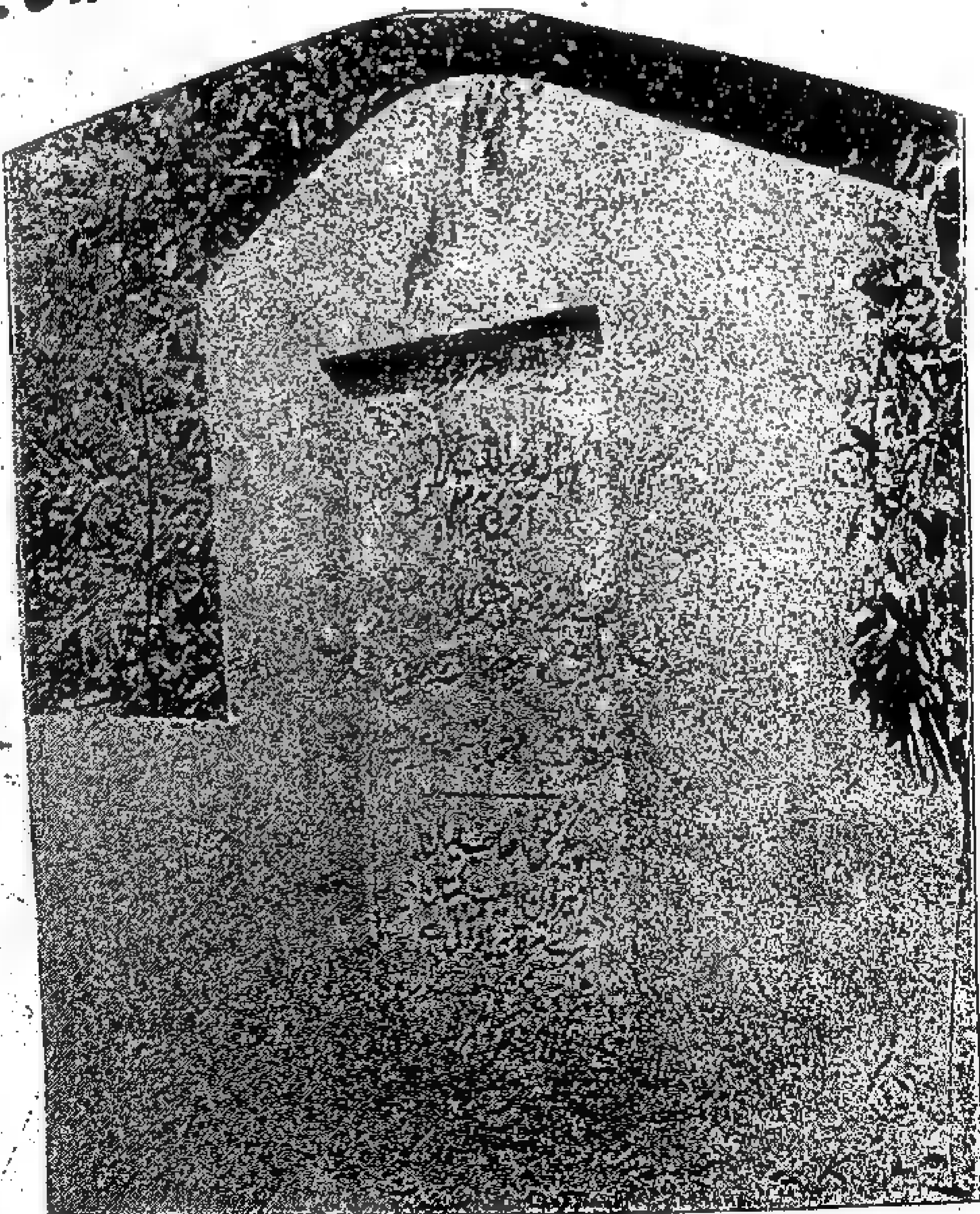
خطابت کا البیلا پن لُٹ گیا — فصاحت کا رنگیں چمن لُٹ گیا
کہاں ایسے ملتے ہیں انساں روز — کہاں ہاتھ آتے ہیں احساں روز
جماعت کی آنکھوں کا تارا گیا — محمد علیؒ کا، سہارا گیا
بیاں کس سے غم کی حکایت کریں — مقتدر کی کس سے شکایت کریں
بجھی شمع، تنویر گم ہو گئی — بخاریؒ کی تصویر گم ہو گئی

بشکریہ

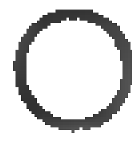
ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور — مؤرخہ ۱۶-۱۲-۶۶

ا

لہ محمد علی جالندھری



آہ! قاضی احسان احمد شجاع آبادی



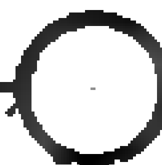
مِلّت کا دھڑکتا ہوا دِل ڈوب گیا ہے
ڈھونڈو تو کسی پھول کے ہونٹوں پہ تبسّم
سرگرمِ سفر قافلۂ قوم تھا جس سے
اِک عمر اُٹھاتا رہا سینوں میں تلاطم
دیکھی نہ کبھی ہم نے شکن اس کی جبیں پر
زنداں کے اندھیروں میں قدم اُس کے ملیں گے
ہر خرقۂ سالوس کو بے ریب و گماں چاک
اب کون سنبھالے گا وہ اندازِ خطابت
اپنے ہی اُجالوں میں بڑھے جاتے ہیں رہرو
ممکن ہی نہیں وقت کا ہاتھ اس کو مٹا دے

اے نغمہ سرایانِ وطن، تم نے سُنا ہے؟
دیکھو تو فلک پر کسی تارے میں ضیا ہے؟
ماضی کے دھندلکوں میں وہ گم بانگِ درا ہے
وہ سازِ دلآویز کہ خاموش ہوا ہے
ہر چند بقیدِ غمِ ایّام رہا ہے
گلشن کے اُجالوں میں بھی درد اُس کا رچا ہے
اُس ختمِ نبوّت کے محافظ نے کیا ہے
ہر جابر و ظالم کو جو پیغامِ قضا ہے
اس طرح وہ دل قوم کا گرما کے گیا ہے
مِلّت کو جو داغ اُس کی جدائی کا ملا ہے

اللہ کی رحمت سحر و شام ہو اُس پر
جس نے ہمیں احساس دلایا کہ "خدا ہے"

مضطر گجراتی

بشکریہ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور، مورخہ ۶۶ - ۱۲ - ۹



اے بخاریؒ کے رفیق!



اے فدائے دینِ قیمّ، اے خطیبِ بے نظیر
تیری تربت پر سدا مولا کی رحمت ہو کثیر

بعد از میرِ شریعتؒ تھا تو لاثانی خطیب
مانتے تھے رہنما اپنا تجھے میر و غریب

عُمر بھر تُو نے کیا ہر دشمنِ دیں سے جہاد
رُوح تیری کیوں نہ ہو فردوس میں آباد و شاد

اب کہاں تجھ سا ملے گا حق نگر روشن دماغ
بجھ گیا ہے تیری رحلت سے خطابت کا چراغ

تُو بزرگانِ سلف سے بھی ہوا ہے فیضیاب
یعنی تیری زندگی تھی کامیاب و کامگار

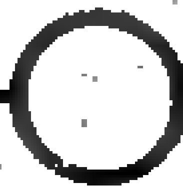
عشقِ ختم المرسلیںؐ میں رہ کے تو ثابت قدم
سرخرو ہو کر گیا ہے، جانبِ ملکِ عدم

جب تلک زندہ رہا تو اے خطیبِ بے مثال
تجھ کو ناموسِ نبوت کا رہا ہر دم خیال

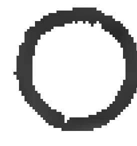
اے بخاریؒ کے رفیق و جانشین نیک نام
قاضیؒ احسان، تیری رُوح کو صدہا سلام

حافظ نور محمد انورؔ

بشکریہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، مؤرخہ ۶۶ - ۱۲ - ۳۰



خطیبِ پاکستان حضرت قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ علیہ

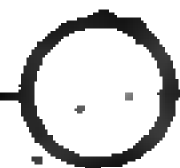


الوداع! اے سرزمینِ پاک کے عالی خطیب — الوداع! اے الوداع ختمِ نبوّت کے نقیب
تیرا اندازِ تکلّم، کفر کو بھایا نہیں — مصلحت کا زہر ایماں نے ترے کھایا نہیں
تو جو ٹکرایا کبھی، برطانوی ایوان سے — آگ کے شعلے بھڑکتے تھے ترے ایمان سے
تیرے دم سے بُت کدہ قادیاں لرزہ کئے — تُو نے شمشیرِ زباں سے کُفر کو چرکے دیئے
تُو عطاء اللہ کے پیغام کی تفسیر تھا — کُفر کے بازار میں ایمان کی تصویر تھا
موت سے بھی چھین لی تُو نے حیاتِ جاوداں — رُک گیا گو دیکھنے کو زندگی کا کارواں
آج ملّت کو ضرورت تھی تری گفتار کی — وقت کو خواہش رہی جیسے ترے کردار کی
ہے ضرورت پھر کسی سیّد عطاء اللہ کی — یا کسی خیبر شکن اندازِ اسد اللہؓ کی
تو مہکتا پھول تھا اس وادیٔ پُرخار میں — تُو بخاریؒ کا چلن تھا مجلسِ احرار میں
تو رہا احسان احمدؒ اور احسانِ وطن — روز و شب تیری بہاروں سے نکھرتا تھا چمن

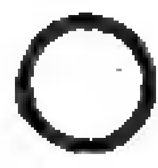
موت سے شکوہ رہے گا غم اُٹھاتا جائے گا
دیدۂ تر جب تلک آنسو بہاتا جائے گا

بشکریہ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور
جنوری ۱۹۶۷ء

جانباز مرزا



قاضی صاحب کی مدح میں
علامہ انور صابری کا فی البدیہہ کلام



سرور و مستی میں کٹ رہے تھے تمام تر صبح و شام "احسان"
زہے مقدر رہا مدینہ میں مدتوں تک قیام "احسان"
وہ جالیوں سے نظر ملا کر حجابِ عقل و خرد اُٹھا کر
خوشا حکایاتِ غم سُنا کر درودِ احسان سلامِ "احسان"
وہ خلوتِ شب کی راز داری وہ چشمِ حسرت کی اشکباری
وہ جذبۂ دل کی بے قراری بحسنِ صد اہتمام "احسان"
نظر پہ تھا رحمتوں کا سایہ بلند تھا شوقِ دل کا پایہ
وہ گود میں بیکسوں کی آیا جواب نُصرت بنام "احسان"



فی البدیہہ علامہ انور صابری

خلاصۂ کتاب ○ چند الفاظ میں

مولانا قاضی احسان احمدؒ ۹ ربیع الاوّل ۱۳۲۴ھ بمقام شجاع آباد پیدا ہوئے۔ ذات جٹ سگوتھی۔ شجاع آباد کے علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں میں حاصل کی۔ اٹھارہ ۱۸ سال کی عمر میں امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، اور احرار میں شامل ہو گئے۔

کشمیر کی جنگِ آزادی اور کوئٹہ کے مظلومین کی امداد میں بھرپور حصّہ لیا۔ قادیان کانفرنس منعقدہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں افتتاحی خطبہ آپ نے دیا۔ آپ تیسرے احراری لیڈر تھے جنہوں نے قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۵ء کا جمعہ پڑھایا اور گرفتار ہوئے۔ جنگِ عظیم دوم میں احرار کی طرف سے فوجی بھرتی کے خلاف تحریک میں حصّہ لیا اور آل انڈیا احرار کے پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ سیاسی طور پر مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء میں بھرپور حصّہ لیا، اور گرفتار ہوئے۔ دورانِ قید آپ کو اور مولانا احمد علی صاحبؒ کو زہر دیا گیا۔ مگر قدرت نے دونوں کو بچا لیا۔ اسی دوران آپ کے والد قاضی محمد امین رحلت فرما گئے۔ مگر حکومتِ پاکستان نے ایک لاکھ روپے ضمانت مہیّا کرنے کے باوجود پیرول پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ۸، ۹ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آخری گرفتاری ۱۹۶۰ء میں ایوب خانی دَور میں ہوئی۔ مگر پندرہ دن کے بعد حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور رہا کر دیئے گئے۔

امیرِ شریعتؒ کی وفات کے بعد ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو آپ مجلسِ تحفّظِ ختمِ نبوت

پاکستان کے امیر منتخب ہوئے۔

اپریل ۱۹۶۶ء میں بیماری کا آغاز ہوا۔ ملتان اور لاہور علاج کرائے گئے سات ماہ کی کشمکش کے بعد ۲۳ نومبر ۱۹۶۶ء مطابق ۹ شعبان ۱۳۸۶ھ بعمر ۶۲ سال ۵ ماہ کینسر کے موذی مرض کی وجہ سے وفات پائی اور شجاع آباد کے نور شاہ قبرستان میں دفن کئے گئے۔ نماز جنازہ میں کراچی سے پشاور تک عقیدت مند شریک ہوئے حضرت مولانا عبداللہ درخواستی نے نماز پڑھائی

"مولانا عبدالشکور دینپوری کا خراج عقیدت"

" احسان پر اللہ کا احسان تھا، کیا عجب انسان تھا۔ بہادر تھا، مردِ میدان تھا، خادمِ قرآن تھا، ذی فہم و ذیشان تھا۔ علماء کا قدردان تھا۔ عشقِ نبی آخر الزمان تھا۔ قاضی پر فضلِ یزدان تھا۔ یوں سمجھ رب مہربان تھا آہ! قاضی مہمان تھا۔ مرحوم کئی صفات کا حامل تھا علماء کے زمرہ میں شامل تھا۔ دشمنوں کا جلیب تھا۔ خوش بخت، خوش نصیب تھا، فصیح تھا ادیب تھا پاکستان کا خطیب تھا۔ قاضی غازی تھا، نمازی تھا اللہ اس سے راضی تھا، قاضی کے دست میں سخا تھی، چشم میں حیا تھی، طبیعت باوفا تھی، پیاری ادا تھی۔ قاضی مہمان نواز تھا۔ کامیاب تھا، سرفراز تھا، طمع سے بے نیاز تھا۔ اسلام کا شہباز تھا۔ پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ جلسے ہو رہے ہیں واعظ نہیں، ممبر ہے زینت ممبر نہیں، مسجد ہے خطیب نہیں، بچیاں ہیں ابا نہیں رہا، بیوی ہے سہاگ اجڑ گیا، چمن ہے مالی نہیں خزانہ ہے محافظ نہیں، مکان ہے مکیں نہیں، اب بھی موت پر یقین نہیں، یا اللہ قاضی مرحوم کو محروم نہ کرنا الا تخافوا ولا تحزنوا کا مژدہ سنانا۔ ایک مسافر غریب کفن بدوش، خاموش پر رحم کی نگاہ ہو،

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

سوانح حیات

خطیب پاکستان حضرت مولٰنا

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

رحمۃ اللہ علیہ

مصنفہ

محمد نور الحق قریشی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی ایڈووکیٹ ملتان

ناشر

مکتبہ احسان نزد چہلیک ملتان شہر فون ۳۶۲۱

قیمت ۱۷ روپے